باسمہٖ تعالیٰ

ہماری بصیرت کے مطابق

جلد دوم

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱

نام کتاب: قرآنی فیصلے

جلد: دوم

ایڈیشن اوّل: ۱۹۸۲ء

ایڈیشن چہارم: اکتوبر ۲۰۰۲ء

ناشر: طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۲۵۔ بی، گلبرگ۲، لاہور ۵۴۶۶۰

Email: trust@toluislam.com · Web. www.toluislam.com

طابع: طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

مطبع: اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز۔ لاہور

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات

قرآنی فیصلے

جلد دوم

(مبنی بر سابقہ جلد چہارم و پنجم)

مضامین سابقہ جلد چہارم

مضمون — صفحہ

باب اول

قرآن مجید

مضمون	صفحہ

باب دوم

نبوت، رسالت، احادیث

مضمون	صفحہ

باب سوم
ہماری تاریخ

باب چہارم
تقدیر

باب پنجم
تصوف

صفحہ | مضمون

باب ششم
علوم سائنس اور قرآن

باب ہفتم
عائلی زندگی

مضمون | صفحہ

باب ہشتم
(فرقہ بندی)

(مضامین سابقہ جلد پنجم)
پہلا باب
مذہبی پیشوائیت اور اسلام

مضمون | صفحہ

دوسرا باب
شرعی قوانین

مضمون | صفحہ

مضمون | صفحہ

تیسرا باب
علماء کی باہمی سر پھٹول

چوتھا باب
تحریک پاکستان اور علماء حضرات

(صرف دو ایک مثالیں)

پانچواں باب
اسلامی نظام و نظام مصطفیٰؐ

مضمون | صفحہ

چھٹا باب
زکوٰۃ کا مفہوم اور نظام زکوٰۃ میں تبدیلیاں

ساتواں باب
ارکان اسلام کے مقاصد

آٹھواں باب
جنسیات

مضمون | صفحہ

نواں باب

تحفظ ناموس رسالتؐ

متفرق سوالات و جوابات

مضمون | صفحہ

مضمون	صفحہ

نگہِ باز گشت

تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد قرآنی فکر اور تعلیم کی نشر و اشاعت ہے۔ اس کا آغاز (تحریکِ پاکستان کے دوران) ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد یہ سلسلہ ۱۹۴۸ء سے مسلسل جاری ہے۔ اس کا بنیادی گوشہ تو قرآنی حقائق اور معارف سے متعلق ہے جس کے لئے ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے بڑی بڑی ضخیم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ہماری روز مرّہ کی زندگی میں بے شمار ایسے معاملات آتے ہیں جنہیں غلطی سے اسلامی سمجھا جاتا ہے' لیکن درحقیقت وہ اسلامی ہوتے نہیں۔ ان کے متعلق ہمیں عوام کی طرف سے سوالات موصول ہوتے تھے اور ان کے جواب طلوعِ اسلام میں شائع کئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ حتّٰی کہ یہ تقاضا ہوا کہ ایسی اہم معلومات کو طلوعِ اسلام کے اوراق میں محبوس رکھنے کے بجائے' ان کا الگ مجموعہ شائع کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ یہ مجموعہ ''قرآنی فیصلے' جلد اول'' کے نام سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ جوئے رواں کی طرح جاری رہا اور اس کے مجموعے علی التواتر شائع ہوتے رہے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۷۹ء میں اس کی چوتھی جلد شائع ہوئی اور اب پانچویں جلد پیشِ خدمت ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہم نے اس سلسلہ کا عنوان ''ہماری بصیرت کے مطابق-- قرآنی فیصلے'' رکھا ہے۔ یہ تخصیص سمجھنے کے قابل ہے۔ بعض معاملات ایسے ہیں جن کے متعلق قرآنِ مجید میں بہ نصِ صریح کہا گیا ہے کہ وہ جائز ہیں یا ناجائز۔ ان میں سے جب کسی کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ ناجائز ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسے قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں ناجائز قرار دیا ہے۔ لیکن اگر قرآنِ مجید نے ایسا نہیں کہا تو اس کے متعلق اس کے دیگر مقامات پر غور و تدبّر کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ اس کا منشا کیا ہے۔ اس کے متعلق کہا جائے گا کہ ''ہماری بصیرت کی رو سے قرآن کا یہ فیصلہ نظر آتا ہے''۔ ایسے فیصلوں کے متعلق ہر صاحبِ علم و بصیرت کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ از خود غور و تدبّر کے بعد دیکھ لے کہ قرآنِ مجید کا منشا کیا ہے۔ ان ہر دو اقسام کے فیصلوں میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔

یہ مجموعے' بہ ہیئتِ مجموعی' اس قدر جامع ہیں کہ جن کے پاس یہ موجود ہیں' انہیں کسی سوال کے پوچھنے کی بمشکل ضرورت پیش آتی ہے۔ جن کے پاس یہ مجموعے نہیں' ان کے سوالات کے جواب میں انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ اس کے متعلق فلاں جلد میں وضاحت ملے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان سوالات کا سلسلہ خود ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ بایں ہمہ' زندگی کے تقاضے ختم نہیں ہوسکتے۔ جب کوئی نیا تقاضا سامنے آتا ہے تو اس کے متعلق ہم سے پوچھا جاتا ہے۔ اس طرح سوال اور جواب کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے' اگرچہ اس کی رفتار میں کمی آجاتی ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسا سوال آئے جس کا جواب آپ کو ان جلدوں میں نہ ملے' تو اسے ہم سے دریافت فرمالیں۔

اس سلسلے کو شروع کئے کم و بیش تیس سال ہوگئے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس دوران میں جو کچھ ہم نے لکھا

ہے اس میں کہیں تضاد نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیاد قرآنِ کریم ہے اور قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں' کوئی اختلاف نہیں (۴/۸۲)۔ اگر ان مجموعوں میں آپ کو کسی مقام پر کوئی جھول' کوئی سلوٹ' کوئی سقم محسوس ہو' تو اسے ہماری فکر کی کوتاہی تصور فرمایئے۔ قرآن کا دامن اس قسم کے اسقام سے بہت بلند ہے۔ انسانی کوششوں میں سہو اور غلطی کا امکان ہوتا ہے' خدا کی کتاب میں نہیں۔

آخر میں ایک اور بات۔ طلوعِ اسلام کے خلاف یہ الزام بڑی شدت سے عائد کیا جاتا ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ اس کے لٹریچر میں آپ دیکھیں گے کہ اس کے نزدیک کسی حدیث کے پرکھنے کا معیار قرآنِ مجید ہے۔ ہم صرف اسی حدیث (روایت) کے صحیح ہونے سے انکار کرتے ہیں جو قرآن کے خلاف جاتی ہو۔۔۔۔ ان مجموعوں میں بھی آپ ہمارے اس معیار کو کارفرما دیکھیں گے۔ اس سے آپ اندازہ لگالیں گے کہ یہ انکارِ حدیث نہیں' بلکہ حدیثوں کے پرکھنے کا صحیح معیار ہے۔

ان تصریحات کے ساتھ یہ مجموعہ اربابِ فکر و دانش کے پیش خدمت ہے۔

والسلام

ناظم' ادارۂ طلوعِ اسلام'

گلبرگ نمبر ۲ لاہور

نومبر ۱۹۸۲ء

طباعتِ جدید

حصہ اوّل (مبنی بر سابقہ جلد اوّل' دوم اور سوم) کی طباعتِ نَو کے وقت (۱۹۸۷ء میں) یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ تمام مطبوعات کا سائز ایک کردیا جائے۔ چنانچہ حصہ اوّل بڑے سائز میں طبع کیا گیا تھا۔ اس وقت یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ جب جلد چہارم اور پنجم کی طباعتِ نَو کا مرحلہ آئے گا تو اس کا سائز بھی بڑا کردیا جائے گا۔ اس وعدہ کے مطابق قرآنی فیصلے حصہ دوم (مبنی بر سابقہ جلد چہارم و پنجم) بھی بڑے سائز پر حاضرِ خدمت ہے۔ بایں دعا کہ اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں یہ ہدایت نصیب کریں کہ ہم اپنی زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کے لئے قرآن کریم کی بارگاہِ عالیہ کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ اس کتابِ عظیم کے نازل کرنے والے اللہ کا فرمان ہے کہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ

بلاشبہ یہ قرآن (سفرِ زندگی میں) اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی اور توازن بدوش ہے۔

والسلام

پروفیسر ڈاکٹر زاہدہ درانی

انتظامی سربراہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور

دسمبر ۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اول

قرآنِ مجید

۱۔ وحی کی کُنہ و ماہیت

سوال : وحی کی کُنہ و ماہیت کیا ہوتی ہے۔ یہ خدا کی طرف سے کیسے نازل ہوتی تھی۔ نبیؐ کو کس طرح ملتی تھی؟
جواب : ایک اصولی بات سمجھ لیجئے۔ حصول علم کا ایک ذریعہ فکر انسانی (Human Intellect) ہے۔ اس کے متعلق ہر شخص علیٰ قدر وسعت جانتا ہے کہ یہ کیسے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی نوعیت، ماہیت اور کیفیت کیا ہوتی ہے، اس لئے ان امور کے متعلق بحث بھی کی جاسکتی ہے اور کسی کے دعویٰ کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے۔

اس کے برعکس، علم کا ایک ذریعہ، وحی ہے جس میں انسانی فکر اور کدو کاوش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ وہ علم ہے جسے حاصل نہیں کیا جاسکتا، یہ خدا کی طرف سے اس کے کسی منتخب بندے کو براہ راست ملتا تھا، کوئی غیراز نبی اس میں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔

اب آپ سوچئے کہ جس علم میں کوئی غیراز نبی شریک تک نہیں ہوسکتا، اس علم کے متعلق غیراز نبی انسانوں کا بحث کرنا کہ اس کی کنہ و حقیقت کیا ہوتی ہے، وہ نبی کو کیسے ملتا تھا، اس میں نبی کی اپنی پوزیشن کیا ہوتی تھی، ان انسانوں کا اپنی حدود سے تجاوز کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ غیراز نبی انسانوں کا ان امور کے متعلق گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے دو اندھے یہ بحث کر رہے ہوں کہ سرخ رنگ کیسا ہوتا ہے؟

یہ ہے، ہمارے عزیز! اس مسئلہ میں غیراز نبی انسانوں کی پوزیشن، خواہ وہ کتنے ہی بڑے مفکر اور متکلم کیوں نہ ہوں!

خدا کی یہ وحی، آخری مرتبہ، حضور نبی اکرمؐ کو ملی جسے حضورؐ نے من و عن بغیر کسی قسم کی آمیزش یا تبدیلی کے دوسرے انسانوں تک پہنچا دیا۔ یہ وحی خدا کے الفاظ میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم اس وحی خداوندی کو اپنے علم و عقل و فکر کی رو سے سمجھ سکتے ہیں، لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ یہ رسولؐ اللہ پر نازل کس طرح ہوئی تھی، نہ ہی کوئی غیراز نبی اسے جان سکتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ ہم یہ ثابت کیسے کرسکتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے، انسان کا نہیں۔ سو اس کے لئے خود اس وحی کا دعویٰ موجود ہے کہ انسانی فکر اس کتاب کی مثل، کوئی کتاب تخلیق نہیں کرسکتی۔ اس دعویٰ کو علم و بصیرت، عقل و فکر اور انسانی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ثابت کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ وحی، انسانی فکر کی تخلیق نہیں لیکن اس کی

پیش کردہ تعلیم کا سمجھنا سمجھانا اور اس کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا' انسانی فکر کا کام ہے۔
یہ ہے ہمارے نزدیک' اس باب میں قرآن کی رو سے صحیح پوزیشن!

۲۔ وحی کی آواز

کراچی سے ایک ماہ نامہ شائع ہوتا ہے' "البلاغ"۔ اس کے مدیر محترم مفتی محمد شفیع صاحب (اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ نومبر۱۹۷۶ء) کے صاحبزادہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔ اس ماہنامہ کی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۵ء میں' حکیم محمود احمد ظفر صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے' جس کا عنوان ہے۔۔۔۔۔ وحی کی آواز۔ اس میں وہ مختلف روایات کی سند سے' یہ بتاتے ہیں کہ جب نبی اکرمؐ پر وحی نازل ہوتی تھی' تو مختلف قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی گھنٹے کی سی آواز' کبھی مکھیوں کے گنگنانے کی سی۔ ان آوازوں کو اہل مجلس بھی سنتے تھے۔ یہ آواز کس کی ہوتی تھی' اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

(۱) پہلا مسلک جو کہ سب سے نمایاں ہے' امام بخاریؒ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کی آواز ہوتی تھی' جو تمام فضا میں گونج جاتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی صحیح میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں' جس میں صاف الفاظ ہیں۔

اذا یکلم اللہ بالوحی۔۔ جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ علاوہ ازیں' آپ نے فرقہ جہمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں کئی احادیث کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کے لئے صوت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ایسا ہی ابن عربیؒ نے بھی لکھا ہے۔

(۲) دوسرا مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ یہ آواز فرشتہ وحی کے پیروں کی ہوتی تھی۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے کئی علماء کا یہی مسلک ہے۔

(فتح الباری' جلد۱ ص۱۶)

(۳) تیسرا مسلک اس بارہ میں یہ ہے کہ یہ فرشتہ کی زبان کی آواز ہوتی تھی۔ کئی شارحین بخاری اور جلیل القدر محدثین اس کے بھی قائل ہیں۔

(واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

اس کے بعد وہ اس کی "فلسفیانہ تشریح" کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

آواز کے اس تیز احساس اور خفیف احساس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وحی خواب و خیال سے بالاتر ایک محسوس شئے ہے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ اس کی بے کیف آواز سے بھی مجلس میں بیٹھنے والے ادراک کر لیتے ہیں اور جو جاہل وحی کو (العیاذ باللہ) محض

ایک دماغی تخیل سمجھتے ہیں' وہ نبوت کی حقیقت سے جاہل اور نا آشنا ہیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر کو وحی کی اس صورت میں جو آواز سنائی دیتی تھی وہ تو گھنٹے کی آواز کی طرح اور بقول سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ کے مشابہ ہوتی تھی۔ اس سے آپ کو احکام الٰہی کا پتہ کیسے چلتا تھا' اس سوال کا جواب شاید زمانہ ما قبل میں مشکل ہوتا' لیکن عصر جدید میں ٹیلیگراف کی ایجاد نے اس سوال کے جواب کو آسان ترین بنا دیا ہے۔ تار گھر میں جا کر دیکھئے۔ آپ کو وہاں صرف ٹک ٹک کی آواز سنائی دے گی جس کو آپ فضول اور لا یعنی سمجھیں گے' لیکن تار کلرک جو اس فن سے واقف ہے' اسی آواز کو سن کر تار لکھتا جاتا ہے۔ آواز ایک ہی ہے لیکن ایک کے نزدیک با معنی اور دوسرے کے نزدیک بے معنی۔ اسی طرح بلا شبہ اگر وحی کی آواز کوئی دوسرا سن بھی لے تو وہ اس کی کیفیت کو اپنے علم کے لحاظ سے اپنے الفاظ میں بیان تو کر سکتا ہے' لیکن اس بسیط اور بے جہت آواز' کلام الٰہی کو اخذ نہیں کر سکتا۔ یہ کلام صرف اور صرف ایک نبی اور رسول ہی سمجھ سکتا ہے' جس پر وحی الٰہی نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہ فرماتے ہیں۔

وصلصلۃ الجرس ھھنا کنقرات التلغراف لاداء الرسالۃ۔

(مشکلات القرآن ص ۱۲۴)

اور گھنٹہ کی آواز ٹیلیگراف کی ٹک ٹک کی طرح ہے جو پیغام رسانی کے لئے کی جاتی ہے۔

طلوع اسلام۔ "وحی کی آواز" اور اس کی اس تشریح کے بعد سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پکڑ کر رہ جائے' اور کیا کرے۔ مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے نہ قرآن ہوتا ہے' نہ ہی عصر حاضر کے علوم اور نہ ہی یہ کبھی اس پر غور کرتے ہیں کہ معاندین اسلام نے کس مقصد کے لئے اس قسم کی روایات وضع کی تھیں' جنہیں اب بطور سند پیش کیا جاتا ہے:۔

وحی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کوئی غیر از نبی کچھ نہیں جان سکتا' نہ ہی اسے معلوم کر سکتا ہے کہ اس کے نزول کی کیفیت کیا تھی۔ لیکن قرآن کریم نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی ہے کہ **فانہ نزلہ علی قلبک (۲/۹۷)** جبریل اسے بحکم خداوندی' قلب نبویؐ پر نازل کرتا تھا۔ دوسری جگہ ہے **نزل بہ الروح الامین علی قلبک (۲۶/۱۹۳)** روح الامین اسے لے کر قلب محمدیؐ پر نازل ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ جو علم کسی کے قلب میں اتارا جائے' اس کی آواز کیسی' اور کسی دوسرے کو اس کا علم و احساس ہونے کا سوال کیا؟ یہ تو رہی ان حضرات کی قرآن کریم سے بے خبری! باقی رہا علم' سو یہ کہتے ہیں کہ:۔

وحی' خواب و خیال سے بالاتر ایک محسوس شے ہے۔

انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ جب "خواب و خیال" بھی محسوس شے نہیں ہوتے تو ان سے بالاتر' "وحی" محسوس شے کیسے ہوسکتی ہے؟ وحی کو خدا نے عالم امر سے متعلق بتایا ہے جب کہا ہے **وکذالک اوحینا الیک روحامن امرنا** ۴۲/۵۲۔ اور یہ ظاہر ہے کہ عالم امر' عالم خلق (یعنی عالم محسوسات) سے بالکل الگ اور غیر مرئی اور غیر محسوس ہے۔ لہٰذا' وحی محسوس شے کیسے ہوسکتی ہے۔ اسے محسوس شے قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہماری مادی دنیا سے متعلق ہے۔ اس سے وحی کا منفرد تصور ہی ختم ہوجاتا ہے۔ اسے:

(۱) خدا کی ایسی آواز قرار دینا جسے اہل مجلس بھی سن لیتے تھے' خود خدا کے متعلق جو تصور سامنے لاتا ہے وہ ظاہر ہے۔

(۲) اسے فرشتہ وحی کے پیروں کی آواز یا اس کی زبان کی آواز کہنا' خود ملا ئکہ (روح الامین) کا جو تصور پیش کرتا ہے' وہ بھی ظاہر ہے۔

اور اسے "ٹیلیگراف کی ٹک ٹک" سے تشبیہ دے کر' وحی کو جس مقام پر لے آیا گیا ہے' اس کے تو خیال تک سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ ان حضرات کو کون سمجھائے کہ جب وحی کے متعلق آپ کی یہ تفصیلات اور تشبیہات' غیر مسلم اہل علم و دانش کے سامنے جاتی ہیں تو وہ حضور نبی اکرمؐ کے متعلق کیا خیال قائم کرتے ہیں۔ اور جب اس قسم کی باتیں خود ہمارے اپنے ہاں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے آتی ہیں تو وہ کس طرح اسلام سے برگشتہ ہی نہیں' متنفر ہوجاتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اس سے کیا غرض! ان کا اسلام تو بس اتنا ہی ہے کہ ان روایات کو تنقید کی حد سے بلند سمجھا جائے اور جو "بدبخت" ان پر دعوت غور و فکر دے' اسے منکر حدیث قرار دے کر' اس پر کفر کا فتویٰ عائد کردیا جائے اور اسے دین کی سب سے بڑی خدمت قرار دے کر' قوم کے سر پر احسان دھرا جائے۔ (مارچ ۱۹۷۵ء)

۳۔ قرآن کو گا گا کر پڑھنا

سوال : گزشتہ چند سالوں سے یہ معمول ہو رہا ہے کہ مختلف اسلامی ممالک سے قاریوں کے گروہ آتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں ان کی قرات کی محفلیں جمتی ہیں۔ وہ گا گا کر قرآن سناتے ہیں اور سامعین مرحبا اور سبحان اللہ کے نعروں سے داد دیتے ہیں۔ وہ چلے جاتے ہیں تو ان کے ریکارڈ' ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اسلام میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کا فائدہ کیا؟

جواب : اس سوال کے جواب تک آنے سے پہلے' تمہیداً" کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم پر غور و فکر کرکے' اس پر عمل کرنے والی جماعت مومنین نے دنیا میں جو محیر العقول انقلاب برپا کیا اور اس سے مفاد پرست گروہوں' ملوکیت' مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری پر جو زد پڑی' وہ تاریخ انسانیت کا ایک عدیم النظیر باب ہے۔ ان گروہوں نے محسوس کرلیا کہ عربوں جیسی قوم میں ـــ جن کے متعلق ان کی ہمسایہ قومیں یہ کہہ کر اپنی نفرت کا اظہار کیا کرتی تھیں

کہ "زشیر شتر خوردن و سوسمار"--- اس قسم کی حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرنے کی موجب یہ کتاب ہے۔ جب تک اس قوم کو اس کتاب سے بیگانہ نہ کر دیا جائے گا' ان کی مفاد پرستیاں محفوظ نہیں رہ سکیں گی۔ چنانچہ مسلمانوں کو اس کتاب عظیم--- زندگی کے اس ضابطہ خداوندی۔ سے بیگانہ بنانے کے لئے انہوں نے قسم قسم کی چالیں چلیں اور طرح طرح کی سازشیں کیں۔ کہیں اس کی محفوظیت کے متعلق دلوں میں شکوک پیدا کرنے کے لئے یہ قصہ وضع کیا گیا کہ رسولؐ اللہ اسے ایک مرتب کتاب کی شکل میں دے کر گئے ہی نہیں تھے۔ یہ ہڈیوں' ٹھیکریوں اور کھجور کے پتوں وغیرہ پر لکھا ہوا منتشر پڑا تھا۔ اسے بعد میں مل جل کر کتابی شکل دی گئی اور وہ بھی اس طرح جس میں شکوک و شبہات کے سیکڑوں قرائن موجود ہیں۔

کہیں کہا گیا کہ شروع میں اس کے حروف پر نقطے ہی نہیں تھے۔ بعد میں لوگوں نے اپنے اپنے قیاس سے ان پر نقطے (اور اعراب) لگائے۔ (نقاط اور اعراب کے فرق سے معانی میں جس قدر فرق پڑ جاتا ہے' عربی دان حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں)۔

کہیں اس کی معنوی حیثیت کے متعلق کہا گیا کہ یہ بڑی مجمل کتاب ہے' جس سے کوئی بات متعین طور پر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے بیسیوں قسم کے خارجی سہاروں کی ضرورت ہے۔

کہیں کہا گیا کہ اس میں سیکڑوں آیات ایسی ہیں جنہیں پڑھا تو جاتا ہے لیکن ان کا حکم منسوخ ہوچکا ہے۔ دوسری طرف' بعض آیات ایسی بھی ہیں جو موجودہ قرآن میں نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔

کہیں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآن کے معانی سمجھنے کی ضرورت نہیں' اس کے الفاظ دہرا لینے سے ثواب مل جاتا ہے۔ اگر کسی کو اس کے الفاظ بھی پڑھنے نہ آتے ہوں تو وہ اس کی سطروں پر انگلیاں پھیر لیا کرے۔ اس سے بھی تلاوت کا ثواب حاصل ہوجاتا ہے۔ بغیر سمجھے نماز میں قرآنی سورتوں کا پڑھ لینا' تراویح میں قرآن شریف ختم کرنا---- جبکہ نہ پڑھنے والا اس کا مطلب سمجھے' نہ سننے والے-- مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے قرآن خوانی--- سب اسی عقیدہ کے برگ و بار ہیں۔

اس سے آگے بڑھے تو ارباب طریقت نے یہ نظریہ قائم کیا کہ قرآن کا حقیقی مطلب' اس کے الفاظ کے لسانی مفہوم سے سامنے نہیں آسکتا۔ اس کے باطنی معانی ہیں جو ارباب طریقت کے ہاں سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں۔ قرآن کا مفہوم ان باطنی معانی کی رو سے سمجھ میں آسکتا ہے---- ان باطنی معانی کی ایک جھلک سامنے آجائے تو انسان ورطہ حیرت میں گم ہو جائے کہ وہ کس طلسم ہوش ربا کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

اس سے یہ عقیدہ وضع ہوا کہ قرآنی حروف و الفاظ کے ورد' وظیفہ' نقش' تعویذ سے وہ کام لئے جاسکتے ہیں جن کا حصول دنیاوی اسباب و ذرائع سے ممکن نہیں--- اور طرفہ تماشا یہ کہ ان کا نام "اعمال قرآنی" رکھ دیا گیا اور ایسا کرنے والے "عامل" کہلانے لگے۔

اور اگر کسی کے دل میں اس کے الفاظ کے معانی کو پیش نظر رکھ کر پڑھنے کا خیال پیدا ہوا تو اس سے یہ کہہ دیا

گیا کہ قرآن میں غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا جو مطلب سمجھا جاسکتا تھا' وہ سمجھا جاچکا ہے۔ تم اسلاف کے بتائے ہوئے مفہوم سے ذرا بھی اختلاف نہیں کرسکتے۔

یہ (اور اس قسم کے دیگر کئی ایک) حربے تھے جو مسلمانوں جیسی انقلاب آفریں جماعت کو قرآن سے دور اور بیگانہ رکھنے کے لئے وضع اور استعمال کئے گئے۔ نتیجہ اس کا ہمارے سامنے ہے۔ وہی قوم جس نے اسی کتاب کی بدولت' ہر باطل نظام کا تختہ الٹ کر رکھ دیا تھا آج' انہی نظاموں کے علمبرداروں کے دروازوں پر بھیک مانگتی دکھائی دے رہی ہے۔

انہی سازشوں میں ایک سازش یہ بھی تھی کہ قرآن کو گا گا کر پڑھا جائے۔ گانے کا تعلق انسانی جذبات سے ہے۔ آپ کسی اعلیٰ موسیقی کو سنئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس دوران میں نہ گانے والا' عقل و فکر کی رو سے کسی بات کی طرف دھیان دے سکنے کے قابل ہوگا' نہ سننے والے۔۔۔ اگر گانے والے کا دھیان ذرا بھی کسی اور طرف چلا جائے تو اس کا راگ بگڑ جاتا ہے۔ اور اگر سننے والے کچھ سوچنے لگ جائیں تو وہ موسیقی کی لذت سے بے کیف ہوجاتے ہیں۔ موسیقی میں' سب جذبات میں گم ہوجاتے ہیں اور اس دوران میں ان کی عقل و فکر کے (SWITCH OFF) ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مقصد ہی یہ ہے کہ جب انسانی ذہن مسلسل سوچ بچار سے تھک جائے' تو اسے کچھ وقت کے لئے سکون مل جائے۔ لہٰذا' کسی چیز کو گا کر پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے متعلق غور و تدبر سے کام نہیں لے سکتا۔ آپ اس کا خود تجربہ کرکے دیکھ لیں۔ آپ کسی عبارت کو جھوم جھوم کر' گا گا کر پڑھیں' آپ دیکھیں گے کہ آپ جذبات سے لذت اندوز تو ہوں گے' لیکن (اس دوران میں) اس کے مطالب و معانی پر غور و فکر نہیں کرسکیں گے۔ اس کے برعکس' آپ اسے نثر کی طرح پڑھیں (یا کسی کو پڑھتے ہوئے سنیں) خواہ آواز سے اور خواہ آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموشی سے۔۔۔۔ آپ اس کے مطالب کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں گے۔

دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کی کتاب سے (جیسی کچھ بھی وہ رہ جاتی ہے) اس کے معتقدین کا تعلق جذباتی رہ جاتا ہے۔ وہ ان کے لئے عملی زندگی کا ضابطہ نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ "مذہبی کتابوں" کو عام طور پر گا کر پڑھا جاتا ہے۔۔۔ مندروں میں ویدوں کے منتر' گردواروں میں گروبانی کے شبد۔۔ گرجاؤں میں "خداوندی گیت" صومعوں میں غزل الغزلات وغیرہ' گا کر پڑھی جاتی ہیں اور اس طرح عقیدت مندوں کے "جذبات کی تسکین" کا سامان بہم پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسی جذباتی تسکین کا نام روحانی اطمینان یا ایشور پرماتما سے لو لگنا رکھ دیا جاتا ہے۔ جب اس کی شدت سے جذبات بے قابو ہوجاتے ہیں تو اس کا مظاہرہ قوالی کی محفل (سماع) میں' وجد اور رقص کی شکل میں ہوتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ بنانے (اور اس طرح دین کو مذہب کی سطح پر لے آنے) کے لئے جو سازشیں ہوئیں' ان میں ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کو گا گا کر پڑھا جائے۔ پھر جس طرح اس قسم کی ہر سازش کو تقدس کا لبادہ اوڑھا دیا گیا' فن قرات پر بھی تقدس کی چادر چڑھا دی گئی۔

آپ نے اس پر غور کیا ہوگا کہ قرآن کریم نے (فاتحہ الکتاب کے بعد) سب سے پہلی سورت کے ابتدائی الفاظ میں اپنا تعارف

ذالک الکتاب

کہہ کر کرایا ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ یہ ایک کتاب (ایک ضابطہ زندگی) ہے' اسے کتاب ہی کی حیثیت دینا۔ اس سے الگ کچھ اور نہ بنا دینا۔ اس کے بعد اس میں بار بار دہرایا گیا ہے' کہ یہ واضح عربی زبان کی ایک کتاب ہے جس میں جو کچھ کہا گیا ہے' نہایت نکھرے اور ابھرے ہوئے انداز میں کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں' التباس نہیں' کوئی مشکوک بات نہیں' کوئی دعویٰ ظن و قیاس پر مبنی نہیں۔ پھر' اس میں بیان کردہ حقائق پر غور و فکر کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ کیا ایک اچھی کتاب کی ایسی ہی خصوصیات نہیں ہوتیں؟ (اور قرآن تو صرف ایک اچھی کتاب ہی نہیں' بے مثل کتاب ہے)۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ کیا ہم نے اسے کتاب ہی سمجھا ہوا ہے' یا کچھ اور بنا رکھا ہے؟ آپ سوچئے کہ:۔

(۱) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی کتاب کا ایک لفظ بھی آپ کی سمجھ میں نہ آیا ہو' اور اس کے باوجود آپ اسے پڑھتے یا سنتے رہیں؟ آپ کبھی ایسا نہیں کرتے۔

(۲) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی کتاب کے الفاظ (یا جس فن سے وہ متعلق ہے اس کی اصطلاحات) کی رو سے' اس کے جو مطالب سامنے آتے ہوں' آپ انہیں مسترد کردیں اور یہ کہیں کہ ان الفاظ کے کچھ باطنی معانی ہیں اور انہی سے اس کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے؟

(۳) کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ کسی ڈاکٹری کی کتاب میں مندرج نسخوں کو کاغذ پر لکھ کر' اور اسے گھول گھول کر مریضوں کو پلائیں۔ یا انجینئری سے متعلقہ کتاب کے فارمولوں کو ٹھیکری پر لکھ کر' گرتے ہوئے پلوں کے نیچے دبا دیں کہ اس سے وہ پل مضبوط ہو جائیں گے؟

(۴) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ ضابطہ فوجداری کی شقوں کو گا گا کر پڑھیں' اور کمرۂ عدالت میں جج کے سامنے' بھیرویں میں الاپیں کہ زانی مرد ہو یا عورت' انہیں سو سو کوڑوں کی سزا ملنی چاہئے (۲۴/۲)۔

جب آپ کسی اور کتاب کے ساتھ یہ کچھ نہیں کرتے' تو قرآن کے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ اس نے خود اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ ---- یہ ایک کتاب ہے---- اس تعارف سے اس کا مقصد یہ کہنا تھا کہ یہ تمہارے لئے زندگی کی راہ نمائی کے لئے کتاب ہے۔ اسے کتاب کی طرح سمجھو' اس پر غور و فکر کرو اور پھر اس کے مطابق زندگی بسر کرو۔

آپ سوچئے کہ کیا ہم نے اسے یہی حیثیت دے رکھی ہے؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ

(۱) جس کثرت' التزام اور اہتمام سے اس کتاب کو پڑھا جاتا ہے'

(۲) جس قدر روپیہ اس کے الفاظ کے دہرانے پر صرف کیا جاتا ہے'

(۳) جس قدر دولت' وقت' توانائی' اس کی آرائش و زیبائش کے لئے وقف کی جاتی ہے' کیا دنیا کی کسی اور کتاب

کے متعلق بھی ایسا کیا جاتا ہے؟ اور اس کے بعد اس حقیقت کو بھی سامنے لائیے کہ
اس کتاب کے مفہوم و مقصود سے جس قدر ہم محروم ہیں'
کیا اس کی مثال کہیں اور بھی مل سکتی ہے؟
اور پھر سوچئے کہ جن لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ **(اولئک) حبطت اعمالھم فلا نقیم لھم یوم القیمۃ وزنا** (۱۸/۱۰۵)--- یہ وہ ہیں جن کے اعمال اس قدر بے نتیجہ رہتے ہیں کہ ان کا وزن کرنے کے لئے' قیامت میں میزان تک کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن **وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا** (۱۸/۱۰۴) وہ بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں--- کیا ہمارا شمار انہی میں نہیں ہوتا؟ (ستمبر ۱۹۶۸)

۴۔ ناظرہ قرآن شریف

نوٹ : اس ضمن میں قرآنی فیصلے' حصہ اول' صفحہ ۲۶۱' ایڈیشن سوم مارچ ۹۲ء کو بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

جب قومیں سوچنا چھوڑ دیتی ہیں تو ان کے فیصلوں کے محرک' جذبات ہوتے ہیں' فکر و شعور نہیں ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان کے فیصلوں کو نظر بظاہر دیکھئے تو وہ بڑے خوش آئند دکھائی دیں گے لیکن ذرا گہرائی میں جا کر ان پر نگاہ ڈالئے تو ان کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں بالعموم اسی قسم کے فیصلے ہوتے ہیں۔ ان کی تازہ مثال حکومت کا یہ فیصلہ ہے کہ اسکولوں میں بچوں کو ناظرہ قرآن شریف پڑھایا جائے۔ نظر بظاہر دیکھئے تو یہ فیصلہ یکسر مستحق تبریک و تہنیت اور در خور تعریف و توصیف قرار پائے گا۔ لیکن آیئے ذرا سطحی جذبات سے نیچے اتر کر اس کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ "ناظرہ" سے مراد یہ ہوتی ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ دہرائے جائیں' ان کے معانی' مفہوم' مطالب نہ سمجھا جائے۔

الفاظ ذریعہ ہوتے ہیں متکلم کے مافی الضمیر کو' مخاطب کو سمجھانے کا۔ الفاظ سے کلام مرتب ہوتا ہے اور جب اس کلام کو صفحہ قرطاس پر محفوظ کر لیا جائے' تو ان صفحات کے مجموعہ کو کتاب کہا جاتا ہے۔ لہٰذا' کتاب اس کلام کا مجموعہ ہوتا ہے' جس سے ایک شخص اپنے خیالات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

لیکن ایک اور چیز ہے جسے سحر یا جادو (MAGIC) کہتے ہیں۔ اس میں بھی الفاظ بولے اور لکھے جاتے ہیں' لیکن ان الفاظ کے معانی کچھ نہیں ہوتے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے معانی سمجھنے کے نہیں۔ ان کی کچھ تاثیر ہے اور وہ تاثیر ان الفاظ کے دہرانے یا لکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

قرآن کریم ایک کتاب ہے۔ اس کے بھیجنے والے نے' افتتاحیہ (سورۂ فاتحہ) کے بعد اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ **ذالک الکتاب**--- یہ ایک عظیم کتاب ہے اور پھر اس میں بار بار تاکید کی کہ اسے سوچ سمجھ کر پڑھو۔ اس کے مطالب و مقاصد پر غور و فکر کرو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو یہ کتاب تمہیں کچھ فائدہ نہ دے گی۔ قرآن کریم نے جو بار بار کہا ہے کہ یہ "کتاب" ہے تو اس سے اس نے اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے کہ اسے سحر (جادو) نہ سمجھ لینا کہ اس

کے الفاظ دہراتے جاؤ اور سمجھ لو کہ ان الفاظ کے تاثیر ہے۔ انہیں دہرانے سے وہ تاثیر پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک کتاب ہے' اس کے الفاظ کے معانی ہیں۔ اسے پڑھنے سے مقصد یہ ہے کہ اس کے معانی سمجھے جائیں' اس کا مطلب اور مفہوم سمجھا جائے۔

جب امت کی گاڑی صحیح پٹڑی پر جا رہی تھی تو قرآن مجید کو کتاب ہی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو قرآن کریم کے متعلق یہ عقیدہ وضع کرلیا گیا کہ اس کے الفاظ میں "برکت" ہے اور انہیں دہرانے سے (سمجھنے سے نہیں بلکہ محض دہرانے سے) "ثواب" حاصل ہوتا ہے اور ثواب بھی اس قدر کہ اس کے ایک ایک حرف کے بدلے دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ مثلاً" الم سے تیس نیکیوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے اور چونکہ مذہب میں (دین میں نہیں بلکہ مذہب میں) "اعمال" سے مقصد حصول ثواب ہوتا ہے تاکہ اس طرح آخرت میں نجات حاصل ہوجائے' اس لئے قرآن کریم کے الفاظ کو بہ غرض حصول ثواب' دہراتے چلے جانا' امت کا عام شعار بن گیا۔ اس طرح یہ قوم' اس کتاب کو مسلسل اور متواتر پڑھتے رہنے کے باوجود' اس کے مطالب و مقاصد سے محروم ہوگئی۔ اور یوں یہ صحیفہ "کتاب" کے زمرے سے نکل کر "سحر" کے دائرہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد' اس کی آیات کے ورد اور وظائف ہونے لگے' تعویذ لکھے جانے لگے اور اس طرح اسے سچ مچ کا "سحر" بنا دیا گیا حتیٰ کہ اب "اعمال قرآنی" سے مراد ہی قرآنی آیات کے وظائف و تعویذ ہوتے ہیں۔۔۔ اور ایسا کرنے والے کو "عامل" کہا جاتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کوئی ایسی کوشش یا اقدام' جو قرآن کو "کتاب" کے زمرہ سے نکال کر "سحر" کی (CATEGORY) میں لے جائے' غلط بنیادوں پر اٹھی ہوئی دیوار پر ایک اور ردا رکھنے کے مترادف ہے۔ یہ دین کی خدمت نہیں' امت کو اس سے اور دور لے جانے کی کوشش ہے۔ "ناظرہ قرآن" کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

آپ ذرا غور کیجئے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنے سے اسکولوں میں ہوگا کیا؟ طالب علم' اردو پڑھے گا' تاریخ' جغرافیہ' سائنس پڑھے گا۔ ان تمام مضامین کے پڑھنے پڑھانے کی کیفیت یہ ہوگی کہ استاد جو کچھ پڑھائے گا اسے بچوں کو سمجھائے گا۔ جو بات بچوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی وہ استاد سے اس کی مزید وضاحت چاہیں گے۔ جو کچھ سمجھ کر پڑھا ہوگا اسے لکھیں گے۔ اس طرح ان مضامین کی کتابیں ان کے علم میں اضافہ کریں گی۔ عین ان مضامین کے درمیان ایک پیریڈ "قرآن شریف" کا بھی آئے گا۔ اس میں استاد جو کچھ پڑھائے گا اسے سمجھائے گا نہیں' صرف اس کے الفاظ پڑھنا اور یاد کرنا سکھائے گا۔ بچے جو کچھ پڑھیں گے۔۔۔ اسے سمجھیں گے نہیں' صرف الفاظ یاد رکھیں گے۔ اور جب یہ کتاب ختم ہوگی تو وہ ان کے علم میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کرے گی۔ ان کے ذہن میں بصر حال' یہ سوال ابھرے گا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے انہیں حاصل کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ دے دیا جائے گا کہ اس کے الفاظ دہرانے سے ثواب ہوتا ہے' اس کی "تلاوت" "موجب برکت" ہوتی ہے۔ گویا ان بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے یہ عقیدہ راسخ کردیا جائے گا کہ قرآن کریم ایک "کتاب" نہیں' اس کا تعلق "سحر" سے ہے اور یہ عقیدہ عمر بھر ان کے شعور یا لاشعور میں جاگزیں رہے گا۔۔۔ فرمایئے! یہ دین کی خدمت ہوئی یا آنے والی نسلوں کو دین سے بیگانہ رکھنے کی "مبارک

کوشش؟"۔ "بیگانہ" ہی نہیں' یہ بچے جب بڑے ہوں گے تو یہ اسلام کو اوہام پرستی کا مظہر قرار دیں گے اور اسے بنظر استخفاف دیکھیں گے۔

قرآن کریم کو ناظرہ پڑھانے کے بجائے' یہی ایک پیریڈ اگر عربی زبان پڑھانے کے لئے مختص کردیا جائے تو اس سے بچے قرآن کریم کو ناظرہ بھی پڑھ جائیں گے اور اس کا مطلب سمجھنے کے قابل بھی ہو جائیں گے۔ لیکن عربی زبان اس فرسودہ طریق سے نہ پڑھائی جائے جس سے سات سال میں گردانیں ہی ختم نہیں ہوا کرتیں۔ اسے سائنٹفک طریق سے پڑھایا جائے تاکہ بچوں کو اس سے دلچسپی بھی پیدا ہو جائے اور ان کا وقت اور توانائی بھی بچے۔ (اگست ۱۹۶۶ء)

۵۔ بچوں کو قرآن شریف کیسے پڑھایا جائے

سوال : ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے اسکولوں میں اسلامیات کے نام سے بچوں کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے' اس سے ان کے ذہن میں اسلام کے متعلق جو الجھنیں پیدا ہوتی ہیں' اس کا تجربہ ہر حساس ماں باپ کو ہو رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے طور پر بچوں کو قرآن شریف کی تعلیم کس طرح دیں' یعنی بچے کی کس عمر سے اسے شروع کیا جائے اور اس کا طریقہ کیا ہو۔

جواب : یہ سوال بڑا اہم ہے اور اسکولوں اور کالجوں میں "اسلامیات" کی چیستاں نے اس کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر غور بھی کیا ہے اور کچھ تجربے بھی--- ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ بچوں کو ابتدائی اسٹیج میں قرآن کریم مسلسل نہیں پڑھانا چاہئے--- ناظرہ پڑھانے کا کچھ فائدہ نہیں اور سمجھ کر پڑھنے کی ان میں ہنوز استعداد نہیں ہوتی۔ انہیں اپنے طور پر باتوں باتوں میں' روز مرہ کی زندگی سے متعلق قرآن کریم کی تعلیم سے آشنا کراتے رہنا چاہئے--- اس سلسلہ میں ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب--- "اسلامی معاشرت"--- کا انداز بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اسی طرح' حضورؐ کی سیرت طیبہ کے جستہ جستہ واقعات بھی انہیں بتاتے رہنا چاہئے۔ جب بچے کی اردو اور انگریزی زبان کی استعداد اس سطح تک پہنچ جائے جس سطح تک ہمارے ہاں بالعموم نویں یا دسویں جماعت کا طالب علم پہنچتا ہے' تو اسے عربی زبان پڑھانا شروع کردینا چاہئے۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ انداز اگر اس نہج کے مطابق جو--- "عربی خود سیکھئے۔*"--- میں اختیار کیا گیا ہے' ہفتہ میں تین چار دن' ایک ایک گھنٹہ بھی اس کے لئے دے دیا جائے تو بچہ' سال چھ مہینے میں اتنی عربی با آسانی سیکھ سکتا ہے جس سے قرآن کریم کے الفاظ اور آیات کا ترجمہ سمجھ میں آجائے۔ اس کے بعد قرآن کریم کو مسلسل پڑھانا شروع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں' الفاظ قرآنی کے ترجمہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ پڑھانے والے کو چاہئے کہ ان الفاظ کا جو مفہوم "لغات القرآن" میں دیا گیا ہے' اسے اپنے الفاظ میں بچے کے ذہن نشین کرائے اور اس کے بعد پوری آیت کا مفہوم "مفہوم القرآن" سے اخذ کرکے اسے ساتھ کے ساتھ سمجھاتا جائے۔ شروع شروع میں یہ سبق' دو دو' تین تین آیات سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس

* ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب از پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا نام ہے۔

سلسلہ کو کالج کی تعلیم کے دوران بھی جاری رکھا جائے۔ جوں جوں بچہ' عام تعلیم میں آگے بڑھتا جائے گا' قرآن زیادہ عمدگی سے سمجھ میں آتا جائے گا۔

اس سلسلہ میں' اس کے لئے سب سے بڑی مشکل "اسلامیات" کی تعلیم پیدا کرے گی' جو قوم کی بدقسمتی سے' اب لازمی قرار پا گئی ہے۔ گھروں میں والدین کو چاہئے کہ "اسلامیات" کی کتابوں کا خود مطالعہ کریں اور ان میں جو باتیں قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہوں' بچوں کو سمجھا دیں کہ وہ غلط ہیں اور موجودہ نظام تعلیم کے ناقص ہونے کی وجہ سے انہیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ حساس اور ذی فہم والدین پر اس باب میں بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور انہیں اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر وہ بچے کی زندگی کو صحیح خطوط پر متشکل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس کوہ کنی اور خارا شگافی سے مفر نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔ ایک انسانی بچے کو دنیا میں لانے سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے' وہ مذاق نہیں۔ یہ تو ۔۔۔ "یک قطرہ خوردہ ایم و بدریا گریستیم" ۔۔۔۔ والا معاملہ ہے۔ (اپریل ۱۹۶۷ء)

۶۔ قرآن کریم کی تعبیر میں اختلاف

سوال : آپ کہتے ہیں کہ قانون سازی کے سلسلہ میں اگر قرآن مجید کو بنیادی سند قرار دے دیا جائے تو موجودہ اختلافات بھی مٹ سکتے ہیں اور ایک ایسا ضابطہ قوانین بھی مدون ہوسکتا ہے' جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوسکے۔ لیکن مولوی صاحبان اس کے خلاف یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی تعبیر میں خود اختلاف ہے۔ اس سے اختلافات کس طرح سے مٹ سکیں گے اور ایک متفق علیہ ضابطہ کس طرح مرتب ہوسکے گا؟ کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب : ہمارے مولوی صاحبان کی تو حالت ہی عجیب ہے۔ قرآن کریم کے متعلق جب ان سے وعظ سنو تو اس میں یہ بتائیں گے کہ خدا کی یہ آخری کتاب بے مثل و بے نظیر ہے۔ دنیا بھر کے انسان مل کر اس کی مانند کوئی کتاب نہیں بنا سکتے۔ یہ اس کتاب عظیم کا معجزہ ہے جس کے سامنے عرب بھی سرنگوں تھے اور آج تک کوئی اس چیلنج کو قبول نہیں کرسکا اور نہ ہی کرسکے گا۔

لیکن جب ان سے اس کتاب کو ضابطہ شریعت بنانے کے متعلق کہا جائے تو یہ دنیا بھر کے نقائص اس کتاب میں گنائے چلے جائیں گے۔ یہ نامکمل ہے' اس میں احکام دیئے گئے ہیں لیکن ان کی عملی تفصیل کہیں نہیں دی گئی۔ یہ غیر واضح اور مبہم ہے۔ یہ اپنا مطلب واضح طور پر بیان نہیں کرسکتی۔ اس میں تضادات ہیں جن کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بعض آیات کو ناسخ مانا جائے اور بعض کو منسوخ۔ لیکن اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کی کون سی آیات ناسخ ہیں اور کون سی منسوخ۔ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کے اندر موجود نہیں' لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ اس کی مختلف "قراتیں" ہیں۔ یعنی ایک آیت قرآن کریم میں کسی طرح لکھی ہوئی ہے اور بعض صحابہؓ اسے کسی اور طرح پڑھتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

آپ غور کیجئے کہ جتنے نقائص یہ حضرات اس کتاب میں بیان فرماتے ہیں' ان میں سے کوئی ایک نقص بھی ان کی اپنی کتاب میں دکھایا جائے' تو یہ اس شخص کے گلے پڑ جائیں اور کبھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں کہ اس میں ایسا نقص موجود ہے۔ اب ان نقائص کی فہرست میں ایک اور اضافہ بھی ہوگیا ہے اور وہ یہ کہ اس کی آیات کے الفاظ تو اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن ان کی تعبیر(INTER PRETATION) میں اختلاف ہے۔ اس لئے ان کا کوئی متفق علیہ مفہوم نہیں لیا جاسکتا۔ لہذا' یہ مسلمانوں کا ضابطہ قوانین بن سکنے کے قابل نہیں۔

قرآن کریم میں احکام بھی ہیں اور حقائق بھی' تاریخی نظائر بھی ہیں اور علمی دلائل بھی۔ قانون سازی کے سلسلہ میں چونکہ معاملہ احکام سے متعلق ہوتا ہے' اس لئے ہم بنیادی طور پر اس کے اسی حصہ کو لیتے ہیں۔ جہاں تک احکام کا تعلق ہے' قرآن کریم میں بعض احکام متعین قانون کی شکل میں دیئے گئے ہیں (**حرمت علیکم امھتکم ۴/۲۳**) اور بعض اصول کی شکل میں (مثلاً **اعدلو** (۵/۸)۔ جہاں تک متعین احکام کا تعلق ہے ان میں کسی تعبیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ احکام واضح' متعین اور محکم ہیں۔ مثلاً" جو مثال ہم نے اوپر پیش کی ہے کہ تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں۔۔۔ ذرا سوچئے کہ اس میں دو تعبیریں ممکن ہیں؟ اس میں ایک ہی سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ "ماؤں" میں سوتیلی مائیں بھی شامل ہیں یا نہیں' تو اس کی وضاحت قرآن کریم نے یہ کہہ کر کردی کہ (**ولا تنکحوا ما نکح اباوکم من النساء** (۴/۲۲) "ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کرچکے ہیں"۔ بات واضح ہوگئی کہ حقیقی اور سوتیلی دونوں مائیں حرام ہیں' حتی کہ رضاعی مائیں بھی۔ (۴/۲۳)

جہاں تک اصولی احکام کا تعلق ہے وہ بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے واضح اور دو ٹوک ہیں۔ انہیں اصولی طور پر بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے مقتضیات کی روشنی میں تفصیلی احکام خود مدون کرے۔ قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے جو جزئی احکام مرتب کئے جائیں گے ان میں حالات کے تقاضے کے مطابق رد و بدل ہوسکے گا۔ مثلاً" "عدل کرو" ایک اصولی حکم ہے۔ عدل کسے کہتے ہیں' اس کی وضاحت مختلف مقامات پر خود قرآن نے کردی ہے۔ لیکن یہ امور کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں عدل کی شکل کیا ہوگی' عدل کرنے کی عملی صورتیں کیا ہوں گی' کس مقام پر کہا جائے گا کہ یہ فیصلہ عدل کے مطابق نہیں' (وغیرہ وغیرہ) اسلامی نظام مملکت کے طے کرنے کے ہوں گے۔ اسی طرح یہ فریضہ بھی اسلامی مملکت کا ہوگا کہ قرآن میں جو اصطلاحات آئی ہیں ان کا منطوق متعین کیا جائے۔ مثلاً" قرآن میں الخمر کی ممانعت آئی ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق کون کون سی چیزوں پر ہوگا اور کن کن حالات میں' اس کا تعین بھی نظام مملکت کرے گا۔ اسی طرح قرآن کریم کے متعین احکام کی روشنی میں ان سے ملتے جلتے حالات کے لئے قوانین کی تدوین بھی اسی مملکت کی ذمہ داری ہوگی۔

قرآن کریم نے امور مملکت کے سلسلے میں مشاورت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس مشاورت کی مشینری کی کیا شکل ہوگی' اس کا تعین بھی اس نے مملکت پر چھوڑ دیا ہے۔ مشورہ دیتے وقت مختلف ارباب فکر و نظر کی آراء مختلف ہوسکتی

ہیں۔ لیکن جب اس کے بعد مملکت کسی فیصلہ پر پہنچ کر قانون نافذ کر دے گی تو اس کی اطاعت سب پر لازم آجائے گی۔ اگر کوئی شخص اس میں کوئی ترمیم چاہے گا تو اس کے لئے اسے وہی طریق کار اختیار کرنا ہوگا جو اس مقصد کے لئے نظام مملکت نے طے کیا ہو۔

غور کیجئے کہ مولوی صاحبان جس چیز کو تعبیر کے اختلافات کا ہوا بنا کر پیش کرتے ہیں' اسلامی نظام مملکت میں اس کا کوئی وجود بھی ہے؟ یہ اختلافات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب نظام مملکت موجود نہ ہو اور تعبیر کا حق ہر ایک کو انفرادی طور پر دے دیا جائے۔ ہمارے مولوی صاحبان کے ذہن میں نظام کا تصور ہی نہیں۔ ان کے نزدیک اسلام انفرادی زندگی کا نام ہے اور انفرادی زندگی میں--- قوانین تو بہت بڑی چیز ہیں--- یہ بھی طے نہیں ہو سکتا کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہئے یا نیچی آواز سے---' اس لئے یہ سمجھ سکنا ان کے بس کی بات نہیں کہ ایک نظام کے تابع اختلافات کس طرح مٹ جایا کرتے ہیں۔ ان کی یہی بے بسی تھی جس کے لئے اقبال نے کہا تھا کہ۔

قوم کیا چیز ہے' قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

ان کی بے بسی کا یہ عالم اور ہماری سادہ لوحی کی یہ کیفیت کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے بغیر اسلامی ضابطہ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتا---- نتیجہ ظاہر ہے۔

باقی رہے خود حقائق جنہیں قرآن کریم نے تشبیہی انداز سے بیان کیا ہے (جنہیں وہ متشابہات کہہ کر پکارتا ہے) مثلاً" **کان عرشہ علی الماء** (۱۱/۷) خدا کا عرش پانی پر ہے۔ سو ان کا سمجھنا انسان کی علمی سطح کی نسبت سے ہے۔ انسان کی علمی سطح مختلف ادوار میں مختلف ہو سکتی ہے۔ اور جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے یہ سطح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے ان تشبیہی حقائق کے متعلق مختلف ادوار میں مختلف تعبیرات ہو سکتی ہیں' نیز کسی ایک دور میں بھی مختلف افراد کی علمی سطح کے مطابق مختلف۔ لیکن ان کے متعلق تعبیرات کے اختلاف سے نہ امت کی عملی زندگی پر اثر پڑتا ہے نہ اجتماعی نظام اور ضابطہ قوانین پر۔ اس کے لئے صرف اتنی احتیاط کی ضرورت ہے کہ کوئی تعبیر قرآن کے اصول سے نہ ٹکرائے لیکن اس باب میں ہمارے مولوی صاحبان کا مسلک یہ ہے کہ ان حقائق کے متعلق' جو کچھ متقدمین نے لکھ دیا ہے وہی حق و صداقت ہے اور اس سے اختلاف' کفر و الحاد۔ یہ مسلک قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے جو انسانوں کو تدبر و تفکر کی شدت سے تاکید کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حکم' نہ تو کسی خاص دور کے انسانوں تک محدود ہو سکتا ہے نہ کسی خاص گروہ کے اندر مقید نہ ہی اس باب میں کسی فرد کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے تدبر کے نتیجہ کو حرف آخر قرار دے کر اسے کفر و ایمان کا معیار ٹھہرائے۔ (اگست ۱۹۶۵ء)

۷- قرآن مجید کی حنفی تفسیر۔

اس اقتباس کو غور سے پڑھئے۔

"صدیوں سے ہمارا سرمایہ حدیث و تفسیر گروہی عصبیت کا تختہ مشق ہے' یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علما کے قلم سے تیار ہوتے رہے۔ کوئی بری بات نہیں۔ علم کی خدمت جس حلقہ سے بھی ہو' خوش آئند ہے' جس جماعت کی جانب سے ہو' قابل پذیرائی ہے' مگر افسوس "علم" جیسے لازوال' ابدیت نشان' سب کی دولت' سب کے سرمایہ کو' ہر عصبیت سے پاک ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا اور اپنے اپنے مسلک کی ترجمان تفسیر و حدیث کی طول و طویل کتابیں بھی بن گئیں۔ بہر حال جو کچھ ہوچکا ہے اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خاص حنفی نقطہ نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو"۔

(تفسیر مدارک کا اردو ترجمہ از مولانا سید انظر شاہ مدرس دارالعلوم دیو بند' پارہ اول کا جز اول' ص ۴)

اب آپ نے سمجھا کہ ہر فرقہ کا قرآن کس طرح الگ الگ ہوگیا ہے؟ اور یہ بھی کہ مروجہ تفاسیر (اور ان پر مبنی تراجم) کی رو سے کس قسم کا قرآن آپ کے سامنے آسکتا ہے؟ سچ کہا تھا حکیم الامتؒ نے کہ :-

زمن بر صوفی ملا سلامے! — کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیؐ را

--------- (مارچ ۱۹۶۹ء)

کتب تفسیر : (مولانا سندھی مرحوم) کتب تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں۔

ہم نے امام فخر الدین رازی کی تفسیر پڑھی' نیز جار اللہ زمخشری کی کتاب کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ معالم التنزیل از فراء بغوی اور تفسیر حافظ ابن کثیر پڑھی۔ ان سب تفسیروں کے ذریعے ہم نے قرآن سمجھنے کی اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کی لیکن سوائے تحیر کے ہمیں کچھ نصیب نہ ہوا۔ اگر زمانہ طالب علمی میں ہم نے نجم الائمہ حضرت شیخ الہند سے چند آیتوں کی تفسیر جو کتابوں میں نہیں ملتی' نہ سنی ہوتی' اور ہمارے لئے وہ اطمینان کا ذریعہ نہ بنتی' نیز شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بعض تفسیری جملے نہ پڑھے ہوتے' تو قدما کی ان تفسیروں کو پڑھ کر ہم علم تفسیر کے حصول سے قطعاً" مایوس ہوجاتے۔ بیشک ہم اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ پہلے زمانے میں مسلمانوں نے انہی کتابوں کی مدد سے قرآن سمجھا تھا اور انہی اصول و قواعد پر انہوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق قرآن کی حکومت قائم کی تھی۔ لیکن جہاں تک اس زمانے کا تعلق ہے ہمارے لئے اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ناممکن ہے' (از ماہنامہ "الرحیم" ستمبر ۱۹۶۵ء) (دسمبر ۱۹۶۶ء)

۸۔ کیا قرآن کریم مکمل ضابطہ حیات ہے؟

سات دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر' ٹیلی ویژن پر جو مسلسل پروگرام نشر ہوا' اس میں ایک مذاکرہ بھی' مندرجہ بالا عنوان سے شامل تھا۔ مجلس مذاکرہ میں کراچی کے دو بزرگوار تھے اور تیسرے صاحب ان کا درمیانی واسطہ۔

ان میں سے ایک صاحب نے تو یہ کہہ کر بات ہی ختم کردی کہ قرآن کریم تلاوت کے لئے ہے۔ اسے ضابطہ وغیرہ نہیں کہا جاسکتا۔ دوسرے صاحب نے ان سے اختلاف تو کیا لیکن جواب میں کوئی متعین اور واضح بات نہ کہی۔ لہٰذا' موضوع نہ صرف مبہم رہ گیا بلکہ ناظرین اور سامعین کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب بھی بن گیا۔ ہماری سمجھ میں تو یہ بات ہی نہیں آتی کہ ٹیلی ویژن یا ریڈیو کے ارباب نظم و نسق کو جس میدان میں درک حاصل نہ ہو' وہ اسے اپنے پروگراموں میں شامل کیوں کرلیتے ہیں؟

سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ عنوان میں لفظ "ضابطہ" کا مفہوم کیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ لفظ ایک قانونی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً" ضابطہ فوجداری' ضابطہ دیوانی وغیرہ سے مراد ہوتا ہے ایسا مجموعہ قوانین جس میں متعلقہ قوانین اور ان کی تفاصیل اور جزئیات وغیرہ مندرج ہوں۔ قرآن کریم ان معنوں میں ضابطہ حیات نہیں۔

اگر ہم "ضابطہ" کے معنی ضبط یعنی کنٹرول میں رکھنے والا' کرلیں تو پھر بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن مجید انسانی زندگی کے تقاضوں کو کنٹرول میں رکھتا ہے' انہیں بیباک نہیں ہونے دیتا۔ مثلاً" جنسی جذبہ انسانی زندگی کا تقاضا ہے اور قرآن کریم وہ حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے اس تقاضے کی تسکین کی جاسکتی ہے۔ یا مثلاً" جلب منفعت انسانی زندگی کا تقاضا ہے اور قرآن کریم وہ حدود و قیود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اس تقاضے کو پورا کرسکتا ہے۔ قرآن کریم میں' بجز معدودے چند قوانین کے' اسی قسم کے حدود اور اصول دیئے گئے ہیں جو ضابطہ حیات کا کام دیتے ہیں۔ اس میں ان ضوابط (یعنی حدود) کی جزئیات نہیں دی گئیں۔ ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق ملت کا قرآنی نظام باہمی مشاورت سے خود متعین کرے گا۔ یہ جزئیات بدلتی رہیں گی لیکن قرآنی حدود ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔

اب رہا سوال اس ضابطہ کے مکمل ہونے کا' سو انسانی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک اس کی طبیعی زندگی اور دوسری وہ زندگی جسے سمجھنے کی خاطر آپ انسانی زندگی کہہ لیجئے۔ جہاں تک طبیعی زندگی کا تعلق ہے' وہ جسم سے متعلق طبیعی قوانین کے تابع رہتی ہے۔ یہ میدان قرآن کریم کے احاطہ ہدایت سے باہر ہے' اگرچہ اس کے لئے بھی اس میں کہیں کہیں کوئی اشارہ مل جاتا ہے۔ قرآن کا حقیقی موضوع انسانی زندگی ہے' اور یہ حقیقت ہے کہ اس زندگی کے جملہ تقاضوں کے متعلق اس میں ضوابط (حدود) موجود ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ضابطہ حیات مکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی نہج سے قرآن کریم کو مکمل بھی کہا ہے اور غیر متبدل بھی (وتمت کلمت ربک صد قا و عد لا لا مبد ل لکلمتہ) (۶/۱۱۶)

واضح رہے کہ قرآن کریم میں ضابطہ کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ (جنوری ۱۹۷۱ء)

۹۔ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

(نوٹ) اس ضمن میں قرآنی فیصلے' حصہ اول صفحہ ۲۳۹ ایڈیشن سوم' مارچ ۹۲ء کو بھی دیکھ لیا جائے۔

قرآن کریم کی رو سے' کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے' ان میں ایک "کتب" بھی ہے' یعنی خدا کی کتابوں پر ایمان۔ ان کتابوں میں وہ بھی شامل ہیں جو حضور نبی اکرمؐ سے پہلے کے انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے ملیں (واضح رہے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق' کتاب ہر نبی کو ملی تھی' "نبی بلا کتاب" کا عقیدہ قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ہے) اور اس کتاب پر بھی جو حضورؐ پر نازل ہوئی' یعنی قرآن کریم۔ ان میں فرق یہ ہے کہ انبیاءؑ سابقہ کی کتابوں پر صرف اس حد تک ایمان ضروری ہے کہ وہ اپنے اپنے وقت میں مختلف انبیاءؑ کو ملیں لیکن اس کے بعد وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہ رہیں۔ ان میں تحریف ہوگئی اور یا وہ بھلا دی گئیں یا حوادث ارضی و سماوی کی نذر ہوگئیں۔ ان کے برعکس' قرآن مجید (جو اس وقت امت کے پاس ہے) حرفاً" حرفاً" وہی ہے جسے خدا نے رسولؐ اللہ پر نازل کیا اور جسے رسولؐ اللہ نے امت کو دیا۔ اس میں ایک نقطے یا شعشعہ کا بھی فرق نہیں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ یہ جو ہمارا دعویٰ ہے کہ اب اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے' تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ منزل من اللہ کتاب' اس آسمان کے نیچے' اب صرف قرآن مجید ہے۔ دیگر مذاہب کی کتابیں جنہیں وہ اپنے بانیان مذاہب کی طرف منسوب کرتے ہیں' اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔

مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ جو کتابیں دیگر اہل مذاہب اپنے انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں' وہ اپنی اصل شکل میں موجود نہیں' ایسی محکم شہادات پر مبنی ہے جس کی تردید وہ اہل مذاہب کر نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا' انہوں نے اس سے عاجز آکر' یہ سازش شروع کی کہ خود قرآن کے متعلق یہ ثابت کردیا جائے کہ یہ بھی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ اس کے لئے انہوں نے روایات وضع کیں اور کثرت سے وضع کیں اور انہیں ان کتابوں میں داخل کردیا جنہیں "صحیح ترین کتب احادیث" قرار دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے عقائد کہ قرآن کریم کو خود رسولؐ اللہ نے جمع اور مرتب شدہ شکل میں امت کو نہیں دیا تھا' اسے بعد میں مرتب کیا گیا۔ مختلف صحابہؓ کے پاس قرآن کے مختلف نسخے تھے جن میں بے حد اختلاف تھا۔ قرآن کا جو نسخہ حضرت عثمانؓ نے جمع کیا اس میں بھی تغیر و تبدل ہوا وغیرہ' انہی روایات کے پیدا کردہ ہیں۔

انہی عقاید میں ایک عقیدہ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا بھی ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے تسلیم یہ کیا جاتا ہے کہ

(۱) خدا کی طرف سے کچھ احکام نازل ہوتے تھے' انہیں پھر وہ منسوخ کر دیتا تھا۔ قرآن کی وہ آیات جن میں وہ احکام دیئے گئے تھے' اگر لکھی ہوئی ہوتیں تو رسولؐ اللہ صحابہ کو حکم دے دیتے کہ انہیں مٹا دیا جائے۔ اگر وہ رسولؐ اللہ اور صحابہؓ کو حفظ یاد ہوتیں تو خدا انہیں ان کے حافظہ سے محو کردیتا۔ یہ وہ آیات ہیں جن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ ان کا حکم بھی منسوخ ہے اور تلاوت بھی۔

(۲) دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم میں تو موجود نہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے اور

(۳) تیسری قسم ان آیات کی ہے جو قرآن کریم میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہوچکا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں' ان تینوں قسموں کی آیات میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا گیا کہ خدا نے اس کا حکم یا اس کی تلاوت منسوخ کر دی ہے' نہ ہی کہیں یہ آیا ہے کہ ایسی آیات بھی تھیں جو پہلے نازل ہوئی

تھیں لیکن بعد میں انہیں حافظوں سے بھی محو کردیا گیا اور جہاں جہاں وہ لکھی ہوئی تھیں، وہاں سے بھی انہیں مٹا دیا گیا۔ یہ سب کچھ کتب روایات میں ہے۔

ظاہر ہے کہ "اس قسم کے قرآن" کے متعلق بیسیوں شکوک ابھریں گے اور اس پر سیکڑوں اعتراضات وارد ہوں گے۔ ہمارے علماء کرام کی طرف سے ان کا کیا جواب دیا جاتا ہے، وہ قابل غور ہے۔ کراچی سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ "البلاغ"۔۔ جس کے مدیر محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔ اس مجلہ کی ستمبر۱۹۷۳ء کی اشاعت میں (خود مدیر کے قلم سے) ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "حفاظت قرآن کے متعلق شبہات اور ان کا جواب"۔ اس مقالہ کے متعلقہ اقتباسات درج ذیل ہیں۔ اقتباسات طویل ہیں لیکن اس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آسکتی تھی، اس لئے ہم نے اس طوالت کو گوارا کرلیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

البلاغ کے اقتباسات

مشہور مستشرق ایف۔ بہل (F - BUHAL)؂۲ نے دعویٰ کیا ہے کہ عہد رسالتؐ کی ابتداء میں قرآن کریم کی آیات لکھی نہیں جاتی تھیں بلکہ ان کی حفاظت کا سارا دار و مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے حافظے پر تھا۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ ابتدائی زمانے کی قرآنی آیات محفوظ نہ رہی ہوں۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں بہل نے قرآن کریم کی دو آیات پیش کی ہیں۔

(۱) **سنقرئک فلا تنسی الا ما شا اللہ** (سورۂ اعلیٰ: ۷ - ۶)

"ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں، مگر جو کچھ اللہ چاہے"

(۲) **ما ننسخ من ایتہ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا** (بقرہ: ۱۰۶)

"ہم جس آیت کو بھی منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے، ہم اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے"

لیکن جو شخص بھی قرآن کریم اور اس کی تفسیر سے ادنیٰ واقفیت رکھتا ہو وہ اس اعتراض کی لغویت محسوس کرسکتا ہے، اس لئے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کی منسوخ آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب جبریل امین علیہ السلام قرآن کریم کی کچھ آیات لے کر نازل ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بھول جانے کے خوف سے بار بار دہراتے رہتے تھے اور اس میں آپؐ کو شدید تعب ہوتا تھا۔ اس آیت میں آپؐ کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ آپ کو یاد کرنے کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، لہٰذا آپ ان آیات کو بھول نہیں سکیں گے۔ لیکن اس پر یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات تو بعد میں منسوخ ہونے کے سبب حافظ سے محو ہوگئیں۔ اس کا جواب دینے کے لئے

؂۲ F-BUHL "EMCYCLOPAEDIA OF ISLAM" P.1067 V.3 "KORAN"

الا ماشا اللہ (مگر جو کچھ اللہ چاہے) کے الفاظ بڑھا دیئے گئے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی آیت کو منسوخ کرے گا تو صرف اسی وقت وہ آیت آپ کے حافظ سے محو ہو سکے گی' اس کے بغیر نہیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنا بیان کیا گیا ہے کہ بعض آیات منسوخ ہونے کی بنا پر آپؐ کے اور صحابہؓ کے حافظوں سے محو ہو جائیں گی۔

لہٰذا' ان دو آیتوں سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض آیات کو جب اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرما دیا تو ان کی کتابت کو مٹانے کا حکم تو دیا ہی گیا مگر ساتھ ساتھ انہیں لوگوں کے حافظے سے بھی محو کر دیا گیا' ورنہ جہاں تک غیر منسوخ آیتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو صراحتہ" کہا جا رہا ہے کہ آپ انہیں کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ اس سے یہ بات آخر کیسے نکل آئی کہ جو آیتیں منسوخ نہیں ہوئیں ان کے فراموش ہو جانے کا بھی کوئی امکان ہے؟

دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو

"مارگولیوتھ نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے

عن عائشہؓ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت لقد انزلت ایتہ الرجم و رضعات الکبیر عشرا" فکانت فی ورقتہ تحت سریر فی بیتی فلما اشکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشاغلنا بامرہ و دخلت دویبتہ لنا فاکلتھا ۳۔

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رجم کی آیت اور بڑے آدمی کی دس رضعات کی آیت نازل ہوئی تھیں۔ یہ آیتیں میرے گھر میں' ایک تخت کے نیچے کاغذ پر لکھی ہوئی تھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (مرض وفات کی) تکلیف شروع ہوئی تو ہم آپؐ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ ہمارا ایک پالتو جانور تھا۔ وہ آیا اور اس نے وہ کاغذ کھا لیا"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت عائشہؓ نے جن آیتوں کا ذکر فرمایا ہے یہ باجماع امت' وہ آیتیں ہیں جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی۔ خود حضرت عائشہؓ بھی ان آیتوں کے منسوخ التلاوۃ ہونے کی قائل ہیں۔ لہٰذا' اگر انہوں نے یہ آیات کسی کاغذ پر لکھ کر رکھی ہوئی تھیں تو اس کا منشاء سوائے ایک یادگار کے تحفظ کے کچھ نہ تھا ورنہ اگر یہ آیات' حضرت عائشہ کے نزدیک' قرآن کریم کا جزو ہوتیں تو وہ کم از کم ان کو تو یاد تھیں۔ وہ ان کو قرآن کریم کے نسخوں میں درج کراتیں لیکن انہوں نے ساری عمر ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس سے صاف واضح ہے کہ خود حضرت عائشہؓ کے نزدیک یہ آیات محض ایک علمی یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں اور قرآن کریم کی دوسری آیات کی طرح

۳۔ مسند احمدؒ حصہ زوائد۔ مسندات عائشہؓ ص۲۶۹ ج۶۔ دار صادر۔ بیروت۔

اس کو مصحف میں درج کرانے کا کوئی اہتمام ان کے پیش نظر بھی نہیں تھا۔ لہٰذا' اس واقعہ سے قرآن کریم کی حفاظت پر کوئی حرف نہیں آتا"۔

یہ ہیں وہ جوابات جن سے یہ حضرات مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے معترضین کو اگر قائل نہیں کردیا تو کم از کم ان کا منہ بند کردیا۔ ہم پوچھتے ہیں اپنے قارئین (بالخصوص قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ) سے کہ (مستشرقین کو تو چھوڑیئے) کیا وہ ان جوابات سے مطمئن ہوگئے ہیں اور ان سے ان کے شکوک و شبہات دور ہوگئے ہیں؟ شکوک و شبہات کا دور ہونا تو ایک طرف' ان سے تو مزید شکوک و شبہات ابھر آتے ہیں۔ (مثلاً) پہلے اس آیت کو لیجئے جسے حضرت عائشہؓ کا جانور کھا گیا تھا۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ ان آیات میں سے تھیں جنہیں خدا نے منسوخ قرار دے دیا تھا۔ ان آیات کے متعلق پہلے کہا گیا ہے کہ رسولؐ اللہ حکم دے دیتے تھے کہ اگر یہ آیات کہیں لکھ رکھی ہیں تو انہیں مٹا دیا جائے۔ اور اگر یہ حافظہ میں ہوتیں تو خدا خود انہیں رسولؐ اللہ اور دوسرے لوگوں کے حافظہ سے محو کردیتا۔ یہ آیت حضرت عائشہؓ کے پاس لکھی ہوئی شکل میں موجود تھی لیکن انہوں نے اسے' رسولؐ اللہ کے حکم دینے کے باوجود مٹایا نہیں۔ کیا رسولؐ اللہ کے زمانے میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ رسولؐ اللہ ایک بات کا حکم دیتے تو صحابہؓ (اور وہ بھی حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ) اس کی تعمیل نہ کرتے؟ اس کی توجیہہ یہ بتائی گئی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اسے ایک یادگار کے تحفظ کے طور پر کسی کاغذ پر لکھ رکھا ہوگا! سوال یہ ہے کہ ان آیات کو بطور یادگار محفوظ رکھنے سے کیا ارشاد رسولؐ اللہ کی تعمیل اور منشائے خداوندی کی تکمیل (کہ ان آیات کو مٹا دیا جائے) ہو جاتی تھی؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ تو کیا اسے باور کرلیا جائے کہ اس زمانے میں ارشادات رسولؐ اللہ کی تعمیل اور منشائے خداوندی کی تکمیل اسی طرح ہوا کرتی تھی؟

اور پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ ایسا صرف حضرت عائشہؓ نے کیا' اور وہ بھی صرف ایک آیت کے سلسلہ میں کیا تھا! کیا معلوم کتنے صحابہؓ نے ان آیات کو لکھ رکھا تھا؟ اور یہ بھی کیا معلوم کہ وہ کہاں کہاں تشریف لے جاچکے ہوں گے اور ان تک رسولؐ اللہ کا یہ حکم پہنچا بھی ہوگا یا نہیں کہ ان آیات کو مٹا دیا جائے! وہ تو ان آیات کو قرآن کریم کا جزو سمجھتے تھے اور اسی حیثیت سے انہوں نے انہیں محفوظ رکھ چھوڑا ہوگا! کیا اس سے ان آیات کی تنسیخ کا مقصد خداوندی پورا ہوگیا تھا؟ اور کیا بعد ازاں جب صحابہؓ ایک دوسرے سے ملتے ہوں گے تو ان آیات کے متعلق نزاعات پیدا نہ ہوتی ہوں گی کہ یہ قرآن کا جزو ہیں یا نہیں؟

اب آیئے اس آیت کے متن کی طرف جس کے متعلق عثمانی صاحب نے فرمایا ہے کہ خدا نے اسے منسوخ کردیا تھا اور اسے حضرت عائشہؓ کا جانور کھا گیا تھا۔ اس آیت میں ایک حکم زانی اور زانیہ کو سنگسار (رجم) کرنے کا تھا۔ تفسیر ابن کثیر کا شمار' اہل سنت والجماعت کی نہایت قابل اعتماد کتب تفاسیر میں ہوتا ہے۔ دیکھئے کہ اس میں اس آیت کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ اس میں سورۂ نور کی دوسری آیت (جس میں حکم خداوندی ہے کہ زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا سو سو کوڑے ہے) کی تفسیر میں لکھا ہے۔

موطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

لوگو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل کی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جو ہم نے تلاوت کی' یاد کی اور اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضہ کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا' چھوڑ کر مرجائیں۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم مطلق حق ہے اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ' خواہ مرد ہو یا عورت جبکہ اس کے زنا پر کوئی شرعی ثبوت یا حمل موجود ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اس سے بھی مطول موجود ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ قرآن میں نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو! خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا' عمر نے لکھ دیا تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا جس طرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں رجم کا ذکر کیا اور فرمایا رجم ضروری ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک ہے۔ خود حضورؐ نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا کھٹکا نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں زیادتی کی جو اس میں نہ تھی تو میں کتاب اللہ کے ایک طرف آیت رجم لکھ دیتا۔ عمر بن خطاب' عبداللہ بن عوف اور فلاں اور فلاں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا۔ یاد رکھو! تمہارے بعد ایسے لوگ آنے والے ہیں جو رجم کو اور شفاعت کو اور عذاب قبر کو جھٹلائیں گے اور اس بات کو بھی کہ کچھ لوگ جہنم سے اس کے بعد نکالے جائیں گے کہ وہ کوئلے ہوگئے ہوں۔ مسند احمد میں لکھا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا' رجم کے حکم کے انکار کرنے کی ہلاکت سے بچنا الخ۔ امام ترمذی بھی اسے لائے ہیں اور اسے صحیح کہا ہے۔ ابو العلی موصلی میں ہے کہ مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت زید بن ثابت بھی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زنا کاری کریں تو انہیں ضرور رجم

کردو۔ مروان نے کہا کہ پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا؟ فرمایا سنو! ہم میں جب اس کا ذکر چلا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہاری تشفی کرتا ہوں کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپ سے ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا۔ کسی نے کہا یا رسولؐ اللہ آپ رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ اب تو میں اسے نہیں لکھ سکتا یا اسی کے مثل۔ یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔ پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی یا پھر تلاوت میں منسوخ ہوگئی اور حکم باقی رہا۔

آپ نے غور فرمایا کہ حفاظت قرآن مجید کے سلسلہ میں ہماری کتب احادیث و تفاسیر میں کیا کہا گیا ہے؟ اور آپ کو شاید اس کا بھی علم ہوگا کہ ہمارے ہاں رجم کا یہ حکم بدستور چلا آرہا ہے۔ شرعی قوانین کی رو سے' غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کو کوڑے مارے جاتے ہیں اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جاتا ہے اور ایسا اس آیت کی رو سے کیا جاتا ہے جو قرآن میں تو موجود نہیں لیکن اس کا حکم بدستور موجود ہے۔

اور اس پر ہم (مسلمانوں) کو شکایت ہوتی ہے کہ غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن محفوظ نہیں اور ہمارے مولانا حضرات ان اعتراضات کا وہ جواب دیتے ہیں جسے آپ تقی صاحب کے مقالہ میں دیکھ چکے ہیں۔ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) کس قدر مظلوم ہے ہمارا قرآن!

---------------- ○ ----------------

اب آیئے قرآن میں ناسخ و منسوخ کے عقیدہ کی طرف۔ ہم اس سلسلہ میں پہلے بھی بہت کچھ اور متعدد بار لکھ چکے ہیں' لیکن چونکہ ابلاغ نے اسے حفاظت قرآن کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کیا ہے' اس لئے اس عقیدہ کی (بارِ دگر) وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ عقیدہ حال کا وضع کردہ نہیں بلکہ اس زمانے سے چلا آرہا ہے جب سے وضعی روایات وجود میں ہیں اور اس وقت تک چلا جائے گا جب تک مسلمانوں کی یہ حالت رہے گی کہ **و اذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباء نا** (۲/۱۷۰) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا"۔ اندھی تقلید اور قرآنی بصیرت دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ کبھی اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ اسی مسلک تقلید کی رو سے مسلمانوں نے قرآن کے بیشتر حصہ کو منسوخ قرار دے رکھا ہے اور یہ نسخ صرف قرآن کی دوسری آیات ہی سے نہیں ہوتا بلکہ قرآن کی آیتیں احادیث سے بھی منسوخ سمجھی جاتی ہیں۔

اس عقیدہ کی سند میں قرآن کریم کی وہی آیت پیش کی جاتی ہے جسے تقی صاحب نے اپنے مقالہ میں درج کیا ہے یعنی

ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا (۲/۱۰۶)

قرآن میں ناسخ و منسوخ کے عقیدہ کی تائید اس آیت سے تو نہیں ہوتی' البتہ اس ترجمہ سے ہوتی ہے جسے تقی صاحب نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے۔ وہ اس کا ترجمہ یوں لکھے ہیں :۔

"ہم جس آیت کو بھی منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے' ہم اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے"۔

اس آیت کا "فعل مستقبل" میں ترجمہ کرنے سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ "خدا ایسا کرے گا"۔ یہ ترجمہ قرآنی مفہوم کے خلاف ہے اور اسے محض اس عقیدہ کی تائید کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ شاہ رفیع الدین اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

"جو موقوف کرتے ہیں ہم آیتوں سے یا بھلا دیتے ہیں ہم ان کو لاتے ہیں ہم بہتر ان سے یا مانند ان کے"

مولانا محمود الحسن (مرحوم) نے یوں ترجمہ کیا ہے

"جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر"

یعنی یہ نہیں کہ نزول قرآن کے زمانے میں خدا نے کہا تھا کہ (تقی صاحب کے ترجمہ کے مطابق) قرآن کی جن آیتوں کو ہم منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے تو ان سے بہتر یا ان جیسی آیات اور بھیج دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کہا۔ اس نے اپنے وحی کا ایک اسلوب بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم ایسا کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے' اسے غور سے سنئے۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ نبی اکرمؐ سے پہلے تمام انبیاء کرامؑ خدا کا پیغام لاتے رہے۔ مخالفین کا اعتراض تھا کہ اگر قرآن کی تعلیم بھی وہی ہے جو پہلے انبیاء کرامؑ کی تھی تو پھر قرآن میں ان کتابوں سے مختلف احکام کیوں ہیں جنہیں وہ اپنی آسمانی کتابیں کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا کہ وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جو احکام وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے جاتے تھے انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی منسوخ کردیتی تھی اور ان کی جگہ ان سے بہتر احکام (یعنی ایسے احکام جو زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کو پورا کرسکیں) دیئے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سابقہ انبیاء کرامؑ کی وحی اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتی تھی۔ اس میں تحریف و الحاق بھی ہوتا تھا اور اس کا اکثر حصہ حوادث ارضی و سماوی کی وجہ سے یا خود انسانی وسیسہ کاریوں کے باعث یا ویسے ہی ذہنوں سے فراموش ہوجاتا تھا۔ بعد میں آنے والا رسول اس فراموش شدہ حصہ کو من جانب اللہ حاصل کرکے پھر لوگوں کو دے جاتا تھا۔ قرآن چونکہ سب سے آخر میں آنے والی کتاب تھی اس لئے اس نے تمام سابقہ احکام کو جو وقتی طور پر نافذ العمل ہونے کے لئے دیئے گئے تھے' منسوخ کردیا اور ان کی جگہ ایسے اصولی احکام دے دیئے جو ہمیشہ کے لئے رہنے والے تھے۔ سابقہ انبیاء کرامؑ کی تعلیم کا وہ حصہ جو فراموش کردیا گیا تھا لیکن جس کا باقی رکھا جانا مقصود تھا اسے قرآن دوبارہ لے آیا۔ اس کی وجہ سے اہل کتاب قرآن میں بعض باتیں ایسی پاتے تھے جو ان کے احکام کے خلاف جاتی تھیں (یعنی جنہیں قرآن نے منسوخ کردیا تھا اور ان کی

جگہ دوسرے احکام نے لے لی تھی)۔ یا ایسی باتیں جس کا ان کتابوں میں کہیں ذکر نہ تھا جو ان کے پاس اس وقت موجود تھیں (یعنی وہ حصہ جو ان کے ہاں فراموش ہوچکا تھا اور جسے قرآن دوبارہ لایا تھا)۔ وہ اس تبدیلی کو بطور اعتراض پیش کرتے تھے کہ اگر قرآن اسی خدا کی طرف سے ہے جس خدا نے سابقہ کتابیں نازل کی تھیں تو پھر قرآن بعینہ ان کتابوں جیسا کیوں نہیں۔

دیکھئے' قرآن کریم ان کی ان بہانہ سازیوں کی پردہ کشائی کس انداز سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (اے رسولؐ!) اہل کتاب ہوں یا مشرکین عرب' وہ اسے گوارا ہی نہیں کرتے کہ وحی تمہاری طرف نازل ہو۔

ما یود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم

(۲/۱۰۵)

"اہل کتاب ہوں یا مشرکین عرب' جو بھی (قرآن کی صداقت سے) انکار کرتے ہیں (ان کے اس انکار کی در حقیقت وجہ یہ ہے کہ) وہ اسے چاہتے ہی نہیں کہ خدا کی یہ خیرو برکت تمہاری طرف نازل ہو جائے (لیکن یہ تو خدا کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ لوگوں کی منشاء کے مطابق)۔ وہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہتا ہے مختص کرلیتا ہے۔ وہ صاحب فضل عظیم ہے"۔

اہل کتاب میں سے یہودی اس انکار و مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ان کی اس مخالفت کی اصلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اسے برداشت ہی نہیں کرسکتے تھے کہ نبوت (بنی اسرائیل کو چھوڑ کر) بنی اسمٰعیل کی طرف چلی جائے[۴۰]۔ لیکن اعتراضات اس قسم کے کرتے تھے کہ قرآن کے احکام ان کی شریعت کے خلاف کیوں ہیں۔ (مثلاً" ان کے ہاں اونٹ حرام تھا' قرآن نے اسے حلال قرار دے دیا وغیرہ وغیرہ) اس کے جواب میں قرآن نے یہ بتایا کہ وحی کا اسلوب یہ ہے کہ **ما ننسخ من ایتہ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا**(۲/۱۰۶) کہ ہم جن سابقہ احکام کو منسوخ کردیتے ہیں' ان کی جگہ بعد میں آنے والے نبی کی وساطت سے ان سے بہتر احکام بھیج دیتے ہیں اور سابقہ تعلیم میں سے جو حصہ فراموش کردیا جاتا ہے اس کی جگہ اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یہی اسلوب قرآن میں کار فرما ہے۔ سورہ نحل میں منکرین قرآن کا اعتراض ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

واذا بدلنا ایتہ مکان ایتہ واللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون (۱۶/۱۰۱)

"جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل

۴۰۔ قریش اسے کیوں نہیں پسند کرتے تھے' اس کی وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ نبوت' ہمارے سرداروں میں سے کسی کو ملنی چاہئے تھی۔ اس غریب اور یتیم کو کیوں مل گئی؟

کر رہا ہے' تو یہ کہتے ہیں کہ (اے رسولؐ) تو یہ کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے (کیونکہ یہ
ان کتابوں سے مختلف ہے جو ہمارے پاس ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے
نہیں (کہ وحی کا اسلوب کیا ہے)

دیکھئے! بات کس قدر واضح ہے۔

یہ تو ہوا کتب سابقہ کے ان احکام کے متعلق جنہیں خدا خود منسوخ کرکے' وحی جدید میں ان سے بہتر احکام عطا کردیتا تھا۔ ان میں ایسے احکام بھی شامل تھے جنہیں اہل کتاب نے اپنی طرف سے وضع کرکے شامل کتاب کر رکھا تھا۔ اس کی شہادت قرآن کریم کے مختلف مقامات میں موجود ہے (مثلاً ۵/۱۳)۔ ان تحریفات کو جدید وحی منسوخ کرکے' ان کی جگہ اصلی احکام دے دیتی تھی۔ سورہ حج میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته فینسخ الله ما یلقی الشیطن ثم یحکم الله ایته والله علیم حکیم (۲۲/۵۲)

"اور ہم نے (اے رسولؐ!) تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ اس کے بعد اس کے تلاوت کردہ (پیغامات خداوندی) میں شیطان نے اپنی طرف سے کچھ ملا نہ دیا ہو۔ (شیاطین یہ کرتے تھے اور) اللہ ان کی اس آمیزش کو (دوسرے رسول کی بعثت سے) مٹا دیتا تھا اور اپنے پیغامات کو پھر محکم بنا دیتا تھا۔ اللہ علیم و حکیم ہے"۔

یہ تھا وحی کے پروگرام کا اسلوب یعنی ہر رسول کی طرف بھیجی جانے والی وحی' سابقہ وحی کے ان احکام کو منسوخ کردیتی تھی جن کا باقی رکھا جانا مقصود نہیں ہوتا تھا' خواہ وہ احکام' سابقہ کتب میں' اپنی اصلی شکل میں موجود ہوں اور خواہ وہ الحاقی یا محرف ہوں۔ ان کی جگہ ان سے بہتر احکام نازل کردیئے جاتے تھے (**نات بخیر منھا** - ۲/۱۰۶)۔
اہل کتاب کے اپنی کتابوں کے بعض پیغامات کے فراموش کردینے کا بھی ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ (**ونسوا حظا مما ذکروا به** (۵/۱۴-۱۳) اگر ان فراموش کردہ پیغامات کا موجود رکھنا مقصود ہوتا تو جدید وحی خداوندی انہیں بحال کردیتی۔

ان تصریحات کی روشنی میں دیکھئے کہ آیہ تنسیخ (۲/۱۰۹) کے صحیح مفہوم کے سمجھنے میں کوئی بھی دقت پیش آتی ہے؟ یعنی اس مفہوم کے سمجھنے میں کہ وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جن سابقہ احکام کا باقی رکھنا مقصود نہیں ہوتا تھا انہیں منسوخ کرکے وحی جدید میں ان سے بہتر احکام دے دیئے جاتے تھے اور وحی سابقہ کے جن احکام کو علیٰ حالہ رکھنا مقصود ہوتا تھا' وحی جدید میں ان کی تجدید کردیجاتی تھی خواہ اہل کتاب نے انہیں فراموش ہی کیوں نہ کردیا ہو۔ اس مفہوم کو

سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس عقیدہ کی کوئی اصل ہو سکتی ہے کہ قرآن کریم کی اپنی آیات، دوسری آیات سے منسوخ ہیں اور بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے، اور ایسی بھی جنہیں پہلے نازل کیا گیا تھا پھر انہیں محو کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ بھی کہ قرآن کی آیات، روایات سے منسوخ ہیں۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قرآن کی بعض موجودہ آیتیں دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں لیکن خدا نے بتایا نہیں کہ کون سی آیات، کون سی سے منسوخ ہو چکی ہیں، تو اس سے قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کو اس سے کیا غرض کہ خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور رسول اللہ کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا؟ اسے تو صرف اس سے غرض ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اس میں کہیں فرق نہ آجائے، خواہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہود کی مکذوبات ہوں یا نصاریٰ کی مفتریات، مجوس کی مخترعات ہوں یا صناوید عجم کی خرافات۔

---------------------- ○ ----------------------

اب آیئے تقی صاحب کی پیش کردہ دوسری آیت کی طرف یعنی **سنقرئک فلا تنسی الا ما شا اللہ** (۸۷/۶-۷)۔ اس کا ترجمہ انہوں نے کیا ہے :-

"ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں مگر جو کچھ اللہ چاہے"۔

اس آیت کو انہوں نے اس عقیدہ کی تائید میں پیش کیا ہے کہ خدا پہلے (قرآن میں) کچھ آیتیں نازل کر دیتا تھا، پھر انہیں واپس لے جاتا تھا اور انہیں حضورؐ کے حافظہ سے بھی محو کر دیتا تھا۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ سرے سے قرآن کریم کے خلاف ہے کہ خدا پہلے کچھ آیات نازل کرتا تھا اور پھر انہیں واپس لے جاتا تھا۔ قرآن کریم میں ہے

ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجدلک بہ علینا وکیلا

(۱۷/۸۶)

"اگر ہم چاہتے تو جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اسے اٹھا کر لے جاتے اور پھر کوئی قوت تیری طرف سے ہمارے خلاف وکالت کر کے (اسے واپس نہ دلا سکتی)"۔

"اگر ہم چاہتے" سے واضح ہے کہ اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا بھی کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا، اس لئے ایسا نہیں کیا۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضورؐ پر نازل کیا اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے گیا۔

اس کے بعد آیئے آیت (۸۷/۶) کی طرف جس سے یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ جو کچھ حضورؐ کی طرف نازل کیا جاتا تھا اسے آپؐ خود تو نہیں بھلا سکتے تھے لیکن جس حصہ کے متعلق خدا چاہتا تھا وہ آپ کے حافظہ سے محو ہو جاتا۔ اس کے لئے سند ہے "الا ماشاء اللہ" جس کا مطلب لیا جاتا ہے "بجز اس کے جس کے لئے خدا کی مشیت ہو کہ آپؐ بھول جائیں"۔

تنسی کا مادہ (ن- س- ی) ہے جس کے معنی بھول جانے کے علاوہ، ترک کر دینے، حفاظت چھوڑ دینے کے بھی

ہیں۔ المنار علامہ محمد عبدہٗ (مرحوم) کی بڑی مستند اور مشہور تفسیر ہے' جسے ان کے شاگرد علامہ رشید رضا (مرحوم) نے مرتب کیا ہے۔ آیت (۶/۸۷) کی تشریح میں وہ نسیان کے مختلف مطالب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

اگر اس کے معنی بھول جانے کے بھی لئے جائیں تو بھی الا ماشاء اللہ اس کی نفی کر دیتا ہے۔ کیونکہ "استثناء بالمشیت" اسلوب قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے (یعنی جہاں الا کے بعد ماشاء اللہ وغیرہ الفاظ آئیں جن سے مراد مشیت خداوندی ہوتی ہے' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا پہلے کہا گیا ہے اس کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا)۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے **خالدین فیھا مادامت السموت والارض الا ماشاء ربک عطاء غیر مجذو ذ** (۱۱/۱۰۸) یعنی غیر مقطوع اور استثناء میں یہ نکتہ ہے کہ یہ ظاہر کر دینا مقصود ہے کہ یہ امور جو ثابتہ اور دائمہ ہیں خدا کی مشیت سے ایسے ہیں' اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایسے نہیں۔ اگر خدا اس کے خلاف چاہتا تو ان کو ویسا ہی بنا دیتا (لیکن اس نے ایسا چاہا نہیں)۔

(المنار' جلد اول' ص۱۹-۴۱۶ زیر **ننسخ و ننسھا**)

الا ماشاء اللہ کے ان معانی کی رو سے' سورہ الاعلےٰ کی آیت نمبر۶ کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ :

"اے رسولؐ! جو کچھ ہم تجھے وحی کی رو سے پڑھائیں گے تو اس میں سے نہ تو کچھ ترک کر سکے گا' نہ فراموش۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ یہ حتمی بات ہے"۔

---------------- ○ ----------------

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے' قرآن کی صحیح پوزیشن۔ اللہ تعالیٰ نے یوم اول سے جو کچھ حضورؐ پر نازل فرمایا اور یوم آخر تک جب اس کے اتمام کا اعلان کر دیا' اس کا کوئی ایک لفظ بھی نہ منسوخ ہوا نہ تبدیل' نہ فراموش۔ یہ سارے کا سارا قرآن' حضورؐ نے خود لکھوا کر' زبانی یاد کرا کر' صحابہؓ کو دیا اور وہی قرآن بلا تغیر و تبدل امت کے پاس متواتر چلا آرہا ہے۔ جس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (۹/۱۵) اس میں تغیر و تبدل کیسے ہو سکتا ہے؟ (مسلمان تو ایک طرف) خود غیر مسلموں کی تحقیق بھی اس کی شاہد ہے۔

یہ تو ہے قرآن کریم کی رو سے حفاظت قرآن کی پوزیشن' لیکن وضعی روایات نے اس کا کچھ بھی غیر مشکوک نہیں رہنے دیا اور انہی کے سہارے غیر مسلم اس کے خلاف اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جو جواب دیا جاتا ہے' اس کا نمونہ آپ تقی صاحب کے مقالہ میں دیکھ چکے ہیں۔ یاد رکھئے! جب تک آپ ان وضعی روایات کو صحیح اور مستند تسلیم کرتے رہیں گے' نہ قرآن کی حفاظت ثابت ہو سکے گی اور نہ ہی معترضین کے کسی اعتراض کا اطمینان بخش جواب دیا جا سکے گا۔ اس قسم کی روایات کے متعلق صحیح موقف وہی ہے جسے (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو' بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ کچھ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیات د ینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جاسکتی- ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا- یقیناً" یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی"-

(ترجمان القرآن' جلد دوم' ص۵۰۰) شائع کردہ' مکتبہ برہان' دہلی-

لیکن یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ وہی بات (مولانا) آزاد کہیں تو وہ امام الہند رہیں لیکن وہی بات طلوع اسلام کہے تو اسے منکر حدیث' کافر' مرتد قرار دے دیا جائے-

لیکن طلوع اسلام کو منکر حدیث اور کافر قرار دینے سے آپ اپنے آپ کو تو مطمئن کرسکتے (بلکہ فریب دے سکتے) ہیں' غیر مسلم معترضین کے اعتراضات کا جواب نہیں دے سکتے' قرآن مجید کی حفاظت ثابت نہیں کرسکتے- اس کے لئے تو (مولانا) آزاد کی طرح "منکر حدیث" بننا اور اسلام کے خلاف اعتراضات کا جواب دینے کے لئے قرآن کو سند و حجت قرار دینا ہی پڑے گا- (اکتوبر ۱۹۷۴ء)

۱۰- قرآن کریم میں تحریف کی نہایت خطرناک سازش

اختلاف قرات

(میرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ محدثیت)

طلوع اسلام کنونشن ۱۹۷۳ء کی مجلس استفسارات میں ایک سوال میرے پاس بھیجا گیا- سوال کا جواب تفصیل طلب تھا اور وقت کم' اس لئے اس کا جواب اس مجلس میں نہ دیا جاسکا- لیکن سوال کی اہمیت اس کے جواب کی متقاضی ہے- سوال یہ تھا:

آج کل اخبارات میں تحریف قرآن کے متعلق کچھ بحث چل رہی ہے' اس میں ایک بات یہ بھی کہی جا رہی ہے کہ میرزا غلام احمد صاحب نے قرآن کی ایک آیت میں اضافہ کردیا تھا- اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ وہ آیت حضرت ابن عباسؓ کی قرات میں اسی طرح ہے جس طرح میرزا صاحب نے لکھا ہے- سوال یہ ہے کہ "حضرت ابن عباس کی قرات" سے کیا مراد ہے- ذرا تفصیل سے سمجھایئے-

بات توجہ سے سمجھنے کی ہے- ہمارے ہاں عام طور پر "قرات" سے مراد قرآن کریم کے پڑھنے کا انداز ہوتا ہے- چنانچہ "قاری" اسے کہتے ہیں جو ایک خاص انداز سے قرآن پڑھے- لیکن اصطلاح میں "قرات" کا مفہوم اس سے بالکل

الگ ہے۔ قرآن مجید کے متعلق شکوک اور شبہات پیدا کرنے کے لئے جس قدر سازشیں ہوئی ہیں، ان میں "اختلاف قرات" ایک اہم کڑی ہے۔

۲۔ اسلام کی صداقت، افضلیت اور اکملیت کا مدار ختم نبوت پر ہے اور ختم نبوت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ:

(۱) تمت کلمت ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکلمتہ (۶/۱۱۶) یعنی قرآن مجید مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے سلسلہ میں جو کچھ انسانوں کو دینا تھا وہ مکمل طور پر قرآن کریم میں دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا، اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں اور جو کچھ اس میں کہا گیا ہے وہ محکم اور ابدی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا اور

(۲) انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحفظون (۱۵/۹)

"حفاظت قرآن کا ذمہ خدا نے خود لے رکھا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن، رسولؐ اللہ کو بذریعہ وحی دیا جسے رسولؐ اللہ نے امت تک پہنچایا، اور جو اس وقت سے اس وقت تک مروج ہے، وہ مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ بنا بریں، اب خدا کی طرف سے کسی وحی کی ضرورت نہیں۔ اسی کو ختم نبوت کہتے ہیں۔ اگر قرآن مجید کی ان تینوں بنیادی خصوصیات میں سے کسی ایک کے متعلق بھی کوئی شک و شبہ پیدا ہو جائے تو دین باقی نہیں رہتا۔

(۳) حضورؐ کو جو قرآن خدا کی طرف سے عطا ہوا، آپ نے اسے نہایت احتیاط اور حفاظت سے، امت کو دے دیا، لکھوا کر بھی اور حفظ یاد کرا کر بھی۔ چنانچہ جو قرآن، امت میں مروج ہے، حضورؐ نے اسے اسی ترتیب اور شکل میں امت کو دیا تھا۔ یہی قرآن مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ دین کے خلاف سازشوں کے سلسلہ میں پہلے اس قسم کی روایات وضع کی گئیں کہ رسولؐ اللہ نے امت کو قرآن مجید مرتب شکل میں نہیں دیا تھا۔ یہ مختلف اور متفرق کاغذ کے پرزوں، پتھر کے ٹکڑوں، کھجور کے پتوں اور اونٹوں کی ہڈیوں پر منتشر تھا۔ اسے بعد میں جمع اور مرتب کیا گیا۔۔۔ عہد صدیقیؓ یا فاروقیؓ یا عثمانیؓ میں،۔۔۔ (روایات کی رو سے) جس طریق سے اسے جمع اور مرتب کیا گیا، وہ بجائے خویش، مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب ہے (میں اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۵۔ موضوع زیر نظر کی طرف بڑھ جانا چاہتا ہوں)۔ عام طور پر اس پر اتفاق ہے کہ عہد عثمانیؓ میں جو نسخہ مرتب ہوا تھا، وہ آگے چلا اور وہی اس وقت تک امت میں رائج چلا آرہا ہے۔ اسی نہج سے اسے مصحف عثمانی کہا جاتا ہے۔

(۴) بات یہاں تک بھی رہتی تو کسی حد تک غنیمت تھا، لیکن سازش اس سے بھی آگے بڑھی۔ کہا یہ گیا کہ خود حضرت عثمانؓ کے زمانے میں، مختلف صحابہؓ کے پاس قرآن مجید کے ایسے نسخے تھے جن میں متعدد آیات ایسی تھیں جو مصحف عثمانی سے مختلف تھیں۔ اسے "اختلاف قرات" کہا جاتا ہے یعنی جب (مثلاً) یہ کہا جائے گا کہ "حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی قرات میں یوں آیا ہے" تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ مصحف عثمانی میں تو یہ آیت یوں درج ہے، لیکن قرآن کا جو نسخہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس تھا، اس میں یہ آیت یوں تھی۔ اس قسم کے اختلافات، دو، چار، دس، بیس،

۵۔ اس کی تفصیل ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقام حدیث" میں ملے گی۔

آیات تک محدود نہیں' ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ حدیث کے مشہور امام اور جامع ابوداؤد کے صاحبزادہ حافظ ابوبکر عبداللہ سجستانی (متوفی ۳۱۶ھ) کی ایک مشہور تالیف ہے۔۔۔ کتاب المصاحف۔۔ اس میں انہوں نے قرآن کی جمع اور تدوین سے متعلق روایات بھی یک جا درج کی ہیں اور صحابہؓ اور تابعینؒ کے مختلف نسخوں (مصاحف) کا بھی ذکر گیا ہے۔ (معاندین کو ایسا مسالہ خدا دے۔ چنانچہ) ایک مستشرق (ARTHUR JEFFERY) نے اس کتاب کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے اور اس میں ان مصاحف کی تفصیل بھی درج ہے جو مختلف صحابہؓ اور تابعینؒ کی طرف منسوب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان مصاحف کی ان آیات کو بھی درج کیا ہے جو مصحف عثمانی سے مختلف ہیں۔ ان میں صرف صحابہؓ کی طرف منسوب مصاحف حسب ذیل ہیں۔ ہم نے قوسین میں ان آیات کی تعداد لکھ دی ہے جو ان میں مصحف عثمانی سے مختلف ہیں۔ مثلاً" ابن مسعود (۱۳۲۲) سے مراد یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف منسوب مصحف میں (۱۳۲۲) آیات ایسی تھیں جو مصحف عثمانی (یعنی ہمارے مروجہ قرآن مجید) سے مختلف تھیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) حضرت ابن مسعودؓ (۱۳۲۲)۔ (۲) حضرت ابی بن کعبؓ (۹۵۲)۔ (۳) حضرت علیؓ (۸۹)۔ (۴) حضرت ابن عباسؓ (۱۸۶)۔ (۵) حضرت ابو موسیٰؓ (۴)۔ (۶) حضرت حفصہؓ (۱۰)۔ (۷) حضرت انس بن مالکؓ (۲۴)۔ (۸) حضرت عمرؓ (۲۸)۔ (۹) حضرت زید بن ثابتؓ (۱۰)۔ (۱۰) حضرت ابن زبیرؓ (۴۳)۔ (۱۱) حضرت عمر ابن العاصؓ (تعداد معلوم نہیں)۔ (۱۲) حضرت عائشہؓ (۱۳)۔ (۱۳) حضرت سالمؓ (۲)۔ (۱۴) حضرت ام سلمہؓ (۴)۔ (۱۵) حضرت عبید ابن عمیرؓ (۱۸)۔

تابعینؒ کی طرف منسوب مصاحف' نیز ایسے مصاحف جو بے نام ہیں' ان کی تعداد الگ ہے۔ ان اختلافات کی یہ نوعیت نہیں کہ ان میں محض زیر' زبر کا فرق ہے' (اگرچہ عربی زبان میں زیر' زبر کے فرق سے بھی بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے) ان میں الفاظ تک بدلے ہوئے ہیں۔ کہیں الفاظ کا اضافہ ہے' کہیں وہ محذوف ہیں۔ کہیں تبدیل شدہ ایسے الفاظ ہیں جن سے معانی کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جب قرآن کریم کے متعلق یہ عقیدہ ہو کہ صحابہؓ کے زمانے میں بھی' مختلف صحابہؓ کے نسخوں میں اختلاف تھا اور جو نسخہ مستند طور پر امت کو دیا گیا تھا (مصحف عثمانی) خود اس میں' اور ان نسخوں میں سیکڑوں مقامات میں اختلاف تھا' تو قرآن کے دعوئے اکملیت' محکمیت (غیر متبدل) اور محفوظ ہونے کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ ہمارے علماء کرام ان "مختلف قراتوں" کے قائل ہیں۔ چنانچہ آپ نے اکثر ان حضرات کو کہتے سنا (یا لکھتے دیکھا) ہوگا کہ قرآن مجید کی آیت یوں ہے لیکن فلاح صحابی کی قرات میں یوں آیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ

افلا یتدبرون القران ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (۴/۸۲)

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے"۔

یعنی قرآن نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ آپ

سوچئے کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ فلاں آیت ایک مصحف میں یوں آئی ہے اور دوسرے میں یوں' تو کیا قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ باقی رہ سکتا ہے؟ اس عقیدہ سے دین کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے- یہ ہے وہ سازش جو قرآن یا (دین) کے خلاف کی گئی!

اس تمہید کے بعد' اس سوال کی طرف آیئے جسے شروع میں درج کیا گیا ہے- سورۂ حج کی ایک آیت ہے-

(ا) وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن ثم یحکم اللہ ایته و اللہ علیم حکیم (۲۲/۵۲)

"(وحی کا سلسلہ ایسا رہا ہے کہ) کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں آیا جس (کے بعد اس) کی وحی میں' دین کے دشمنوں (شیاطین) نے آمیزش نہ کردی ہو- (جب ایسی تحریف ہو جاتی تھی تو خدا ایک اور رسول بھیج دیتا تھا اور اس کی طرف نازل کردہ وحی کے ذریعے) اس آمیزش شیطانی کو منسوخ کرکے' خالص وحی کو پھر محکم کردیتا تھا اور یہ سب کچھ خدا کے علم و حکمت کی بنا پر ہوتا تھا-۶-"

مرزا غلام احمد نے اپنی کتاب' "براہین احمدیہ" میں (جو غالباً ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے) کہا ہے کہ انہوں نے رسالت یا نبوت کا دعویٰ نہیں کیا- انہوں نے "محدث" ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس کی سند میں کہا ہے کہ محدثین کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے- (معترضین نے کہا کہ) مرزا صاحب نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت کو اس طرح پیش کیا ہے-

(۲) وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث الا ......

یعنی مرزا صاحب نے قرآن کریم کی آیت میں' لفظ محدث کا اضافہ اپنی طرف سے کردیا ہے- یہ قرآن میں تحریف ہے اور جس دعویٰ کی بنیاد تحریف قرآنی پر ہو' اس کے باطل ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ مرزا صاحب کے متبعین کی لاہوری شاخ کے ترجمان "پیغام صلح" کی ۱۴ نومبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے-

مصنف کتابچہ نے اس عبارت سے پیشتر یہ الفاظ حذف کردیئے ہیں' "آپ کو معلوم ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی قرات میں آیا ہے"- حضرت مرزا صاحب' حضرت ابن عباسؓ کی قرات درج کر رہے ہیں اور فاضل مصنف اسے آیت قرآنیہ قرار دے کر اور سیاق

۶- ہمارے مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ کیا کیا ہے' اور تفسیری روایات نے اس میں کیا گل کھلائے ہیں- ہم اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے ہم سردست اپنے آپ کو موضوع زیر نظر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں-

و سباق کو حذف کر کے اشتعال انگیزی میں مصروف ہیں تا کہ نان جویں تو میسر آسکے۔ یاد رہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی قرات درج کر کے حضرت مرزا صاحب بھی یہی ثابت کر رہے ہیں کہ میرا منصب ملہم و محدث کا ہے نہ کہ نبوت کا' جیسا کہ غالی مریدوں اور مخالفوں کا پروپیگنڈا ہے۔

میرزا صاحب نے براہین احمدیہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

آپ لوگ کیوں قرآن شریف میں غور نہیں کرتے اور کیوں سوچنے کے وقت غلطی کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ صاحبوں کو خبر نہیں کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس امت کے لئے بشارت دے چکے ہیں کہ اس امت میں بھی پہلی امتوں کی طرح محدث پیدا ہوں گے اور محدث بفتح دال وہ لوگ ہوں گے جن سے مکالمات و مخاطبات الہیہ ہوتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ابن عباس کی قرات میں آیا ہے۔ **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ ایتہ** ۷۔ پس اس آیت کی رو سے بھی جس کو بخاری نے بھی لکھا ہے' محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے جس میں دخل شیطان کا قائم نہیں رہ سکتا۔

(براہین احمدیہ' شائع کردہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام' لاہور)
۱۹۷۰ء آفسٹ ایڈیشن' ص۳۴۸' حاشیہ در حاشیہ)

آپ ان الفاظ کو غور سے پڑھئے۔ میرزا صاحب پہلے کہتے ہیں کہ " ابن عباس کی قرات میں آیا ہے"۔ اور اس کے بعد لکھتے ہیں "اس آیت کی رو سے بھی جسے بخاری نے بھی لکھا ہے' محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے۔ "بالفاظ دیگر' وہ قرات حضرت ابن عباس کی آیت کو "آیت" کہہ کر پکارتے ہیں (جس کے معنی لامحالہ آیت قرآنی ہیں) اور اس آیت کو اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ "محدث" کا الہام قطعی اور یقینی ہوتا ہے" (واضح رہے کہ لفظ محدث سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا)۔

اس ضمن میں ہم "احمدی" حضرات سے حسب ذیل سوالات متعین طور پر پوچھنا چاہتے ہیں۔

(ا) کیا ان کے عقیدے کی رو سے' اللہ تعالیٰ نے جو آیت بذریعہ وحی رسولؐ اللہ پر نازل کی تھی' وہ اس طرح تھی جس طرح ہمارے مروجہ قرآنی نسخوں میں درج ہے یا اس طرح' جیسے قرات حضرت ابن عباس میں بتائی جاتی ہے (لفظ محدث کے اضافہ کے ساتھ)۔

۷۔ میرزا صاحب نے یہاں آیت کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن اپنے اشاریہ میں اس کا حوالہ (انبیاء ـــــ ۲۱ : ۲۵) لکھا ہے جو غلط ہے۔ قرآنی آیت کا حوالہ سورۃ الحج آیت نمبر ۵۲ ہے۔ (۲۲/۵۲)

(۲) اگر وہ آیت اس طرح تھی جس طرح مروجہ قرآنی نسخوں میں درج ہے (لفظ محدث کے بغیر)، تو جس آیت میں لفظ محدث کا اضافہ ہو، آپ اسے کیا قرار دیں گے؟ کیا آپ اسے قرآن میں تحریف قرار دیں گے یا نہیں، کیونکہ اضافہ بھی تو تحریف ہوتا ہے۔

(۳) اگر آپ اسے قرآن میں تحریف قرار دیں گے تو جو شخص اپنے کسی دعویٰ کی تائید میں اس قسم کی محرف آیت کو پیش کرے، اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے!

(۴) اور اگر آپ کہیں کہ آپ دونوں آیتوں کو منزل من اللہ مانتے ہیں تو پھر قرآن کریم کے اس دعویٰ کے متعلق آپ کیا کہیں گے کہ اس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۵) آپ دنیا کے سامنے "منزل من اللہ قرآن شریف" کون سا پیش کرتے ہیں؟ وہی جو مسلمانوں میں مروج ہے یا دیگر قراتوں والا؟ اگر وہی پیش کرتے ہیں تو دوسری قراتوں والے مصاحف کی آپ کے نزدیک کیا حیثیت ہے؟

ہم "احمدی" حضرات سے گزارش کریں گے (خواہ وہ قادیانی ہوں یا لاہوری) کہ وہ ان سوالات کے دو ٹوک اور متعین جوابات مرحمت فرمائیں۔ اس قسم کا جواب کہ "اس باب میں جو عقیدہ جمہور مسلمانوں کا ہے وہی ہمارا عقیدہ ہے"، قابل تسلیم نہیں ہوگا۔ بات آپ کے مقتدائے کی ہے، اس لئے اس کا جواب آپ کے ذمے ہے۔ آپ اپنا متعین جواب لکھئے (خواہ وہ جمہور مسلمانوں کے مطابق ہو یا اس کے خلاف)۔ آپ کا جواب موصول ہونے پر بات آگے چل سکے گی۔ (پرویز) (جنوری ۱۹۷۴ء)

اس کے جواب میں "احمدی" حضرات کی لاہوری شاخ کے ترجمان "پیغام صلح" بابت ۲۳ جنوری ۱۹۷۴ء نے مقالہ افتتاحیہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے دیکھ کر ہمیں افسوس ہوا کہ اگر ان حضرات کا مبلغ علم اتنا ہی ہے تو پھر اس مذہب کا خدا حافظ جس کے یہ مبلغ ہیں۔ اور اگر انہوں نے ایسا کچھ (دیدہ و دانستہ) محض میرزا صاحب کی مدافعت کے لئے لکھا ہے تو یہ صورت حالات اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز ہے۔ "پیغام صلح" نے لکھا ہے کہ جسے "اختلاف قرات" کہا جاتا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ ان (صحابہؓ) کی طرف منسوب قرآنی نسخوں (مصاحف) میں یہ آیات اس طرح درج تھیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرات ان آیات کا مفہوم یہ لیتے تھے۔ "پیغام صلح" کے الفاظ یہ ہیں۔

> (۱) اس سے ظاہر ہے کہ ان نسخوں میں مندرج آیات کو آیات قرآنی قرار نہیں دیا گیا، بلکہ "اختلاف قرات" کہا گیا ہے اور یہ اختلاف قرات کیا ہے؟ اس کو آیات قرآنی کی تعبیر و تفسیر ہی کہا جاسکتا ہے۔
>
> (۲) قرات ابن عباس سے مفہوم یہ ہے کہ اس قرات کے مطابق محدث کے معنی بھی اس آیت سے نکل سکتے ہیں۔
>
> (۳) میرزا صاحب نے اپنے دعوائے محدثیت کی تائید میں اسے قرآن کی آیت کے

طور پر پیش نہیں کیا بلکہ صرف آیت قرآنی کا مفہوم قرار دیا ہے۔

عربی زبان کا ایک ابجد خواں بھی اس حقیقت سے واقف ہو گا کہ "قرات" کے معنی "تفسیر و تعبیر" نہیں۔ اس کے معنی "پڑھنا" ہیں۔ جب "قرات ابن عباس" کہا جائے گا تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے اور جس طرح وہ اس آیت کو پڑھا کرتے تھے اسی طرح یہ ان کے مصحف میں درج تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیری روایات الگ ہیں اور ان کی طرف منسوب کردہ مصحف (قرآنی نسخہ) الگ۔ ان کی تفسیر میں نہیں' بلکہ ان کی طرف منسوب کردہ مصحف میں زیر بحث آیت' لفظ محدث کے اضافہ کے ساتھ درج ہے۔ لہٰذا' اسے "تفسیر" کہنا دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ "قرات" کا لفظ قرآن کریم میں (بصیغہ فعل) اور کتب احادیث میں "پڑھنے" کے معنوں میں آیا ہے۔ بخاری میں "مدالقرات" ایک باب ہے جس میں "قرات رسولؐ اللہ" کے تحت لکھا ہے کہ حضورؐ قرآن کریم کو ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ کو کھینچ کر پڑھا کرتے تھے۔ بخاری (کتاب فضائل قرآن) میں حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ایک روایت ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ :-

> میں نے ہشام بن حکیم (ابن حزام) کو رسولؐ اللہ کی زندگی میں سورۂ فرقان پڑھتے سنا۔
> **"فاستمعت لقراتہ"** میں نے ان کا پڑھنا (قرات) سنا تو وہ بہت سے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جو مجھے رسولؐ اللہ نے نہیں پڑھائے تھے...

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "قرات" کے معنی "پڑھنا" ہیں' تفسیر یا مفہوم نہیں۔ ویسے بھی قرآنی آیت **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ......** کے متعلق کہنا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث......** قرآن کریم سے (معاذ اللہ) مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآن کریم نے "رسول اور نبی" کہا ہے۔ ان میں سے کون سا لفظ ہے جس کا مفہوم "محدث" ہے؟ اور اگر یہ تفسیر ہے تو پھر اضافہ کسے کہتے ہیں؟

آیئے! آپ کو بتائیں کہ صاحب "کتاب المصاحف" (بجستانی) نے "اختلاف قرات" کا مفہوم کیا بتایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ فلاں صاحب کا مصحف' ہمارے مصحف سے مختلف ہے تو اس اختلاف کی تین شکلیں ہوں گی۔

(۱) رسم الخط (کتابت) میں اختلاف۔
(۲) آیات میں الفاظ کے اضافہ کا اختلاف۔
(۳) آیات میں الفاظ کی کمی کا اختلاف۔ (کتاب المصاحف ص۳۰)

اس کے بعد جب وہ اختلاف قرات کی روایات درج کرتے ہیں تو ان میں اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں کہ فلاں راوی (یا راویوں) نے کہا ہے کہ **سمعنا عمر ابن الخطاب یقراء** ہم نے عمر ابن خطابؓ کو اس آیت کو یوں پڑھتے سنا..... **یا وقال ھذا قرات ابی ابن کعبؓ......** راوی نے کہا ہے کہ یہ ابی بن کعبؓ کی قرات ہے (ص۵۳'۵۱)۔

ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اختلاف قرات سے کیا مراد ہے۔

رسم الخط کے اختلاف سے قطع نظر' اختلاف قرات کی دو شکلیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) آیات میں الفاظ کا اضافہ۔ (۲) الفاظ کی کمی۔ پہلے الفاظ کی کمی کی دو چار مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) مروجہ نسخوں میں **فلا رفث لا ولا فسوق ولا جدال فی الحج** (۲/۱۹۷) مصحف عبداللہ بن مسعود میں **فلا رفث ولا جدال فی الحج** (ولا فسوق کے الفاظ نہیں ہیں)۔

(۲) مروجہ نسخوں میں **قالا ربنا ظلمنا انفسنا** **وان لم تغفرلنا وترحمنا**۔ (۷/۲۳) مصحف ابن مسعودؓ میں **قالا ربنا الا تغفرلنا و ترحمنا** (ظلمنا انفسنا کی کمی اور **وان لم** کی جگہ **الا تغفرلنا**)۔

(۳) مروجہ نسخوں میں **ومن الشیطین من یغوصون لہ ویعملون عملا دون ذالک وکنالھم حفظین**۔ (۲۱/۸۲)

مصحف ابن مسعودؓ میں **ومن الشیطین من یغوص لہ ویعمل و کنالھم حفظین** (الفاظ میں کمی اور اختلاف دونوں)۔

آیات میں الفاظ کے اضافہ کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تفسیر (یا توضیح مطلب) کے لئے لکھ دیئے گئے ہیں لیکن جن آیات میں الفاظ کو حذف کر دیا گیا ہے' ان کے متعلق کیا کہیں گے؟ یا (مثلاً") اس اختلاف کے متعلق کہ مروجہ قرآن مجید میں ہے **وسخر لکم الیل والنھار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ** (۱۶/۱۲) اور مصحف ابن مسعودؓ میں ہے **وسخرلکم الیل والنھار والشمس والقمر والریاح بامرہ** کیا الریاح (ہوائیں) النجوم (ستارے) کی تفسیر قرار پاسکتی ہے؟

"کمی" کے متعلق اتنا اور سن لیجئے کہ مصحف حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ میں قرآن کریم کی تین سورتیں (سورۃ فاتحہ' سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) تھیں ہی نہیں (روایات میں ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ یہ سورتیں قرآن کا حصہ ہیں ہی نہیں)۔

غور فرمایا آپ نے کہ "اختلاف قرات" کا کیا مفہوم ہے؟ جہاں تک اضافہ کا تعلق ہے' ہم اس کے لئے ایک مثال ہی کافی سمجھتے ہیں۔ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے سلسلہ میں قرآن کریم (سورۃ النساء) میں ان رشتوں کی تفصیل دینے کے بعد جن سے نکاح حرام ہے' کہا گیا ہے۔

> **واحل لکم ما وراء ذالکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین فما استمتعتم بہ منھن فاتوھن اجورھن فریضہ .....** (۴/۲۴)
>
> "اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں' اس طرح کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ساتھ چاہو نکاح میں لا کر نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔ سو تم ان میں سے جس

کے ساتھ نفع اٹھانا چاہو تو انہیں ان کے مقرر کردہ مہر دے دو" (ترجمہ مولانا محمد علی لاہوری)

سینوں کے ہاں اس معاہدہ کا نام نکاح ہے جو مہر ادا کرکے' دائمی طور پر کیا جاتا ہے اور جو موت یا طلاق سے فسخ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس' شیعہ حضرات متعہ کے قائل ہیں جس میں ایک مرد اور ایک عورت' ایک مدت معینہ کے لئے مباشرت کا معاملہ طے کرلیتے ہیں اور اس کے لئے اس عورت کو جنسی تعلق کا معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ سینوں کے ہاں متعہ حرام ہے۔

اس تمہید کے بعد آگے بڑھیئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سینوں کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کی قرات (مصحف) میں مندرجہ بالا آیت یوں آئی ہے۔

فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی .....

تم ان سے ایک مدت معینہ کے لئے فائدہ اٹھاؤ۔

یعنی اس قرات کی رو سے آیت قرآنی میں "الی اجل مسمی" کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے متعہ کی سند مل جاتی ہے۔ اب دیکھئے کہ اس اضافہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کیا فرماتے ہیں۔ سینوں کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ قابل اعتماد تفسیر' تفسیر طبری ہے۔ وہ اس آیت (۴/۲۴) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

> "ابو نضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۃ النساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا' کیوں نہیں۔ کہا' پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ **فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی**۔ میں نے کہا' نہیں۔ میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اصلی آیت یونہی ہے۔ عبدالاعلیٰ کی روایت میں بھی ابو نضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی **فما استمتعتم بہ منھن**۔ ابن عباسؓ نے کہا **الی اجل مسمی**۔ میں نے کہا میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا' "خدا کی قسم! خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے"۔

ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب بھی یہ بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے یا نہیں کہ "اختلاف قرات" سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کے بعد بھی آپ فرمائیں گے کہ اختلاف قرات سے مراد تفسیر اور مفہوم کا اختلاف ہے؟ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "خدا کی قسم! خدا نے اس آیت کو نازل ہی اس طرح کیا تھا جس طرح میں پڑھتا ہوں نہ کہ اس طرح جس طرح یہ مصحف عثمانی میں درج ہے"!

آیئے اب آپ کو یہ بتائیں کہ یہ تصور کہاں سے آیا ہے کہ "اصل میں تو یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی' لیکن مروجہ قرآن میں یہ اس طرح درج ہے"۔

شیعہ حضرات کا عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن مسلمانوں میں مروج ہے وہ محرف ہے۔ اس میں اکثر و بیشتر آیات اس طرح نہیں لکھی گئیں جس طرح وہ نازل ہوئی تھیں۔ ان میں تحریف کردی گئی ہے۔ اصلی آیات کا علم ان کے ائمہ کرامؒ کو ہے۔ الکافی شیعہ حضرات کی سب سے زیادہ قابل اعتماد احادیث کی کتاب ہے۔ یہی ان کے مسلک کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ اس میں متعدد آیات کے متعلق لکھا ہے کہ یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی تھی لیکن مروجہ قرآن میں اس طرح درج ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

عن جابر عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال قلت لہ لم سمی امیر المومنین قال اللہ سماہ وھکذا انزل فی کتابہ واذ اخذ ربک من بنی ادم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علے انفسھم الست بربکم وان محمد رسول اللہ وان علیا امیر المومنین (۷/۱۷۲)

جابر نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ حضرت علیؓ کا نام امیرالمومنین کیوں ہوا۔ فرمایا کتاب خدا میں یوں نازل ہوا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

(کتاب الشافی' ترجمہ الکافی' جلد اول' ص۵۰۹)

قرآن کریم (مروجہ نسخوں) میں اس آیت (۷/۱۷۲) میں **"وان محمد رسول اللہ وان علیا امیر المومنین"** کے الفاظ نہیں۔ لیکن الکافی میں ہے کہ یہ آیت دراصل اس طرح نازل ہوئی تھی جس طرح الکافی میں درج ہے۔ یا مثلاً:۔

عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قولہ تعالی و من یطع اللہ و رسولہ فی ولایتہ علی وولایتہ الائمتہ من بعدہ فقد فاز فوزا" عظیما - ھکذا نزلت۔

ابو بصیر سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیت **من یطع اللہ و رسولہ** کے متعلق فرمایا..... (اس کے بعد آیت درج ہے) کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی تھی۔

(کتاب الشافی' جلد اول' ص۵۱۰)

قرآن کریم کے مروجہ نسخوں میں آیت (۳۳/۷۱) میں یہ الفاظ نہیں **"فی ولایتہ علی و ولایتہ الائمتہ من بعدہ"** لیکن الکافی کا بیان ہے کہ یہ آیت دراصل ان الفاظ کے ساتھ نازل ہوئی تھی لیکن مصحف عثمانی میں ان الفاظ کو حذف کر دیا گیا ہے۔

غرضیکہ' الکافی میں متعدد آیات ایسی درج ہیں جو مروجہ قرآنی نسخہ سے مختلف ہیں اور جن کے متعلق کہا گیا کہ **"ھکذا انزلت"** یہ اسی طرح نازل ہوئی تھیں۔ اس کو وہ "قرات اہل بیت" کہتے ہیں۔

شیعہ حضرات نے یہ کہا تو سینوں نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ یہ روایات شیعہ حضرات کی ہیں جو ہمارے نزدیک وضعی ہیں۔ ہم ان کو سند تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ خود سینوں کی کتب روایات میں بے شمار آیات ایسی آگئیں جو مروجہ نسخہ قرآن مجید سے مختلف ہیں۔ انھیں "اختلاف قرات" کہا جاتا ہے۔ ان کے متعلق وہ صحابہؓ جن کی طرف یہ روایات منسوب ہیں' فرماتے ہیں (جیسا کہ ہم حضرت ابن عباسؓ کے متعلق دیکھ چکے ہیں) کہ یہ آیات دراصل نازل اس طرح ہوئی تھیں' یعنی وہی بات جو شیعہ حضرات کی روایات میں تھی۔ اس کے بعد سینوں کے پاس' شیعہ حضرات کی مخالفت کے لئے کوئی دلیل نہ رہی' اور شیعہ اور سنی دونوں کی کتب روایات کی رو سے ثابت ہو گیا کہ موجودہ قرآن مجید (معاذ اللہ) محرف ہے۔

لیکن سنی حضرات ہیں کہ ہزار برس سے شیعہ حضرات سے جھگڑتے چلے آرہے ہیں کہ آپ لوگ قرآن کو محرف کہتے ہیں حالانکہ قرآن غیر محرف' غیر متبدل' کتاب خداوندی ہے اور اس کے ساتھ ہی "اختلاف قرات" کی روایات کو بھی صحیح مانتے چلے آتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ ان روایات کو صحیح مان کر' تحریف فی القرآن کا ثبوت آپ خود بہم پہنچا رہے ہیں۔

---------- ○ ----------
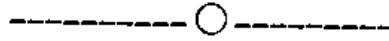
اب آیئے عقیدۂ محدث کی طرف اور اسے غور سے پڑھیے۔

الکافی کی "کتاب الحجۃ" کے ایک باب کا عنوان ہے

نبی و رسول و محدث کا فرق

اس کے نیچے سب سے پہلی روایت یہ درج ہے:۔

زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے **اٰیتہ کان رسولا" نبیا"** کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے۔ فرمایا نبی وہ ہے جو فرشتہ کو خواب میں دیکھتا ہے' اس کی آواز سنتا ہے' لیکن ظاہر بظاہر حالت بیداری میں نہیں دیکھتا اور رسول وہ ہے جو آواز بھی سنتا ہے' خواب میں بھی دیکھتا ہے اور ظاہر میں بھی۔ میں نے پوچھا' امام کی منزلت کیا ہے۔ فرمایا فرشتہ کی آواز سنتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث......

(کتاب الشافی' جلد اول' ص ۲۰۳)

عربی (الکافی) میں (**ولا محدث**) کے نیچے (حاشیہ میں) لکھا ہے:۔

انما ھو فی قراۃ اھل البیت علیھم السلام۔ (جلد اول' ص۱۷۶)

قرات اہل بیت میں اسی طرح آیا ہے

الکافی میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ میں اور میرے صلب میں گیارہ امام محدث ہیں۔ (الشافی' جلد اول' ص۲۸۱)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ محدث کے عقیدہ کا سرچشمہ (ORIGIN) کیا ہے اور قرات کا مفہوم کیا؟

لیکن یہ روایت شیعہ حضرات کی ہے جو سینوں کے نزدیک سند قرار نہیں پا سکتی تھی اس لئے سینوں کے ہاں یہی روایت "قرات ابن عباسؓ" کے لباس میں آگئی۔ چنانچہ مصحف حضرت ابن عباسؓ میں یہ آیت اسی طرح درج ہے۔ یعنی:۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول و لا نبی ولا محدث۔ (۲۲/۵۲)

اور اس کو میرزا صاحب اپنے دعویٰ محدثیت کی تائید میں پیش فرماتے ہیں اور "پیغام صلح" اسے تفسیر قرار دیتا ہے۔

---------- ○ ----------
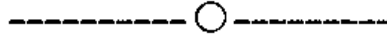
حقیقت یہ ہے کہ:۔

(۱) قرآن کریم جس طرح خدا کی طرف سے حضورؐ پر نازل ہوا' حضورؐ نے اسے محفوظ و مرتب شکل میں امت کو دے دیا۔ یہ مصحف' حضورؐ کی زندگی میں لکھا ہوا' مرتب شکل میں بھی موجود تھا اور ہزاروں' لاکھوں حفاظ کے سینے میں بھی محصور۔

(۲) قرآن کریم کا یہی نسخہ صحابہ کرامؓ کے پاس تھا۔ اس کی نقول عہد خلافت راشدہ میں مختلف ممالک میں بھیجی گئیں۔ یہی قرآن امت کے پاس محفوظ شکل میں اب تک چلا آرہا ہے۔

(۳) کسی کے پاس نہ کوئی اور نسخہ تھا اور نہ کوئی اس بات کا مدعی یا قائل کہ اس کے پاس کچھ آیات ایسی ہیں جو مروجہ قرآن میں اور طرح درج ہیں۔

اس قسم کی تمام روایات جن میں کہا گیا ہے کہ۔ (۱)حضورؐ قرآن کو غیر مرتب شکل میں چھوڑ گئے تھے۔ (۲)اسے بعد میں صحابہؓ نے مرتب کیا۔ (۳)مختلف صحابہؓ بعض آیات کو کسی اور طرح پڑھتے تھے یا۔ (۴)ان کے پاس مختلف مصاحف تھے' سب وضعی ہیں اور قرآن کریم کو محرف ثابت کرنے کی سازش۔

ہمارے علماء ان وضعی روایات کو صحیح مانتے ہیں کہ انہیں اسلاف کی تقلید میں ایسا کرنا پڑتا ہے' لیکن آپ غور کیجئے کہ ایک صاحب (میرزا غلام احمد صاحب) نبی' رسول' یا کم از کم' مامور من اللہ' مجدد' محدث' ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ایک ایسی روایت کو اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کرتے ہیں جو بالبداہت وضعی ہے۔ یہ صورت دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو مرزا صاحب کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ محدث کے نظریہ کا سرچشمہ کونسا ہے اور کس طرح یہ شیعی عقیدہ' وضعی روایات کے راستے سینوں کے ہاں پہنچ گیا اور یا انہوں نے عام مسلمانوں کے تقلیدی عقیدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے' دانستہ ایسا کیا۔ دونوں صورتوں میں جو نتیجہ سامنے آتا ہے' ظاہر ہے۔

اس کے بعد میرا سوال جو پہلے اٹھایا گیا تھا' بدستور قائم رہتا ہے۔ یعنی:۔

(ا) میرزا صاحب نے کہا ہے کہ ابن عباسؓ کی قرات میں آیت (۲۲/۵۲) لفظ "محدث" کے اضافہ کے ساتھ آئی ہے۔

(۲) طبری کی تفسیر سے واضح ہے کہ خود حضرت ابن عباسؓ نے اس امر کی تشریح کر دی تھی کہ ان کی "قرات" سے مراد یہ ہے کہ متعلقہ آیات دراصل یوں نازل ہوئی تھیں۔

(۳) اس سے واضح ہے کہ خود مرزا صاحب یہ مانتے تھے کہ یہ آیت لفظ محدث کے اضافہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی اور مروجہ نسخہ قرآن میں اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا' وہ قرآن میں تحریف کے قائل تھے۔ یہ کہہ کر ان کی مدافعت کرنا کہ اختلاف قرات سے مراد تفسیر و تعبیر ہے' خود فریبی ہے یا مغالطہ آفرینی کی ناکام کوشش۔
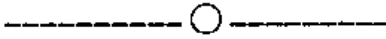
"پیغام صلح" نے مرزا صاحب کے غلط مسلک کی مدافعت میں جس طرح پیچ و تاب کھائے ہیں' اس قسم کے واقعات سے یہ حقیقت اور بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ختم نبوت کا اعلان کس طرح خدا کی رحمت ہے۔ اس عقیدہ کا عملی مفہوم یہ ہے کہ حضورؐ نبی اکرم کے بعد کوئی شخصیت ایسی نہیں ہو سکتی جسے ہم منزہ عن الخطاء سمجھنے کے لئے مکلف ہوں۔ ختم نبوت پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک میرزا صاحب ایک عام انسان تھے۔ اس لئے ان کی فکر میں اسقام اور پیش کردہ تعلیم میں غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب انہیں مامور من اللہ ملہم ربانی تسلیم کر لیا جائے تو پھر انہیں منزہ عن الخطاء ماننا پڑتا ہے اور ایسا ماننے والوں پر' ہر معاملہ میں ان کی مدافعت عقیدۃً ضروری قرار پا جاتی ہے۔ اب سوچئے کہ جس شخص کو کسی کی ناقابل مدافعت (غلط) بات کی مدافعت کرنی پڑے تو (اگر اسے اپنی اس مجبوری کا احساس ہے تو) وہ کس قدر ذہنی کوفت اور قلبی اذیت میں مبتلا رہے گا۔ اور اگر (شدت عقیدت کی بنا پر) اسے اس کا احساس ہی نہیں' تو اس سے کس قدر مضحکہ انگیز حرکات سرزد ہونگی۔ یہی کیفیت میرزا صاحب کے اغلاط و اسقام کی مدافعت میں انکے متبعین کی ہوتی ہے' جیسا کہ زیر نظر بحث سے واضح ہے۔ (پرویز)

(مارچ ۱۹۷۴ء)

۱۱۔ جمع و تدوین قرآن مجید (روایات کی روشنی میں)

"اختلاف قرات" سے متعلق وہ مقالہ جو سابقہ صفحات میں درج کیا جا چکا ہے' شائع ہوا تو چاروں طرف سے اس قسم کے استفسارات موصول ہونے شروع ہو گئے کہ قرآن مجید کی جمع و تدوین کے متعلق جو کچھ روایات میں آیا ہے' اسے بھی تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ ان کے جواب میں حسب ذیل مقالہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ یہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے تاکہ آپ کو معلوم ہو

جائے کہ وضعی روایات کے ذریعے اسلام کے خلاف کتنی گہری اور خطرناک سازش ہوئی ہے۔ اس قسم کی ہیں وہ روایات جن کو صحیح ماننے سے طلوع اسلام کو "منکر حدیث" قرار دیا جاتا ہے۔

عجمی سازشوں نے جہاں حقیقی اسلام کی جگہ ایک بالکل نیا اسلام وضع کر کے مسلمانوں میں عام کر دیا' اس کے ساتھ ہی انہوں نے چپکے ہی چپکے ایسی کوششیں بھی کیں جن سے یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ قرآن بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں رہا۔ یہ اس سازش کا اتنا بڑا حربہ تھا جس نے فی الواقع دین کی عمارت کو متزلزل کر دیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے قرآن کی جمع و تدوین کے متعلق عجیب و غریب داستانیں وضع کیں اور انہیں احادیث کے مجموعوں میں بھر دیا۔ اس ضمن میں حافظ ابو بکر عبد اللہ ابن ابی داؤد سلیمان ابن اشعث بجستانی کی شہرۂ آفاق کتاب "کتاب المصاحف" (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس میں قرآن کریم سے متعلق ان تمام روایات کو یک جا جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ روایتیں اکثر صحاح ستہ اور دوسری مستند کتب روایات میں منتشر طور پر موجود ہیں۔

کتاب المصاحف۔ یہ کتاب ابو بکر عبد اللہ بن ابی داؤد کی تصنیف ہے جن کا سنہ پیدائش ۲۳۰ھ اور سنہ وفات ۳۱۶ھ ہے۔ آپ حدیث کے مشہور امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث بجستانی (جن کی کتاب سنن ابو داؤد صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے) کے بیٹے ہیں۔ آپ کی کتاب المصاحف علمائے حدیث کے ہاں بہت مستند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر متقدمین کی کتابوں میں اس کتاب کے حوالے ملتے ہیں۔ امام ابن الجرزیؒ نے ان کو ثقہ' کبیر' مامون کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

مصنف کے اس مختصر تعارف کے بعد ہم آپ کو کتاب المصاحف کے جستہ جستہ مقامات سے روشناس کراتے ہیں۔ سنتے جایئے اور سر دھنتے جایئے۔

قرآن کو حضورؐ نے جمع نہیں کیا بلکہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جمع کرایا

(۱) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت زید بن ثابتؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہل یمامہ کا قتل ہوا' حضرت ابو بکرؓ نے مجھے آدمی بھیج کر بلایا۔ وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ ابو بکرؓ کہنے لگے کہ یہ (عمرؓ) میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہو گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے۔ میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کر لو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو۔ عمرؓ نے کہا بخدا یہ کام اچھا ہی ہے اور اس بارہ میں مجھ سے برابر کہتے رہے' حتیٰ کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرح صدر کر دیا تھا میرا بھی شرح صدر کر دیا اور میری رائے بھی وہی ہو گئی جو ان کی تھی۔ ابو بکرؓ مجھ سے کہنے لگے تم نوجوان اور عقل مند آدمی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وحی لکھتے رہے ہو۔ ہم تمہیں متہم نہیں سمجھتے' لہٰذا تم قرآن کو لکھ لو۔ زیدؓ بن ثابت

کہتے ہیں کہ بخدا اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسولؐ اللہ نے نہیں کیا وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے۔ چنانچہ ابو بکرؓ اور عمرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے' حتی کہ جس امر کے لئے ان دونوں کو شرح صدر ہو چکا تھا مجھے بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی میری رائے بھی ہو گئی جو ان دونوں کی رائے تھی۔ چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے کاغذ کے ٹکڑوں' کھجور کے پٹھوں' پتھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں (حافظوں) سے تلاش کرنا شروع کیا۔ حتی کہ ایک آیت جو میں حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا مجھے نہیں ملی' یعنی **لقد جاء کم رسول من انفسکم** (الآیہ) چنانچہ میں نے اس کو ڈھونڈا۔ بالآخر' خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اس کو اس کی سورۃ میں لکھ دیا۔

صدیق اکبرؓ کے زمانے میں قرآن کیونکر جمع کیا گیا۔

(۲) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عروہ بن زبیر سے نقل کرتے ہیں کہ جب بہت سے قاری قتل ہو گئے تو ابو بکرؓ کو یہ خوف ہوا کہ اس طرح تو قرآن ہی ضائع ہو جائے گا۔ آخر انہوں نے عمرؓ اور زیدؓ ابن ثابت سے کہا کہ مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو شخص کتاب اللہ کے متعلق کسی چیز پر دو گواہ پیش کر دے اس کو قرآن میں لکھ لو۔

(۳) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبد خیر سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو کہتے ہوئے سنا کہ مصاحف کے بارہ میں سب سے بڑا ثواب ابو بکرؓ کو ملے گا۔ خدا ابو بکرؓ پر رحم فرمائے۔ وہی پہلے شخص ہیں جس نے قرآن کو لوحین کے درمیان جمع کر دیا۔

قرآن صدیق اکبرؓ نے خود جمع کیا اور حضرت زیدؓ نے نظر ثانی فرمائی

(۴) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ سالم اور خارجہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابو بکر صدیقؓ نے قرآن کو کاغذات میں جمع تو کر لیا تھا مگر زید بن ثابتؓ سے درخواست کی تھی کہ ان کو ایک نظر دیکھ لیں۔ زید بن ثابتؓ نے اس سے انکار کر دیا' حتی کہ انہوں نے عمرؓ سے مدد چاہی کہ وہ زید بن ثابتؓ کو راضی کرادیں۔ چنانچہ عمرؓ نے انہیں راضی کرا دیا اور نظر ثانی کر دی۔ یہ کتابیں ابو بکرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہیں۔ پھر عمرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہیں۔ پھر حضرت حفصہؓ اہلیہ رسول اللہ صلعم کے پاس رہیں۔ حضرت عثمانؓ نے انہیں منگایا تو حفصہؓ نے ان کو دینے سے انکار کر دیا' حتی کہ عثمانؓ سے عہد لیا کہ وہ انہیں واپس کر دیں گے اور اس شرط کے ساتھ بھیج دیں۔ چنانچہ عثمانؓ نے ان کو صحفوں میں لکھ کر حفصہؓ کو وہ کتابیں واپس کر دیں اور وہ ان ہی کے پاس رہیں حتی کہ مروان نے اپنے زمانے میں انہیں لے کر جلا دیا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسے اہم واقعہ کے متعلق ایک بیان دوسرے سے کس طرح ٹکراتا جا رہا ہے۔ لیکن

بایں ہمہ' یہاں تک یہ کہا گیا ہے کہ قرآن رسول اللہؐ نے مرتب کر کے نہیں دیا تھا بلکہ حضرت ابو بکرؓ صدیق کے عہد میں مرتب ہوا تھا۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھئے:۔

جمع قرآن کا کام صدیق اکبرؓ نے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے شروع کیا اور عثمانؓ نے تکمیل کی۔

(۵) امام ابن ابی داوٗد اپنی سند کے ساتھ یحیٰی بن عبد الرحمٰن بن حاطب سے نقل کرتے ہیں کہ عمر ابن الخطابؓ نے قرآن کو جمع کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لئے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ جس شخص نے رسولؐ اللہ سے کچھ بھی قرآن حاصل کیا ہو اسے ہمارے پاس لے آئے۔ لوگوں نے قرآن کو کاغذات پر' لکڑی کی تختیوں پر اور کھجور کے پتھوں پر لکھ رکھا تھا۔ اور عمرؓ کسی شخص سے کوئی چیز اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ گواہی نہ دیں۔ اسی اثناء میں عمرؓ شہید ہو گئے تو عثمان ابن عفانؓ کھڑے ہوئے اور انہیں نے لوگوں سے کہا کہ جس کے پاس کتاب اللہ کا کچھ حصہ ہو وہ ہمارے پاس لے آئے اور یہ بھی اس وقت تک کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ گواہی نہ دے دیں۔ چنانچہ خزیمہ ابن ثابت آئے اور کہنے لگے کہ میں دیکھ رہا ہوں تم نے دو آیتیں لکھنے سے چھوڑ دی ہیں۔ پوچھا گیا وہ کون سی دو آیتیں ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم سے یہ دو آیتیں حاصل کی تھیں "**لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم** (۹/۱۲۸) آخر سورت تک"۔ اس پر عثمانؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ دونوں آیتیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ پھر عثمانؓ نے خزیمہؓ سے پوچھا "بتاؤ ان آیتوں کو کہاں رکھیں"۔ خزیمہؓ نے جواب دیا کہ قرآن کی جو سورت سب سے آخر میں نازل ہوئی ہو' اسے ان آیتوں ہی سے ختم کر دو۔ چنانچہ سورہء براۃ کو ان ہی آیتوں سے ختم کر دیا گیا۔

لیجئے! اب بات یہاں تک پہنچا دی گئی کہ قرآن کو نہ تو رسولؐ اللہ نے مرتب فرمایا نہ ہی یہ عہد صدیقی میں مرتب ہوا۔ اس کی ابتداء حضرت عمرؓ نے کی اور وہ بھی اسے ادھورا چھوڑ کر شہید ہو گئے۔ اب آگے بڑھئے!

عہد عثمانی میں قرآن میں اختلافات

(۶) امام ابن ابی داوٗد اپنی سند کے ساتھ یزید بن معاویہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں ولید بن عقبہ کے زمانے میں مسجد میں اس حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا جس میں حضرت حذیفہؓ (مشہور صحابی) بھی تشریف فرما تھے۔ مسجد میں اس وقت روکنے والے اور پولیس کے سپاہی وغیرہ موجود نہ تھے کہ یکایک کسی پکارنے والے نے پکار کر اعلان کیا جو شخص ابو موسیٰ (اشعریؓ) کی قرات پر قرآن پڑھتا ہو وہ اس گوشہ کی طرف آجائے جو ابواب کندہ کے پاس ہے اور جو شخص عبد اللہ بن مسعودؓ کی قرات پر قرآن پڑھتا ہو وہ اس گوشہ کی طرف آجائے جو عبد اللہ کے گھر کی طرف ہے۔۔۔ اور وہاں دو آدمیوں میں سورہ بقرہ کی ایک آیت کے بارہ میں اختلاف ہوا تھا۔ ایک پڑھتا تھا "**واتموا الحج**

والعمرة للبیت" اور دوسرا پڑھتا تھا "**واتموا الحج والعمرة للہ**" (۲/۱۹۶)۔ حضرت حذیفہؓ کو غصہ آگیا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ انہوں نے فوراً" اپنے کرتہ کو سمیٹ کر بغل میں کیا اور مسجد میں ہی کھڑے ہو گئے (یہ واقعہ حضرت عثمان کے زمانہ کا ہے) اور فرمانے لگے یا تو امیرالمومنین میرے پاس آئیں یا میں امیرالمومنین کے پاس جاؤں (تو میں اس کے متعلق اس سے کہوں) کیونکہ تم سے پہلی امتوں نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے خدا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے مومنین کو ساتھ لے کر منکرین سے قتال کیا' حتیٰ کہ خدا نے اپنے دین کو غالب کر دیا۔ پھر خدا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا تو لوگوں نے بے لگام گھوڑے کی طرح ہر طرف دوڑ لگانی شروع کر دی۔ پھر خدا نے عمرؓ کو خلیفہ بنایا تو وہ اسلام کے عین وسط میں اترے (اور اس کو اعتدال پر قائم کرنا چاہا)۔ پھر خدا نے ان کو بھی اٹھا لیا تو لوگوں نے پھر منہ زور گھوڑے کی طرح ہر طرف جادہ پیائی شروع کر دی۔ اس کے بعد خدا نے عثمانؓ کو خلیفہ بنایا اور اللہ کی قسم وہ وقت قریب ہے کہ لوگ اسلام میں وہ جادہ پیائی کریں جو اپنی تمام پچھلی جادہ پیائیوں کو پیچھے چھوڑ جائے۔

زید بن ثابتؓ کے انتخاب پر عبداللہ بن مسعودؓ کی ناگواری

(۷) امام ابو داؤد اپنی سند کے ساتھ ابراہیم نخعی سے نقل کرتے ہیں کہ جب (عثمانؓ نے اپنے مرتب کردہ قرآن کے علاوہ) باقی تمام مصاحف کو پھاڑ ڈالنے کا حکم دیا تو عبداللہ ابن مسعود نے کہا' "لوگو! اپنے قرآنوں کو چھپالو کیونکہ جو شخص کچھ چھپا کر رکھے گا قیامت کے روز اسے اپنے ساتھ لے کر آئے گا اور بہترین چھپانے کی چیز قرآن ہی ہے جسے تم میں سے کوئی قیامت کے روز اپنے ساتھ لے کر آئے"۔

(۸) نیز امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبید اللہ بن عتبہ سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے زید ابن ثابتؓ کے لئے قرآن لکھنے کو ناپسند کیا اور کہنے لگے' اے مسلمانوں کی جماعت! مجھے تو قرآن لکھنے کے کام سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے اور اس کی ذمہ داری ایک ایسے شخص نے لی ہے کہ بخدا میں اسلام لایا تو وہ ابھی اپنے کافر باپ کی صلب میں موجود تھا (یعنی پیدا بھی نہیں ہوا تھا)۔

غور فرمایا آپ نے کہ جمع قرآن کی مزعومہ کوششوں کے سلسلہ میں صحابہؓ کا رد عمل کیا بتایا جا رہا ہے اور ان کے باہمی تعلقات کو کس رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۹) نیز امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ زر بن جیش سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا' "میں نے حضورؐ کے دہن مبارک سے ستر (۷۰) سے اوپر سورتیں پڑھی ہیں اور زید بن ثابتؓ ابھی بچہ تھے جن کے سر پر دو زلفیں لہراتی رہا کرتی تھیں۔ نیز شقیق سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے کہا' "**من یغلل یات بما غل یوم القیمتہ**" عثمانؓ مجھے کس کی قرات پر قرآن پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ستر سے اوپر سورتیں پڑھی ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جانتے ہیں کہ میں

ان میں کتاب اللہ کا سب سے بڑا جاننے والا ہوں اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کو جانتا ہے تو میں سفر کر کے بھی اس کے پاس جاتا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن

(۱۰) نیز امام ابن ابی داؤد ابن شہاب زہری کی اسی روایت کو نقل کرنے کے بعد جو نمبرا میں گزر چکی ہے' ابن شہاب زہری ہی کی روایت سے انس ابن مالکؓ انصاری سے یہ اضافہ نقل کرتے ہیں کہ آذر بائیجان اور آرمینیہ کے غزوہ میں اہل شام اور اہل عراق جمع ہوئے اور آپس میں انہوں نے ایک دوسرے کو قرآن سنایا تو اس میں بڑا اختلاف ہوا اور قریب ہو گیا کہ ان میں کوئی فتنہ برپا ہو جائے۔ جب حذیفہ ابن الیمان نے قرآن کے بارہ میں ان کے یہ اختلافات دیکھے تو وہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور کہا لوگ قرآن کے بارہ میں بڑا اختلاف کر رہے ہیں' حتی کہ بخدا مجھے یہ اندیشہ ہو رہا ہے کہ وہ بھی اسی اختلاف میں مبتلا نہ ہو جائیں جس میں یہود اور نصاریٰ مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ بہت گھبرائے اور انہوں نے حضرت حفصہؓ کے پاس آدمی بھیج کر وہ صحیفہ نکلوایا جو ابو بکرؓ کے حکم سے زید بن ثابت نے جمع کیا تھا اور اس سے کئی مصحف لکھوائے اور ان کو ملک کے گوشوں میں بھیج دیا۔ جب مروان مدینہ کا امیر ہوا تو اس نے حضرت حفصہؓ کے پاس آدمی بھیج کر وہ صحیفے منگائے تاکہ انہیں جلا دے۔

مروان نے حضرت حفصہؓ کے صحیفے جلا دیئے

اسے یہ اندیشہ تھا کہ لکھنے والے ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرنے لگیں مگر حضرت حفصہؓ نے انکار کر دیا۔ ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے سالم بن عبد اللہ نے بیان کیا کہ جب حضرت حفصہؓ کا انتقال ہوا تو مروان نے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کے پاس سختی کے ساتھ کہلا کر بھیجا کہ ان صحیفوں کو اس کے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ جوں ہی لوگ حضرت حفصہؓ کے جنازہ سے فارغ ہو کر لوٹے' عبد اللہ ابن عمرؓ نے وہ صحیفے مروان کے پاس بھیج دیئے۔ مروان نے ان کو الگ الگ کر کے جلا دیا اس اندیشہ سے کہ ان صحیفوں میں کوئی چیز اس کے خلاف نہ ہو جو حضرت عثمانؓ نے لکھا تھا۔

عہد عثمانؓ میں قرآن کیسے جمع کیا گیا۔

(۱۱) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ ایوب سے اور وہ ابو قلابہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ایک معلم کسی شخص کی قرات کے مطابق تعلیم دیتا تھا اور دوسرا معلم دوسرے شخص کی قرات کے مطابق۔ بچے قرآن پڑھتے اور آپس میں اختلافات کرتے حتی کہ یہ اختلافات معلمین تک بلند ہو گئے اور لوگوں نے ایک دوسرے کی قرات پر تکفیر شروع کر دی۔ حضرت عثمانؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے خطبہ دیا اور کہا' "تم لوگ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی قرآن میں اختلاف کرتے ہو اور دوسروں کی تغلیط کرتے ہو۔ جو لوگ دوسرے

شہروں میں مجھ سے دور ہیں ان کی غلطیاں اور اختلافات تو اور بھی سخت ہیں- اے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اتفاق سے کام لو اور تم لوگوں کے لئے ایک (متفقہ) امام (کتاب اللہ) لکھ دو- ابو قلابہ کہتے ہیں کہ مجھ سے مالک بن انسؓ نے بیان کیا (یہ امام مالک بن انس کے داد ہیں) کہ میں ان لوگوں میں شریک تھا جنھوں نے ان کو قرآن لکھوایا- اکثر کسی آیت کے بارہ میں اختلاف ہوتا تھا اور کوئی ایسا آدمی یاد آجاتا تھا جس نے اس آیت کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا اور بعض مرتبہ وہ شخص موجود نہیں ہوتا تھا یا کسی دیہات میں ہوتا تھا تو اس سے آگے اور پیچھے کی آیتیں لکھ لیتے تھے اور اس آیت کی جگہ چھوڑ دیتے تھے' حتیٰ کہ وہ شخص خود آجاتا یا اس کو بلوا لیا جاتا تھا (اور اس سے پوچھ کر وہ آیت لکھ لی جاتی تھی)-جب مصحف لکھنے سے فراغت ہو گئی تو حضرت عثمانؓ نے تمام شہروں میں لکھ دیا کہ میں نے ایسا ایسا کام کیا ہے اور جو کچھ میرے پاس تھا میں نے اس کو مٹا دیا ہے- لہٰذا' جو کچھ (اس قرآن کے خلاف) تمہارے پاس ہو تم بھی اس کو مٹا دو-

(۱۲) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ مصعب ابن سعد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے جدا ہوئے ابھی تیرہ سال ہی گزرے ہیں مگر تم قرآن میں شک کرنے لگے ہو- کہتے ہو کہ یہ ابی (بن کعبؓ) کی قرات ہے اور وہ عبد اللہ (بن مسعودؓ) کی قرات ہے- خدا کی قسم! تو اپنی قرات ٹھیک نہیں پڑھتا- لہٰذا' میں تم میں سے ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس کے پاس بھی کتاب اللہ میں سے کوئی چیز ہو وہ بالضرور اسے میرے پاس لے آئے- چنانچہ کوئی کاغذ کا ورق لے کر آتا' کوئی چمڑے کا ٹکڑا لے کر آتا جس میں قرآن لکھا ہوا ہوتا-حتیٰ کہ اس طرح بہت کچھ جمع ہو گیا- پھر حضرت عثمانؓ اندر گئے اور ایک ایک آدمی کو بلا بلا کر قسم دے دے کر انہوں نے پوچھنا شروع کیا کہ کیا تم نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے- کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں یہ کچھ لکھوایا تھا؟ وہ شخص اقرار کرتا- حضرت عثمانؓ اس سے فارغ ہو گئے تو لوگوں سے پوچھا تم میں سے بہترین کاتب کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب زید بن ثابتؓ- پھر انہوں نے پوچھا تم میں لغت عربی کا بہترین ماہر کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ سعید بن العاصؓ- حضرت عثمانؓ نے کہا ٹھیک ہے سعید لکھوائیں اور زید لکھتے جائیں- چنانچہ زید ابن ثابتؓ نے قرآن لکھا اور کئی قرآن لکھے اور ان قرآنوں کو عثمانؓ نے لوگوں میں پھیلا دیا- ابو قلابہ کہتے ہیں کہ میں نے بعض اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ عثمانؓ نے بہت اچھا کام کیا-

(۱۳) امام ابن ابی داؤد اپنی دوسری سند سے مصعب ابن سعد ہی سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ابی (ابن کعبؓ) اور عبداللہ (بن مسعودؓ) اور معاذ (ابن جبلؓ) کی قرات کو سنا تو لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا' ابھی تمہارے نبیؐ کی وفات کو پندرہ سال ہوئے ہیں اور تم قرآن میں اختلاف کرنے لگے ہو- میں ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس کے پاس بھی قرآن میں سے کچھ ہو جسے اس نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو' اسے میرے پاس لے آئے- چنانچہ لوگ لکڑی کی تختیاں' ہڈی کے ٹکڑے' کھجور کی چھالیں جن میں قرآن لکھا ہوا تھا' لانے لگے-

جو شخص لے کر آتا اس سے حضرت عثمانؓ پوچھ لیتے کہ کیا اس نے یہ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ تم میں فصیح ترین شخص کون ہے؟ لوگوں نے سعید بن العاصؓ کا نام لیا۔ پھر پوچھا کہ بہترین ماہر کتابت کون ہے؟ لوگوں نے زید بن ثابتؓ کا نام لیا۔ آپ نے فرمایا اچھا زید لکھیں اور سعید لکھوائیں۔ چنانچہ کئی مصحف لکھے گئے اور ان کو مختلف شہروں میں تقسیم کردیا گیا۔ مصعب بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جس نے عثمانؓ کے اس فعل پر عیب چینی کی ہو۔

(۱۴) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ محمد (ابن ابیؒ) سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ قرآن پڑھتے تھے اور نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہتا تھا کہ جو کچھ تو پڑھتا ہے اس سے تو کافر ہوگیا۔ اس کی اطلاع عثمان بن عفانؓ کو کی گئی تو ان کے دل پر بڑی گرانی ہوئی اور انہوں نے قریش اور انصار کے بارہ آدمیوں کو جمع کیا جن میں ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ بھی تھے اور ان سب کو اس صحن میں اکٹھا کردیا جو حضرت عمرؓ کے مکان میں تھا۔ اسی مکان میں قرآن رہتا تھا۔ حضرت عثمانؓ بھی ان لوگوں کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ محمد (ابن ابیؒ) کہتے ہیں کہ مجھ سے کثیر ابن افلح نے بیان کیا جو ان لوگوں کے لئے قرآن لکھنے والوں میں سے ایک تھے کہ اکثر ان بارہ آدمیوں میں اختلاف ہوجاتا تھا تو اس اختلافی آیت کو وہ موخر کردیا کرتے تھے' محمد کہتے ہیں کہ میں نے کثیر سے پوچھا کہ تم لوگ اس کو موخر کیوں کردیا کرتے تھے۔ تو انہوں نے بتایا کہ یہ مجھے معلوم نہیں۔ محمد کہتے ہیں کہ میں نے اس بارہ میں ایک گمان بنایا ہے' تم لوگ اسے یقین نہ بنا لینا۔ میرا گمان یہ ہے کہ جب ان میں کسی آیت کے متعلق اختلاف ہوتا تھا تو وہ اسے اس لئے موخر کردیتے تھے کہ دیکھیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو حضورؐ کے ساتھ آپ کے آخری دور میں شریک رہا ہو تو اس آیت کو اس کے قول کے مطابق لکھ لیں۔

قرآن کی ترتیب حضرت عثمانؓ نے قائم کی تھی

(۱۵) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے عثمانؓ سے کہا کہ تم نے سورۂ انفال کو جو مثانی میں سے ہے' سورہ برات کے ساتھ کیوں رکھ دیا حالانکہ وہ مئین میں سے ہے اور پھر ان دونوں کو سبع طوال میں رکھ دیا ہے۔ ایسا تم نے کیوں کیا؟ عثمانؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف زمانوں میں مختلف عدد والی سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں۔ جب آپ پر کچھ وحی نازل ہوتی تو کسی کاتب کو آپ بلا کر فرما دیتے کہ اس آیت کو ایسی ایسی سورت میں رکھ دو جس میں ایسا ایسا تذکرہ آیا ہے۔ سورۂ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو ابتداً مدینہ میں نازل ہوئیں اور سورۂ برات بالکل آخر میں نازل ہوئی ہے مگر دونوں کا قصہ ایک سا ہے۔ مجھے خیال گزرا کہ سورۂ برات سورۂ انفال ہی کا حصہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا اور ہمیں آپ نے یہ بتایا نہیں کہ آیا واقعی یہ اسی کا حصہ ہے بھی یا نہیں۔ اسی وجہ سے میں نے دونوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر نہیں لکھی اور دونوں کو سبع طوال میں رکھ دیا۔

یہاں تک یہ کہا گیا ہے کہ قرآن حضرت عثمانؓ کے عہد میں مرتب ہوا۔ لیکن یہ قرآن کس قسم کا تھا اس کی بابت بھی سن لیجئے۔

قرآن میں غلطیاں رہ گئیں

(۱۶) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر قرشی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ مصحف سے فارغ ہوگئے اور انہوں نے اسے دیکھا تو فرمایا تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا مگر اس میں کچھ غلطیاں مجھے نظر آتی ہیں جنہیں عرب لوگ اپنی زبانوں سے ٹھیک کرلیں گے۔

لیجئے! قرآن عہد عثمانی میں مرتب تو ہوا لیکن اس میں بھی غلطیاں رہ گئیں۔ ان غلطیوں کو حضرت عثمانؓ نے درست نہیں کیا بلکہ علی حالہ رہنے دیا کہ عرب خود اپنی زبان سے درست کرلیں گے۔ اور آگے بڑھئے۔

(۱۷) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عکرمہ طائی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ کے پاس مصحف لایا گیا تو اس میں انہیں کچھ غلطیاں نظر آئیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگر لکھنے والا بنو ہذیل کا اور لکھانے والا بنو ثقیف کا کوئی آدمی ہوتا تو اس میں یہ غلطیاں نہ پائی جاتیں۔

(۱۸) سعید ابن جبیر سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا قرآن میں چار حرف غلط ہیں۔ (۱) **الصٰبئون** (۵/۶۹) (۲) **والمقیمین** (۴/۱۶۲) (۳) **فاصدق واکن من الصلحین** (۶۳/۱۰) اور (۴) **ان هذان لساحران** (۲۰/۶۳)

(۱۹) زبیر ابو خالد کہتے ہیں کہ میں نے ابان بن عثمان سے پوچھا کہ آیت۔۔۔**الراسخون فی العلم منهم والموسنون یوسنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک والمقیمین الصلوة والموتون الزکوة** الآیۃ کیسے ہوگیا۔ آگے اور پیچھے رفع لایا گیا ہے اور **المقیمین** پر نصب ہے۔ ابان نے جواب دیا کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ پچھلا حصہ لکھا چکا تھا' اس نے پوچھا آگے کیا لکھوں۔ لکھوانے والے نے کہا کہ **المقیمین الصلوة** لکھو۔ اس سے جو کچھ کہا گیا لکھ دیا۔

(۲۰) عروہ کہتے ہیں کہ قرآن کی غلطیوں کے متعلق میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا **ان هذان لساحران** اور **والمقیمین الصلوة والموتون الزکوة** اور **والذین هادوا والصٰبئون** کے متعلق سوال تھا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا' "بھتیجے! یہ کاتبوں کا کام ہے کہ انہوں نے لکھنے میں غلطی کر ڈالی۔

صرف غلطیاں ہی نہیں رہ گئی تھیں بلکہ بعض آیات بھی قرآن میں درج ہونے سے رہ گئی تھیں۔ (مثلاً") ہمارے ہاں مشہور ہے کہ شادی شدہ زانی کی سزا سنگسار ہے لیکن قرآن کریم میں ایسی کوئی آیت نہیں۔ اس ضمن میں' سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے) حضرت عائشہؓ کی طرف یہ روایت منسوب ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ آیہ رجم (سنگسار) اور رضاعت کبیر والی آیت ایک صحیفہ میں تھی جو میرے تخت کے نیچے رکھا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہوگئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو

بکری آگئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی (اور وہ آیتیں ضائع ہوگئیں)- چنانچہ اس کے بعد فیصلہ یہ کیا گیا کہ یہ آیت قرآن میں تو داخل نہ کی جائے لیکن عمل اس کے مطابق ہو-

اس کے بعد کتاب المصاحف میں ہے کہ جو نسخہ حضرت عثمانؓ نے مرتب فرمایا تھا اس میں اور مدینہ منورہ کے دیگر مصاحف میں کئی ایک آیات میں اختلاف تھا- اس کتاب میں اس قسم کے تمام اختلافی مقامات درج ہیں- نیز یہ کہ قرآن مجید کے جو نسخے مختلف شہروں کے لئے مرتب کئے گئے تھے ان میں بھی باہم گر اختلاف تھا- ان اختلافات کو بھی اس کتاب میں تفصیل سے دیا گیا ہے-

اختلاف قرات

ازاں بعد، امام ابن ابی داؤد نے اپنی کتاب نیز اس کے انگریزی ترجمہ میں (جسے مشہور مستشرق آرتھر جیفری نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے) ان قرآنی نسخوں کی تفصیل دی ہے جو عہد حضرت عثمانؓ اور ان کے بعد مختلف صحابہؓ اور تابعینؒ کے پاس تھے اور جن میں بے شمار آیات ایسی تھیں جو مصحف عثمانؓ میں درج شدہ آیات سے مختلف تھیں- ان کی تفصیل سابقہ صفحات میں دی جاچکی ہے-

سابقہ صفحات میں "اختلاف قرات" کے متعلق بھی تفصیل سے لکھا جاچکا ہے- اس ضمن میں ایک مثال کا اضافہ کیا جاتا ہے-

یہ سب کو معلوم ہے کہ سنی حضرات وضو میں پاؤں دھوتے ہیں اور شیعہ حضرات پاؤں پر مسح کرتے ہیں- ایک صاحب نے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے دریافت کیا کہ ان میں سے کون سا طریق قرآن کے مطابق ہے- مودودی صاحب نے اس کے جواب میں (جو ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا) پہلے قرآن کریم کی متعلقہ آیت درج کی جو حسب ذیل ہے-

ایایھا الذین امنوا اذا قمتم الی الصلوۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا بروسکم وارجلکم الی الکعبین (۵/۶)

اس کے بعد تحریر فرمایا

"اس میں لفظ **وارجلکم** کی دو قراتیں متواتر ہیں- نافع، ابن عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قرات **وارجلکم** (بفتح لام) ہے، اور ابن کثیر، حمزہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرات **وارجلکم** (بکسر لام)- ان میں سے کسی قرات کی حیثیت بھی یہ نہیں ہے کہ بعد میں کسی وقت بیٹھ کر نحویوں نے اپنے اپنے فہم اور منشاء کے مطابق الفاظ قرآنی پر خود اعراب لگا دیئے ہوں، بلکہ یہ دونوں قراتیں متواتر طریقے سے منقول ہوئی ہیں- اب اگر پہلی قرات اختیار کی جائے تو **وارجلکم** کا تعلق **فاغسلوا** کے حکم سے جڑتا ہے

اور معنی یہ ہوجاتے ہیں "اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک"۔ اور اگر دوسری قرات قبول کی جائے تو اس کا تعلق **وامسحوا برء وسکم** سے قائم ہوتا ہے اور معنی یہ نکلتے ہیں "اور مسح کرد اپنے پاؤں پر ٹخنوں تک"۔

یہ صریح اختلاف ہے جو ان دو معروف و مشہور اور متواتر قراتوں کی وجہ سے آیت کے معنی میں واقع ہوجاتا ہے۔ اس تعارض کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں قراتوں کو کسی ایک ہی مفہوم (غسل یا مسح) پر محمول کیا جائے لیکن اس کی جتنی کوششیں بھی کی گئیں وہ ہمیں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچاتیں کیونکہ جتنے وزنی دلائل کے ساتھ ان کو غسل پر محمول کیا جاسکتا ہے قریب قریب اتنے ہی وزنی دلائل مسح پر محمول کرنے کے حق میں بھی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محض قواعد زبان کی بنا پر ان میں سے کسی ایک معنے کو ترجیح دی جائے لیکن یہ صورت بھی مفید مطلب نہیں کیونکہ دلائل ترجیح دونوں پہلوؤں میں قریب قریب برابر ہیں۔ اب آخر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عمل کو دیکھا جائے"۔

اور اس کے بعد لکھا:۔

قرآن کے الفاظ سے جو بات واضح نہ ہوتی ہو اسے سمجھنے کے لئے اس ذریعہ سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کون سا ہوسکتا ہے۔

قطع نظر اس کے کہ شیعہ حضرات اسی "معتبر ذریعہ" کی رو سے پاؤں پر مسح کرتے ہیں اور سنی حضرات کا دعویٰ ہے کہ وہ بھی اسی "معتبر ذریعہ" کی رو سے پاؤں دھوتے ہیں' مودودی صاحب کے ارشاد ہے کہ قرآنی آیت کی دونوں قراتیں متواتر ہیں اور ایسی مستند کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) قرآن کریم کی یہ آیت **ارجلکم** میں ل کے زبر کے ساتھ بھی نازل ہوئی تھی اور زیر کے ساتھ بھی اور دونوں کا یہ اختلاف اس قدر اہم ہے کہ ایک قرات کی رو سے پاؤں دھونے کا حکم ملتا ہے اور دوسری قرات کی رو سے پاؤں پر مسح کرنے کا اور اس طرح قرآن کے الفاظ سے بات واضح نہیں ہوتی"۔

آپ سوچئے کہ اس کے بعد' قرآن مجید کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے اور ہم جو دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پورے حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ایک حرف اور نقطہ کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا' اس دعویٰ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے"۔ قرآن کے الفاظ سے بات اسی لئے حل نہیں ہوتی کہ آپ زبر کے ساتھ ل کو بھی منزل من اللہ مانتے ہیں اور زیر کے ساتھ بھی منزل من اللہ ---- اور اس کے بعد سوچئے کہ ایسی کتاب نازل کرنے والے (خدا) کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور قائم ہوتا ہے جو متضاد احکام نازل کردیتا ہے؟ اور اگر خدا نے اس آیت کو

ایک ہی شکل میں نازل کیا تھا۔۔۔ یعنی ل کے زیر یا زبر کے ساتھ۔۔۔۔ تو اگلی صورت یہی سامنے آتی ہے کہ رسولؐ اللہ نے (معاذ اللہ) کسی کو ل کے زیر کے ساتھ بتا دیا اور کسی کو زبر کے ساتھ۔ اس صورت میں سوچئے کہ خدا کے رسولؐ کے متعلق کیا تصور سامنے آتا ہے اور اگر یہ صورت بھی نہیں تھی تو پھر فرمایئے کہ یہ دو قراتیں کس طرح وجود میں آئیں؟

آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ اختلاف قرات کے ماننے والے یہ قطعاً نہیں بتاتے کہ ان مختلف قراتوں کا سرچشمہ کیا ہے؟ کیا خدا نے ایسا کہا یا اس کے رسولؐ نے؟۔۔۔۔ اس باب میں شیعہ حضرات کا مسلک واضح ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ان آیات کو اسی طرح اتارا تھا جس طرح ان کے ائمہ پڑھتے تھے۔ مصحف عثمانی میں ان میں تحریف کردی گئی۔ لیکن سنی حضرات نہ اسے ماننے کے لئے تیار ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ایسا کردیا اور نہ ہی یہ بتاتے ہیں کہ پھر دوسری قراتوں کی حیثیت کیا ہے! مصحف عثمانی بھی صحیح اور متضاد آیات بھی درست! ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

آگے چل کر مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

"اب عقل کے لحاظ سے دیکھئے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشاء سے قریب تر محسوس ہوتا ہے (یعنی ل کے زبر والی آیت کے مطابق)"۔

لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے بعد ل کے زیر والی قرات کا کیا بنے گا جو اسی طرح متواتر اور مستند ہے جس طرح ل کے زبر والی قرات؟

ہم نے اوپر کہا کہ "اختلاف قرات" کے عقیدہ کی رو سے یہ فطری نتیجہ سامنے آتا ہے کہ (معاذ اللہ۔۔۔ معاذ اللہ) رسولؐ اللہ کسی کو ایک طرح قرآنی آیت بتاتے اور کسی کو دوسری طرح! اس کی تائید میں ہماری بخاری شریف میں ایک روایت ملتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

مسور ابن مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن عبد قاری حضرت عمرؓ سے سن کر بیان کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم (ابن حزام) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سورۃ فرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ میں نے ان کا پڑھنا سنا تو وہ بہت سارے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھائے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز ہی میں ان پر حملہ کر بیٹھوں مگر میں نے بمشکل صبر کیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے انہی کی چادر میں انہیں کس لیا اور میں نے ان سے پوچھا کہ یہ سورت جو میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے سنی ہے، تمہیں کس نے پڑھائی؟ انہوں نے کہا کہ مجھے تو رسولؐ اللہ نے پڑھائی ہے۔ میں نے کہا تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مجھے اس کے خلاف پڑھائی ہے جو

تو پڑھ رہا تھا اور میں اس کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے چلا۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں نے اس کو سورۂ فرقان کو ایسے الفاظ میں پڑھتے ہوئے سنا ہے جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انہیں چھوڑ دو ہشام! پڑھو"۔ چنانچہ ہشام نے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھ دیا جیسا کہ میں نے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یونہی تو نازل ہوئی ہے"--- پھر فرمایا عمرؓ! اب تم پڑھو۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ نے مجھے پڑھائی تھی میں نے پڑھ کر سنائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یوں بھی نازل ہوئی ہے"۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قرآن تو سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ لہٰذا' جس طرح آسان ہو پڑھ لیا کرو"۔

سوچئے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

یہ ہے وہ شکل جو "اختلاف قرات" کے عقیدہ سے ہمارے سامنے آتی ہے! سوچئے کہ اس کے بعد دین کا کچھ بھی باقی رہتا ہے۔ لیکن دین کا کچھ باقی رہے یا نہ رہے' ہمارے علماء حضرات ان روایات کو وضعی قرار دینے کے لئے تیار نہیں۔ جو ایسا کہے' اسے منکر حدیث قرار دے کر اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا ہے۔

یاد رکھئے! اختلاف قرات کی تمام روایات وضعی ہیں۔ قرآن کریم بغیر کسی اختلاف کے' خدا کی طرف سے نازل ہوا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح مرتب و مدون کر کے خود امت کو دیا اور وہی قرآن' بغیر ایک حرف کے تغیر و تبدل کے امت کے ہاں مروج چلا آرہا ہے۔ ایسی تمام روایات جو اس میں کسی قسم کے اختلاف کی نشاندہی کرتی ہیں' وضعی ہیں اور خاص سازش کا نتیجہ۔ (جولائی ۱۹۷۴ء)

۱۲۔ مودودی صاحب نے قصہ ہی تمام کر دیا

مودودی صاحب نے اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں "رسائل و مسائل" کے عنوان سے ایک سلسلہ تشریحات شروع کر رکھا ہے' جس کا نقطہ ماسکہ یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کے فیصلوں میں حک و اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے اور رد و بدل بھی۔ ان کا یہ پورے کا پورا مقالہ (تشریحات) خاص محاکمہ کا متقاضی ہے۔ لیکن اسے ہم کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سر دست ہم اس کا صرف وہی حصہ سامنے لانا چاہتے ہیں جس کا تعلق قرآن مجید سے ہے۔

(۴) قرآن مجید کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت قرآن پاک کو جس حالت میں چھوڑا وہ یہ تھی کہ اپنی مکمل اور مرتب صورت میں وہ صرف ان حافظوں

کے سینے میں محفوظ تھا جنہوں نے حضورؐ سے سیکھ کر اسے از اول تا آخر یاد کیا تھا۔
تحریری شکل میں آپ نے اس کا لفظ لفظ لکھوا ضرور دیا تھا' مگر وہ متفرق پارچوں پر'
تختیوں' کھجوروں کی چھالوں' شانے کی ہڈیوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر لکھا گیا تھا' جو
ایک تھیلے میں رکھی ہوئی تھیں۔ حضور نے اسے سورتوں کی ترتیب کے ساتھ ایک
مسلسل کتاب کی صورت میں مرتب نہیں فرمایا تھا۔

(ترجمان القرآن' ستمبر ۱۹۷۵ء' ص ۳۵ و نومبر ۷۵ء' ص ۴۲)

اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں' حضرت عمرؓ کے ایماء سے حضرت زیدؓ نے اسے (قرآن کریم کو) کس طرح مرتب فرمایا۔ انہوں نے اسے اس "تھیلے" میں جمع شدہ اجزاء کی مدد سے نہیں' بلکہ ان پارچوں' ہڈیوں' کھجور کے پتوں وغیرہ کی مدد سے مرتب کیا جو لوگوں کے ہاں بکھری پڑی تھیں۔ (حضرت زیدؓ کی اس ترتیب کی تفصیل کتب روایات میں درج ہے اور طلوع اسلام میں متعدد مقامات پر اس پر تبصرہ کیا جاچکا ہے۔ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں)۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سرانجام نہیں دیا تھا' اسے حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے سرانجام دیا' یعنی حضورؐ کے چھوڑے ہوئے تھیلے کو کتابی شکل دے دی۔ یہ ان کے نزدیک "رد و بدل" کی نمایاں ترین مثال ہے"۔

(ترجمان القرآن' ستمبر ۱۹۷۵ء' ص ۳۵)

آپ غور فرمائیے کہ مودودی صاحب کی اس تشریح کے مطابق قرآن کریم کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق (معاذ اللہ) کس قسم کا خیال ذہن میں ابھرتا ہے یعنی۔

حضور نے قرآن کریم کو مرتب صورت میں صحابہؓ کو حفظ تو کرادیا لیکن ۲۶' ۲۶ کاتبوں کے باوجود' اسے کتابی شکل میں مرتب فرما کر امت کو نہ دیا۔ حضورؐ کے بعد اس فریضہ کو صحابہؓ نے سرانجام دیا۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب قرآن کریم کے شروع میں (سورۃ فاتحہ کے بعد) **ذالک الکتاب** یعنی یہ وہ کتاب ہے' کہا تھا...... تو کیا اس سے اشارہ اس تھیلے کی طرف تھا (جسے مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق رسولؐ نے رکھا ہوا تھا) یا یہ آیت اس وقت اتری تھی جب حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں قرآن مجید نے کتاب کی شکل اختیار کرلی تھی؟

سوچئے کہ اس کے بعد ہمارا نوجوان طبقہ اس قرآن کے متعلق کیا خیال کرے گا جو امت کے ہاتھوں میں موجود چلا آرہا ہے۔

(۵) اس کے بعد مودودی صاحب نے دین میں کمی کی مثال بیان فرمائی ہے۔ اس سلسلہ

میں لکھتے ہیں کہ قرآن کریم در حقیقت سات زبانوں میں نازل ہوا تھا اور رسولؐ اللہ نے بھی قرآن کریم کو ان سات زبانوں میں ہی پیش کیا اور امت کو سکھایا تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد جب زبانوں کے اس اختلاف سے جھگڑے پیدا ہونے شروع ہوئے تو حضرت عثمانؓ نے ان میں سے صرف ایک زبان والے قرآن کو باقی رکھا اور بقایا چھ زبانوں والے نسخوں کو جلا دیا۔

مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ :

اس معاملہ میں آپ یہ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ قریش کی زبان کے سوا باقی چھ زبانوں کی قراتیں، جو سب کی سب توقیفی تھیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی تھیں، اس مصلحت کی بنا پر منسوخ کردی گئیں کہ امت کو قرآن کے الفاظ اور اس کی عبارتوں میں اختلاف کے فتنے اور خطرے سے بچا لیا جائے حالانکہ انہیں منسوخ کرنے کا کوئی حکم نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا نہ رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے سنا گیا۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۷۵ء، ص۳۹ و نومبر ۱۹۷۵ء، ص۴۳)

آپ ذرا دل کو تھام کر دیکھئے کہ مودودی صاحب کیا ارشاد فرما رہے ہیں؟ وہ کہہ یہ رہے ہیں کہ :۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید سات زبانوں میں نازل کیا تھا۔

(۲) رسولؐ اللہ نے بھی قرآن کریم کو ان سات زبانوں ہی میں امت کو دیا تھا۔

(۳) رسولؐ اللہ کی وفات تک، نہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ ان میں سے صرف ایک زبان کا قرآن باقی رکھا جائے اور دیگر چھ زبانوں والے قرآن منسوخ سمجھے جائیں اور نہ ہی رسولؐ اللہ نے کوئی ایسا حکم دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ منشائے خدا اور رسول یہی تھا کہ قرآن مجید ان سات مختلف زبانوں میں موجود رہے۔

(۴) لیکن حضرت عثمانؓ نے ان میں سے چھ زبانوں کے قرآنوں کو منسوخ قرار دے کر جلا دیا اور ایک زبان کے قرآن کو باقی رکھا۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ اس قرآن مجید کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جسے ہم (خدا کے ارشاد اور اپنے ایمان کی بنا پر) اس دعویٰ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ یہ لفظاً" لفظاً" وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور جسے رسولؐ اللہ نے امت کو دیا تھا۔ (واضح رہے کہ مودودی صاحب نے سات زبانیں ، اور چھ زبانیں اور ایک زبان، جس میں قرآن رکھا گیا، کے الفاظ بصراحت لکھے ہیں۔ اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی زبان کا جہاں جہاں بھی ذکر کیا ہے اس کے لئے لسان واحد کا صیغہ ہی استعمال کیا ہے، السنہ (زبانیں، جمع کا صیغہ) کہیں استعمال نہیں کیا۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ وہ ہم نے جو کہا تھا کہ اس شخص کا مقصد ہی یہ ہے کہ نوجوان نسل کو دین سے

برگشتہ کیا جائے' کیا اس میں کوئی شبہ باقی رہ سکتا ہے؟ کہا جائے گا کہ یہ باتیں مودودی صاحب نے اپنی طرف سے نہیں لکھیں۔ یہ سب کتب احادیث میں موجود ہیں۔ تو ہم عرض کریں گے کہ احادیث کے متعلق تو مودودی صاحب نے خود فرمادیا ہے کہ وہ ہر حدیث کو صحیح نہیں مانتے۔ لہٰذا' جن روایات کی بنیادوں پر مودودی صاحب نے قرآن مجید کے متعلق یہ کچھ لکھا ہے' ظاہر ہے کہ وہ انہیں خود اپنی بصیرت کے مطابق صحیح مانتے ہیں (ہمارے نزدیک' وہ تمام روایات جو قرآن کریم کے خلاف جاتی ہیں' وضعی ہیں اور مودودی صاحب جیسی ذہنیت رکھنے والوں کی سازش کا نتیجہ)۔

اور قیامت یہ ہے کہ اس شخص کی کتابوں (بالخصوص نام نہاد تفسیر) کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں' (بالخصوص انگریزی زبان) میں بھی شائع ہو رہے ہیں۔۔۔ نہ معلوم اس "پردہ زنگاری" کے پیچھے کون سا "معشوق" چھپا بیٹھا ہے؟

(فروری ۱۹۷۶ء)

۱۳۔ قرآن مجید کی حفاظت (فرقہ اہل قرآن کی گمراہی)

قارئین میں سے ایک صاحب نے اپنے کسی ملنے والی کی طرف سے اٹھایا گیا ایک اعتراض پیش کیا ہے جس کا جواب طلوع اسلام میں شائع کرنا مناسب سمجھا گیا ہے۔ اعتراض یہ ہے

> خدا کی طرف سے انبیاء سابقہ کو جو کتابیں دی گئیں ان کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہیں لیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں انسانوں نے تحریف کردی۔ آخر میں خدا نے ضروری سمجھا کہ اپنی کتاب کی حفاظت خود ہی کرنی چاہئے تو قرآن شریف کے سلسلہ میں یہ کہہ دیا کہ اس کی حفاظت ہم خود کرلیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے دل میں یہ خیال سابقہ تجربات کی ناکامی کے بعد پیدا ہوا۔ خدا کے متعلق اس قسم کا تصور یکسر باطل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ بات یوں نہیں تو پھر اس کا جواب کیا ہے؟

طلوع اسلام

خدا کے متعلق اس قسم کا تصور فی الواقع باطل ہے اور پیدا ہوتا ہے اس غلط مفروضہ سے جس پر مذکورہ بالا اعتراض کی بنیاد ہے۔ وہ مفروضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کتب سابقہ کو ابدی طور پر محفوظ رکھنا چاہتا تھا' لیکن انسانوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ تو اس کے بعد خدا نے یہ سوچا کہ اسے اپنی کتاب کی حفاظت آپ کرنی چاہئے۔ صحیح صورت یہ نہیں۔ کتب سابقہ کا ابدی طور پر محفوظ رکھے جانا مشیت خداوندی کا مقصود تھا ہی نہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کتابیں تمام نوع انسان کے لئے ابدی طور پر ضابطہ ہدایت قرار پانے کے لئے نازل نہیں کی گئی تھیں۔ ان ادوار میں ہوتا یہ تھا کہ ایک رسول ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتا۔ اس کی تعلیم کا دائرۂ اثر و نفوذ بھی ایک خاص خطہ زمین تک محدود ہوتا۔ اس کی طرف نازل کردہ کتاب میں جو جزئی احکام شریعت دیئے جاتے' وہ اس قوم اور اس زمانہ کے حسب حال

ہوتے۔ جب زمانہ ذرا اور ترقی کر جاتا تو سابقہ احکام میں سے جو اس قابل ہوتے کہ وہ اس دور میں بھی **نافذ العمل** رہ سکیں' انہیں بحال رہنے دیا جاتا۔ جو اس قابل نہ رہتے ان کی جگہ دوسرے احکام دے دیئے جاتے۔ یوں ان سابقہ کتابوں کے (یوں سمجھئے کہ) نئے ایڈیشن شائع کر دیئے جاتے (واضح رہے کہ دین کے اصول تو وہی رہتے ہیں کیونکہ وہ غیر متبدل تھے۔ اس تبدیلی کی ضرورت ان احکام شریعت میں لاحق ہوتی جو وقتی تقاضوں کے مطابق دیئے جاتے تھے)۔ یہ تصریح خود قرآن مجید میں موجود ہے جب کہا کہ **ما ننسخ من ایتہ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا** (۲/۱۰۶) "ایک رسول کے بعد جب دوسرا رسول آتا تو اس وقت دیکھا جاتا کہ سابقہ رسول کی وساطت سے دیئے گئے احکام شریعت میں سے جو نافذ العمل رہنے کے قابل نہیں رہے' انہیں منسوخ کرکے ان کی جگہ جدید احکام دے دیئے جاتے اور جن احکام میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی لیکن انہیں (سابقہ رسول کی امت نے) فراموش کردیا ہوتا' ان کی تجدید کردی جاتی۔ سورۃ النحل میں اس کی وضاحت **واذا بدلنا ایتہ مکان ایتہ** (۱۶/۱۰۱) کہہ کر کردی گئی ہے' یعنی ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم دے دینا" اب ظاہر ہے کہ جو کتابیں دی ہی وقتی طور پر گئی تھیں' ان کا ابدی طور پر محفوظ رکھے جانا مقصود مشیت تھا ہی نہیں۔

وحی خداوندی کا یہ سلسلہ اسی انداز سے جاری رہا تا آنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق ایک ایسی کتاب کا دیا جانا ضروری سمجھا گیا جو تمام نوع انسان کے لئے ابدی طور پر ضابطہ ہدایت بننے کے قابل ہو۔ یہ کتاب (قرآن کریم کی شکل میں) دی گئی۔ اس کے متعلق اعلان کردیا کہ **وتمت کلمت ربک صدقا و عدلا لا مبدل لکلمتہ** (۶/۱۱۶) "تیرے رب کے قوانین اس کتاب میں تکمیل تک پہنچ گئے۔ اب ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ جو کتاب مکمل بھی ہوگئی اور غیر متبدل بھی قرار دے دی گئی' اس کا ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا جانا بھی ضروری تھا۔ اس بنا پر خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا (۱۵/۹) اور اس کے بعد سلسلہ وحی کے ختم کردینے کا اعلان کردیا۔ چونکہ قرآن کریم کو تمام نوع انسان کے لئے ابدی طور پر ضابطہ ہدایت بنانا تھا' اس لئے اس میں احکام شریعت بہت کم دیئے گئے ہیں۔ اس کی تعلیم بیشتر ان اصولوں پر مبنی ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہیں۔ اس کتاب کے متبعین سے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے' جزئی احکام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود مرتب کریں۔ **وامرھم شوری بینھم** (۴۲/۳۸) کا یہی مطلب ہے۔ یہ اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں وضع کردہ احکام' زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے (اس طرح احکام وضع کرنے کا فریضہ قرآنی مملکت ادا کرے گی جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت بھی کہا جاتا ہے)۔

انبیاء سابقہ کے زمانے میں وقتی احکام کی کیا صورت تھی' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ سیلاب سے بچنے کے لئے کشتی کی ضرورت ہوگی تو انہیں یہ بھی وحی کی رو سے بتانا پڑا کہ کشتی کس طرح بنائی جاتی ہے (۱۱/۳۷)۔ ظاہر ہے کہ جب زمانہ ذرا آگے بڑھا تو کشتی بنانے سے متعلق آسمانی ہدایات کی ضرورت نہ رہی (حتیٰ کہ اس قسم کی کشتی کی بھی ضرورت نہ رہی جسے حضرت نوحؑ نے بنایا تھا)۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ آپ

تورات—(بائبل کے عہد نامہ عتیق) کو دیکھئے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے لئے بھی کس تفصیل اور کثرت کے ساتھ احکام ملتے ہیں۔ اس قسم کے جزئی اور تفصیلی احکام اس زمانہ کی وقتی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھے۔ وہ ابدی طور پر غیر متبدل قرار نہیں پاسکتے تھے۔ ابدی طور پر وہی نظام کارفرما رہ سکتا ہے جسے قرآن کریم نے تجویز کیا ہے' یعنی غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں وقتی احکام خود مرتب کرنا۔

(ضمناً) ہمارے ہاں جب قرآنی نظام مملکت باقی نہ رہا تو قرآن کریم نے جس بلند و بالا حکمت کے پیش نظر جزئی احکام خود نہیں دیئے تھے' وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ سمجھا یہ گیا کہ اسلام مکمل اور آخری دین اسی صورت میں قرار پاسکتا ہے جب اس میں' زندگی کے تمام تقاضوں کے لئے چھوٹے سے چھوٹے احکام بھی موجود ہوں اور وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں۔ قرآن کریم میں تو یہ احکام تھے ہی نہیں' اس لئے انہیں خود مرتب کرلیا گیا اور انہیں ابدی قرار دے دیا۔ انہیں احکام فقہ کہا جاتا ہے۔ سابقہ شریعتوں کے ناقابل عمل احکام کو بدلنے کے لئے تو بعد کے رسول آجایا کرتے تھے۔ لیکن اب چونکہ سلسلہ نبوت ختم ہوچکا ہے' اس لئے ان احکام (فقہ) کو بدلنے کے لئے کوئی رسول بھی نہیں آئے گا۔ یہ ہے وہ مقام جس پر ہم صدیوں سے کھڑے ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ انسانوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ احکام کو احکام شریعت کہہ کر' امت سے ان پر عمل کرائیں۔ یہ احکام خدا کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ اس خیال کے تابع وہ لگے قرآن کریم سے احکام فقہ تلاش کرنے! لیکن قرآن کریم میں یہ احکام تھے نہیں۔ تو اب کیا کیا جائے! اب وہ لگے اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنے اور وہ احکام جو قرآن میں تھے نہیں' لگے انہیں قرآن سے تلاش اور متعین کرنے۔ اس کا جو نتیجہ ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اسے **تلاعب بالدین**— دین سے مذاق کرنے— کے سوا اور کیا کہا جائے۔ یہ حضرات اپنے آپ کو "اہل قرآن" کہتے ہیں۔ مصیبت یہ کہ اہل فقہ نے جو احکام مدون کئے تھے' انہیں بہرحال' انسانوں کے وضع کردہ احکام ہی کہا اور سمجھا جاتا ہے' خواہ ان انسانوں کا پایہ کتنا ہی بلند کیوں نہ تصور کرلیا جائے۔ لیکن یہ لوگ (اہل قرآن) جو احکام پیش کرتے ہیں ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ خود خدا کے مقرر کردہ احکام ہیں! یا للعجب!!

یہ تمام الجھنیں اس لئے پیدا ہو رہی ہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے جس حکمت اور غایت کے لئے قرآن کریم کو اس انداز کی کتاب ہدایت بنایا تھا' وہ غایت نگاہوں سے اوجھل ہوچکی ہے اور (۲) جس نظام نے اس کتاب پر عمل کرانا تھا' وہ نظام قائم نہیں رہا۔ اب ہر شخص اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو اس کی دانست میں (معاذ اللہ) قرآن میں رہ گئی ہے۔ اسی غلط نگہی یا گمراہی کی ایک مظہر قادیانی نبوت تھی جس کے مدعی نے آکر یہ کہا کہ جہاد کا حکم ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کرنا ضروری سمجھا تو مجھے بھیج دیا کہ میں اس کے منسوخ ہونے کا اعلان کرکے قرآن میں ترمیم کردوں (معاذ اللہ)۔ آپ نے دیکھا کہ ایک نظام قرآنی کے قائم نہ رہنے سے امت کس کس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوگئی؟ (مئی ۱۹۷۶ء)

۱۴- قرآن سے غفلت برتنے سے عمر ضائع ہوگئی

(مولانا انور شاہ کاشمیریؒ (دیو بندی) کا مخلصانہ اعتراف اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی تنبیہہ)

مولانا انور شاہؒ کاشمیری (دیو بندی) دنیائے علم و تقویٰ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا نام سنتے ہی نگاہیں احترام سے جھک جاتی ہیں۔ ان کی آخری زندگی کا ایک عبرت آموز واقعہ مفتی محمد شفیع۸۔ صاحب کی زبانی موقر ماہنامہ "میثاق" کی نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جو اس قابل ہے کہ اسے نہایت غور و فکر سے ملاحظہ کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گزار کروں جو اہم بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔ قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا "حضرت کیسا مزاج ہے؟" کہا "ہاں! ٹھیک ہی ہے' مزاج کیا پوچھتے ہو' عمر ضائع کردی!"

میں نے عرض کیا "حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں' دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں' مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی!"

فرمایا "میں تمہیں صحیح کہتا ہوں' عمر ضائع کردی!"

میں نے عرض کیا "حضرت بات کیا ہے؟"

فرمایا "ہماری عمر کا' ہماری تقریروں کا' ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کردیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا' تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔ اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابو حنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود

۸۔ یہ بھی اب مرحوم ہوچکے ہیں۔ (نومبر ۱۹۷۶ء)

اپنا لوہا منوائے گا۔ وہ تو ہمارے محتاج نہیں اور امام شافعیؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "**صواب محتمل الخطاء**" (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کریں اور دوسرے کے مسلک کو خطاء محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں۔ اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں"

پھر فرمایا:۔

"ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا۔ اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح۔ یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی، قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق یا بالسر حق تھی۔ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا"۔

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ یہ تھے:۔

"اللہ تعالیٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہؒ کو، نہ مالک کو نہ احمد بن حنبلؒ کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے جنہوں نے نور ہدایت چار سو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدان حشر میں کھڑا کرکے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس۔ یہ نہیں ہوگا۔

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کردی، اپنی قوت صرف کردی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرامؑ لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام

کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا' اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی' آج یہ دعوت تو نہیں دی جارہی۔ یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہئے تھا' وہ پھیل رہے ہیں' گمراہی پھیل رہی ہے' الحاد آرہا ہے' شرک و بت پرستی چل رہی ہے' حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی و فروعی بحثوں میں!"

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا "یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کردی"۔

طلوع اسلام

یہ تاثر در حقیقت' عبرت آموز تفسیر ہے قرآن کریم کی اس آیہ جلیلہ کی جس میں اس نے اسلاف کے ساتھ ہمارے رشتہ اور تعلق کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ

تلک امتہ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسلون عما کانوا یعملون (۲/۱۴۱)

"یہ لوگ اپنے اپنے کام سرانجام دے کر دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انہوں نے جو اچھے کام کئے ان کی انہیں جزا ملے گی اور ان کی غلطیوں کا ان سے مواخذہ ہوگا۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ (تم سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا)۔

کیا ہمارے علمائے کرام بالعموم' اور وابستگان دیو بند بالخصوص' حضرت شاہ صاحبؒ کے اس حاصل زندگی سے کچھ سبق حاصل کریں گے؟ (لیکن یہ کبھی ایسا نہیں کریں گے)۔

(۲) ترک قرآن

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ دیو بندی کا مقام بلند بھی کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اسی ماہنامہ کے صفحہ ۴۸ پر (مفتی محمد شفیع صاحب ہی کے حوالے سے) ان کا ایک واقعہ درج ہے جو اسی طرح غور و فکر کا محتاج ہے۔ شیخ الہند مرحوم نے فرمایا:۔

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں' تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس

لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کردوں کہ قرآن کریم کو لفظاً" اور معناً" عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"۔

حضرت شیخ الہندؒ نے جو فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی کے دو سبب معلوم ہوئے' ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا اور دوسرے آپس کے اختلافات' تو یہ دوسرا سبب بھی درحقیقت پہلے سبب ہی کا فطری نتیجہ ہے۔ قرآن کریم نے اپنے نزول کا مقصد یہ بتایا تھا کہ وہ نوع انسان کے اختلافات کو ختم کرے گا۔ لہٰذا' قرآن کریم کو چھوڑ دینے کا فطری نتیجہ باہمی اختلافات ہیں اور ان کے مٹانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر اختلافی معاملہ میں قرآن کریم کو اتھارٹی تسلیم کرلیا جائے۔

لیکن یہاں مصیبت یہ ہے کہ ان لوگوں کے روزگار کا دار و مدار ہی ان اختلافات پر ہے۔ جو شخص انہیں قرآن کو اتھارٹی تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے' وہ اس پر کفر کے فتوے لگا دیتے ہیں اور ان اختلافات کی رو سے پیدا شدہ فرقوں کو "مکاتب فکر" کا نام دے کر خود فریبی یا دانستہ فریب دہی کا شکار ہو جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے وہ تباہی رک جائے گی جس کی لپیٹ میں اس وقت تمام کی تمام امت مسلمہ آچکی ہے۔

(جنوری ۱۹۷۶ء)

باب دوم

نبوت' رسالت' احادیث

۱- رسالت محمدیہ کا ثبوت

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب کا تفصیلی خط آیا ہے- چونکہ خط میں جو سوال اٹھایا گیا ہے اس کا تعلق کسی ایک فرد (یعنی مستفسر) ہی سے نہیں بلکہ وہ سوال اکثر دلوں میں (بالخصوص ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں) پیدا ہوتا رہتا ہے' اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس خط اور اس کے جواب کو طلوع اسلام میں شائع کیا جائے- خط حسب ذیل ہے-

"بچپنا تھا- کچھ اچھی طرح یاد نہیں- شاید اکتالیس بیالیس کا زمانہ تھا- اس وقت طلوع اسلام والد محترم کے ہاتھوں میں دیکھا تھا- ہجوں سے طلوع اسلام کا نام پڑھ کر بہت خوش ہوا تھا اور والدہ کے سامنے شوخی بگھارنی شروع کی کہ میں اب رسالہ بھی پڑھ لیتا ہوں- پھر کچھ مدت بعد خبر نہیں طلوع اسلام نکلنا بند ہوگیا یا والد صاحب نے لانا چھوڑ دیا- خدا جانے کیا ہوا- کبھی نہ دیکھا یا دیکھا تو کچھ خیال نہ کیا- وقت سالوں کی شکل میں بیت گیا- غالباً" اکیاون باون آیا' تو ہمارے ہاں طلوع اسلام بھی آنا شروع ہوگیا- اب کے میں نے طلوع اسلام کے ہجے نہیں کئے- پڑھا' شروع سے آخر تک پڑھ گیا- کئی ایک کیا بلکہ بہت سی باتیں سمجھ سے بالاتر تھیں- مگر اکتاہٹ کے بجائے دل چسپی بڑھتی رہی- ایک دفعہ ایک مہمان نے ڈرائنگ روم کی میز پر طلوع اسلام پڑا دیکھا' تو حیران ہو کر والد صاحب سے پوچھنے لگا' کیوں صاحب! یہ طلوع اسلام آپ پڑھتے ہیں؟ والد صاحب کے اثبات پر مہمان کے چہرے پر کچھ اچھے جذبات نہ دیکھ کر طلوع اسلام سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی- مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں' میں نے والد صاحب سے پوچھا تھا کہ پرویز صاحب نے اتنا علم کیسے اور کہاں سے حاصل کرلیا ہے؟ والد محترم ہرماہ طلوع اسلام لاتے رہے اور میں ہرماہ طلوع اسلام پڑھتا رہا- یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۶۴ء اور جنوری ۱۹۶۵ء کا شمارہ بھی پڑھ کر طلوع اسلام کے پرانے پرچوں کے ساتھ محفوظ کردیا ہے-

کیمیائے سعادت' شاہ ولی اللہ کا نظریہ توحید' بہشتی زیور اور قصص الانبیاء سے لے کر مولانا آزاد کی تصنیفات اور پہلے پانچ سات پاروں کی تفسیر کے علاوہ مولانا مودودی کی پچیس تیس کتابوں کو بھی پڑھا- ادیب فاضل کے کورس میں سیرت النبی اور کئی ایک مذہبی قسم کی کتابوں سے پالا پڑا- دوچار باہر کے مصنفین کی کتابیں بھی نظر سے گزریں- (BIBLE CORRESPONDENCE SCHOOL) سے "بائبل مقدس" کا "کورس" کرکے لینے کو تو سرٹیفکیٹ بھی لیا ہے- گرونانک کے خیالات پر مبنی سکھ منی اور جپ جی کا بھی مطالعہ کیا ہے- شرمد بھگوت گیتا کا ترجمہ بھی پڑھا اور

تلسی داس کی رامائن پڑھی۔ موج کوثر، آب کوثر، یعنی ان سب کوثروں کو بھی دیکھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے خیالات پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ "مولوی" کے پندرہ بیس اور اس سے دوگنے "آستانہ" کے پرانے رسالوں کا اسٹاک مل گیا۔ چھوڑا اسے بھی نہیں۔ ستیارتھ پرکاش پڑھ چکا ہوں۔ برق کی تصانیف کو بھی دیکھا۔ ان کے علاوہ کئی ایک کتابیں اور مضامین اور ہیں جن کی لسٹ بتانا گویا "میں" کو اجاگر کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ جو کچھ پڑھا بڑی جستجو سے پڑھا۔ جتنا پڑھا تشنگی اتنی ہی شدت اختیار کرتی گئی۔ ان مندرجہ بالا کتابوں کے پڑھنے سے ہوا یہ کہ میں ایک روز یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ مذہب میں آخر رکھا ہی کیا ہے۔ اس میں کتنے جھگڑے ہیں، اس میں کتنے جھنجھٹ ہیں۔ موجودہ زمانے میں مذہب سے روپے کی طاقت زیادہ ہے اور مذہب کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر یہ جھگڑا کرانے والی اور دلوں میں وہم ڈالنے والی شے نہ ہو تو کون سی قیامت آجائے گی۔ پھر میں اس خیال سے متفق ہوگیا اور شدت سے ہوا۔ سوچتا دنیا میں مذہب کی چنداں ضرورت نہیں اور اگر کبھی ضرورت تھی بھی تو پہلے وقتوں میں جب کہ تعلیم عام نہ تھی۔ مذہب اخلاق سکھانے کے لئے میدان عمل میں آیا۔ آج کے دور میں اگر مذہب نہ بھی ہو تو بھی لوگ تعلیم سے اخلاق سیکھ سکتے ہیں۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ وقت، خود بخود سکھا دیتا ہے۔ اور پھر وہ لوگ جو مذہب تو کجا خدا ہی کو نہیں مانتے، وہ بھی تو زندگی گزار لیتے ہیں اور ہم سے بہت بہتر گزارتے ہیں۔ آگے جا کر انہیں عذاب ملے گا تو یہ بھی صحیح طور پر کیا معلوم۔ مذکورہ کتابوں نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد ڈارون کی تھیوری نے رہا سہا بھی خاک کی نذر کردیا اور گویا مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ ڈارون نے غلط نہیں کہا۔ میں "ڈارون کا سالک" آخری مقام بھی طے کرنے کو تھا۔ اب میں آزاد ہونے کو تھا۔ یہی میری انتہا تھی لیکن میں نے مطالعہ نہیں چھوڑا۔ جو بھی مذہبی کتاب ملتی، پڑھتا اور پڑھنے کے بعد ہنس کے کسی کونے میں پھینک دیتا۔ طلوع اسلام اور اس ادارہ کی دوسری کتابیں بھی پڑھتا، مگر انہیں پڑھ کر کبھی ہنسی نہیں آئی بلکہ دیر تک خاموش کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ سوچ کیا ہوتی تھی۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ معراج انسانیت، انسان نے کیا سوچا، قرآنی فیصلے، سلیم کے نام خطوط، طاہرہ کے نام خطوط، ابلیس و آدم، مزاج شناس رسول، ان کے علاوہ کئی اور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان مذکورہ کتابوں اور طلوع اسلام کے مسلسل مطالعہ سے ممکن ہے بہت سے فائدے ہوئے ہوں، مگر جس فائدے کا مجھے علم ہے وہ یہ ہوا کہ میں ہر کسی بات کو عقل و شعور سے کام لے کر ماننے کا عادی ہوگیا اور اس عادت نے مجھے یہ ماننے پر مجبور کردیا کہ ڈارون غلط کہتا ہے۔ مسلمان ہی کیا بلکہ دنیا کی تقریباً تمام قومیں خدا کے وجود کی کسی نہ کسی طرح قائل ہیں لیکن قائل ہونا اور بات ہے اور کسی بات پر مطمئن ہونا اور بات۔ اب میں قائل ہونے کے علاوہ مطمئن بھی ہوں۔ مجھے اطمینان ہے، مجھے یقین ہے، مجھے تسکین ہے، مجھے تسلی ہے۔ وہ خدا جو وہموں کے پردے میں تھا، آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے اب ظاہر ہوچکا ہے۔ اب میں اس خدا کو دل میں محسوس کرتا ہوں۔

لیکن یہ کہتے ہوئے مجھے نہایت افسوس ہے، شدید قلق ہے، بڑا دکھ ہے کہ وہ اطمینان جو مجھے خدا کے تصور سے ہے، رسول کریمؐ کے متعلق ویسا اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ قائل ہونا اور بات ہے اور

مطمئن ہونا اور بات ہے۔ اب اس درد کا مداوا چاہتا ہوں تاکہ دل میں وہم' وسوسے' شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بن جاؤں اور شاید پھر عمل کرنا بھی شروع کردوں۔ ہاں تو آپ رسول کریمؐ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ

(ا) وہ سچے تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ امین تھے وغیرہ وغیرہ۔ سب درست مگر یہ سب اچھائیاں تو نبوت ملنے سے پہلے بھی تھیں۔

(۲) چونکہ قرآن میں ان کی رسالت کا ذکر ہے اس لئے وہ رسول تھے۔ بالکل ٹھیک ہے' اس کے لئے ہمیں قرآن کو خدائی کلام ثابت کرنا پڑے گا۔ یعنی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن خدائی کلام ہے' تو پھر آپ کی رسالت خود بخود پایہ ثبوت تک پہنچ جائے گی۔ اور قرآن کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ :

(ا) چونکہ قرآن کے چیلنج کے باوجود اس جیسی کوئی دوسری کتاب نہیں بنی' اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ قرآن کے چیلنج کو منظور کرکے دوسری کتاب اس کے مقابلہ میں بنائی گئی ہو اور مسلمانوں نے اپنے عروج میں یا اس سے پہلے ہی کسی طریق سے ضائع کردیا ہو یا کسی کو دے دلا کر ضائع کرادیا ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایسی کتاب بنائی جاتی تو کفار اس ذوق و شوق سے دعوت اسلام پر لبیک نہ کہتے۔ عرض ہے کہ سرداروں کے ظلم و ستم سے نجات کے لئے بھی تو کفار اسلام قبول کرسکتے تھے۔

(۲) چونکہ قرآن شریف میں کوئی بات جھوٹی نہیں' اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک کتاب ایسی لکھی جائے جس میں کوئی جھوٹ نہ ہو' تمام فنڈامینٹل ہوں۔

(۳) چونکہ عام آدمی ایسی فلسفیانہ باتیں نہیں کرسکتا' اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔

باتوں کا عمر' تجربے اور کوشش و دھیان وغیرہ پر بھی دار و مدار ہوتا ہے اور پھر چالیس سال کی عمر تک تو خاصا تجربہ حاصل ہوجاتا ہے۔

(۴) چونکہ پرانے زمانے کی (گزشتہ قوموں کی) باتیں بھی اس میں موجود ہیں جبکہ رسول کریمؐ تھے ہی نہیں' اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔ پرانی داستانیں دوسری مذہبی کتابوں میں بھی درج تھیں جنہیں ان پڑھ کے لئے پڑھنا ناممکن ضرور تھا' مگر کسی نہ کسی طرح سنی ضرور جاسکتی تھیں۔ ان باتوں کے علاوہ کچھ باتیں سینہ بسینہ بھی چلی آرہی ہوں گی۔ دونوں طریقوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر کوئی "پرانی بات" ایسی ہے جو نہ تو کہیں کسی کتاب میں ہو اور نہ ہی سینہ بسینہ چلی آرہی ہو' تو ایسی بات کی صحت کے متعلق کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ درست ہے یا غلط۔

مرہم کچھ اس طرح رکھیں کہ جلد آرام آجائے اور دل میں کسی وسوسے یا وہم (جو کہ دل میں دو چار سیکنڈ ہی کے لئے آتا ہے) کی گنجائش ہی نہ رہے۔ جب تک اطمینان نہ ہو اس وقت تک صرف قائل ہونا کوئی فخر کی بات نہیں۔ کیا آپ مجھے فخر کرنے کا موقع نہ دیں گے؟"۔

جواب : مجھے آپ کے ذوق تجسس کا معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی اور اس سے بھی کہ میں نے اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق جو کچھ اپنی کتابوں میں پیش کیا ہے اس سے آپ کے بہت سے شکوک رفع ہوگئے اور خدا پر آپ کا اطمینان اس درجہ محکم ہوگیا کہ آپ کا اضطراب' سکون سے بدل گیا۔ وہ سکون جو عقل و فکر اور علم و بصیرت کی بنا پر حاصل ہوتا ہے' نہ وہ جو جہالت اور تقلید پر مبنی ہوتا ہے اور غور و تدبر اور تنقید و تحقیق سے ختم ہوجاتا ہے۔ (ضمناً" یہ بھی ایک بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ میری انہی کتابوں سے (جنہیں ان میں سے کسی نے بھی پڑھا نہیں تھا) ہمارے ہاں کے مفتیان کرام نے مجھے "خدا کا منکر" لہٰذا (معاذ اللہ) ملحد و بے دین قرار دیا تھا اور انہی کتابوں سے آپ علی وجہ البصیرت' خدا پر ایمان لائے ہیں۔ **یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا** (۲/۲۶ کا یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے۔

آپ نے بالکل صحیح سمجھا ہے کہ ایمان وہی ایمان ہے جو علی وجہ البصیرت دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے بعد لایا جائے۔ اگر ناخن میں چبھی ہوئی پھانس نکالی نہ جائے تو وہ ساری رات سونے نہیں دیا کرتی۔

۲ ـــ آپ کے سوال کا ملخص یہ ہے کہ یہ کس طرح مانا جائے کہ قرآن کریم خدا کا کلام ہے' نبی اکرمؐ نے اسے خود ہی وضع کرکے اسے خدا کی طرف منسوب نہیں کردیا؟

قبل اس کے کہ میں اس سوال کا جواب عرض کروں' آپ کے اعتراضات میں سے دو ایک اہم شقوں کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سے اصل سوال پر خاصی روشنی پڑے گی۔

آپ نے لکھا ہے کہ "آپ رسول کریمؐ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سچے تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ امین تھے' وغیرہ وغیرہ۔ سب درست مگر یہ اچھائیاں تو نبوت ملنے سے پہلے بھی تھیں"۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ صحیح ہے (اور اس کی صحت میں کسی کو بھی شبہ نہیں) کہ نبی اکرمؐ نبوت سے پہلے سچے تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ نبوت ملنے کے بعد ان کی یہ سب خوبیاں ختم ہو گئی تھیں اور وہ راتوں رات ایسے بدل گئے تھے کہ (معاذ اللہ) اتنا بڑا جھوٹ بولنے لگ گئے اور پھر تئیس برس تک مسلسل جھوٹ بولتے چلے گئے۔ ایسا کرنے والے کو یا تو اتنا بڑا مکار اور ریاکار ہونا چاہئے کہ وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق اس قسم کا دعویٰ کرے اور پھر اتنے لمبے عرصہ تک اس منافقت' عیاری اور مکاری کو نہایت کامیاب طریق سے نباہتا چلا جائے۔ اور یا وہ ایسا نفسیاتی مریض ہو کہ اپنے توہمات کو خدا کا کلام سمجھ کر اس خود فریبی میں مبتلا ہو جائے کہ وہ مامور من اللہ ہے۔ (اس قسم کی نفسیاتی بیماریاں ہوتی ہیں۔ ہماری طب قدیم میں بھی اس قسم کی علامات کو "نوعے ازجنون" کہا گیا ہے)۔

لیکن رسولؐ اللہ کی نبوت کی تئیس سالہ زندگی ان دونوں باتوں کی تغلیط کرتی ہے۔ مکاری و عیاری کا پردہ کسی نہ کسی مقام پر ضرور چاک ہو جاتا ہے' بالخصوص جب مخالفین کی ہزاروں نگاہیں اس کی تلاش میں ہوں اور نفسیاتی مریضوں کی ایک ایک حرکت ان کے غیر متوازن ذہن اور مشتت ذات (TORN PERSONALITY)

کی غماز ہوتی ہے۔ بعض متعصب پادریوں نے حضورؐ کے خلاف اس قسم کے الزامات بھی لگائے تھے۔ لیکن خود انہی کے ارباب علم و تحقیق نے ان کی تردید کر دی اور برملا کہا کہ آپؐ کی زندگی میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ملتی۔

۳۔ آپ نے اس دعوے کے سلسلہ میں (کہ قرآن کا چیلنج ہے کہ اس جیسی کتاب کوئی انسان نہیں بنا سکتا) کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی کوئی کتاب بنائی گئی ہو اور مسلمانوں نے اسے ضائع کر دیا ہو۔

قرآن کا یہ چیلنج' قریش عرب تک ہی محدود نہیں تھا۔ ان سے زیادہ تحدی کے ساتھ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو بھی دیا گیا تھا۔ یہودی ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور عیسائیوں کی اتنی اتنی عظیم الشان سلطنتیں موجود تھیں۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی طرف سے اس چیلنج کا جواب دیا گیا ہو اور اس کا کوئی ذکر ان کی کسی تاریخ میں موجود نہ ہو؟ کتاب ضائع کی جا سکتی ہے (حالانکہ جس تسلسل سے عیسائی سلطنتیں ظہور اسلام کے وقت سے لے کر اس زمانہ تک چلی آرہی ہیں' اس کے پیش نظر ایسا ہونا بھی ناممکنات میں سے ہے) لیکن اس قسم کے واقعہ کے تذکرہ کو ساری دنیا کی کتب تاریخ سے مٹا دینا تو کسی طرح ممکن نہیں۔

پھر' قرآن کا یہ چیلنج' اسی دور تک محدود نہیں تھا۔ ساری دنیا کے لئے' اور ہر ایک زمانے کے لئے تھا۔ دنیا نے (بالخصوص عیسائی دنیا نے) اسلام کی مخالفت میں ہر ممکن حربہ استعمال کیا۔ سیکڑوں برس تک صلیبی لڑائیاں ہوتی رہیں' ہزارہا کتابیں اسلام کے خلاف لکھی گئیں' مناظرے کئے گئے' مباحثے ہوئے (اور ہوتے چلے جا رہے ہیں)۔ اگر اس چیلنج کا قبول کر لینا ممکن ہوتا تو مخالفین کو اتنا کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ایک کتاب' قرآن کی مثل لکھ دی جاتی۔ ساری دنیا کے مسلمان شکست کھا جاتے۔

اور اب بھی کونسا موقع نکل گیا ہے؟ دنیا اس چیلنج کو قبول کر کے اس جھگڑے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں ختم کر دیتی؟ ذرا سوچئے کہ یہ سوچنے کا مقام ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ "سرداروں کے ظلم و ستم سے نجات کے لئے بھی تو کفار اسلام قبول کر سکتے تھے"۔ ہو سکتا ہے کہ مظلوم اور مقہور' کمزور و ناتواں لوگوں نے اسی طرح اسلام قبول کر لیا ہو۔ (اور اسلام کی برتری کا یہ ثبوت بھی کیا کم ہے کہ وہ مظلوموں اور کمزوروں کی پناہ گاہ ہے!) لیکن سوال یہ ہے کہ ان سرداروں نے اسلام کس طرح قبول کر لیا؟۔ بلالؓ اور صہیبؓ نے تو مظلومیت سے بچنے کے لئے اسلام قبول کر لیا ہو گا۔ (حالانکہ اسلام قبول کرنے سے ان پر جس قدر ظلم و ستم ڈھائے گئے' وہ ان مظالم سے کہیں شدید تھے جو ان پر اس سے پہلے روا رکھے جاتے تھے) لیکن ابو بکرؓ و عمرؓ' عبد الرحمٰن اور عثمانؓ' طلحہ اور زبیر (رضی اللہ عنہم) نے کن مظالم کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا؟ ان کا شمار تو سرداران قریش میں ہوتا تھا!

۴۔ آپ کہتے ہیں کہ گذشتہ زمانے کی جو باتیں قرآن کریم میں مذکور ہیں' وہ باتیں پہلی کتابوں میں موجود تھیں' یا سینہ بسینہ چلی آرہی تھیں اور جو باتیں نئی تھیں' ان کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط!

گزشتہ زمانے کی جو باتیں کتب سابقہ میں بیان ہوئی تھیں' ان میں اور جس طرح وہ قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں ان میں' جہاں جہاں اختلاف ہے (یا جو باتیں صرف قرآن میں بیان ہوئی ہیں) وہ مقامات قابل غور ہیں۔ جوں جوں تاریخی تحقیقات بڑھتی جا رہی ہیں' وہ قرآن کے بیانات کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتی جا رہی ہیں۔ یہ مشکل ہے کہ ان مقامات کی تفصیل' یا نشاندہی ایک خط میں درج کر سکوں۔ یہ موضوع بڑا تفصیل طلب ہے۔ ایک آدھ مثال پر غور کیجئے۔ عیسائیوں کے ہاں یہ مسلمہ چلا آرہا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش' ۲۵/دسمبر کو ہوئی۔ قرآن نے کہا کہ ان کی پیدائش اس موسم میں ہوئی تھی جب کھجوریں درختوں پر پکتی ہیں۔ یہ موسم دسمبر میں نہیں ہوتا' گرمیوں کا ہوتا ہے۔ اب خود مغربی محققین اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش اور آپ کی زندگی سے متعلق دیگر اہم کوائف جس طرح بائبل میں مذکور ہیں محض افسانے ہیں۔ اب ان کی تحقیقات کا رخ قرآن میں بیان کردہ واقعات کی طرف ہے۔ ان میں سے بعض کی تصدیق وہ کر چکے ہیں۔ اور جب ان کی تحقیق آگے بڑھے گی تو بقایا کی تصدیق بھی اسی طرح ہوتی جائے گی۔ یا مثلاً" فرعون موسیٰؑ کی لاش کے متعلق' کتب سابقہ خاموش تھیں۔ قرآن نے بتایا کہ اسے غرقابی کے بعد' محفوظ رکھ لیا گیا تھا۔ مصری تہ خانوں کی کھدائی نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ فرعون کی ممی شدہ لاش محفوظ رکھی ہے۔

اب میں آپ کے اصل سوال کی طرف آتا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کی طرف آپ نے خود ہی اشارہ کر دیا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ "باتوں کا عمر' تجربے' کوشش اور دھیان وغیرہ پر بھی دار و مدار ہوتا ہے۔ اور پھر چالیس سال کی عمر تک تو خاصا تجربہ حاصل ہو جاتا ہے"۔ اس لئے قرآن میں جو "فلسفیانہ باتیں" ہیں وہ رسولؐ اللہ کے اپنے علم و تجربہ کی پیداوار ہو سکتی ہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس کی تائید کے لئے کسی دلیل و شواہد کی ضرورت نہیں کہ انسان کتنا ہی زیادہ دانا و بینا کیوں نہ ہو' نہ اس کی معلومات اپنے زمانے کی علمی سطح سے آگے جا سکتی ہیں' نہ وہ اپنے ماحول سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ حتیٰ کی جن امور کو بڑے بڑے مفکر بطور اپنے فلسفہ کے پیش کرتے ہیں' شعوری اور غیر شعوری طور پر ان قیاسات کا منبع بھی ان کے زمانے تک کا علم انسانی ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محمدؐ ابن عبد اللہ (بحیثیت ایک انسان کے) اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے تھے۔ نہ ان کی معلومات اپنے زمانے کی علمی سطح سے آگے بڑھ سکتی تھیں' نہ وہ اپنے ماحول سے یکسر غیر متاثر رہ سکتے تھے۔ اب دیکھنا یہ چاہیے کہ زندگی کے جو اصول قرآن نے دیئے ہیں' کیا وہ اس زمانے کی علمی سطح تک محدود تھے یا اس سے آگے جاتے تھے اور آیا ان اصولوں کو پیش کرنے والا' اپنے ماحول سے متاثر ہو کر یہ کچھ کہہ سکتا تھا؟ اس باب میں میری دشواری پھر یہی ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہے۔ خط اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا' میں دو چار مثالوں پر ہی اکتفا کروں گا۔

(۱) زمانہ نزول قرآن میں' بادشاہت کو' ساری دنیا میں' مسلمہ نظام سیاست و تمدن سمجھا جاتا تھا۔ کہیں راجہ

کو ایشور کا اوتار مانا جاتا تھا' کہیں بادشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ۔ سلاطین کے آسمانی حقوق الوہیت کا عقیدہ عام تھا۔ کوئی انسانی ذہن ایسا نہیں تھا جو اس عقیدہ میں کسی قسم کا سقم یا عیب محسوس کرے۔ عین اس زمانے میں' عرب کی سرزمین کا ایک امی یہ کہتا ہے کہ یہ عقیدہ بالکل باطل اور یہ تصور یکسر غلط ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت صرف قانون کی ہو سکتی ہے اور قانون بنانے کا اختیار بھی کسی انسان کو حاصل نہیں۔ ان قوانین کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے متنازعہ فیہ معاملات کا تصفیہ' لوگوں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہئے۔

میں پوچھتا یہ ہوں کہ کیا اس زمانے کا کوئی انسانی ذہن یہ اصول حکمرانی دے سکتا تھا؟

(۲) خود خدا کے متعلق یہ عقیدہ' اسی زمانے تک ہی نہیں' بلکہ (عام طور پر) آج تک بطور مسلمہ چلا آتا ہے کہ "خدا قادر مطلق ہے"۔ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ وہ جسے چاہے خاک سیاہ کر دے جسے چاہے تخت پر بٹھا دے' جسے چاہے تباہ کر دے جسے چاہے فروغ دے دے۔ اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ لیکن آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے' ایک شخص یہ کہتا ہے کہ خدا بے شک قادر مطلق ہے لیکن اس نے اس کائنات کے نظام کے لئے خود ہی کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اب یہاں جو کچھ ہوتا ہے ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے' اس لئے وہ کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اپنے کام میں لا سکتا ہے (یہ اس زمانے میں کہا جا رہا تھا جب دنیا کائناتی قوتوں کو دیوی دیوتا مانتی تھی) اور اپنی ہر ناکامی کے اسباب و علل پر غور کر کے' سمجھ سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور مجھے کیا کرنا چاہئے جس سے آئندہ ایسا نہ ہو۔

آپ سوچئے کہ کیا اس زمانے میں یہ کچھ' انسانی ذہن کہہ سکتا تھا؟

(۳) ذات پات کی تمیز اور انسانوں کی طبقاتی تقسیم اس زمانے کا عام معمول تھا۔ حتیٰ کہ اسے خدائی سند اور برہما کی تخلیق قرار دیا جاتا تھا۔ عین اس زمانے میں (اور خود عرب میں جہاں یہ تفریق اپنے انتہا تک پہنچ رہی تھی) یہ کہا گیا کہ ہر انسانی بچہ' محض انسان ہونے کی جہت سے' یکساں واجب التکریم ہے۔ مدارج کا فرق صرف جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی بنا پر ہونا چاہئے۔

غور کیجئے کیا اس اصول کو بطور ایک غیر متبدل اصول حیات اور مستقل قدر کے پیش کرنا' اس زمانے کے ذہن کی پیداوار ہو سکتا تھا؟

(۴) اس زمانے میں جب ایک بستی کے رہنے والے' دوسری بستی والوں کے حالات سے واقف نہیں ہوتے تھے اور دنیا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی' ایک شخص یہ کہتا ہے کہ یہ تقسیم' انسانوں کی خود ساختہ ہے۔ تمام نوع انسان ایک عالمگیر برادری ہے اور اسے آخر الامر ایک قوم بن کر رہنا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا ایک مشترکہ ضابطہء قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔ لہٰذا' قبائلی یا قومی تشکیل کا مدار نسل یا وطن کے اشتراک پر نہیں' آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے۔ ذرا سوچئے کہ یہ تصور اس زمانے کی علمی سطح سے کتنا آگے تھا؟

کیا اس قسم کا تصور انسانی ذہن کی تخلیق ہو سکتا تھا؟

(۵) غلامی اس زمانے میں ساری دنیا میں بطور ایک مسلمہ کے رائج تھی اور دنیا کے بلند ترین ذہنوں کے حامل، اسے فطرت کا تقاضا اور صحیح انسانی تقسیم قرار دیتے تھے۔ اس زمانے میں یہ اصول پیش کرنا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے، کیا ماحول کا اثر یا اس زمانے کی علمی کاوش کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

(۶) اس زمانے میں جب زمینداری، جاگیرداری اور سرمایہ داری کو معیشت کا متفق علیہ نظام قرار دیا جاتا تھا (اور اس کے خلاف، عرب کے ہمسایہ ملک میں مزدک کی اشترا کی کوشش بری طرح ناکام ہو چکی تھی)، یہ اصول پیش کرنا کہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کا مہیا کرنا نظام معاشرہ کی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے رزق کے سرچشموں کو معاشرہ کے کنٹرول میں رہنا چاہئے۔ دولت جمع کرنا عذاب جہنم کا موجب ہے اور اپنی محنت کے ماحصل کو نوع انسان کی بہبود کے لئے کھلا رکھنا جنت کی خوشگواریوں کا باعث۔ اور اس کے لئے ایسی محکم بنیادیں مہیا کرنا جن سے یہ نظام کبھی ناکام ثابت نہ ہو۔ غور کیجئے کہ کیا یہ چیز عرب کے تاجرانہ قبیلہ سے متعلق ایک فرد کی ذہنی تخلیق ہو سکتی تھی؟

(۷) اس زمانے میں، مذہبی پیشوائیت "دنیائے روحانیت" کا ایسا عقیدہ تھا جس میں کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ دنیا کا ہر مذہب، اسے ایمان کا جزو قرار دیتا تھا۔ عین اس زمانے میں، کسی کا یہ اعلان کرنا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب اور دربان نہیں - یہ احبار و رہبان (علماء اور مشائخ) لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں۔ دین میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہ اعلان ہو رہا ہے اس گھرانے کے فرد کی طرف سے جو کعبہ کے متولیوں میں سب سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کیا یہ تصور اس شخص کے اپنے ذہن کی تخلیق ہو سکتا تھا؟

(۸) ان اقدار و اصول حیات سے ہٹ کر، علمی حقائق کی طرف آیئے، تو (مثلاً) علم الافلاک کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے۔ تمام اجرام فلکی اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ یہ عظیم الجثہ کرے، کشش ثقل کی زنجیروں کے ساتھ بندھے ہوئے مسلسل مصروف خرام ہیں۔ زمین اس قدر تیزی سے گھومنے کے باوجود، مخلوق کے لئے رہائش و آسائش کا گہوارہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ سائنٹیفک حقائق، اس زمانے کا انسانی ذہن وضع کر سکتا تھا؟

آپ انہی چند مثالوں پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا یہ باتیں اس زمانے میں انسانی تجربہ یا کاوش کا نتیجہ ہو سکتی تھیں۔ اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ دنیا نے اس زمانے میں ان باتوں کو جھٹلایا۔ لیکن دنیا جوں جوں، علم، تجربہ اور سائنٹیفک تحقیقات و انکشافات میں آگے بڑھتی جا رہی ہے، کیا وہ ان اصولوں کی طرف آ رہی ہے جو اس رسولؐ نے پیش کئے تھے یا ان نظریات کو صحیح تسلیم کر رہی ہے جو اس سے پہلے دنیا میں بطور مسلمات مانے جاتے تھے؟ کیا (قرآن کے الفاظ میں) انفس و آفاق کی شہادتیں، قرآنی حقائق کی تائید کر رہی ہیں یا تردید؟ اور کیا آج کا

اپنے ذہن کے وضع کردہ نظام زندگی کے ہاتھوں کا ستایا ہوا انسان' جس قسم کے نظام کو انسانیت کی نجات و سعادت کا ضامن سمجھ کر' اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے' وہ نظام وہی نہیں جسے اس رسولؐ نے یہ کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا کہ انسان کو آخر الامر اس کی طرف آنا پڑے گا۔

کیا یہ حقائق' اس رسولؐ کے اس دعویٰ کی صداقت نہیں کہ "میں جو کچھ کہتا ہوں وہ میرے اپنے ذہن کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ علم الہٰی ہے جو بذریعہ وحی مجھے دیا گیا ہے" **"وما ینطق عن الھوی[b] ان ھو الا وحی یوحی"** (۵۳/۳-۴)

خدا کرے کہ میری یہ معروضات' آپ کے لئے اس مرہم کا کام دیں جس کی آرزو میں آپ نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ لیکن اگر اب بھی کوئی بات وضاحت طلب رہ گئی ہو تو میں اس کی مزید تشریح کی بھی کوشش کروں گا **ھی حتی مطلع الفجر۔** (پرویز)

(مارچ ۱۹۶۵ء)

نوٹ :۔ اس ضمن میں قرآنی فیصلے حصہ اول' ایڈیشن سوم' مارچ ۹۲ء میں عنوان "کیا اقوام مغرب کو وحی کی ضرورت ہے" صفحہ ۵۱۴ بھی دیکھ لیجئے۔

۲۔ اطاعت رسولؐ کا مفہوم ـــــ احترام کا صحیح مفہوم

"اطاعت رسول" کا تفصیلی مفہوم "قرآنی فیصلے حصہ اول' ایڈیشن سوم' مارچ ۹۲ء صفحہ ۳۳۵ میں' "قرآن کا سیاسی نظام" کے زیر عنوان ملے گا۔ زیر نظر سوال ایک اور نوعیت کا ہے' اس لئے اس کا الگ جواب دیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ سوال اور جواب ملاحظہ فرمایئے۔

سوال :۔ اگست کے پرچے میں آپ نے سورۂ نساء کی آیت **فلا و ربک لا یومنون (۴/۶۵)** .... الخ درج کی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک رسولؐ اللہ کو اپنے معاملات میں حکم تسلیم نہ کریں اور پھر ان کے فیصلوں کے خلاف دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ اس کے باوجود آپ نے حضرت زیدؓ کا واقعہ درج کیا ہے کہ انہوں نے رسولؐ اللہ کے فرمانے کے باوجود اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔ لیکن اسے معصیت رسول نہ سمجھا گیا کیونکہ آپؐ نے ایسا اپنی ذاتی حیثیت سے فرمایا تھا۔ اس لئے حسب ذیل سوالات دل میں ابھرتے ہیں:۔

(ا) ہماری کتب احادیث میں رسولؐ اللہ کے کسی ارشاد کے ساتھ یہ تصریح نہیں ہوتی کہ اس بات کا حکم حضورؐ نے اپنی کس حیثیت سے دیا تھا۔ اس سے ایک تو یہ واضح ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا ہر قول وحی خداوندی تھا جس کی اطاعت واجب تھی' ان کا یہ کہنا صحیح نہیں۔ دوسرے یہ کہ جن احادیث کے متعلق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ صحیح ہیں' ان کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آپؐ نے وہ حکم اپنی ذاتی حیثیت سے بطور مشورہ دیا تھا یا

کسی اور حیثیت سے۔ اس لئے احادیث کی رو سے متعین طور پر اطاعت رسولؐ اللہ کیسے کی جا سکتی ہے؟

(۲) دوسرے یہ کہ رسولؐ اللہ کے فیصلے کے خلاف اگر کسی کے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس ہو، تو وہ شخص مومن نہیں رہتا۔ کیا یہ حیثیت کسی اور کو بھی حاصل ہو سکتی ہے؟

(۳) ہم اپنے کئی معاملات میں، دوسروں کے فیصلوں کو صحیح نہیں سمجھتے لیکن اس کے باوجود، متعدد وجوہات کی بناء پر، ان فیصلوں کو مان لیتے ہیں حالانکہ دل اس پر کڑھتا رہتا ہے، مثلاً" کسی زبردست کے ڈر سے یا اپنے کسی بڑے کے احترام کی وجہ سے وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ اطاعت کیسی ہو گی؟

جواب:۔ (ا) آپ نے صحیح سمجھا ہے۔ سنت کے سلسلہ میں اسی قسم کی دشواریاں ہیں جنہیں ہم مدت سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان کا اطمینان بخش جواب تو کہیں سے ملتا نہیں البتہ "منکر حدیث" اور منکر رسالت" کے فتوے ضرور صادر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس طرح یہ مسائل حل تو ہو نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ برسوں کی تگ و تاز کے باجود، ایسے قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکے (نہ ہی کبھی ہو سکتے ہیں) جنہیں یہ حضرات متفقہ طور پر مطابق "کتاب و سنت" قرار دیں۔ [ا] اس لئے کہ جب یہ حضرات متفقہ طور پر یہی طے نہیں کر سکتے کہ "سنت" کا اطلاق کس پر ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں کہ فلاں فیصلہ مطابق سنت ہے یا نہیں۔

(۲) اس سلسلہ میں پہلے یہ دیکھئے کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ ایمان کے معنی ہیں کسی بات کو دل کی پوری پوری رضا مندی کے ساتھ صحیح تسلیم کر لینا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی بات کے تسلیم کرنے میں دل کی رضا مندی شامل نہ ہو (دل میں اس کے خلاف گرانی پائی جائے) تو اسے ایمان کہا ہی نہیں جائے گا۔

دوسرے یہ کہ نبی پر ایمان لانے کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس بات کو دل کی پوری پوری رضا مندی کے ساتھ تسلیم کیا جائے کہ (i) نبی، خدا کے احکام کو صحیح صحیح طور پر ہم تک پہنچاتا ہے۔ اور (ii) اس کے فیصلے احکام خداوندی کے مطابق ہوتے ہیں۔ نبی پر ایمان لانے کے بعد، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے کسی فیصلے کے خلاف اگر دل میں گرانی محسوس ہو، تو یہ بات نبی پر ایمان کے خلاف ہو گی۔

نبی کے علاوہ، ہم کسی انسان پر ایمان لانے کے لئے مکلف نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ پوزیشن کسی اور کی نہیں ہو سکتی کہ اس کے فیصلے کے خلاف دل میں گرانی گذرے تو انسان کا ایمان جاتا رہے۔

البتہ ایک بات قابل غور ضرور ہے۔ ایک شخص آپ کے سامنے قرآن کریم کا کوئی فیصلہ پیش کرتا ہے۔ اسے آپ تسلیم تو کر لیتے ہیں لیکن دل کی کبیدگی کے ساتھ۔ آپ کی یہ کبیدگی اس شخص کے خلاف نہیں ہو گی، بلکہ در حقیقت قرآن کریم کے خلاف ہو گی۔ اور قرآن کریم پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف ہیں۔ اس لئے یہ چیز اس ذیل میں آجائے گی۔ البتہ اگر صورت یہ ہے کہ وہ فیصلہ قرآن کریم کے کسی اصول کے ماتحت اس شخص کا (یا کسی اور کا)

ا۔ مودودی صاحب کو بالآخر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رو سے تو کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ ملاحظہ ہو "ایشیا" مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء

اپنا استنباط ہے اور آپ اس سے متفق نہیں' تو اس کے خلاف دل میں کبیدگی پیدا ہو جانا خود قرآن کریم کے خلاف کبیدگی پیدا ہونے کے مراوف نہیں ہو گا۔

(۳) جن لوگوں کے فیصلوں کی اطاعت ہم کرھا" (مجبورا") کرتے ہیں (خواہ وہ مجبوری کسی قسم کی ہو۔ خود اپنے کسی مفاد کا خیال بھی تو مجبوری ہوتی ہے) اول تو اس کے لئے "اطاعت" کا لفظ ہی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ "اطاعت" اس فرماں پذیری کو کہتے ہیں جس میں دل کی رضا مندی شامل ہو لیکن ایسی "اطاعت" کے لئے جس میں دل کی رضا مندی شامل نہ ہو' احترام کا لفظ تو بالکل استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ احترام' اس تعظیم کو کہتے ہیں جو دل کے پورے خلوص اور رضا مندی کے ساتھ کی جائے۔ اگر آپ کسی کے فیصلے کے خلاف دل میں کبیدگی محسوس کرتے ہیں لیکن اسے کسی مصلحت کے تابع مان لیتے ہیں۔۔۔ مثلاً" کسی کے ڈر کی وجہ سے یا کسی کی ناراضگی کے خیال سے' تو یہ کہئے کہ میں نے اسے مصلحتاً تسلیم کر لیا۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ میں نے ان کے احترام کی وجہ سے اسے مان لیا' تو اس سے آپ ایسے جذبہ کا اظہار کر رہے ہیں جو فی الحقیقت آپ کے دل میں نہیں۔ یہ "احترام" ایسا ہی ہے جیسا ہمارے ہاں رمضان شریف کا "احترام" کیا جاتا ہے کہ دل میں یہ جذبات موجزن ہوتے ہیں کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی اور زبان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اس کے احترام میں لوگوں کے سامنے نہیں کھاتے پیتے۔ احترام اس کا ہے جو رمضان کے روزوں کو خدا کا حکم سمجھے اور اس حکم کے خلاف دل میں کوئی کبیدگی محسوس نہ کرے' لیکن (خدا ہی کی دی ہوئی اجازت کے ماتحت) اپنی کسی معذوری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے' اور حکم خداوندی کی تعظیم کے جذبہ کے ماتحت' کھلے بندوں نہ کھائیے پیئے' الا بحالت مجبوری۔ احترام اس شخص کا ہے کہ وہ کسی کے فیصلے کو اپنے کسی فائدے یا دل کے رجحان کے خلاف ہی کیوں نہ پائے لیکن اسکے باوجود اس بات پر یقین رکھنے کی وجہ سے کہ وہ حق و باطل اور غلط اور صحیح کو مجھ سے بہتر سمجھتا ہے' اس فیصلہ کے خلاف دل میں کوئی کبیدگی محسوس نہ کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس سے اس فیصلہ کی سند یا علت دریافت کر کے اپنا مزید اطمینان کر لے۔ جہاں یہ بات نہ ہو وہاں مصلحت ہوتی ہے' احترام نہیں ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ جب لوگوں کی حالت یہ ہو جائے کہ دل اور زبان میں ہم آہنگی نہ رہے' تو پھر وہ زبان سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جو دل کے جذبات کی ترجمانی کے لئے وضع ہوئے تھے حالانکہ ان کے دل کے جذبات ان الفاظ کی تائید نہیں کر رہے ہوتے۔ **یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم** (۳/۱۶۶) (وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا)۔ لیکن جب کسی معاشرہ میں الفاظ اپنا حقیقی مفہوم ہی کھو بیٹھیں' تو وہ معاشرہ (یوں سمجھئے کہ) زبان ہی کوئی دوسری بولنے لگ جاتا ہے۔ اس صورت میں اس معاشرہ کو اپنے ہاں کے مروجہ الفاظ کے معانی کے لئے لغات بھی نئی مرتب کرنی چاہئے تاکہ کسی کو لفظوں سے دھوکا نہ لگ سکے (لیکن یہ بحث الگ ہے اور ہمارے زیر نظر موضوع سے ہٹی ہوئی)۔

مومن' قرآنی مملکت کے فیصلوں کی (صحیح معنوں میں) اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے احکام کی اطاعت کراتی

ہے اور اس وجہ سے اس کا ان کے دل میں احترام ہوتا ہے۔ انہیں اگر کسی فیصلہ کی صحت کے بارے میں کچھ شبہ گزرے تو وہ اپنے اطمینان کی خاطر مملکت سے اس کی وضاحت کرا لیتے ہیں۔ اور اگر مملکت دیکھے کہ اس سے سہو ہو گیا ہے تو وہ فوراً" اپنی اصلاح کر لیتی ہے۔ (ستمبر۱۹۶۵ء)

۳۔ ختم نبوت کی اصولی بحث

مسئلہ ختم نبوت نے آج کل پھر غیر معمولی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ چاروں طرف اس کا شور ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ (۱۹۵۳ کے ہنگاموں کی طرح اب بھی) اس کا صحیح اور متعین مفہوم بہت کم لوگوں کے ذہن میں ہے۔ یہ مقدس موضوع' جو دین کی اصل و اساس ہے' اوائل عمر ہی سے میرا مرکز فکر اور محور نظر رہا ہے اور میں گزشتہ چالیس سال سے اس پر لکھتا اور بولتا چلا آرہا ہوں۔ میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت اور صحیح مفہوم نہایت مختصر الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا تمہیداً" ذکر کرنا ضروری ہے۔

(۲) ۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ ریاست بہاولپور کی ایک خاتون نے عدالت میں یہ دعوٰی دائر کیا کہ اس کا خاوند مرزائی ہو کر مرتد ہو گیا ہے' اس لئے اس کے ساتھ اس کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور مسلمانوں کی طرف سے اس دور کے چوٹی کے علماء حضرات شہادت کے لئے پیش ہوتے رہے۔ زیر بحث مسئلہ ختم نبوت تھا۔ نو سال تک یہ مقدمہ زیر سماعت رہا۔ اس کے بعد منشی محمدؐ اکبر (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاول نگر نے ۷/فروری ۱۹۳۵ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ اس زمانے میں بھی الگ شائع ہوا تھا اور اس کے بعد بھی شائع ہوتا رہا۔ حال ہی میں اسے "محفل ارشادیہ" سیالکوٹ نے پھر کتابی شکل میں شائع کیا ہے اور یہی نسخہ اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

محترم ڈسٹرکٹ جج نے اپنے فیصلے میں پہلے یہ لکھا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ-------

"مقام نبوت" کا کوئی جامع تصور ان کے سامنے آسکے۔ اس سلسلے میں علماء حضرات کی طرف سے نبی کی مختلف تعریفیں پیش ہوتی رہیں لیکن ان سے ان کا اطمینان نہ ہوا۔ آخر کار:۔

ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان "میکانکی اسلام" از جناب چوہدری غلام احمدؐ صاحب پرویز میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آج کل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلے میں نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے' میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس پر انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔" (صفحہ نمبر۱۰۷)

اس کے بعد فاضل جج نے میرے مضمون کو بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا اور اس کی بنیاد پر یہ فیصلہ دیا کہ۔

"مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے۔ لٰہذا' اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخ ارتداد مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے"۔ (صفحہ نمبر۱۸۲)

میں نے اس واقعہ کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا ہے کہ جب تک مقام نبوت یا نبی کی صحیح تعریف سامنے نہ ہو، مسئلہ ختم نبوت سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اسی کو میں ذیل میں مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

(۳) انسانی علم کا ذریعہ مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، تعلیم و تعلم اور درس و تدریس ہے۔ یہ ذرائع علم ہر شخص کے لئے کھلے ہیں اور جس کا جی چاہے اپنی محنت اور استعداد کے مطابق مطلوبہ علم حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن علم کا ایک اور ذریعہ ہے (یا تھا) جو ان ذرائع سے بالکل منفرد اور یکسر الگ تھا۔ اس علم کو خدائے تعالیٰ کسی منتخب ہستی کو براہ راست عطا کرتا تھا۔ اس میں نہ اس ہستی کی اپنی فکر کو کوئی دخل ہوتا تھا اور نہ ہی وہ اسے اپنی محنت اور کاوش سے حاصل کر سکتا تھا۔ اس علم کو وحی کہا جاتا ہے اور جس ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا، قرآن نے اسے نبی اور رسول کہہ کر پکارا ہے۔ نبی اور رسول ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ یوں سمجھئے کہ خدا کی طرف سے اس علم کو پانے کی جہت سے وہ نبی کہلاتا ہے اور اسے دوسرے انسانوں تک پہنچانے کی جہت سے رسول۔ بہرحال، ہر نبی رسول ہوتا تھا اور ہر رسول نبی۔

(۴) نبی کو جو علم خدا کی طرف سے ملتا تھا، اسے وحی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہی وحی اس نبی کی کتاب کہلاتی تھی۔ واضح رہے کہ اس کتاب کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ایک ضخیم جلد ہو۔ وحی کا ایک حکم بھی اس نبی کی کتاب کہلاتا تھا۔ کتاب کے معنی حکم یا قانون کے ہیں۔ لہٰذا، کوئی نبی بلا کتاب نہیں آتا تھا۔

(۵) قرآن کی رو سے نبوت کا یہ سلسلہ حضرت نوحؑ سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا۔ ہوتا یہ کہ ایک نبی آتا۔ وہ خدا کی وحی یا کتاب اپنی امت کو دے جاتا۔ اس کے بعد یا تو اس کے نام لیوا اس میں تحریف کر دیتے اور یا وہ دست برد زمانہ سے ضائع ہو جاتی۔ تو اس کے بعد ایک اور نبی مبعوث ہو جاتا۔ علم خداوندی کی رو سے سابقہ نبی کی وحی سے جو کچھ باقی رکھنا مقصود ہوتا، اس نبی کو وہ وحی بھی عطا کر دی جاتی اور اس کے علاوہ ضرورت کے مطابق مزید احکام بھی دے دیئے جاتے۔

(۶) یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا، تا آنکہ مشیت خداوندی نے یہ طے کیا کہ اب ایک ایسا ضابطہ حیات بذریعہ وحی نازل کردیا جائے جو تمام انسانوں کے لئے...... قیامت تک کے لئے، زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کے لئے کافی اور وافی ہو۔ یہ ضابطہ حیات قرآن کریم ہے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ اس ضابطہ کے متعلق خود خدائے تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ **وتمت کلمت ربک صدقا و عدلا لا مبدل لکلمتہ** (۶/۱۱۶) "تیرے رب کی باتیں صدق اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب انہیں تبدیل کرنے والا کوئی نہیں"۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ **انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحفظون** (۱۵/۹) "ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور اس کی حفاظت بھی ہمارے ذمے ہے"۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ

(۱) قرآن کریم قیامت تک تمام نوع انسان کے لئے ضابطہ حیات ہے۔

(۲) یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی اور
(۳) اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے ضابطہ ہدایت کی موجودگی میں قیامت تک وحی خداوندی کی ضرورت نہیں پڑسکتی۔ بالفاظ دیگر' اس ضابطہ ہدایت کی تکمیل کے ساتھ سلسلہ نبوت کا خاتمہ ہوگیا--- یہ خدا کی آخری کتاب ہے اور جس ذات گرامیؐ پر یہ کتاب نازل ہوئی تھی' وہ خدا کا آخری نبیؐ--- نہ اس وحی کے بعد کسی اور وحی کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس نبیؐ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کی گنجائش۔ قرآن خاتم الکتب ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین جو شخص حضورؐ کے بعد اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ اسے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے' وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹا ہے' خدا پر افترا کرتا ہے اور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں انتہائی گستاخی۔ کیونکہ وحی کے دعویٰ سے وہ (معاذ اللہ) حضورؐ کا ہمسر ہونے کا مدعی ہوجاتا ہے۔ یہ کہنا کہ کسی کو حضورؐ کی اطاعت سے نبوت مل سکتی ہے' مقام نبوت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے' نبوت صرف خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی اور حضورؐ کی ذات گرامی پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ نبوت کی مختلف قسمیں نہیں ہوتیں۔ ظلی' بروزی' حلولی وغیرہ یہ اصطلاحات مجوسیوں کی وضع کردہ ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔

(۷) ایک رسول خدا کی وحی کو انسانوں تک پہنچاتا ہی نہیں تھا' بلکہ وہ ایک امت کی تشکیل کرتا تھا جو اس وحی کے مطابق ایک نیا نظام وجود میں لاتی تھی۔ یہ امت اس نبی کی طرف نسبت سے متشکل ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لاتا ہے وہ امت عیسوی کا فرد قرار پاتا ہے۔ جب تک وہ حضرت عیسیٰؑ کو آخری نبی مانتا ہے وہ اس امت کا فرد رہتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک اور نبی--- (یعنی نبی اکرمؐ) کی نبوت پر ایمان لے آتا ہے' وہ امت عیسوی سے کٹ کر امت محمدیہؐ میں داخل ہوجاتا ہے۔ حالانکہ وہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ کو بھی خدا کا نبی مانتا ہے۔ اس مثال سے یہ واضح ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو نبی تسلیم کرلیتا ہے تو وہ امت محمدیہؐ سے کٹ کر اس نئے نبی کی امت میں شامل ہوجاتا ہے' خواہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بھی ایمان کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے خدا کے آخری نبیؐ کی طرف نسبت سے بننے والی امت' دین کے نقطہ نگاہ سے آخری امت ہوتی ہے--- اسی امت کو مسلمان کہا جاتا ہے--- اس سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرتا ہے تو اسے مسلمان نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔ نہ ہی اسے مسلمان قرار دیا جاسکتا ہے جو اس مدعی نبوت کو مسلمان کہے۔

(۸) یہ ہے قرآن کریم کی روشنی میں ختم نبوت کا مفہوم' منطوق اور اس کا عملی نتیجہ۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں نہ کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے نہ بحث و تمحیص کی ضرورت۔ بات بالکل واضح ہے۔

(۹) میں نے اس جگہ اس اہم مسئلے پر نہایت مختصر الفاظ میں گفتگو کی ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر میں نے

۲ے خواہ وہ اس کا اصطلاحی نام کچھ اور بھی کیوں نہ رکھ لے۔ (پرویز)

اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف مرتب کی ہے جو اس وقت کتابت و طباعت کے ابتدائی مراحل میں ہے۔ اس میں ان نکات کی پوری پوری تفصیل آجائے گی[۳]۔ ویسے میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب ـــــ "شاہکار رسالت' عمر فاروقؓ" ـــ کے آخری باب میں بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

میں اس مقالہ کو ان الفاظ پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو میری مایہ ناز تصنیف "معراج انسانیت" کے افتتاحیہ کا مقطع کا بند ہیں اور میرے لئے باعث صد فخر و سعادت۔

> "خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا' آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے' وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعل راہ کی ضرورت رہی اور نہ کسی اور ہادی طریقت کی احتیاج۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذات اقدس و اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ ؎

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفیٰؐ رو

(جولائی ۱۹۷۴ء) (پرویز)

۴- دین اللہ یا دین الرسول

ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ترجمان' ماہنامہ "فکر و نظر" کی مئی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ـــــ قرآن کریم کے سیاسی مبادیات ـــــ اس مقالہ میں ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو قرآن کریم کے خلاف ہے اور اس کی زد دین کی اساسات پر پڑتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم نے اس کا تعاقب ضروری سمجھا ہے۔ اس میں تحریر ہے:

> دین کے معنی مذہب کے ہیں[۴]۔ لیکن دین کا استعمال ملت سے وسیع تر معنوں میں ہوتا ہے۔ دین کی نسبت پیغمبر اور خدا دونوں کی طرف کی جاسکتی ہے۔ قرآن مجید میں دین اللہ اور دین ابراہیم کی ترکیب متعدد جگہ آتی ہے۔ لیکن ملت اللہ کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نظر نہیں آیا۔ ملت کا تعلق فقط نبی سے ہے اور دین کی اضافت نبی اور اللہ

۳۔ یہ کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (نومبر ۱۹۷۶ء)

۴۔ دین کے معنی مذہب کے نہیں ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر وہ دوسرا نکتہ ہے جسے ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

دونوں کی طرف ہوسکتی ہے۔
یہ صحیح نہیں کہ "قرآن مجید میں دین اللہ اور دین ابراہیم کی ترکیب متعدد جگہ آئی ہے۔ "متعدد جگہ" تو ایک طرف، قرآن مجید میں کہیں ایک جگہ بھی "دین ابراہیم" کی ترکیب نہیں آئی۔ اور یہ بات حضرت ابراہیمؑ تک ہی محدود نہیں، قرآن مجید میں کہیں بھی دین کی نسبت کسی نبی کی طرف نہیں کی گئی۔ ہر جگہ دین کی نسبت خدا ہی کی طرف کی گئی ہے اور یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ دین خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ رسول، خدا کے دین کو انسانوں تک پہنچاتا ہے اور خود بھی اس کا متبع ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی رو سے 'دین کی نسبت یا اضافت نبی کی طرف نہیں کی جاسکتی۔
البتہ جب کوئی شخص یا قوم، خدا کے دین کو اختیار کرلے، تو قرآن میں اسے "اس کا دین" (دینہ یا دینھم) کہا گیا ہے۔ اسی جہت سے ایک نبی بھی اس دین کو **دینی** (میرا دین) کہہ سکتا ہے جسے وہ خدا کی طرف سے پاکر، خود بھی اختیار کرتا ہے اور دنیا کے سامنے بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً" سورۂ یونس میں ہے **قل یایھا الناس ان کنتم فی شک من دینی** ....(۱۰/۱۰۴) "اے نوع انسان! اگر تم میرے دین کے متعلق کسی قسم کے شک میں ہو تو..... یعنی اس دین کے متعلق جسے میں پیش کرتا ہوں۔ (اگست ۱۹۷۱ء)

۵۔ رسول اللہؐ پر (معاذ اللہ) جادو

ہفت روزہ توحید (لاہور) جماعت اہل حدیث کا ترجمان ہے۔ یہ جماعت بدعتیں مٹانے اور اسلام سے توہمات ختم کرنے کی مدعی ہے۔ اس جریدہ کی ۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں، حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظم کے متعلق لکھا ہے:

> مدینہ کے یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی دفعہ جادو کیا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ بالآخر، انہوں نے ایک ماہر جادوگر کی خدمات حاصل کیں۔ حافظ صاحب نے فتح الباری میں اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔
> جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماہ ذوالحجہ میں حدیبیہ سے واپس تشریف لائے اور محرم سے ۷ھ کا آغاز ہوا تو سرکردہ یہودی ایک جادوگر لبید بن اعصم کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے:
> **یا ابا الاعصم انت اسحرنا وقد سحرنا محمدا فلم نصنع شیا ونحن نجعل لک جعلا علی انہ تسحرہ سحرینکوہ فجعلوا لہ ثلثتہ دنانیر۔**
> ترجمہ: اے ابوالاعصم! ہم نے محمدؐ پر جادو کیا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوسکے۔ تم جادو میں ہم سب سے زیادہ ماہر ہو۔ اس لئے اس پر کوئی مہلک جادو کرو۔ ہم آپ کا حق الخدمت ادا کئے دیتے ہیں۔ راوی کا بیان ہے اس کام کے لئے انہوں نے اس کو تین

اشرفی معاوضہ دیا"۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں

لبید نے موم لے کر آپ کا مجسمہ بنایا۔ اس میں جگہ جگہ سوئیاں گاڑ دیں۔ پھر ایک تانت لے کر اس میں گیارہ گرہیں لگائیں اور جادو پھونک کر اس پتلے پر لپیٹ دی۔ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ اس نے کسی طرح آپ کے سر کے بال حاصل کئے۔ ان کو کنگھی کے دانوں میں پھنسا کر جادو کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ دونوں طریقے استعمال کئے اور جادو کا عمل مکمل کرنے کے بعد کھجور کے گابھے کے چھلکے میں رکھ کر غیر آباد کنوئیں ذی اروان کی تہ میں چھپا دیا۔

اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے، آپ کی طبیعت بگڑنے لگی اور آپ پر بیماری کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ کی بصارت پر بھی اثر پڑا۔ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات میں بھی فرق آگیا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں:

مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اخذ عن النساء والطعام والشراب

(فتح الباری ۴۲۵/۲۴)

عن عائشۃ حتی انکر بصرہ (حوالہ مذکور)

کم و بیش آپ چھ مہینے تک متاثر رہے۔ جب تکلیف بڑھنے لگی تو ایک رات آپ نے اللہ تعالیٰ سے بار بار دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خواب میں فرشتوں کی معرفت جادو کی خبر بتا دی۔ چنانچہ آپ دوسرے دن صحابہؓ کی ایک جماعت لے کر کنوئیں پر گئے۔ اس کی تہ سے جادو شدہ پتلہ اور کنگھی نکالی۔ آپ معوذ تین پڑھتے جاتے تھے اور تانت سے گرہیں کھولتے اور پتلے سے سوئیاں نکالتے جاتے تھے۔ جب سوئی نکالتے، تو آپ کو تکلیف محسوس ہوتی لیکن اس کے بعد فوراً آرام آجاتا حتی کہ جب آپ نے وہ تمام عمل باطل کردیا تو فی الفور آپ کے تمام عوارض دور ہوگئے۔

حتی قام کانما نشط من عقال

"جیسے کوئی آدمی رسیوں میں بندھا ہوا ہو اور اس کی رسیاں کھول دی جائیں"۔

طلوع اسلام

قرآن کریم میں ہے کہ مخالفین (کفار اور مشرکین) حضورؐ کے خلاف مختلف قسم کے بہتان تراشتے۔ کبھی آپ کو ساحر، کبھی شاعر، کبھی مجنوں کہتے کبھی مسحور---- سورۂ فرقان میں ہے:

وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلا مسحورا انظر کیف ضربوا لک
الامثال فضلوا فلا یستطیعون سبیلا (۹-۸/۲۵)
اور یہ ظالم (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر
کسی نے جادو کردیا ہے۔ دیکھو! یہ تمہارے خلاف کس کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ
گمراہ ہو چکے ہیں اور اب (صحیح) راستہ پا نہیں سکتے۔

یعنی کفار اور مشرکین حضورؐ کے خلاف یہ بہتان بھی تراشتے کہ آپؐ پر (معاذ اللہ) کسی نے جادو کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتا ہے کہ یہ لوگ بکتے ہیں اور گمراہ ہو چکے ہیں۔

اور یہ ہمارے "حامیان دین متین" ہیں کہ بخاری شریف کے حوالے اور فتح الباری کی تائید کے ساتھ دھڑلے سے، خم ٹھونک کر کہتے ہیں کہ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ آپ پر جادو کیا گیا تھا اور اس کا آپؐ پر اثر بھی ہوا تھا' یعنی آپؐ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) "رجل مسحور" تھے۔

غور فرمایا آپ نے کہ یہ حضرات خدا اور اس کے رسول کے متعلق کس قسم کا تصور پیش کرتے ہیں؟ اور اگر کسی کی غیرت ایمانی اسے گوارا نہ کرے کہ وہ اپنے رسولؐ مقبول کی شان اقدس کے خلاف اس قسم کی باتوں کو سچا سمجھے (بالخصوص جب خود خدا اس کی تردید کر رہا ہو) اور کہہ دے کہ اس قسم کی روایات وضعی ہیں' تو اسے "منکر حدیث" قرار دے کر' ملحد و مرتد (اور نہ جانے کیا کچھ) قرار دے دیا جائے! حقیقت یہ ہے کہ

از باغباں شد است کہ صیاد آں نہ کرد

(جون ۱۹۶۹ء)

۶۔ معراج شریف کس سال اور کس ماہ میں ہوا؟

روزنامہ "کوہستان" کے معراج النبیؐ نمبر (۱۹۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء) میں' مولانا احمد علیؒ کا ایک مضمون "معراج سید الانبیاء علیہ الصلوۃ والسلام" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے

اختلاف روایات

معراج شریف کس سال ہوا

سال	حوالہ کتاب
ہجرت کے چھ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری شرح بخاری باب معراج
ہجرت کے آٹھ ماہ پہلے ہوا	" " " " "
ہجرت سے گیارہ ماہ پہلے ہوا	" " " " "

ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا	فتح الباری و عینی شرح البخاری
ہجرت سے چودہ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری
ہجرت سے پندرہ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری و عینی شرح البخاری
ہجرت سے سترہ ماہ پہلے ہوا	" " " " "
ہجرت سے اٹھارہ ماہ پہلے ہوا	" " " " "
ہجرت سے تین سال پہلے ہوا	عینی شرح البخاری
ہجرت سے آٹھ سال پہلے ہوا	" " "

اختلاف روایات

معراج شریف کس ماہ میں ہوا

نام ماہ		حوالہ کتاب
ہجرت کے چھ ماہ پہلے ہوا	شوال	فتح الباری و عینی شرح البخاری
ہجرت کے آٹھ ماہ پہلے ہوا	ذی الحجہ	" " " "
ہجرت کے گیارہ ماہ پہلے ہوا	ربیع الاول	" " " "
ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا	ربیع الاخر	فتح الباری
ہجرت سے چودہ ماہ پہلے ہوا	رجب	فتح الباری و عینی
ہجرت سے پندرہ ماہ پہلے ہوا		شرح البخاری
ہجرت سے سترہ ماہ پہلے ہوا	رمضان	فتح الباری

یہ اختلاف

(۱) اس واقعہ کے ضمن میں ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب حضورؐ نے اسے بیان فرمایا تو کفار نے اس پر بڑے اعتراض کئے اور اس طرح اس کا چرچا عام ہوگیا۔ اور

(۲) اختلافات، مختلف کتب روایات و سیر سے نہیں لئے گئے، احادیث کی معتبر ترین کتاب۔۔۔ بخاری۔۔۔ اور اس کی شرح سے لئے گئے ہیں۔

اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری (کتب تاریخ میں نہیں بلکہ) کتب احادیث تک میں، خود عہد رسالتمابؐ کے اہم ترین واقعات کے متعلق بھی جو کچھ مذکور ہے اس میں کس قدر تضاد ہے۔ (دسمبر ۱۹۶۸ء)

۷۔ رسولؐ اللہ اور تفسیر قرآن مجید

ہفتہ وار المنبر (لائل پور) کی ۱۸-۲۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر "امام غزالی کی نکتہ چینی" کے

عنوان سے، حسب ذیل الفاظ شائع ہوئے ہیں

امام غزالیؒ نہ صرف یہ کہ تفسیر بالرائے کرنے والوں کی تائید کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں جو صحابہؓ اور تابعینؒ سے منقول تفسیر کو پسند کرتے ہیں اور اس سے تجاوز نہیں کرتے۔ غزالیؒ کے وجوہ تنقید مندرجہ ذیل امور ہیں۔

(۱) اگر یہ درست ہے کہ آنحضرتؐ نے قرآن کریم کی ساری تفسیر بیان فرما دی ہے تو ضروری ہے کہ سلف سے جو کچھ بھی تفسیر کے سلسلہ میں مروی ہے، وہ سند صحیح کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو اور سب کا سب آپؐ سے سنا ہو۔ لیکن یہ بات قرآن کے صرف بعض حصوں کے بارے میں تو درست ہے، سارے قرآن کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اور جب صورت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی سارے قرآن کی تفسیر کا صرف کچھ حصہ ہی ہم تک پہنچا تو ہمیں چاہئے کہ باقی حصہ کے بارے میں آنحضرتؐ سے منقول تفسیر کی روشنی میں ہم تفسیر سمجھنے کی کوشش کریں۔

(۲) یہ کہ صحابہؓ سے منقول جو تفسیر مرفوعاً ثابت نہیں، لا محالہ اسے تفسیر بالرائے قرار دیا جائے گا۔ اور جب انہوں نے ایک طرح ڈال دی ہے تو مناسب ہے کہ ہم بھی ان کے راستہ پر چلیں اور تفسیر میں ان کے افکار و آراء سے بھی اسی طرح مستفید ہوں جس طرح فقہ میں ان سے استفادہ کرتے اور عربیت میں ان کو حجت سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی اس امر میں مانع نہیں ہے کہ ہم قرآن کو اپنے اجتہاد سے سمجھنے کی کوشش کریں بشرطیکہ صحیح علمی بنیادوں پر قرآن فہمی کی قابلیت کسی شخص میں پیدا ہوچکی ہو۔

طلوع اسلام : اس کے باوجود ان حضرات کی عملی کیفیت یہ ہے کہ اگر آج کوئی شخص اپنے اجتہاد سے قرآن کی تفسیر کرتا ہے تو یہ اس کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جاتے ہیں کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سلف صالحین کی تفسیر کے خلاف ہے۔ (دسمبر ۱۹۶۸ء)

۸۔ روایات پرکھنے کا معیار قرآن مجید نہیں

احادیث کے متعلق قرآنی فیصلے حصہ اول، باب دہم، ایڈیشن سوم، مارچ ۹۲ء میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے، لیکن ذیل کا تبصرہ اپنی نوعیت کا منفرد ہے۔ اس لئے اسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ آپ اسے غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

جماعت اہل حدیث کے ترجمان، الاعتصام (لاہور) کی ۲۳ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

"دسمبر ۱۹۶۵ء کے رسالہ "فکر و نظر" راولپنڈی میں لکھا گیا ہے "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

اذا روی عنی حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ فان وافقہ فاقبلوہ والا تذروہ (؟)"

"جب کوئی حدیث میری نسبت بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو۔ اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو، ورنہ اسے چھوڑ دو۔

واضح رہے کہ یہ بات جو مقالہ نگار نے لکھی ہے جتنی بڑی شہرت پذیر ہے اسی قدر یہ بڑا جھوٹ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ لگایا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ روایت گھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی، اسی دور میں ماہرین فن حدیث ائمہ کرامؒ نے ببانگ دہل اعلان کردیا تھا کہ یہ ہرگز ہرگز فرمان رسولؐ نہیں بلکہ یہ عبارت زنادقہ (گمراہ لوگوں) کی وضع کردہ ہے۔چنانچہ چوتھی صدی کے نامور فقیہ و محدث امام خطابی نے صراحت فرمائی ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات للفتنی ص۲۸ و مولانا محمد عبدالحیٔ لکھنوی حنفیؒ کی ظفر الامانی ص۲۶۷۔ نیز دیکھئے جامع بیان العلم ابن عبدالبر، ص۱۹۱ جلد۲) امید ہے کہ محترم مقالہ نگار (ڈاکٹر معصومی صاحب) آئندہ احتیاط فرمائیں گے"۔

طلوع اسلام

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے نزدیک، احادیث کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ یعنی اگر کوئی حدیث قرآن کے مطابق ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ رسولؐ اللہ کی نہیں اور اگر وہ قرآن کے خلاف ہے تو اسے صحیح سمجھئے **انا للہ وانا الیہ راجعون!**

اور یہ کچھ اس ذات اقدس و اعظمؐ کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کا یہ اعلان خود قرآن کریم میں موجود ہے کہ **ان اتبع الا ما یوحی الی** (۴۶/۹) میں تو اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے (مارچ ۱۹۷۰ء)

۹۔ روایات میں جنت کی تفصیل

سوال : قرآن شریف میں جنت کی بعض تفاصیل کا ذکر ہے۔ کیا حدیثوں میں بھی جنت کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تفاصیل کیا ہیں؟

جواب : احادیث میں جنت کی بڑی تفاصیل دی گئی ہیں۔ ان سب کو یہاں درج کرنا مشکل ہے۔ چند ایک تفاصیل بطور نمونہ درج ذیل کی جاتی ہیں۔ یہ احادیث، مشکوۃ شریف کے اس اردو ترجمہ سے لی گئی ہیں، جسے مولوی نور

محمدؐ کارخانہ تجارت کتب، کراچی نے شائع کیا ہے۔ یہ اس کتاب کی دوسری جلد کے صفحات ۳۲۶ لغایت ۳۳۲ پر درج ہیں۔ ہر حدیث سے پہلے اس کا نمبر شمار بھی دیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے

(۵۳۴۴) ابی ہریرہؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں ایک درخت ہے۔ اگر کوئی سوار اس کے سایہ میں سو برس تک چلتا رہے تب بھی وہ سایہ ختم نہ کر سکے۔ اور جنت میں تمہاری کمان کی برابر جگہ ان تمام چیزوں سے بہتر و برتر ہے جن پر آفتاب طلوع یا غروب ہوتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

(۵۳۴۵) ابی موسیٰؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں مومن کے لئے ایک خالی موتی کا ایک خیمہ ہوگا جس کا عرض (ایک روایت میں ہے جس کا طول) ساٹھ کوس کا ہوگا۔ اس خیمہ کے ہر گوشے میں اس کی بیویاں وغیرہ ہوں گی اور ایک گوشے کے آدمی دوسرے گوشہ کے آدمیوں کو نہ دیکھ سکیں گے۔ ان سب گھروں میں مسلمان چلتا پھرتا رہے گا۔ اور مومن کے لئے دو جنتیں ہوں گی جن کے برتن اور تمام چیزیں چاندی کی ہوں گی اور دو جنتیں سونے کی، جن کے برتن اور تمام چیزیں سونے کی ہوں گی۔ اور لوگوں اور ان کے پروردگار کے درمیان بزرگی و عظمت باری کا صرف ایک پردہ حائل ہوگا (یعنی) جنت عدن کے اندر۔ (بخاری و مسلم)

(۵۳۴۶) انسؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں ایک بازار ہے جس میں جمعہ کو جنتی جمع ہوں گے اور وہاں شمالی ہوا چلے گی جو جنتیوں کے منہ اور کپڑوں پر خوشبو ڈالے گی اور اس کے حسن و جمال میں زیادتی ہو جائے گی۔ پھر جب وہ زیادہ حسین و جمیل بن کر اپنی بیویوں کے پاس جائیں گے تو ان کی بیویاں کہیں گی قسم ہے خدا تعالیٰ کی! ہم سے جدا ہو کر تم نے اپنے حسن و جمال کو بڑھا لیا۔ اس کے جواب میں وہ کہیں گے، اور ہمارے بعد تمہارے حسن و جمال میں زیادتی ہوگی۔ (مسلم)

(۵۳۴۷) ابی ہریرہؓ کہتے ہیں رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے جو لوگ جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے، وہ چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوں گے اور ان کے بعد جو جماعت داخل ہوگی، وہ اس روشن ستارے کی مانند ہوگی جو سورج اور چاند سے کم اور دوسرے ستاروں سے زیادہ روشن ہے۔ اور جنتیوں کے دل ایک شخص کے دل کی مانند ہوں گے، یعنی نہ تو ان میں اختلاف ہوگا اور نہ بغض و عداوت۔ اور جنت میں ہر جنتی کی دو بیویاں حورعین میں سے ہوں گی جن کی پنڈلیوں کا گودا، ہڈی اور گوشت کے اندر نظر آتا ہوگا (یعنی وہ اس قدر حسین ہوں گی کہ ان کا گودا ہڈیوں اور گوشت کے اندر سے دکھائی دے گا)۔ جنتی صبح و شام اللہ تعالیٰ کو یاد کریں گے۔ نہ تو بیمار ہوں گے، نہ پیشاب کریں گے نہ پائخانہ پھریں گے، نہ تھوکیں گے اور نہ رینٹھ سنکیں گے۔ اور جنتیوں کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے۔ ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی۔ ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن اگر ہوگا۔ ان کا پسینہ مشک ہوگا اور سارے جنتی ایک شخص کی سیرت و عادت پر ہوں گے اور صورت میں اپنے باپ آدمؑ کی شکل پر اور ان کا قد ساٹھ گز اونچا ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

(۵۳۴۸) جابرؓ کہتے ہیں، رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے جنتی جنت میں کھائیں گے اور پئیں گے، لیکن نہ تو تھوکیں

گے' نہ پیشاب کریں گے' نہ پاخانہ پھریں گے اور نہ رینٹھ سنکیں گے۔ صحابہ نے پوچھا کھانے کا فضلہ کیا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا ڈکار ہوجائے گا اور پسینہ مشک کی خوشبو کی مانند--- اور سبحان اللہ والحمد للہ کہنا جنتیوں کے دل میں ڈال دیا جائے گا اور وہ اس طرح ان کی زبان پر رواں ہوگا جیسے سانس جاری ہے۔ (مسلم)

(۵۳۵۸) ابی ہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جنت میں جو درخت بھی ہے' اس کا تنا سونے کا ہے۔ (ترمذی)

(۵۳۶۱) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے خداوند تعالیٰ کے اس قول "وفرش مرفوعہ" کے متعلق فرمایا کہ ان بچھونوں کی بلندی اتنی ہوگی جتنی کہ آسمان و زمین کے درمیان مسافت ہے' یعنی پانچ سو برس کا راستہ۔ (ترمذی)

(۵۳۶۴) انسؓ کہتے ہیں نبی صلعم نے فرمایا ہے جنت میں مومن کو جماع کی اتنی قوت عطا کی جائے گی (یعنی مثلاً" دس عورتوں سے جماع کرنے کے وقت)۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ صلعم! کیا مرد کو اتنی عورتوں سے جماع کرنے کی قوت ہوگی؟ فرمایا' جب مرد کو سو مردوں کے برابر قوت عطا کی جائے گی تو پھر وہ کیوں اتنی عورتوں سے جماع کی قوت نہ رکھ سکے گا۔ (ترمذی)

(۵۳۷۰) ابی ایوبؓ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسولؐ اللہ! میں گھوڑوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ کیا جنت میں گھوڑے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا اگر تجھ کو جنت میں داخل کیا گیا تو تجھ کو یاقوت کا ایک گھوڑا دیا جائے گا جس کے دو بازو (پر) ہوں گے۔ پھر تجھ کو اس پر سوار کیا جائے گا اور جہاں تو جانا چاہے گا' یہ گھوڑا تجھ کو اڑا کر لے جائے گا۔ (ترمذی)

(۵۳۷۵) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے ادنیٰ درجہ کا جنتی وہ ہوگا جس کے پاس اسی ہزار خادم ہوں گے اور بہتر (۷۲) بیویاں۔ اور اس کے لئے موتی' زبرجد اور یاقوت کا خیمہ ہوگا اتنا بڑا جتنی مسافت کہ جابیہ اور صفا کے درمیان ہے۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنتیوں میں سے جو لوگ دنیا کے اندر مریں (یعنی وہ لوگ جو جنت میں جائیں گے) خواہ وہ چھوٹی عمر کے ہوں یا بڑی عمر کے' جنت کے اندر تیس سال کی عمر کے ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ ان کی عمر نہ ہوگی' اور اسی طرح دوزخی۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضور صلعم نے فرمایا ہے جنتیوں کے سر پر تاج رکھے ہوں گے اور ان تاجوں کا معمولی موتی ایسا ہوگا جو مشرق و مغرب کے درمیان کو روشن کردے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ جب جنتی جنت کے اندر اولاد کا خواہشمند ہوگا' تو حمل اور بچہ کی (تیس سال کی) عمر ایک ساعت میں وقوع پذیر ہوگی (یعنی یہ سب باتیں ایک ساعت کے اندر عمل میں آجائیں گی اور تیس سال کا بچہ پیدا ہو جائے گا)۔ ابو اسحٰق بن ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ جنتی کی اس خواہش کا پورا ہونا ممکن تو ہے لیکن وہ ایسی خواہش نہیں کرے گا۔ (ترمذی' یہ حدیث غریب ہے)

(۵۳۷۸) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں مرد ستر مسندوں پر تکیہ لگا کر بیٹھے گا اور یہ صرف ایک پہلو پر ہوں گے (دوسرے پہلو پر اور طرح طرح کی مسند اور تکئے ہوں گے)۔ پھر جنت کی عورتوں میں سے

ایک عورت اس کے پاس آئے گی اور اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس کے کاندھے پر ٹھوکا دے گی۔ مرد اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اس کے رخساروں میں جو آئینہ سے زیادہ صاف و روشن ہوں گے' اپنا چہرہ دیکھے گا۔ اور اس عورت کا معمولی سا موتی (اتنا بیش قیمت ہوگا کہ) مشرق و مغرب کے درمیان کو روشن کردے گا۔ یہ عورت اس مرد کو سلام کرے گی اور مرد اس کے سلام کا جواب دے گا اور پوچھے گا کہ تو کون ہے؟ وہ عورت کہے گی' میں مزید۵ میں سے ہوں (یعنی ان چیزوں میں سے جو خداوند تعالیٰ جنتیوں کو اپنے پاس سے اور دے گا)۔ اس عورت کے جسم پر ستر کپڑے (رنگ برنگ کے) ہوں گے جن کے اندر سے اس کا جسم نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ اس کی پنڈلی کا گودا تک بھی دکھائی دے گا۔ اور اس کے سر پر تاج ہوں گے جن کا ایک معمولی موتی مشرق و مغرب کے درمیان کو روشن کردے گا۔ (احمد)

ایک اور

آخر میں ایک روایت تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ لکھا ہے:

> حضرت ابو طیبہؒ فرماتے ہیں کہ جنتیوں کے سروں پر ابر آئے گا اور انہیں ندا ہوگی کہ بتلاؤ! کس چیز کا برسنا چاہتے ہو۔ پس جو لوگ جس چیز کا برسنا چاہیں گے' وہی چیز ان پر اس بادل سے برسے گی۔ یہاں تک کہ کہیں گے کہ ہم پر ابھرے ہوئے سینے والی ہم عمر عورتیں برسائی جائیں۔ چنانچہ وہی برسیں گی۔ اسی لئے فرمایا کہ فضل کبیر' زبردست کامیابی' کامل نعمت یہی ہے۔
>
> (اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر از مولانا محمد جونا گڑھی' پارہ ۲۵' ص۱۱)

یہ ہیں وہ احادیث جنہیں منسوب کیا جاتا ہے حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف! یا للعجب (اگست ۱۹۶۵ء)

۱۰۔ ذبح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

ہمارا مذہب پرست طبقہ اگر طوعاً" قرآن کریم کی طرف نہیں آتا تو اسے کرہاً" اس طرف آنا پڑتا ہے اگرچہ--- بعد از خرابی بسیار--- اور کرہاً" سے مراد یہ ہے کہ جوں جوں علم و بصیرت کی روشنی پھیلتی ہے' دنیا توہم پرستیوں سے متنفر ہو کر عقل و فکر کی رو سے بات سمجھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔

ہمارے ہاں یہ عقیدہ مسلسل چلا آرہا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے (حضرت اسمٰعیلؑ) کو خدا کی راہ میں قربان کردیں--- چنانچہ انہوں نے اس حکم کی تعمیل میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لٹا

۵۔ قرآن مجید میں ہے هم ما يشاؤن فيها ولدينا مزيد جنت میں جنتیوں کو ہر وہ چیز ملے گی جس کے وہ خواہشمند ہوں گے اور اس کے علاوہ ہماری طرف سے اور زیادہ دیا جائے گا کہ اسی کی طرف ان الفاظ کا اشارہ ہے۔ ۱۲۔ مترجم۔

دیا اور خدا نے اسے بچالیا اور اس کی جگہ جانور کی قربانی کا حکم دے دیا۔

عرصہ ہوا' پرویز صاحب نے اس سلسلہ میں لکھا کہ وہ خواب' حضرت ابراہیمؑ کے اپنے خیالات کا عکاس تھا' خدا کی طرف سے نہیں تھا۔ خدا کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ انسانوں کی قربانی کا حکم دے گا' بڑی زیادتی ہے۔ باقی رہا حضرت اسمٰعیلؑ کا "ذبح عظیم" ہونا' تو اس سے مراد یہ تھی کہ انہیں اور ان کی ذریت کو وادی غیر ذی زرع میں خانہ خدا کی تولیت کے لئے وقف کردیا جائے۔ اس پر ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جو طوفان برپا کیا گیا' وہ ان فتاویٰ سے ظاہر ہے جو پرویز صاحب کے خلاف صادر کئے گئے تھے۔

اور اب یہ طبقہ خود اس طرف آرہا ہے۔ گزشتہ عید الاضحیٰ کی تقریب پر نوائے وقت (لاہور) کی ۱۴ دسمبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں' مولانا محمد عنایت اللہ وارثی کے قلم سے ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے پہلے یہ بتایا ہے کہ جس زمانے میں حضرت ابراہیمؑ کی بعثت ہوئی' ان کی قوم (بلکہ ساری دنیا) کس کس قسم کی جہالتوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک "رسم بد" انسانوں کو (بزعم خویش) خدا کی راہ میں قربان کردینا بھی تھا۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے:

> ایسے موقع پر ملک کے سب سے بڑے پروہت' شاہی بت خانوں کے مہتمم اور منتظم اعلیٰ آزر کے بیٹے ابراہیمؑ نے آخری عمر میں اپنے ایک تمثیلی خواب کو عینی خواب تصور کرکے اکلوتے نوجوان بیٹے اسمٰعیلؑ کو چھیانوے سال کی عمر میں اطاعت کے سچے جذبہ کے تحت ذبح کرنے کی کوشش کی' لیکن قدرت کو اس خواب میں اسماعیلؑ کو خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کردینے کا اشارہ مقصود تھا اور انسانی قربانی کی اس بد رسمی کو جس میں ایک اشرف مخلوق انسان کو خدا کی راہ میں جہاد کرکے شہادت کا رتبہ بلند حاصل کرنے اور کلمتہ اللہ کے بلند کرنے کی بجائے یوں ہی لٹا کر بے مقصد ذبح کرایا جائے' ہمیشہ کے لئے مٹا دینا مطلوب تھا اور یہ کار خیر پیغمبرؑ ہی کے ہاتھ سے کرانا ضروری تھا۔ اس کے بجائے حیوانی قربانی کا فطری عمل رواج پانا تھا جو آج تک چلا آرہا ہے۔ وہ بھی صرف خدا ہی کے نام پر' جو ہر جان کا پیدا کرنے والا ہے اور اس امانت کی واپسی کا حق دار ہے۔ چنانچہ یہ عمل پورا ہوا۔
>
> اس صورت میں اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ ان معنوں میں ذبیح نہیں کہ انہیں فی الواقع چھری سے ذبح کرایا گیا اور نہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت یہ ہے کہ انہوں نے بیٹے کو ذبح کیا ہے۔ بلکہ سنت ابراہیمیؑ بیٹے کو ذبح نہ کرنا ہے جس عمل نے انسان کو اس طرح اس کی حالت میں ذبح کرنے کی رسم بد کو ہمیشہ کے لئے جد انبیاء (ابراہیمؑ) کے ہاتھوں ختم کرایا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں "انسانی قربانی" کو کس طرح "بد رسم" قرار دیا گیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے خواب کو تمثیلی بتایا گیا ہے! پھر حضرت اسمٰعیلؑ کے "ذبح عظیم" ہونے کی توجیہہ بھی وہی بیان کی گئی ہے جسے پرویز صاحب نے عرصہ پہلے پیش کیا تھا!

یہ ہے زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر قرآنی حقائق کی طرف آنا۔

لیکن، اس کے باوجود، یہاں خیر سے، ایک ایسے "بزرگوار" بھی موجود ہیں، جن کی زندگی کا گویا مشن یہ ہے کہ اسلام کو ایسی گھناؤنی شکل میں پیش کیا جائے جس سے دنیا اس سے متنفر ہو جائے۔ عیدالاضحیٰ ہی کی تقریب پر انہوں نے بھی ایک تقریر کی جس میں حضرت ابراہیمؑ کے اس واقعہ کے متعلق فرمایا:

> بہر حال، بچہ کچھ ہوشیار ہوا۔ اس عمر کو پہنچا کہ باپ کا دست و بازو بن سکے۔ اس وقت اشارہ ہوتا ہے کہ اسے قربان کردو۔ صاف الفاظ میں یہ حکم نہیں ہے کہ اسے قربان کردو۔ خواب میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ اس کو قربان کر رہے ہیں یعنی حکم کے الفاظ میں نہیں۔ صرف ایک فعل دکھایا جا رہا ہے کہ وہ بچے کو قربان کر رہے ہیں۔ نبی کا خواب چونکہ وحی کی نوعیت رکھتا ہے، اس لئے اس خواب کو دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام اپنی جگہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مجھ سے میرے بیٹے کی --- میرے اکلوتے بیٹے کی --- قربانی مانگی جا رہی ہے۔
>
> (مودودی صاحب کی تقریر، جامعہ منصورہ، لاہور، بحوالہ چٹان، بابت ۲۹ دسمبر ۱۹۷۵ء)

یعنی یہ صاحب فرما رہے ہیں کہ "نبی کا خواب وحی کی نوعیت رکھتا ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ (حکم نہ سہی اشارہ) خود خدا کی طرف سے ہوا تھا!--- (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یعنی جس عمل کو ایک مولانا صاحب، زمانہ جاہلیت کی "رسم بد" قرار دے رہے ہیں جسے حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں مٹانا مقصود خداوندی تھا، یہ حضرت اس کے متعلق فرما رہے ہیں کہ اس رسم پر عمل پیرا ہونے کا حکم (اشارہ) خود خدا نے وحی کے ذریعے دیا تھا۔

اور یہ ہے اس تفسیر القرآن کا نمونہ جس کے تراجم اب غیر ملکی زبانوں میں کئے جا رہے ہیں۔

از باغباں شد است کہ صیاد آں نہ کرد

واضح رہے کہ خدا کی طرف سے وحی خوابوں کے مبہم اشارات میں نہیں آیا کرتی تھی۔ وہ قلب نبویؐ پر نازل ہوا کرتی تھی (۲/۹۷) اور واضح زبان میں (۹۵-۱۹۲/۲۶) (فروری ۱۹۷۶ء)

۱۱۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی اور شیر خوار بچہ

ایک طالب علم اپنے خط میں لکھتا ہے کہ "عید کے موقع پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک تقریر کی تھی جسے اخبار چٹان نے شائع کیا ہے۔ اس میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ:

> آج تاریخ انسانی کا وہ عظیم دن ہے جس کی نظیر تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملتی۔ ذرا اپنی آنکھوں کے سامنے اس نقشے پر غور کیجئے کہ ایک انسان مکہ معظمہ کی وادی میں جو پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی اور جس میں آس پاس دور دراز کہیں کسی آبادی کا نشان نہ تھا' وہاں اپنے اکلوتے بچے کو لے کر اس کی ماں کے ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور پانی کا ایک مشکیزہ اور ایک تھیلے میں کچھ کھجوریں' اس کے پاس رکھ دیتا ہے۔ جب وہ وہاں سے پلٹنے لگتا ہے تو اس کی بیوی اس سے کہتی ہے کہ--- "مجھے کہاں چھوڑے جا رہے ہو' اس بچے کو کہاں چھوڑے جا رہے ہو"۔ مگر وہ خاموشی کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ آخر کار وہ پوچھتی ہیں کہ "کیا خدا کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں؟" وہ جواب دیتے ہیں کہ "ہاں!" ..... "خدا کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں"" اور اس صبر و ضبط کی پیکر اور اللہ پر بھروسہ کرنے والی خاتون نے یہ سننے کے بعد' کہ خدا کے حکم سے ایسا کیا جا رہا ہے'کوئی فکر اور کسی پریشانی اور کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا اور اس جنگل میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد یہ طالب علم لکھتا ہے کہ اس واقعہ کے پڑھنے کے بعد میرے دل میں جو خیالات پیدا ہوئے ہیں' انہیں تحریر نہیں کر سکتا۔ میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ جیسی عظیم شخصیت نے ایسا کیا ہوگا! لیکن جب میں نے یہ پڑھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ "وہ خدا کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں"۔ تو میرے دل میں اور بھی اضطراب پیدا ہوا کہ کیا اللہ تعالیٰ اس قسم کے حکم دیتا تھا؟ میں بڑی کش مکش میں مبتلا ہوں۔ مجھے بتایئے کہ کیا یہ واقعہ قرآن مجید میں ہے؟ اگر نہیں تو پھر مودودی صاحب نے ایسا کس طرح کہہ دیا؟

طلوع اسلام

یہ واقعہ قرآن شریف میں نہیں' تورات میں ہے اور وہیں سے ہماری کتب روایات میں درج کر دیا گیا ہے اور اسی کو مودودی صاحب جیسے "مفسر" عام کرتے چلے جا رہے ہیں تاکہ سوچ سمجھ سے کام لینے والے طالب علم اسلام سے برگشتہ ہوتے جائیں--- اور جب طلوع اسلام یہ کہتا ہے کہ بابا! خدا کے لئے اس قسم کی وضعی روایات کو رسولؐ اللہ کی احادیث مت کہو' تو اسے "منکر حدیث" قرار دے کر بدنام کرنے کی مہم شروع کر دی جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مودودی صاحب اپنے مشن میں ہیں بہت کامیاب۔ اس طالب علم نے تو اپنے شکوک کے ازالہ کے لئے ہم سے دریافت کر لیا۔ نہ معلوم اس جیسے کتنے طلباء (اور دیگر تعلیم یافتہ نوجوان) ان باتوں کو اسلام کی تعلیم سمجھ کر دین سے برگشتہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں (فروری ۱۹۷۶ء)

۱۲- نبوت نبی اکرمؐ کے خلاف یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش

(حیات و وفات مسیح جیسے مسائل کی اہمیت!)

ایک صاحب لکھتے ہیں:-

قرآن شریف کی رو سے ایک مسلمان کے لئے تمام سابقہ انبیاءؑ پر ایمان لانا ضروری ہے اور ہم ان پر ایمان لاتے ہیں- لیکن ان میں سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور وفات کے مسائل نے اس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ یہ گویا ہمارے لئے ایمان کی شرط قرار پاگئے ہیں- جو شخص ان مسائل میں مولوی صاحبان کا ہم نوا نہیں ہوتا' اس پر کفر کے فتوے لگ جاتے ہیں- حالانکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا قائل ہوتا ہے جو ایمان کے لئے بنیادی تقاضا ہے- تمام انبیاء کرامؑ میں سے حضرت عیسیٰؑ کی ان خصوصیات کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟ اسے تفصیل سے سمجھایئے گا کہ ان سوالات نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے-

جواب : ان مسائل نے اس قدر اہمیت کیوں حاصل کر رکھی ہے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکے گی جب تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہود اور نصاریٰ نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے- حضور نبی اکرمؐ نے جو دین پیش کیا' اس کا مقابلہ نہ یہودیت کر سکتی تھی نہ عیسائیت- یہ لوگ قرآن مجید میں تو کوئی رد و بدل کر نہیں سکتے تھے- انہوں نے ایسی ایسی روایات وضع کرکے انہیں جزو دین بنا دیا جس سے اسلام کی صحیح صورت ہی مسخ ہوگئی- اس طرح وہ اگر اپنے مذاہب کو اسلام سے افضل ثابت نہ بھی کرسکے تو بھی اسلام کو ان کی سطح پر لانے میں ضرور کامیاب ہوگئے- چنانچہ ہمارے مروجہ اسلام کا بیشتر حصہ انہی تحریفات پر مشتمل ہے جنہیں "اسرائیلیات" کہا جاتا ہے- اسلام میں اس طرح تبدیلی پیدا کرنے کے بعد سوال انبیاء کرامؑ کا سامنے آیا- ان کی محرف کتابوں میں ان کے انبیاء کی جو زندگی سامنے آتی ہے وہ حضور نبی اکرمؐ کی بلند اور پاکیزہ سیرت کے مقابلہ میں ٹھہر ہی نہیں سکتی- ان کی دوسری کوشش یہ تھی کہ وہ حضورؐ کی طرف ایسی باتیں منسوب کردیں جن سے ان کے انبیاء آپ سے بلند مقام پر نظر آئیں- مثال کے طور پر آپ بخاری شریف میں معراج سے متعلق روایت کو دیکھئے- اس میں کہا گیا ہے کہ جب حضورؐ واپس تشریف لا رہے تھے تو راستے میں (آسمان پر) حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی- (اس کے بعد کیا ہوا' اسے بخاری شریف

کے الفاظ میں سنئے)۔

حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کہ آپ کو کیا حکم دیا گیا ہے؟

حضرتؐ نے فرمایا مجھے ہر روز پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا آپ کی امت ہر روز پچاس نمازیں نہیں پڑھ سکتی۔ اور میں نے خدا کی قسم! آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ بہت سخت برتاؤ کیا ہے۔ پس آپ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ جایئے اور اپنی امت کے لئے اس میں تخفیف کی درخواست کیجئے۔ چنانچہ میں لوٹ گیا اور اللہ نے مجھے دس نمازیں معاف کردیں۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کے آیا تو انہوں نے ویسا ہی کہا۔ پھر میں لوٹ گیا اور اللہ نے مجھے دس نمازیں معاف کردیں۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کے آیا تو انہوں نے ویسا ہی کہا۔ پھر میں خدا کے پس لوٹ گیا تو مجھے ہر رو پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کے آیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کو کس چیز کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے کہا ہر روز پانچ نمازوں کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہ آپ کی امت ہر روز پانچ نمازیں نہیں پڑھ سکتی اور بیشک میں نے آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ بہت سخت برتاؤ کیا ہے۔ پس آپ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ جایئے اور اپنی امت کے لئے اس میں تخفیف کی درخواست کیجئے۔ حضرتؐ نے فرمایا! میں نے اپنے پروردگار سے (کئی مرتبہ) درخواست کی' اب مجھے شرم آتی ہے۔ لہٰذا' اب میں راضی ہوں اور (اس کے حکم کو) تسلیم کرتا ہوں۔

(صحیح بخاری' جلد دوم' ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی ص۷۱-۷۰)

آپ غور کیجئے کہ اس روایت کی رو سے (اس خدا کو تو چھوڑیئے جس نے نماز جیسے فریضہ کے متعلق اس طرح حکم دیا) دیکھئے یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں حضور نبی اکرمؐ کی کیا پوزیشن سامنے آتی ہے؟ آپ نے دیکھا کہ یہودی سازش اس ایک روایت کے ذریعے اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہوگئی؟ اس نے "اپنے نبی" کو کیا مقام عطا کردیا اور حضور نبی اکرمؐ کو کس مقام پر لے آئی! اور پھر سازش کی کامیابی کا یہ عالم کہ مسلمان ان روایات کی حفاظت کے لئے مرنے مارنے تک آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور جو شخص یہ کہہ دے کہ اس سے حضورؐ کی عظمت میں فرق آتا ہے' اس لئے یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی' اسے "منکر حدیث" قرار دے کر' دائرہ اسلام سے خارج کردیا جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں کامیاب سازش!!

۲۔ اور آگے بڑھئے۔ نبی اکرمؐ نے (از روئے قرآن) حضرت ابراہیمؑ کو امت مسلمہ کا مورث اعلیٰ اور اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا متبع قرار دیا۔ یہودی حضرت ابراہیمؑ کو بھی نبی تسلیم کرتے تھے لیکن' چونکہ رسولؐ اللہ نے اپنے آپ

کو ان کی ملت کا پیرو قرار دیا اور انبیاء بنی اسرائیل میں انہیں ایک بلند مقام پر فائز بتایا' انہوں نے (یہودیوں نے) ایک روایت وضع کی کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ یہ روایت بھی مجموعہ بخاری میں موجود ہے۔ اس ایک روایت سے انہوں نے "مسلمانوں کے" دو جلیل القدر نبیوں کو جس مقام پر لاکر کھڑا کر دیا وہ ظاہر ہے' یعنی ایک وہ جس نے جھوٹ بولا اور دوسرا وہ جس نے اس کے جھوٹ کی تصدیق کی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ اب مسلمان ہیں کہ اس روایت کو اپنے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور یہودی یہ فلیتہ چھوڑ کر الگ بیٹھے ہنس رہے ہیں۔

ہم اس مقام پر انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ ہمارے احادیث کے مجموعوں میں اس اس قسم کی (وضعی) روایات شامل ہیں جن سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ (معاذ اللہ) بے حد داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب اسلام کے مخالفین کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ لیکن آج کوئی مسلمان ان کا انکار کرے اور پھر دیکھے کہ علماء حضرات اس کا کیا حشر کرتے ہیں۔

۳۔ اب آیئے عیسائیوں کی طرف۔ بخاری شریف کے پہلے باب کا عنوان ہے "رسولؐ اللہ کی طرف وحی کی ابتدا کس طرح ہوئی" اس میں کہا گیا ہے کہ بعثت سے پہلے آپ کا معمول تھا کہ آپؐ کھانے پینے کا کچھ سامان ساتھ لے کر غار حرا میں تشریف لے جاتے اور وہاں کئی کئی دن لگاتار محو عبادت رہتے۔ واضح رہے کہ اس روایت کا اتنا حصہ بھی اس زمانے کا وضع کردہ نظر آتا ہے جب مسلمانوں میں تصوف آیا اور صوفیا نے پہاڑوں' جنگلوں' غاروں میں ریاضتوں اور مراقبوں کے ذریعے خدا سے "شرف ہمکلامی" حاصل کیا۔ اس "ہم کلامی" کی سند قرآن مجید سے تو مل نہیں سکتی تھی۔ انہوں نے یہ روایت وضع کی کہ خود رسولؐ اللہ نے اسی طریق سے خدا سے ہم کلامی کا مقام حاصل کیا تھا۔ یہ سارا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ اول تو ختم نبوت کے بعد خدا سے ہم کلامی کے امکان کا تصور ہی ختم نبوت کی مہر کو توڑ دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نبوت' خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی' مراقبوں اور ریاضتوں سے حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے متعلق تو قرآن یہاں تک کہتا ہے کہ ہونے والے نبی کو ایک ثانیہ پہلے بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے اس مرتبہ بلند کے لئے منتخب کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب اسے وحی سے سرفراز کیا جاتا تھا تو یہ سارا ماجرا واضح طور پر اس کے سامنے آجاتا تھا۔ پھر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا تھا۔ لہٰذا' اس روایت کا شروع کا حصہ بھی اس کے اگلے حصے کی طرح وضعی ہے۔ لیکن ہم نے اس مقام پر اسے اس کے اگلے حصے کی نسبت سے درج کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ اس طرح غار حرا میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ ـــــ

> فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے (آپ سے) کہا کہ پڑھو! آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں پھر فرشتے نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے (زور سے) دبایا' یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھیئے تو میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر فرشتے نے مجھے پکڑ لیا اور (زور سے) دبایا یہاں

تک کہ مجھے تکلیف ہوئی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھیئے۔ تو میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ فرشتے نے مجھے پھر پکڑ لیا اور سہ بارہ مجھے (زور سے) دبایا۔ پھر مجھ سے کہا کہ **اقرا باسم ربک الخ** (۹۶/۱-۳) اپنے پروردگار کے نام (کی برکت) سے پڑھو! جس نے (ہر چیز) کو پیدا کیا' انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا اور (یقین کرلو کہ) تمہارا پروردگار بڑا بزرگ ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اس واقعہ کے سبب سے (مارے خوف کے) ہلنے لگا اور آپ خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور وہاں لوگوں سے کہا کہ مجھے کمبل اڑھا دو' مجھے کمبل اڑھا دو۔ ان لوگوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا یہاں تک کہ (جب) آپ کے دل سے خوف جاتا رہا' تو آپؐ نے خدیجہؓ سے سب حال (جو غار میں گزرا تھا) بیان کرکے کہا کہ بلاشبہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ خدیجہؓ بولیں کہ (آپ کو اس قسم کا خیال کرنا) ہرگز نہیں (چاہیئے)۔ خدا کی قسم! اللہ آپ کو کبھی پریشان نہ کرے گا۔ یقیناً" آپ قرابت کی پاسداری کرتے ہیں اور (خدا کی راہ میں) مدد کرتے ہیں۔ پھر خدیجہؓ آپ کو لے کر چلیں اور ورقہ بن نوفل' اپنے چچا کے بیٹے' کے پاس آپ کو لائیں۔ اور ورقہ ایک شخص تھا جو زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہوگیا تھا اور عبرانی کتاب لکھا کرتا تھا یعنی جس قدر اللہ کو منظور ہوتا تھا انجیل کو عبرانی میں لکھا کرتا تھا اور بڑا بوڑھا آدمی تھا کہ بینائی جا چکی تھی۔ تو اس سے خدیجہؓ نے کہا کہ' اے میرے بیٹے! اپنے بھتیجے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) سے (ان کا حال) سنو۔ ورقہ بولے اے میرے بھتیجے! تم کیا دیکھتے ہو؟ رسول خدا صلعم نے جو کچھ دیکھا تھا ان سے بیان کردیا۔ تو ورقہ نے آپ سے کہا کہ یہ وہ فرشتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ اے کاش میں اس (زمانہ) میں (جب آپ نبی ہوں گے) جوان ہوتا۔ اے کاش میں (اس وقت تک) زندہ ہی رہتا جب کہ آپ کو آپ کی قوم (مکہ سے) نکالے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر بہت تعجب سے) فرمایا کہ' کیا یہ لوگ مجھے نکالیں گے؟ ورقہ نے کہا ہاں۔ جس شخص نے آپ کی جیسی بات بیان کی اس سے (ہمیشہ) دشمنی کی گئی۔ اور اگر مجھے آپ (کے نبوت) کا زمانہ مل گیا تو میں آپ کی بہت زور دار مدد کروں گا۔ مگر چند ہی روز میں ورقہ کی وفات ہوگئی اور وحی کی آمد چند روز کے لئے سست ہوگئی۔

(صحیح بخاری' جلد اول' ص ۲' ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی)

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک وضعی روایت میں عیسائی کیا کچھ کر گئے ہیں؟ وہ یہ کہہ گئے ہیں کہ رسولؐ اللہ کے

سامنے فرشتہ آیا۔ اس نے خدا کی وحی آپ تک پہنچائی۔ خدا نے آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا لیکن آپ کو کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کیا ہوا ہے! الٹا آپ پر خوف طاری ہوگیا۔ یہ بات ایک عیسائی عالم--- ورقہ بن نوفل--- نے بتائی کہ آپ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ آپ کو نبوت سے نوازا گیا ہے! یعنی (۱) اجزائے نبوت کے متعلق اس عیسائی عالم کو خود صاحب نبوت (نبی اکرمؐ) سے بھی زیادہ علم تھا۔ (۲) اس کے کہنے پر کہ آپ کو نبوت مل رہی ہے آپ اپنے آپ کو نبی سمجھنے لگ گئے۔ (۳) لیکن اس علم و شہادت کے باوجود خود عیسائی کا عیسائی ہی رہا' آپ پر ایمان نہ لایا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک روایت سے عیسائیوں نے اپنے ایک عالم کے مقابلہ میں حضورؐ کو کس مقام پر لاکھڑا کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں انہوں نے (اپنے نبی) حضرت عیسیٰؑ کو ان خصوصیات کا حامل قرار دیا جو (ظاہر ہے کہ) رسولؐ اللہ میں نہیں تھیں' یعنی یہ کہ ان کی (حضرت عیسیٰؑ کی) پیدائش بھی دنیا کے تمام انسانوں' حضرات انبیاء کرامؑ اور خود حضور نبی اکرمؐ کے مقابلہ میں منفرد تھی اور ان کی حیات ارضی کی پہلی منزل بھی منفرد--- وہ بن باپ کے پیدا ہوئے اور زندہ آسمان پر تشریف لے گئے۔ اس طرح انہوں نے' اپنے نبی (حضرت عیسیٰؑ) کی افضلیت حضور نبی اکرمؐ پر ثابت کردی اور اپنے اس دعویٰ کی تائید و تصدیق خود مسلمانوں کی روایات سے کردی اور ان روایات کی اہمیت اس قدر بڑھا دی کہ یہ مسلمانوں کے ہاں (گویا) جزو ایمان قرار پاگئیں۔

۴ - اس کے بعد آگے بڑھیئے۔ اس دین کے متعلق جسے حضور نبی اکرمؐ نے پیش کیا تھا' خدا نے کہا ہے کہ **لیظھرہ علی الدین کلہ** (۶۱/۹) وہ تمام ادیان عالم پر غالب آئے گا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا یہ غلبہ حضور نبی اکرمؐ کی حیات ارضی میں تکمیل تک نہیں پہنچا تھا۔ اسے آپؐ کے بعد آپ کی امت کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچنا تھا۔ لیکن نزول حضرت مسیحؑ سے متعلق روایات میں کہا گیا کہ یہ غلبہ حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچے گا۔ یعنی دین مصطفویؐ کا آخری غلبہ رہین منت ہوگا" عیسائیوں کے نبی (حضرت عیسیٰؑ) کے ہاتھوں کا۔ یہ ہے جو (ان وضعی روایات کی رو سے) عیسائی کہہ گئے۔ اور پھر اس کے لئے اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ یہ مسلمانوں کے ایمان کا جزو بن گئیں۔ جب اس قسم کے اعتراضات ابھرے کہ ایک انسان بہ جسد عنصری' آسمان پر زندہ کس طرح رہ سکتا اور واپس آسکتا ہے' تو (اس اعتراض سے بچنے کے لئے) بعض نے کہہ دیا کہ وہ آنے والا مسیح ابن مریم' بہ نفس نفیس نہیں ہوگا' ان کا "مثیل" ہوگا۔ سادہ لوح لوگ خوش ہوگئے کہ اس اعتراض کا جواب مل گیا۔ لیکن اتنا نہ سوچا کہ اس سے عیسائیوں کے ہاتھ کتنا بڑا حربہ آگیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سوچو کہ جس نبی (یعنی حضرت عیسیٰؑ) کا مثیل' دین محمدیؐ کو غلبہ عطا کرے گا' خود اس نبی کا مقام کس قدر بلند ہوگا' یعنی جو بات (معاذ اللہ) نبی اکرمؐ سے نہ ہوسکی' آپ کی امت میں سے کسی سے نہ ہوسکی' اسے ہمارے (عیسائیوں کے) نبی کے مثیل نے آکر پورا کردیا۔ جب مثیل کی عظمتوں کا یہ عالم ہے تو خود اس نبی کے مقام کی رفعتوں کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

یہ ہے جو کچھ یہودی اور عیسائی سازشوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے اور ہم ہیں کہ ان روایات کو جزو ایمان بنائے

بیٹھے ہیں۔

یاد رکھئے روایات کے صحیح یا وضعی ہونے کا معیار قرآن کریم ہے اور قرآن کریم میں کسی آنے والے کا ذکر نہیں۔ آنے والا' وہ نبیؐ آخرالزمان تھا جو آج سے چودہ سو سال پہلے دین کامل کے ساتھ آگیا۔ اس کے بعد "آنے والوں" کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ (دسمبر ۱۹۷۳ء)

۱۳۔ سیرت رسول اللہ

مودودی صاحب کی تفسیر کے آئینے میں

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب رقمطراز ہیں کہ :۔

مودودی صاحب کی معرکہ آراء تفسیر' تفہیم القرآن کی تکمیل پر ایک عظیم جشن منعقد کیا گیا۔ اس جشن میں اس تفسیر پر مودودی صاحب پر گلہائے عقیدت برسائے گئے۔ اس اہتمام کو دیکھ کر توجہ غیرارادی طور پر اس طرف جاتی ہے کہ اس تفسیر کا وہ کونسا امتیازی نکتہ ہے جس کی وجہ سے اسے لاثانی قرار دیا گیا اور قوم پر ایک عظیم احسان گردانا گیا۔ نکات تو بہت ہیں' کہاں تک گنائے جائیں۔ گلہائے رنگارنگ چاروں اطراف میں بکھرے پڑے ہیں۔ تاحد نظر تحیر انگیز حقائق زیب وہ کتاب ہیں جن کے بیان کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ تاہم تفسیر کی خاصیت یہ ہے کہ مفسر نے بات صاف کرنے کی بجائے داستانوں میں الجھا کر رکھ دیا ہے اور اسے اپنے ہی ہاتھوں مجموعہ اضداد بنا دیا ہے۔ انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ ایک چیز کو خود ہی فرض کر لیا گیا ہے اور پھر اس پر حسب منشا حاشیئے چڑھائے گئے ہیں۔ مودودی صاحب کی ذہنی تخلیق کی آمیزش نے قرآنی حقائق پر پڑے ہوئے پردوں کو اور دبیز کر دیا ہے۔ اس طرح جس چیز کی کسر رہ گئی تھی صاحب موصوف نے اسے پورا کر دیا ہے۔ قرآن اور صاحب قرآنؐ کے خلاف وہ ہرزہ سرائی کی گئی ہے کہ الحذر! دیگر جلیل القدر انبیاء کو بھی دل کھول کر ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔

یہ تو تھا مودودی صاحب کی تفسیر کا انداز۔ لیکن اس وقت مسئلہ زیر بحث' وہ رنگ ہے جس میں مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں قرآن اور صاحب قرآنؐ کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس وقت سورۃ "الاعلیٰ" (سورہ ۸۷) کی صرف دو آیات کی تفسیر قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ترجمہ بھی مودودی صاحب ہی کا ہے۔

سنقرئک فلا تنسیٰ ۙ الا ماشاء الل[illegible] (۸۷/۶-۷)

ترجمہ :۔ ہم تجھے پڑھوا دیں گے۔ پھر تم نہیں بھولو گے سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔

آیت نمبر (۸۷/۶) کی تفسیر میں مودودی صاحب وحی کے بارے میں بالصراحت کہتے ہیں کہ

"ہم آپ کو اسے پڑھوا دیں گے اور وہ ہمیشہ کے لئے آپ کو یاد ہو جائے گی۔ اس بات کا کوئی اندیشہ آپ نہ کریں کہ اس کا کوئی لفظ بھی آپ بھول جائیں گے...... اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن جس طرح معجزے کے طور پر آنحضرت صلی اللہ

> علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا' اسی طرح معجزے کے طور پر ہی اس کا لفظ لفظ آپ کے حافظے میں محفوظ بھی کر دیا گیا تھا اور اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا گیا تھا کہ آپ اس میں سے کوئی چیز بھول جائیں یا اس کے کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہو جائے"

اس سے صاف ظاہر ہے اور ہے بھی حقیقت' کہ خدا کا منشا یہ تھا کہ قرآن حکیم حضورؐ کے سینہ میں اس طرح جمع اور محفوظ کر دیا جائے کہ اس بات کا کوئی امکان باقی نہ رہے کہ آپ اس میں سے کچھ بھول جائیں یا کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ آپ کی زبان مبارک سے نکل جائے۔ کیونکہ خدا ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ لیکن آیت کے اس حصہ **الا ماشاء اللہ** کی تفسیر کرتے ہوئے مودودی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ۔

> اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے' بلکہ اللہ کا فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے ورنہ اللہ چاہے تو اسے بھلا سکتا ہے۔

دیکھا آپ نے کس قدر تضاد ہے استدلال میں اور الجھاؤ ہے بیان میں۔ آپ ذرا سوچئے کہ جب خدا نے ایسا چاہا ہی نہیں تھا کہ جو کچھ حضورؐ کے سینہ میں جمع اور محفوظ کرا دیا جائے گا اس میں سے کچھ بھی حضورؐ بھول سکیں تو دوسرے ہی ٹکڑے کی تفسیر میں خدا کے اس قانون کے بخئے کیوں ادھیڑ دیئے گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حتمی طور پر (CATEGORICALLY) یہ اعلان کر دیا کہ **سنقرئک فلا** تنسی(۸۷/۶) تو یہ ایسے اعلان کی حیثیت اختیار کر گیا جس کے خلاف کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیا قرآن حکیم کا یہ اعلان مودودی صاحب کے لئے قابل قبول نہیں؟

مگر سب سے زیادہ دل ہلا دینے والا ان آیات کی تفسیر کا وہ حصہ ہے جہاں آپ فرماتے ہیں:۔

> دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اس وعدے سے مستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔

دیکھا آپ نے ایک غلط مفروضہ کی بنا پر مودودی صاحب کس کس قسم کی قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ پہلے ایک بات کو خود ہی وضع کرنا اور پھر اسکی تاویلیں کرنا' یہ کہاں کا فہم قرآن ہے۔ اگر ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے جناب مودودی' قرآن کی بارگاہ سے پوچھتے تو ان آیات کا مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا۔ کیونکہ اس کا دعویٰ ہے **ان علینا بیانہ** (۷۵/۱۹)۔ اور پھر ایسا کرنے سے ان کا وقت اور توانائی بھی ضائع ہونے سے بچ جاتے' جنہیں وہ کسی تعمیری کام میں صرف کر سکتے تھے۔ لیکن جس کے فہم کا انحصار غیر از قرآن پر ہو تو ایسی حالت میں قرآن اس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ چنانچہ زیر نظر آیات کی تفسیر کی وضاحت میں مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

اس مفہوم کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرات کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت ابی بن کعب نے پوچھا کیا آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا' نہیں میں بھول گیا تھا۔

اب صاحب تفسیر نے حضورؐ کو ایسی کشتی پر سوار کرا دیا ہے کہ وہ "نسیان" کی متلاطم موجوں میں تھپیڑے کھاتی نظر آتی ہے۔ اگر مودودی صاحب کی فکر کا سرچشمہ قرآن ہوتا تو ان سے ایسی حرکت کبھی سرزد نہ ہوتی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مودودی صاحب کی فکر کا سرچشمہ قرآن نہیں تو پھر کیا ہے؟ اس کا جواب تو آپ کو ان کی متذکرہ تفسیر کے اس ٹکڑے میں مل چکا ہے جہاں (بقول ان کے) حضورؐ پر "نسیان" لاحق ہوجانا صحیح بخاری کی ایک روایت سے ثابت کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں "نسیان" کی مزید تشریح کے لئے مودودی صاحب کے علم و فکر کے سرچشمہ کی چند ایک مثالیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

(ا) ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نماز قائم کی گئی اور صفیں کھڑی کر کے برابر کی گئیں۔ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف تشریف لائے تو جب آپ اپنی نماز پڑھنے کی جگہ کھڑے ہو گئے' اس وقت یاد کیا کہ جنب ہیں۔ پھر ہم سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر رہو اور آپ لوٹ گئے اور غسل کیا۔ بعد اس کے ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ پھر آپ نے تکبیر تحریمہ کہی اور ہم سب نے آپ کے ہمراہ نماز پڑھی

(روایت نمبر۲۶۴'۲۰۱' صحیح بخاری' جلد اول' ترجمہ مرزا حیرت دہلوی)

ملاحظہ کی آپ نے "نسیان" کی کیفیت۔ کیا ایسی بھول ایک رسول کے شایان شان ہے؟ اور آگے بڑھئے۔

(ب) عبد اللہ بحینہ کہتے ہیں (اور قبیلہ از وشنودہ کے ہیں اور بنی عبد مناف کے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے) کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن) لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی تو (بھولے سے) پہلی دو رکعتوں (کے ختم) پر کھڑے ہو گئے اور بیٹھے نہیں تو لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے' یہاں تک کہ جب آپ نماز تمام کر چکے اور لوگ آپ کے سلام پھیرنے کے منتظر ہوئے تو آپ نے بیٹھے ہی بیٹھے تکبیر کہی اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کئے بعد اس کے سلام پھیرا۔

(روایت نمبر۷۷۷' ۷۷۸' ایضاً)

(ج) "حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی تو (دو رکعتوں کے بعد) آپ نے سلام پھیر دیا۔ ذوالیدین نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا نماز کچھ کم پڑھائی گئی ہے (اس وقت آپ نے دو ہی رکعتیں پڑھیں)۔ پس آپ نے اپنے اور اصحاب سے پوچھا کہ کیا ذوالیدین صحیح کہتے ہیں؟ ان لوگوں نے عرض کیا جی ہاں۔ تو آپ نے دو رکعتیں اور پڑھیں، پھر دو سجدے کئے، (روایت نمبر۱۱۳۶۔ ایضاً")

اس مضمون کی کئی روایات اور بھی آپ کو ملیں گی لیکن اختصار کے طور پر میں نے چند ایک ہی پر اکتفا کیا ہے۔ مندرجہ بالا روایات ایک تو حضورؐ کا (بقول روایات) نماز میں بھول جانا نظر آئے گا اور دوسرے اس بھول کے کفارہ میں دو سجدے (سہو کے) ادا کرنا نظر آئیں گے۔ ان دو سجدوں کی اساس بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب کوئی شخص تم میں سے نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان آتا ہے اور اس کے دل میں شبہ ڈال دیتا ہے یہاں تک کہ وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے نماز کس قدر پڑھی۔ لہٰذا، جب یہ بات کسی کو پیش آوے تو اسے چاہیے کہ بیٹھے بیٹھے دو سجدے کر لے۔

(روایت نمبر۱۱۴۲۔ایضاً")

اس روایت کی رو سے جو کوئی نماز میں بھول جاتا ہے، وہ شیطان کے غلبہ کی وجہ سے بھول جاتا ہے۔ لہٰذا، (معاذ اللہ۔ بقول ان کے) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شیطان کے غلبہ کی وجہ سے نماز میں بھول جاتے تھے جس کی وجہ سے دو سجدے (سہو کے) ادا کرتے تھے۔ دیکھا آپ نے متذکرہ تفسیر میں مودودی صاحب کے بیان کردہ "نسیان" کے ڈانڈے کہاں جا کر ملتے ہیں۔ یہ قرآن کی تفسیر ہے یا (معاذ اللہ) تضحیک؟

لیکن برادران عزیز! قرآن حکیم کا فتویٰ اس بات میں کچھ اور ہے۔ قصہ آدم کی تمثیل میں ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت مانگی تاکہ وہ لوگوں کو بہکا سکے اور ان کے دل میں وسوسہ ڈال سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دیدی اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ

ان عبادی لیس لک علیھم سلطن الا من اتبعک من الغوین○ (۱۵/۴۲)

تیرا غلبہ میرے مخلص بندوں پر نہیں ہو سکے گا۔ تیرا بس انہیں پر چلے گا جو متوازن راہ چھوڑ کر تیرے پیچھے لگ جائیں گے۔

اور پھر اس کا اعتراف خود ابلیس نے بھی کیا تھا کہ

الا عبادک منھم المخلصین۔ (۱۵/۴۰) "بے شک جو اللہ کے مخلص بندے ہیں ان پر میرا زور نہیں چل سکے گا اور نہ ہی میرا غلبہ ان پر ہو سکے گا"۔

تو پھر براوران عزیز! آپ خود ہی اپنے دل سے پوچھئے کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر بھی کوئی عبد خالص ہے- اور کیا خالق مطلق کے واضح فتویٰ کے باوصف اور ابلیس کے اپنے اعتراف کے باوجود' ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ جیسی ہستی پر شیطان کے غلبہ سے نماز میں "نسیان" لاحق ہو سکتا تھا جس کے کفارہ کے لئے وہ سجدہ سہو ادا کرتے تھے- یہ ہے نمونہ اس مایہ ناز تفسیر تفہیم القرآن کا جس کی تکمیل پر جشن مسرت منایا گیا اور جسے انسانیت پر ایک عظیم احسان قرار دیا گیا- آخر میں شمع قرآنی کی روشنی میں جسے طلوع اسلام نے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا ہے' محولہ بالا سورۃ "الاعلیٰ" کی آیات کا ترجمہ و مفہوم پیش کرتا ہوں-**سنقرئک فلا تنسے**(۸۷/۶) (اے محمدؐ) ہم قانون الٰہی (قرآن) کو تیرے سینہ میں اس طرح جمع و محفوظ (ثبت) کردیں گے کہ تو اسے کبھی بھول نہیں سکے گا (ترک نہیں کرسکے گا)- اور پھر تاکید و تائید کے لئے کہا **الا ما شاء اللہ** (۸۷/۷) اور خدا نے ہرگز ایسا نہیں چاہا کہ قانون الٰہی (قرآن) کبھی بھی تیرے قلب و نگاہ سے محو ہو سکے-

اس آیت میں **الا** استثنا کے لئے نہیں بلکہ جو حقیقت آیت نمبر(۸۷/۶) میں بیان کی گئی ہے اس کی تائید و تاکید کے لئے آیا ہے- عربی دان اسے اچھی طرح جانتے ہیں- لہٰذا' اس قسم کے تراجم اور تفاسیر بالکل غلط اور گمراہ کن ہیں' جو مودودی صاحب نے اپنی تصنیف تفہیم القرآن میں پیش کئے ہیں- علم تفسیر کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم ہے' باقی سب بتان آزری.........! (دسمبر۱۹۷۳ء)

باب سوم
ہماری تاریخ

ہمارا تاریخی ریکارڈ کہاں چلا گیا؟

سوال:۔ ہماری سب سے پہلی تاریخ (تاریخ طبری) تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی' اور وہ بھی کسی سابقہ تحریری ریکارڈ سے نہیں' بلکہ زبانی روایات کی رو سے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے کا تاریخ رکارڈ موجود ہی نہیں تھا یا ان حضرات کو وہ ملا نہیں تھا؟

جواب:۔ ہمارے جامعین احادیث اور مورخین نے (ان کے بیانات کے مطابق) بڑی سعی و کاوش سے مواد اکٹھا کیا۔ اس کے لئے انہوں نے دور دراز کے سفر اختیار کئے' سیکڑوں' ہزاروں افراد سے ملے۔ اگر تحریری ریکارڈ کہیں موجود ہوتا' تو وہ یقیناً" اسے حاصل کر لیتے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ تحریری ریکارڈ کہیں تھا ہی نہیں۔ اس لئے انہوں نے زبانی روایات کی بنا پر احادیث کے مجموعے اور تاریخ مرتب کی۔

اس سلسلہ میں ایک بات بڑی غور طلب ہے۔ مدینہ' ہماری سب سے پہلی مملکت کا دارالخلافہ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ مملکت قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کی وسعت قریب بائیس لاکھ مربع میل تک چلی گئی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس کی حدود دور دراز تک پھیل گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض مملکت کے کاروبار کے لئے کوئی سیکریٹریٹ ہو گا' محکمہ مال ہو گا۔ صوبوں کے گورنروں سے امور مملکت کے سلسلہ میں خط و کتابت ہوتی ہو گی۔ داخلی امور حکومت کے متعلق احکامات جاری ہوتے ہوں گے۔ دیگر مملکتوں کے سفراء اور قاصد آتے جاتے ہونگے۔ فوج سے متعلق امور سرانجام پاتے ہوں گے۔ یہ سب کچھ تحریری طور پر ہوتا ہو گا۔

دوسری طرف اسے بھی پیش نظر رکھئے کہ رسولؐ اللہ کے زمانے سے لے کر آج تک مدینہ پر مسلمانوں کا تسلط رہا ہے۔ کسی غیر مسلم کے قدم اس سرزمین پر نہیں پڑے۔ وہاں کوئی ایسا زلزلہ نہیں آیا جس سے عمارات زمین میں دھنس گئی ہوں۔ کوئی سیلاب نہیں آیا جس سے شہر غرقاب ہو گیا ہو۔ کوئی ایسی آگ نہیں لگی جس سے وہ بستی خاکستر ہو گئی ہو۔ کوئی فوجی یورش ایسی نہیں ہوئی جس سے اس پر تباہی آ گئی ہو۔

لیکن ان تمام امور کے باوجود' اس مملکت کے کاروبار سے متعلق کوئی پرزہ کاغذ کہیں نہیں ملتا' نہ مدینہ میں ملتا ہے نہ کہیں باہر۔ سوال یہ ہے کہ اس مملکت سے متعلق تحریری ریکارڈ کہاں چلا گیا؟ کہاں گم ہو گیا؟ اسے کون لے گیا۔ وہ کیسے ضائع ہوا؟ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ تاریخ کے متلاشیوں کو بحرمیت کے کنارے حضرت مسیح

کے زمانے سے بھی قبل کے مخطوطات (SCROLLS) تک مل گئے۔ مکتشفین کو بابل اور نینوا کے کھنڈرات سے حمارابی تک کے زمانے کے احکام و قوانین کا پتہ چل گیا۔ مصر کی قدیم تہذیب کے متعلق' چٹانوں پر کندہ اور دیواروں پر منقوش مواد مل گیا۔ لیکن مدینہ کی مملکت سے متعلق تحریر میں ایک لفظ تک کہیں سے دستیاب نہیں ہوا۔

اور آگے بڑھیے۔ خلافت راشدہ کے بعد' اسلامی مملکت کا دارالخلافہ دمشق میں منتقل ہو گیا اور وہاں قریب ایک سو سال تک اموی حکومت کار فرما رہی۔ وہ اس زمانے کی سب سے بڑی بین الاقوامی مملکت تھی۔ اس حکومت سے متعلق بھی اصلی (ORIGINAL) ریکارڈ کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں چلا گیا؟ اور جتل ریکارڈ تو عباسی حکومت کا بھی نہیں ملتا۔ اس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بغداد کی تباہی میں تلف ہو گیا ہو گا۔ لیکن مدینہ اور دمشق کے متعلق تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بالخصوص مدینہ کے متعلق کہ وہاں کی حکومت (عہد رسالت مآبؐ اور خلافت راشدہ کی حکومت) اور اس کے متروکات کے ساتھ توامت کی عقیدت وارادت بھی وابستہ تھی۔ پھر اس تحریری ریکارڈ کو کیا ہوا؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے' تاریخ کے کسی محقق نے اس کے متعلق تحقیق ہی نہیں کیا کہ یہ ریکارڈ چلا کہاں گیا!

اس کے بعد آپ غور فرمایئے کہ جس تاریخ کے اور جتل ماخذ کی یہ کیفیت ہو' اسے کس حد تک قابل اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس دور کا ایک ہی تحریری سرمایہ ہے جو ہم تک محفوظ چلا آ رہا ہے اور وہ ہے قرآن کریم۔

(جون ۱۹۶۹ء)

باب چہارم

تقدیر

۱۔ کیا دعا سے خدا کے فیصلے بدل سکتے ہیں؟

مودودی صاحب کے درس قرآن و حدیث میں موضوع زیر بحث دعا تھا۔ ایک صاحب نے سوال کیا:۔
اگر انسان کا مقدر پہلے سے طے ہو چکا ہے تو پھر دعا کے کیا معنی ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے کو بدل دیتا ہے؟
جواب میں فرمایا:۔

جی ہاں PRE-DESTINTAION بھی صحیح ہے اور دعا بھی اپنی جگہ درست ہے۔ تقدیر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بات طے کرنے کے بعد بے بس ہو گیا ہے۔ وہ جس طرح فیصلہ کرتا ہے اسی طرح اس فیصلے کو بدلنے کا اختیار بھی رکھتا ہے کہ وہ پہلے سے طے کر چکا ہو کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنے فیصلے کو بدل دوں گا اور اگر دعا نہیں مانگے گا تو میں اس کے ساتھ طے شدہ فیصلے کے مطابق معاملہ کروں گا۔ اس چیز کو اصطلاحاً" تقدیر معلق کہتے ہیں' وہ تقدیر جس میں اللہ تعالیٰ نے ردو بدل کی گنجائش رکھی ہو۔ اور تقدیر مبرم وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہو کہ اس میں تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

(ایشیا' مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۶۹ء)

ایشیا کی ۲۵ جولائی کی اشاعت میں ہے کہ مودودی صاحب نے اپنے اس جواب کی مزید تصریح یوں فرمائی۔

اس حدیث میں ایک اہم سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ پہلے سے ایک فیصلہ کر دیتا ہے اور انسان کی تقدیر میں وہ لکھا جاتا ہے تو پھر دعا کا کیا فائدہ؟ ظاہر ہے کہ جب آدمی کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ جائے تو وہ اپنے خدا سے مایوس ہو جاتا ہے اور اس کا کوئی تعلق اپنے خدا سے نہیں رہتا۔۔۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے بارے میں آدمی کا یہ تصور درست نہیں ہے۔ جو خدا فیصلہ کرتا ہے وہ اپنے فیصلے کو بدلنے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ اگر وہ بادشاہ ہے' حاکم ہے' مختار مطلق ہے اور کوئی چیز اسے باندھنے والی نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ہاتھ جوڑ کر اس کے آگے معافی مانگیں اور وہ متوجہ نہ ہو۔ قضا عربی زبان میں

> فیصلے کو کہتے ہیں اور دعا حقیقت میں درخواست ہے جو اللہ تعالٰی کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ پس اللہ تعالٰی کو پورا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اپنے بندوں کی درخواست قبول کرتے ہوئے اپنے سابقہ فیصلے کو بدل دے اور چاہے تو نہ بدلے۔ لیکن اس کی یہ مرضی بھی اپنی عظیم الشان حکمت کے تابع ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ الل ٹپ کسی دعا کو قبول کر لیتا ہے اور کسی کو رد کر دیتا ہے۔
>
> متکلمین نے اسی لئے یہ رائے دی ہے کہ قضا کی دو قسمیں ہیں' ایک قضائے مبرم اور دوسری قضائے معلق۔ قضائے مبرم وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالٰی نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اسے کسی صورت میں تبدیل نہیں کروں گا اور قضائے معلق وہ ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالٰی کا ہی یہ فیصلہ ہے کہ اگر بندے نے مجھ سے درخواست کی اور میرے آگے دست طلب دراز کیا تو میں اسے تبدیل کر دوں گا۔ خود قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے **ادعونی استجب لکم** ۴۰/۶۰ مجھ سے مانگو میں تمہاری پکار کو سنتا ہوں۔
>
> ظاہر ہے کہ اللہ تعالٰی کے کچھ فیصلے ایسے ہیں جو بندے کی دعا سے بدلے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے تو بندوں کو اس طرف رغبت دلائی گئی ہے۔

اس پر کسی صاحب نے پوچھا کہ " اگر دعاؤں کے بعد اللہ تعالٰی اپنے فیصلے بدل دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ فیصلے لکھ رہا تھا (نعوذ باللہ) اسے معلوم نہ تھا کہ متعلقہ شخص دعا مانگے گا یا نہیں"۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا:۔

> فیصلے میں اس نے یہ لکھا تھا کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا۔ اگر نہیں مانگے گا' تو اسے برقرار رکھوں گا۔ میں پہلی حدیث ہی میں اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ خدا کو تو قیامت تک کے آنے والے واقعات کا علم ہوتا ہے' اس لئے اسے فیصلے میں یہ کیوں لکھنا پڑا کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا۔ اگر نہیں مانگے گا تو اسے برقرار رکھوں گا۔ کیا اسے اس وقت (معاذ اللہ) اس کا علم نہیں تھا کہ یہ شخص دعا مانگے گا یا نہیں۔

ہم نے اس لئے کہا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کسی نے ان سے یہ سوال نہیں پوچھا"۔ یہ اس لئے کہ اگر کسی نے یہ سوال پوچھ لیا ہوتا تو اس وقت تک اس کے خلاف ایک احتسابی کمیٹی بیٹھ چکی ہوتی یہ فیصلہ دینے کے لئے کہ اس شخص کے عقائد خلاف اسلام ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اقبال پر بھی کفر کا فتویٰ لگ چکا ہوتا جس نے کہا تھا کہ ۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اور یہ تفسیر ہے قرآن کریم کی ان آیات کی جن میں کہا گیا ہے کہ **لا تبدیل لکلمت اللہ** (۱۰/۶۴) خدا کے فیصلوں (قوانین) میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ **ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا** (۳۳/۶۲) تو خدا کی روش میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ **ان اللہ لا یغیر مابقوم حتی یغیروا ما بانفسھم** (۱۳/۱۱) جس قسم کی تبدیلی کوئی قوم اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔

رمز باریکش بحرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی' او دیگر است
خاک شو' نذر ہوا سازو ترا — سنگ شو' برشیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست — قلزمی؟ پائندگی تقدیر تست
(اقبالؒ)

اس لئے دعا خدا کے فیصلے بدلوانے کا نام نہیں۔ اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ دعا' اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی شدت آرزو کا نام ہے تاکہ اس تبدیلی کے مطابق خدا کا فیصلہ (قانون خداوندی) اس پر لاحق ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے ؎

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے
(اقبالؒ)

لیکن یہ حقائق ان حضرات کی سمجھ میں کیسے آسکتے ہیں؟---- سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند---- کہاں قرآن کی بلندیاں' کہاں ان کے ذہن کی پستیاں! ؎

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کور مادر زاد و نور آفتاب
(اقبالؒ)

(اکتوبر ۱۹۶۹ء)

۲۔ رضا اور مشیت میں فرق؟

مودودی صاحب کا پیش کردہ خدا کا تصور

ان صفحات میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے کہ مودودی صاحب کا مشن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا اسلام پیش کیا جائے جس سے ہمارا سوچ بچار کرنے والا نوجوان طبقہ اسلام کا لبادہ اتار کر پھینک دے اور جس کا دنیا کے ارباب فکر و

نظر مذاق اڑائیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کی طرف سے پیش کردہ متعدد تصورات اور عقائد سامنے لا چکے ہیں۔ اس وقت یہ دیکھئے کہ وہ خدا کے متعلق کیا تصور پیش کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے ترجمان "ایشیا" کی ۴ اپریل ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا درس قرآن شائع ہوا ہے (جو غالباً ان کی تفسیر سے لیا گیا ہے)۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

> قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضا میں بہت بڑا فرق ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ کسی چیز کا اللہ کی مشیت اور اس کے اذن کے تحت رونما ہونا لازمی طور پر یہ معنے نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی واقعہ کبھی صدور میں نہیں آتا جب تک اللہ اس کے صدور کا اذن نہ دے ...... کسی چور کی چوری' کسی قاتل کا قتل' کسی ظالم و مفسد کا ظلم و فساد اور کسی کافر و مشرک کا کفر و شرک' اللہ کی مشیت کے بغیر ممکن نہیں .... مگر اس قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے۔

اس سے (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ) بیچارے اللہ میاں کی مجبوری کا اندازہ لگائیے۔ وہ ایک واقعہ کے صادر ہونے کا حکم دیتا ہے دراں حالیکہ وہ اس سے خوش نہیں۔ ظاہر ہے کہ اسے یہ تلخ گھونٹ بہ امر مجبوری پینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھئے کہ کوئی تھانیدار اپنے ماتحت سپاہی سے کہے کہ فلاں بے گناہ کو گرفتار کر کے الٹا لٹکا دو۔ وہ سپاہی کہے کہ حضور آپ جانتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہے' پھر آپ مجھے ایسا کرنے کا حکم کیوں دے رہے ہیں۔ اس کے جواب میں تھانیدار صاحب کہتے ہیں کہ بھائی میں بھی جانتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے لیکن میں یہ حکم چاؤ سے نہیں دے رہا۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے اوپر سے ایسا ہی کہا گیا ہے۔ آپ سوچئے کہ مودودی صاحب کے پیش کردہ خدا کی کیفیت بھی (معاذ اللہ) کچھ ایسی ہی نہیں؟ وہ ایسے احکام نافذ کرنے پر مجبور ہوتا ہے جنہیں وہ ناپسند کرتا ہے لیکن اس کے باوجود' اسے وہ احکام صادر کرنے پڑتے ہیں توبہ توبہ معاذ اللہ۔ ہمیں افسوس مودودی صاحب پر نہیں ' بے حد افسوس ان کے ان معتقدین پر ہے جو ان کی اس قسم کی مزخرفات پر بھی تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اندھی عقیدت کس طرح انسانوں سے فکر و بصیرت کی صلاحیتیں چھین لیتی ہے۔ لیکن جس قوم سے میرزا غلام احمد جیسوں کو معتقدین کی کھیپ مل سکتی ہے اس سے مودودی صاحب کو متبعین کا مل جانا کون سی تعجب کی بات ہے؟

(مئی ۱۹۷۶)

۳۔ ابتلاء یا آزمائش

ایک صاحب نے (جن کی اہلیہ' پانچ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر انہیں داغ مفارقت دے گئی ہیں) مودودی صاحب کو لکھا:

> اہلیہ کے انتقال کے فوراً بعد ہی سے یہ سوال دل و دماغ پر مسلط ہو چکا ہے کہ آخر وہ

کونسا گناہ عظیم ہے جس کی پاداش میں مجھے اور میری اولاد کو یہ سزا دی گئی۔ اور اگر یہ واقعی گناہ کا نتیجہ ہے تو میرے معصوم بچوں کو اس میں کیوں شامل کر لیا گیا؟ اس کے جواب میں مجھ سے یہ کہا گیا ہے اور کئی مرتبہ میں بھی اپنے آپ سے یہی کہتا ہوں کہ ہر انسان بہرحال گنہگار ہے اور اپنے گناہوں کی مغفرت کے لئے ہم جتنی بھی اللہ تعالیٰ کے حضور لجاجت سے دعا کریں، کم ہے۔ مگر موت کی مصیبت چونکہ اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے نیک بندوں پر بھی جن کی نظیر پیش کرنا شاید ممکن نہیں، آچکی ہے اور اس کے تلخ عواقب سے نہ صرف خود انہیں بلکہ ان کی بے مثال اولادوں کو بھی دوچار ہونا پڑا ہے، لہٰذا یہ حکم لگانا، کہ فلاں موقع پر موت کا وقوع کسی خاص گناہ یا گناہوں کے کسی خاص مجموعے کی پیداوار تھا، غالباً" درست نہ ہوگا۔

مزید بر آں، دعا مانگنے کے بارے میں بھی متعدد ظنون و اوہام پیدا ہو گئے کہ یہ عمل واقعی وہ تاثیر رکھتا ہے یا نہیں جو عموماً" اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ میں نے اور میرے بچوں نے مرحومہ کی صحت یابی کے لئے سیکڑوں دعائیں کیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کے بعد میں نے دعا مانگنا ترک تو نہیں کیا مگر منافقت ہو گی اگر میں یہ کہوں کہ اہلیہ کے بارے میں دعاؤں کے رائگاں جانے سے مجھے کمال درجے کی مایوسی نہیں ہوئی۔ میرے بچوں پر اس کا اثر بہت برا ہوا ہے اور وہ دعا کے قائل ہی نہیں رہے۔ پچھلے دنوں میں نے ان کو اس امر کی ترغیب دلانا چاہی تو وہ مجھ سے کہنے لگے کہ "آپ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ خدا سے دعا کیا کرو، وہ سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔ ہم نے اپنی ماں کے لئے بیشمار مخلصانہ دعائیں کیں مگر ایک بھی مستجاب نہ ہوئی"

علاوہ ازیں، سب سے زیادہ ایک پیچیدہ اور تکلیف دہ سوال جو اس سے پیشتر بھی کئی دفعہ پیدا ہو چکا ہے مگر جس کی تلخی اور شدت موجودہ حالات میں کئی گنا زیادہ محسوس ہوئی، وہ پیمانہ عمر کی مقدار اور موت کے مقدر ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ حقیقت بہ صراحت مذکور ہے کہ موت کا وقت معین ہے اور وہ کسی طرح آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ اس کے بالمقابل مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ خود ہمارے ملک میں جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جا رہی ہے، افراد کی اوسط عمر میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اہل مغرب کی اوسط عمر مدتوں سے اہل مشرق کی اوسط عمر سے زیادہ رہی ہے اور آج بھی ہے۔ ان حقائق سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کی کمی بیشی شاید ان معنوں میں مقدر نہیں جن معنوں میں ہم اسے مقدر سمجھتے آرہے ہیں۔

بلکہ انسانی سعی و کوشش بھی عمر کے بڑھانے اور گھٹانے میں دخیل ہے۔ مجھے اس امر کا پورے طور پر احساس ہے کہ یہ سوال جبر و قدر کے عام مسئلہ ہی کا ایک جزو ہے اور اس میں محض استدلال کی مدد سے کسی صحیح نتیجے تک پہنچنا شاید ممکن نہیں۔ مگر جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں، محض یہ کہہ کر ان مسائل سے اغماض نہیں کیا جا سکتا۔

---------------- ☆ ----------------

آپ نے غور فرمایا کہ ان الفاظ میں ایک قلب مضطرب کی دھڑکنیں کس طرح ابھر ابھر کر فریاد طلب سامنے آرہی ہیں۔ اب اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ مودودی لکھتے ہیں:

آپ کی پریشانیوں کا حال معلوم کر کے افسوس ہوا۔ آپ کو اپنی اہلیہ مرحومہ کی وفات کے سبب سے جو اضطراب لاحق ہے اور جس ذہنی کیفیت سے آج کل آپ گزر رہے ہیں، اس میں صبر کی تلقین کرنا گویا فطرت سے لڑنے کا مشورہ دینا ہے۔ لیکن درحقیقت اس صورت حال میں صبر کے سوا کچھ بھی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ صبر نہ کرے تو اس نقصان کی تلافی بہرحال نہیں ہو سکتی جو پہنچ چکا ہے۔ صرف اپنی تکلیف میں اضافہ ہو سکتا ہے[۱]۔

آپ کا یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ آپ کی اہلیہ کی وفات کوئی سزا ہے جو آپ کو یا آپ کے بچوں کو دی گئی ہے۔ دراصل یہ سزا نہیں بلکہ ان بے شمار آزمائشوں میں سے ایک آزمائش ہے جو دنیا کی اس امتحان گاہ میں انسان کو لازماً پیش آتی ہیں۔ دنیا میں کوئی انسان غیر فانی نہیں ہے۔ ہر ایک کو لازماً کسی نہ کسی وقت مرنا ہے اور موت بہرحال اس شرط کے ساتھ نہیں آتی کہ مرنے والا اپنے پیچھے کوئی ایسا شخص نہ چھوڑے جس کے لئے اس کی موت وجہ پریشانی بن سکے۔ بچے، جوان، بوڑھے، سب مرتے ہیں۔ اکثر مرنے والے ایسی حالت میں مرتے ہیں جس سے بہت سے دوسرے انسانوں کے لئے رنج و غم کے علاوہ بہت سی الجھنیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

دنیا کی بہت سی دوسری آزمائشوں کی طرح اس آزمائش سے بھی انسان کو کبھی نہ کبھی ضرور سابقہ پیش آتا ہے۔ اس پر دل برداشتہ ہونے کی بجائے اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اس سے بخیر گزرنے کی طاقت بخشے اور ان مشکلات کو رفع کر دے جو ان سے رونما ہوئی ہیں۔

دعا کے بارے میں بھی یہ سمجھ لیجئے کہ دعا ایک درخواست ہی ہے جو مالک کائنات

۱۔ خود ہی کہتے ہیں کہ صبر کرنا فطرت سے لڑائی کرنا ہے اور خود ہی صبر کی تلقین کئے جا رہے ہیں۔ (طلوع اسلام)

سے کی جاتی ہے۔ مالک ہر دعا کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہے اور نہ وہ اس شرط کے ساتھ مانگنی چاہیے کہ مالک لازماً اس کو قبول ہی کرے۔ ہمارا کام اس سے صرف التجا کرنا ہے۔ یہ اس کے مالک ہونے اور ہمارے بندہ ہونے کا عین تقاضا ہے۔ وہ قبول کرے تو اس کا کام، نہ قبول کرے تو اس کو اختیار ہے۔ اگر معمولی انسانی حکومتیں بھی ہر سائل کی ہر درخواست کو قبول نہیں کرتیں اور ان کے قبول نہ کرنے کی وجہ بہت سی ایسی مصلحتیں ہوتی ہیں جنہیں سائلین نہیں جانتے، تو آخر کائنات کی حکومت کیسے ہماری ہر درخواست کو قبول کر لینے کی پابند ہو سکتی ہے۔ اور کائنات کا یہ نظام کیسے چل سکتا ہے اگر ہر دعا مانگنے والے کی ہر ایک دعا جوں کی توں قبول کر لی جائے۔

پیمانہ عمر کے بارے میں جو سوال آپ نے کیا ہے، اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آج تک کسی تدبیر سے بھی انسان اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ ہر انسان کی عمر خود مقرر کر دے اور یہ طے کر دے کہ اس عمر کو پہنچنے سے پہلے کوئی شخص نہ مرنے پائے گا۔ آج تمام انسانی تدبیروں کے باوجود، ہر عمر کے آدمی مر رہے ہیں، عین ہسپتالوں میں مر رہے ہیں اور ایسے ایسے باوسیلہ آدمی بھی مر رہے ہیں جن کو علاج کی بڑی بڑی ممکن سہولتیں میسر آ سکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اعداد و شمار کی بنیاد پر بس یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کی اموات کی شرح کم ہو گئی ہے اور انسانوں کی اوسط عمر میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسان کے ہاتھ میں عمر کا سررشتہ آ گیا ہے۔ درحقیقت جس طرح تمام شعبہ ہائے زندگی میں اللہ تعالیٰ بتدریج انسان پر قوانین کائنات کے اسرار کھول رہا ہے اور رفتہ رفتہ اس کو مزید ذرائع پر دسترس عطا کر رہا ہے، اسی طرح انسانی امراض کے اسرار بھی وہ اس پر منکشف کرتا جا رہا ہے۔ ان کے علاج کے ذرائع بھی اس کو دیتا جا رہا ہے اور اسی کے مطابق وہ انسان کی تقدیر بھی بدلتا جا رہا ہے۔ لیکن بہرحال تمام دوسرے معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی انسان کی تقدیر ہے خدا ہی کے ہاتھ میں۔ اور آج بھی جب کسی انسان کی موت کا وقت آجاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مرنے سے بچا نہیں سکتی۔

میرے خیال میں آپ کو موجودہ ذہنی پریشانی سے نکلنے میں جو چیز سب سے زیادہ مدد دے سکتی ہے وہ قرآن مجید کا غائر مطالعہ ہے۔ اگر میری تفسیر تفہیم القرآن آپ کے پاس ہو تو آپ اس زمانے میں فرصت کے اوقات .... زیادہ تر اس کے مطالعہ میں صرف کریں۔ امید ہے کہ اس سے آپ کو سکون قلب حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۶۶ء)

طلوع اسلام

ہم نہیں کہہ سکتے کہ جن صاحب نے مودودی صاحب سے یہ سوال کیا تھا اس جواب سے ان کے دل درد آگیں کو سکون حاصل ہوا یا نہیں۔ لیکن اتنا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس جواب سے اسلام بے چارہ سرپیٹ کر رہ گیا ہوگا کہ اس کی طرف کیا کچھ منسوب کیا جا رہا ہے۔

بیماری' موت' دعا' تقدیر وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کی تشریح و تفسیر ضمنی طور پر پیش کی جا سکے۔ ان موضوعات پر ہم تفصیل سے بہت کچھ کہہ چکے ہیں اور قارئین طلوع اسلام اس سے آگاہ ہیں ۲؎۔ اس وقت ہم ان چند اشارات پر اکتفا کرتے ہیں کہ:-

(۱) صحت' بیماری' عمر کا تعلق خدا کے مقرر کردہ قوانین طبیعی سے ہے۔ اگر ان کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو انسان کی صحت قائم رہتی ہے' بیماری کم آتی ہے اور آتی بھی ہے تو اس کی مدافعت آسانی سے ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کریم کی یہی تعلیم ہے اور اس کی تائید اب انسان کے تجربات اور مشاہدات کر رہے ہیں--- موت کا ایک دن مقرر ہے--- شاعرانہ خیال ہے' حقیقت نہیں۔ موت کا دن پہلے سے مقرر نہیں ہوتا۔ انسان' اسے خود خدا کے قوانین کے مطابق مقرر کر لیتا ہے۔ کسی کا جی چاہے تو آج ہی اپنے گلے میں پھندا ڈال کر اپنی زندگی ختم کر سکتا ہے۔ آخر کار موت پر تو انسان قابو نہیں پا سکتا لیکن بیماری پر پا سکتا ہے اور اپنی عمر بڑھا بھی سکتا ہے۔

(۲) خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرنے سے جو نقصان رساں نتائج سامنے آتے ہیں (بیماری انہیں میں سے ایک ہے) ان کا ازالہ' خدا ہی کے مقرر کردہ دوسرے قانون کی طرف رجوع کرنے سے ہو سکتا ہے (بیماری کی صورت میں صحیح علاج اس کی مثال ہے)۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ایسے قوانین عطا کر رکھے ہیں جو تخریبی نتائج کی مدافعت کر سکتے ہیں۔

(۳) خدا کسی کی آزمائش نہیں کرتا--- ایک شخص ہماری دوستی کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ اس دعویٰ دوستی میں سچا ہے یا نہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی کسی مصیبت میں اس کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ وہ کس حد تک اپنے دعویٰ میں سچا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے اس دوست کی آزمائش ہو جاتی ہے۔ خدا کو اس قسم کی آزمائشیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ البتہ مصائب و تکالیف کے وقت ہم خود اپنی آزمائش کر لیتے ہیں کہ ہم میں حوصلہ اور ہمت کس قدر ہے اور ہم کس حد تک نامساعد حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مصائب و تکالیف ہمیں اپنی صلاحیتوں کی پرکھ کرنے کے مواقع بہم پہنچاتی ہیں۔ قرآن کریم میں جس ابتلا کا ذکر آتا ہے اس سے یہی مراد ہے' نہ کہ خدا کسی اپنے مقصد کے لئے ہماری آزمائش کرتا ہے۔ خدا کی ذات اس سے بہت بلند ہے۔

(۴) مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے اور انہیں دور کرنے کے لئے بے شک قرآن کریم کا غائر مطالعہ بے حد نفع

۲؎ مسئلہ تقدیر پر پرویز صاحب کی مستقل تصنیف میں شائع ہو چکی ہے جس کا نام "کتاب التقدیر" ہے۔۔ (نومبر ۱۹۷۲ء)

بخش ہے کہ وہ خدا کے ان قوانین کی نشان دہی کرتا ہے جن کے مطابق کائنات میں یہ کچھ ہوتا ہے لیکن جن انسانی خیالات کا نام ان حضرات نے قرآنی تعلیم رکھ چھوڑا ہے (خواہ اسے یہ براہ راست پیش کریں یا پہلے قرآن کی کوئی آیت پڑھ کر) ان سے تو ان الجھنوں میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی یہی تعلیم تو ہے جس کی وجہ سے ہمارے زمانے کا "غور کرنے والا طبقہ" اسلام سے دور بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ (فروری ۱۹۶۶ء)

۴۔ بے گناہوں پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں؟ قصور کس کا ہے؟

ایک صاحب قلب حساس کا خط ملاحظہ فرمایئے :۔

"کچھ ہی سال ادھر کی بات ہے جب میں ..... ریلوے اسٹیشن پر بطور ..... کام کرتا تھا۔ رات کے بارہ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر مسافر خانے میں جا کر ایک کپ چائے پی جو گرم ہونے کے باوجود سرد ہونٹوں سے لگنے کے بعد ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی سردی میں مسافر خانے کے کونے میں ایک غریب خاندان جس پر غربت کو بھی شرم آئے' بیٹھا ہوا تھا۔ مرد جو مفلوک الحال ہونے کے علاوہ ٹی بی کے مارے خون تھوک رہا تھا' مجھے فارغ پا کر یا جانے کیا سوچ کر' میرے پاس آیا اور کہنے لگا' مجھے غالباً" یہ بتانے کی دقت تو پیش نہ آئے گی کہ مجھے ٹی بی ہے۔ ہاں اس بات کا آپ کو علم نہ ہوگا کہ میں حیدر آباد مل میں اچھی خاصی کمائی کرتا تھا۔ جب ٹی بی ہوئی تو مل والوں نے نکال دیا۔ دوا دارو کیا' افاقہ تو خیر کیا ہونا تھا۔۔۔۔ مگر ہاں اثاثہ ضرور ختم ہو گیا۔ بھائی کے پاس رہنے لگا تو کچھ روز بعد بھاوج کے کہنے پر بھائی نے دھتکار دیا۔ آخر بیمار سے پیار بھی کون کرے۔ کوئٹہ جا رہا تھا بغیر ٹکٹ ہونے پر یہاں گاڑی سے اتار دیا گیا ہوں۔ کھانے کو تو خیر پہلے بھی کچھ نہ تھا البتہ پینے کو آنسو تھے۔ ہائے رے وہ بھی نہ رہے۔ کیا آپ مجھے' میری بیوی اور بچیوں کو کوئٹہ پہنچانے کا انتظام کر دیں گے۔ میں نے بچیوں کی طرف دیکھا جن میں سے ایک کی عمر سات برس کے لگ بھگ اور دوسری کی تیرہ چودہ کے قریب تھی۔ دونوں بچیاں پھٹی میلی سی ایک ہی چادر اوڑھے دونوں ایک دوسری کے ساتھ اکٹھی بیٹھی سردی کے مارے کانپ رہی تھیں۔ خاموش مگر کس حسرت سے ٹکٹکی باندھے مجھے چائے پیتے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اس غریب خاندان کی کیا مدد کی' اسے چھوڑیئے۔ دو چار روز بعد بھی جب اس خاندان کو وہیں پایا تو میں نے چائے والے سے پوچھا کہ یہ لوگ ابھی تک کوئٹہ کیوں نہیں گئے تو وہ ہنس کر کہنے لگا کہ بھولے بادشاہو! ابھی سودا نہیں ہوا۔ مطلب ؟ مطلب یہ کہ ایک زمیندار آیا تھا۔ وہ بڑی لڑکی کے آٹھ سو دے رہا تھا اور یہ بارہ سو مانگ رہے تھے۔ سودا نہیں ہوا مگر وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے۔ اور جب رات کے بارہ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر پھر چائے پینے گیا تو وہ خاندان وہاں نہیں تھا۔ دکاندار نے بھی کہا کہ معلوم نہیں وہ کب اور کہاں چلے گئے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ "سودا" ہوا یا نہیں۔ اگر نہیں ہوا تو بھی ایسے سودے آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اور اگر سودا ہو گیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمیندار اس بچی کو اپنے ہاں لے جائے گا۔ اس کے ساتھ نوکروں سے بھی برا سلوک کیا جائے گا۔ کھانے کو اتنا دیا جائے گا کہ بمشکل زندہ رہ سکے۔ معصوم بچی کے سر پر کام ہوگا کہ صبح سے شام

تنگ کرنے پر بھی ختم نہ ہوگا۔ اس پر ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ مفت کی۔ بچی کو ہر وقت زدوکوب کیا جائے گا مگر کیا مجال جو اف بھی کر سکے۔ درد کا درماں نہ ہوگا۔ کوئی اس کے سر پر دست شفقت پھیرنے والا نہ ہوگا۔ فرار ہونا تو درکنار تڑپ کر مرجانا بھی اک بات ہے مگر بچاری کو تو اس پر بھی اختیار نہ ہوگا۔ کچھ سالوں بعد اس کی ذمہ داریاں تبدیل ہو جائیں گی۔ پھر ایک جگہ سے دوسری، تیسری اور چوتھی جگہ بکنا شروع ہو جائے گی اور خدا جانے کہاں کی کہاں پہنچ جائے گی۔

اس طرح اس بچی نے تمام عمر گناہ اور دکھوں میں گزاری۔ آخر اس گناہ اور دکھ کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر گناہ کو معصوم بچی کے باپ کے سر تھوپ دیا جائے یا معاشرے یا حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے، بہرصورت بچی کو جو دکھ ملے آخر وہ کس سلسلے میں؟ کس جرم میں؟ کس قصور کی پاداش میں؟ ذمہ دار کوئی ہو یا قصور کرنے والا کوئی ہو اور پکڑی جائے بچی جیسے عیسائیوں کے ہاں ہے کہ "ہم ان کا بدلہ ان کی اولاد سے لیتے ہیں"۔ یہ تو کسی طور مبنی برانصاف نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ "ہر آدمی اپنے اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے" یا جو خرابی آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے، تو بھی بچی نے اپنے کئے کا پھل نہیں پایا۔ بچی نے کونسا گناہ کر دیا تھا جس کی پاداش میں اس کی تمام عمر دکھ میں بیتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس بچی کو اگلے جہان جا کر دکھ کی بجائے سکھ ملے گا تو یہ بھی مبنی برانصاف نہیں کہ قدرت نے اسے اس جہان میں سکھ نہ دیا بلکہ الٹا سکھ کے بجائے (اور لطف کی بات یہ کہ بغیر کسی گناہ کے) دکھ دیا۔

ان باتوں کو جوں جوں سوچتا ہوں پریشانی بڑھتی جاتی ہے۔ کیا آپ اس اضطراب کو دور کر سکیں گے؟"

طلوع اسلام

اسی قسم کے تھے وہ مقامات جہاں ذہن انسانی نے اپنے عجز کا مظاہرہ مختلف انداز سے کیا۔ اس نے کبھی (عیسائیت کے عقیدہ کی رو سے) یہ کہا کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور اس کی پاداش میں دکھ جھیلتا ہے۔ کبھی (یونان سے برآمد شدہ اور ہندوؤں کے اپنائے ہوئے عقیدہ تناسخ کی رو سے) یہ کہا کہ ہر انسان اپنے پچھلے جنم کے کرموں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ کہیں اس نے (مجوسیوں کے تتبع میں اختیار کردہ مسلمانوں کے عقیدہ کے رو سے) یہ کہا کہ یہ باتیں انسان کی تقدیر سے متعلق ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ جن کا دل (مہاتما بدھ کی طرح) زیادہ رقیق تھا، انہوں نے اس قسم کے دو چار واقعات دیکھ کر خود دنیا سے فرار کی راہ اختیار کر لی۔ اگر ان کے دل جذبات کی رو میں بہ جانے کی بجائے، حقائق کا بے نقاب سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتے تو اس بات کا سمجھنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔ اس طرح ان کے سامنے یہ حقیقت آجاتی ہے کہ فرد، معاشرہ کا جزو ہوتا ہے۔ جس قسم کا معاشرہ اسی قسم کے افراد کے حالات۔ غلط معاشرہ میں بے گناہ افراد بڑے دکھ جھیلتے اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور اس معاشرہ کا مفاد پرست طبقہ انہیں "گناہ اول" "تناسخ" یا تقدیر کے عقیدوں میں الجھائے

رکھتا ہے تاکہ ان کی نگاہ ان کی طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔ اگر انہیں بتا اور سمجھا دیا جائے کہ ان کی مصیبتیں اور تکلیفیں اسی معاشرہ کی پیدا کردہ ہیں تو وہ اٹھ کر اس معاشرہ کو زیر وزبر کر دیں اور اس کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر دیں۔ غلط معاشرہ کا یہی وہ "فتنہ" ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس سے محتاط رہو کیونکہ اس کی خرابیاں انہیں تک محدود نہیں رہا کرتیں جو ان کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس آگ کے شعلے دوسروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ ہماری نگاہ ان تکلیفوں کی طرف تو جاتی ہے جو غلط معاشرہ میں ہمیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان کے لئے ہم پکار اٹھتے ہیں کہ یہ سزا ہمیں کس جرم کے پاداش میں مل رہی ہے۔ لیکن معاشرہ کی طرف سے ہمیں جو سہولتیں میسر ہوتی ہیں ان کے متعلق ہم کبھی نہیں سوچتے (اور کہتے) کہ ہم نے (انفرادی طور پر) وہ کون سے کارنمایاں کئے ہیں جن کے صلہ میں ہمیں یہ سب آسانیاں میسر ہو رہی ہیں۔ (مثلاً) انگریزی طب کی کتابوں میں ایک تصویر دیکھنے میں آئے گی۔ آج سے قریب دو اڑھائی ہزار سال قبل کا زمانہ ہے۔ یونان کا ملک۔۔۔ ایک بادشاہ کی ٹانگ میں ناسور ہو گیا ہے جس کے متعلق اطبا کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔ بادشاہ کو فرش پر لٹا رکھا ہے اور چار پانچ دیوہیکل غلام اسے چاروں طرف سے دبائے ہوئے ہیں کہ وہ ہلنے نہ پائے۔ ایک "سرجن" آری سے اس کی ٹانگ کاٹ رہا ہے۔ ایک طرف کوئلے دہک رہے ہیں جن میں لوہے کی سلاخیں گرم ہو رہی ہیں۔ پاس ہی کڑاہی میں تیل اونٹھ رہا ہے۔ جب آری سے ٹانگ کٹتی ہے تو دوسرا طبیب اسے لوہے سے داغتا ہے اور اس پر گرم گرم تیل ڈالتا جاتا ہے تاکہ خون بند ہو جائے اور زخم جل کر سوکھ جائے۔ آپ سوچئے کہ اس عمل جراحی میں اس مریض (بادشاہ) پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس نے چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔

اس سے اگلے ہی صفحہ پر دور حاضر کے ایک کلینک کی تصویر ہے جس میں سرجن نے مریض کو ایک ٹیکہ لگا کر بے حس کر دیا ہے اور نہایت اطمینان سے اس کا اپریشن کئے جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بادشاہ نے کیا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں اسے اس قدر جانکاہ تکلیف برداشت کرنی پڑ رہی تھی اور ہم نے کون سے "اعمال صالحہ" کئے ہیں جن کی جزا میں ہم اس قدر آرام اور راحت سے اپنا علاج کرا لیتے ہیں۔ یہ ہے معاشرہ میں افراد کی حالت کا نقشہ۔

یہ مثال طبیعی احوال و کیفیات کی ہے۔ اسی سے تمدنی اور عمرانی احوال و کیفیات کا اندازہ لگا لیجئے۔ جب اور جہاں معاشرہ صحیح اقدار انسانیت کا حامل ہو گا' افراد کی زندگی سکون اور اطمینان سے گزرے گی۔ جب وہ غلط بنیادوں پر متشکل ہو گا' افراد مصیبتیں بھگتیں گے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو بے نقاب کیا اور کہا کہ بے گناہ افراد کو مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ غلط معاشرہ کو صحیح معاشرہ میں تبدیل کیا جائے۔ معاشرہ کو غلط بنیادوں پر قائم رہنے دینا اور افراد کی مصیبتوں پر آنسو بہانا (یا خیر خیرات سے ان کی تکالیف کو دور کرنے یا ان میں کمی کرنے کی کوشش کرنا' حالانکہ اس سے ان کی طبیعی تکالیف تو دور ہو سکتی ہیں لیکن ان کے شرف انسانیت کی جس قدر تذلیل

ہوتی ہے' ایک قلب حساس کے نزدیک اس کی تکلیف' طبیعی تکلیف سے کہیں زیادہ اور شدید ہوتی ہے) یا تو کمزوری اعصاب کی دلیل ہے اور یا مفاد پرست گروہ کی فریب کاری کا مظہر جس کا آلہ کار مذہبی پیشوائیت بنتی اور مظلوموں کو غلط عقائد کی افیون پلا کر سلائے رکھتی ہے۔ ان مصیبتوں کا صحیح علاج غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ کی تشکیل کے سوا کچھ نہیں۔

صحیح معاشرہ کا قیام وہ عمل صالحہ ہے جس کا خوش گوار اور حیات بخش ثمرہ تمام (موجودہ اور آنے والی نسلوں تک کے) افراد معاشرہ کو ملتا ہے اور غلط معاشرہ کو قائم کرنا یا اس کے قائم رکھنے میں ممد معاون بننا (خواہ یہ معاونت بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ) وہ جرم ہے جس کی پاداش میں افراد معاشرہ اس قسم کی تکلیفیں برداشت کرتے اور دکھ جھیلتے ہیں۔ غلط معاشرہ کو بدلنے والے افراد بھی اپنی ان کوششوں میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں' لیکن اس سے ان کی ذات کی ایسی نشونما ہو جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں طبیعی تکالیف اور مصائب ہیچ ہو جاتے ہیں۔ (مئی ۱۹۶۶ء)

۵۔ بے وقت کی بارشوں سے کسان تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کیوں؟

ایک خط : "میں یہ خط گاؤں سے لکھ رہا ہوں۔ کسانوں نے رات دن ایک کر کے چھ ماہ کی محنت شاقہ کے بعد گیہوں کی فصل تیار کی۔ فصل پکی' کسانوں کے گھروں میں مسرت کی لہریں دوڑ گئیں کہ اب چند دنوں کے بعد ان کی کوٹھیاں اناج سے بھر جائیں گی۔ وہ سال بھر کا قرضہ چکائیں گے۔ آئندہ سال کے لئے روٹی کی فکر سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ کئی رکے ہوئے کام کاج کریں گے۔ انہی جذبات کو سینوں میں لئے ہوئے کسانوں نے گیہوں کاٹی۔ دھوپ کڑاکے کی تھی۔ انہیں اس کی ضرورت تھی۔ چٹیل میدانوں میں گیہوں گاہنے کے لئے ڈال دی۔ سارا سارا دن اس چلچلاتی دھوپ میں انہوں نے اور ان کے بے زبان مویشیوں نے لہو پسینہ ایک کر کے اسے گاہا۔ اب اسے اڑا کر دانہ اور بھوسہ الگ کرنا باقی تھا کہ رات اچانک کالی گھٹا اٹھی۔ آدھی رات سے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پکی پکائی فصل پانی کی نذر ہو گئی۔ کسان حسرت بھری نگاہوں سے اپنی اجڑتی ہوئی دنیا کو دیکھ رہے تھے اور کچھ کر نہیں سکتے۔ ان کی بے بسی اور بے کسی قابل رحم ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ میاں کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے انہیں اس طرح تباہ کر دیا۔ مولوی صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ سب تمہارے گناہوں کی سزا ہے۔ اللہ میاں کسی پر ظلم زیادتی نہیں کیا کرتے۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ گنہگار تو ہم سے بھی بڑھ کر کئی ہیں۔ ان کا تو بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ گناہوں کا وبال ہم پر ہی کیوں پڑ رہا ہے جو کئی سالوں سے ہمارے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے؟--- فرمایئے میں انہیں کیا جواب دوں؟

طلوع اسلام

کسانوں کی بے بسی' آپ کی حیرت' اور ملا کی جہالت' سب اپنے مقام پر ٹھیک ہے۔ بادل' ہوائیں' دھوپ' سردی' گرمی' وہ "ملائکہ" ہیں جن کے متعلق ہمیں کہا گیا ہے کہ وہ "آدم" (یعنی آدمی) کے سامنے سجدہ ریز ہوں

گے۔ جب "ابن آدم" (یعنی زمانہ قدیم کا انسان) ہنوز مقام آدم تک نہیں پہنچا تھا وہ ان ملا ئکہ کو اپنے سامنے جھکا نہیں سکا تھا۔ وہ ان سے ڈرتا، کانپتا تھا۔ جوں جوں وہ "آدم" بنتا گیا فطرت کی قوتیں اس کے تابع تسخیر ہوتی چلی گئیں۔ ہماری بے بسی کی وجہ یہ ہے کہ ہم مقام آدم تک نہیں پہنچ سکے۔

ہمارے ہاں فصلوں کے بونے اور کاٹنے کا پروگرام نہ معلوم کتنے ہزار سال پہلے متعین ہوا تھا۔ یہ مقرر ہوا تھا اس زمانے کے موسموں کے مطابق ـــــ اب موسموں میں تغیر آچکا ہے لیکن ہمارے ہاں فصلوں کا پروگرام ابھی تک وہی چلا آرہا ہے۔ یہ فریضہ قوم کے ارباب فکر و دانش کا تھا کہ وہ ان موسمی تغیرات کا جائزہ لے کر فصلوں کے لئے ایک نیا پروگرام مرتب کرتے اور کسانوں کو اس کے مطابق ہدایت کرتے، لیکن انہوں نے یہ نہ کیا۔

زندہ قوموں نے یہ بھی کیا اور اس کے ساتھ ہی ایسی ایسی مشینیں بھی ایجاد کرلیں جن سے ہفتوں کے کام گھنٹوں میں سرانجام پا جائیں۔ مثلاً انہوں نے (HARVESTER) تیار کرلئے ہیں۔ ایک مشین پورے گاؤں کی کھڑی فصل کو کاٹ کر ـــــ گاہ کر ـــــ دانہ کو بھوسے سے الگ کر کے ـــــ بوریاں بھر کر تیار کر دیتی ہے اور یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ ایک دن میں ہو جاتا ہے۔ وہاں پورے گاؤں کی کاشت کو اپریٹو طریق سے ہوتی ہے۔ اس لئے ایک مشین، ایک دن میں سب کچھ کر کے اگلے دن دوسرے گاؤں پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح نہ کسانوں کی حسرت بھری نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف تکتی ہیں نہ انہیں خدا کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ نہ ملا کو یہ فریب انگیز افیون پلانی پڑتی ہے کہ یہ سب تمہارے گناہوں کی سزا ہے اور نہ ہی آپ جیسوں کو کسی معقول جواب کی تلاش میں مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔

یہاں، نہ یہ ہوا، نہ وہ ـــــ اب ان کسانوں کو کون بتائے کہ انہیں کس کے گناہوں کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے؟ ایک بتانیوالے نے البتہ اتنا بتایا تھا کہ ؎

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب! (زبور عجم)

سو ہم نے اسے شاعر کا خواب کہہ کر ان سنی کر دیا۔

(جون ۱۹۶۶ء)

۶۔ کیا ہر ایک کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے؟

سورہ ہود کی ایک آیت ہے۔ **وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا** (۱۱/۶) "اور کوئی جاندار روئے زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو"۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ۳؎ نے اس آیت

۳؎ جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (نومبر ۱۹۷۶ء)

جلیلہ کی تفسیر بیان فرمائی ہے، جو ہفت روزہ شہاب (لاہور) کی ۱۹ ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں وہ پہلے فرماتے ہیں:

انسان کے رزق کی کفالت حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور نہ صرف انسان کی بلکہ زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی۔ وہ جہاں کہیں رہتا ہے یا چلا جاتا ہے اس کی روزی اس کے پاس پہنچتی ہے۔ تو کفار کے یہ ارادے کہ اپنے کسی کام کو اللہ تعالیٰ سے چھپالیں، جہالت اور بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔

پھر اس کے عموم میں جنگل کے تمام درندے، پرندے اور حشرات الارض، دریا اور خشکی کے سب جانور داخل ہیں۔ اس عموم کی تاکید کے لئے لفظ "من" کا اضافہ کر کے "وما من دابۃ" فرمایا۔ دابۃ ہر اس جانور کو کہتے ہیں، جو زمین پر چلے۔ پرندے جانور بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ ان کا آشیانہ بھی کہیں زمین پر ہی ہوتا ہے۔ دریائی جانوروں کا بھی تعلق زمین سے ہونا کچھ مخفی نہیں۔ اب سب جانداروں کے رزق کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے ذمہ لے کر ایسے الفاظ سے اس کو بیان کیا ہے جیسے کوئی فریضہ کسی کے ذمہ ہو۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری حق تعالیٰ پر ڈالنے والی کوئی اور طاقت نہیں بجز اس کے کہ اس نے اپنے فضل سے یہ وعدہ فرما لیا۔ مگر وعدہ ایک صادق کریم کا ہے جس میں خلاف ورزی کا کوئی امکان نہیں۔ اسی یقین کو ظاہر کرنے کے لئے اس جگہ لفظ علیٰ لایا گیا ہے جو فرائض کے بیان کے لئے مستعمل ہوتا ہے"۔

اس دعویٰ کے ثبوت میں (کہ ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری خدا پر عائد ہوتی ہے) انہوں نے ایک واقعہ بیان فرمایا ہے۔

ایک عجیب جانور: "بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہ طور پر پہنچے اور وہاں آگ کی بجائے تجلیات الٰہی سامنے آئیں اور ان کو نبوت و رسالت عطا ہو کر فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لئے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس کا کون متکفل ہوگا۔ اس خیال کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں۔ انہوں نے تعمیل حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا۔ حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں۔ ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا۔ اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا جس کے منہ میں ہرا پتہ تھا۔ آج بھی پہاڑوں کی چٹانوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ان میں سے جانور (جاندار کیڑے) نکلتے ہیں۔

حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یقین تو کوئی نہ ہوتا، مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہو گئے۔ زوجہ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہوا ہے، وہاں جا رہا ہوں"

---------○---------

اس کے بعد مفتی صاحب کے دل میں وہ خیال پیدا ہوا جو ہر اس شخص کے دل میں ابھرتا ہے جو دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہزاروں انسان بھوک سے مرجاتے ہیں تو اس وقت خدا کی یہ ذمہ داری کہاں چلی جاتی ہے؟ وہ فرماتے ہیں:

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے' تو پھر ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں کہ بہت سے جانور اور انسان غذا نہ ملنے کے سبب بھوکے پیاسے مرجاتے ہیں"۔

سوال بڑا اہم ہے اور اس کا جواب سننے کے لئے یقیناً" آپ مضطرب و بے قرار ہوں گے۔ لیجئے جواب حاضر ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اس کے جواب علماء نے متعدد لکھے ہیں۔ ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک اس کی اجل مقدر یعنی عمر پوری نہیں ہو جاتی۔ جب یہ عمر پوری ہو گی تو اس کو بہرحال مرنا اور اس جہاں سے گزرنا ہے جس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں۔ کبھی جلنا یا غرق ہونا یا چوٹ اور زخم بھی سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا رزق بند کر دیا گیا' اس سے موت واقع ہو گئی"

سورہ ہود کی اس آیت کی یہ تفسیر مفتی محمد شفیع صاحب نے بیان فرمائی ہے۔ اس آیت کے متعلق ایک صاحب نے مودودی صاحب سے بھی دریافت کیا اور اپنے سوال میں لکھا کہ

"مجھے جو بات کھٹک رہی ہے وہ یہ ہے کہ جب رزق کا ذمہ دار اللہ ہے تو بنگال کے قحط میں جو تیس ہزار آدمی ۴۴-۱۹۴۳ء میں مر گئے تھے' ان کی موت کا کون ذمہ دار تھا؟
(ترجمان القرآن' جنوری ۱۹۶۶ء)

اب اس سوال کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر جتنی مخلوقات ہیں ان سب کے رزق کا سامان خدا نے پیدا کیا ہے۔ یہ سامان اگر خدا پیدا نہ کرتا تو کون چھوٹے چھوٹے کیڑوں اور بھنگوں سے لے کر نوع انسانی تک' اس بے حد و بے حساب مخلوق کے لئے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق رزق فراہم کر سکتا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ مخلوقات میں سے کچھ افراد کبھی رزق نہ ملنے کی وجہ سے بھی مر جاتے ہیں تو اس سے آخر یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رزاق ہونے کا انکار کر دیا جائے؟ اول تو آپ ذرا یہ اندازہ کریں کہ مخلوقات میں سے کتنے فی کروڑ' بلکہ کتنے فی ارب ایسے ہیں جو رزق نہ ملنے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ جس طرح خدا نے اپنی

مخلوقات کے لئے زندگی کا بے حدو حساب سامان فراہم کیا ہے اسی طرح اس نے ان کے مرنے کے لئے بھی تو بے شمار اسباب پیدا کئے ہیں- روزانہ لاکھوں کروڑوں آدمی پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں- مرنے والے ایک ہی طرح نہیں مرتے بلکہ بے شمار مختلف صورتوں سے مرتے ہیں اور موت کی ان بے شمار صورتوں میں سے ایک صورت رزق نہ ملنا بھی ہے- جب موت کا وقت مقرر آپہنچتا ہے تو اس وقت رزق کی موجودگی بھی کسی متنفس کو موت سے نہیں بچا سکتی- صرف رزق ہی نہیں بلکہ زندگی اور موت کا سامان بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے- اس لئے **علی اللہ رزقھا** کے ساتھ **یعلم مستقرھا ومستودعھا** بھی فرمایا گیا-

☆

طلوع اسلام

مفتی صاحب کی بیان کردہ تفسیر اور مودودی صاحب کے جواب کا ملخص قریب قریب ایک ہی ہے، یعنی ان حضرات کا ارشاد یہ ہے کہ ہر فرد کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری خدا نے خود لے رکھی ہے- لیکن جب کوئی شخص رزق نہ ملنے کی وجہ سے مرجاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا نے اس کی موت ہی ایسے لکھی تھی- بالآخر موت کا اختیار بھی تو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے! اب اگر اس قسم کے دلائل باہرہ کے بعد بھی کوئی شخص اسلام کا گرویدہ نہ ہو تو اس کی سیاہ بختی کا کیا علاج؟

لیکن اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ صاحب! یہ فرمایئے کہ ایک مزدور صبح سے شام تک مزدوری کی تلاش میں مارے مارے پھرتا ہے- اسے کہیں مزدوری نہیں ملتی اور وہ شام کو خالی ہاتھ گھر واپس آجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اور اس کے بیوی بچے بھوکے سو جاتے ہیں یا اگر اس کو مزدوری ملتی ہے تو اتنی کہ اس سے ان سب کا پیٹ نہیں بھرتا تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اس مزدور کے افراد خاندان کو موت تو نہیں آتی لیکن یہ رزق نہ ملنے یا کم ملنے کی وجہ سے سسک سسک کر زندگی کے دن پورے کرتے ہیں- تو کیا یہی ہے خدا کی وہ ذمہ داری جس کا اعلان اس نے ایسے واضح الفاظ میں کیا ہے؟ اگر کوئی شخص کسی خاندان کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اور اس کے بعد انہیں اس طرح کھانے کو دے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو کماحقہ پورا کر رہا ہے؟ اقوام متحدہ کے غذائی شعبہ کی رپورٹ یہ ہے کہ اس وقت دنیا کی قریب آدھی آبادی ایسی ہے جسے دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا- کیا مخلوق کے رزق کی ذمہ داری پوری کرنا اسی کو کہتے ہیں؟

یہ تو ہے ان حضرات کی ذہنی سطح جو اس قسم کے جوابات سے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کی حقانیت اور قرآن کی افضلیت کو دلائل و براہین کی رو سے ثابت کر دیا ہے اور پھر اس پر (یہ اور ان کے عقیدت مند) پھولے نہیں

ساتے --- کہ ہم نے کتنا بڑا کارنمایاں کر دکھایا ہے۔

--- اب دیکھئے قرآن کریم کے متعلق ان کا مبلغ علم! قرآن کریم لوگوں سے بار بار کہتا ہے کہ تم غریبوں اور مسکینوں کو رزق بہم پہنچانے کا انتظام کیوں نہیں کرتے؟ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ جو شخص **یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین** (۳-۲/۱۰۷) یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مساکین کو رزق بہم پہنچانے کے لئے دوسروں کو رغبت نہیں دلاتا --- وہ تکذیب دین کرتا ہے خواہ وہ دکھاوے کی کتنی ہی نمازیں کیوں نہ پڑھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے تو وہ لوگوں سے کیوں کہتا ہے کہ تم بھوکوں کی روٹی کا انتظام کرو اور جو ایسا نہیں کرتے انہیں مستحق عذاب قرار دیتا ہے؟

یہ خیال کہ خدا خود ہر ایک کو رزق پہنچاتا ہے' انہی حضرات کا پیدا کردہ نہیں۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ کن لوگوں کا پیدا کردہ ہے؟ سورہ یٰسین میں ہے **واذا قیل لھم انفقو مما رزقکم اللہ** جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق خدا نے تمہیں دیا ہے اس میں سے محتاجوں اور مسکینوں کے لئے کھلا رکھو یعنی ان کے لئے بھی دو **قال الذین کفروا للذین امنوا انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ** تو کفار' اہل ایمان سے کہتے ہیں کہ ہم ایسے لوگوں کے رزق کا انتظام کیوں کریں کہ اگر خدا چاہتا تو ان کے رزق کا انتظام خود کر دیتا۔ اس کے جواب میں خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ **ان انتم الا فی ضلال مبین** (۳۶/۴۷) تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو --- یعنی قرآن کریم کی رو سے اس قسم کا عقیدہ --- کہ خدا براہ راست رزق پہنچاتا ہے --- کفار کا پیدا کردہ اور کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ قرآن کی تعلیم کے خلاف' مسلمانوں میں یہ عقیدہ اس وقت آیا جب قرآنی نظام کی جگہ نظام سرمایہ داری نے لے لی اور اس کی حمایت' مذہبی پیشوائیت نے اس قسم کے عقائد پھیلا کر کی کہ --- رزق کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے "بلا حدو نہایت" دولت دیدے' جسے چاہے مفلس اور غریب رکھے۔ اگر کسی کو رزق نہیں ملتا تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کی مشیت ہی ایسی ہے۔ اگر مخلوق بھوکی مرتی ہے تو اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔ خدا نے ان کا رزق ختم کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور یہی ہیں وہ عقائد جو ان حضرات کی طرف سے اسلام کے نام سے پھیلائے جاتے ہیں۔

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ :-

(۱) رزق کے ذخائر خدا نے بلا مزد و معاوضہ' نوع انسان کی پرورش کے لئے عطا کر دیئے ہیں۔

(۲) ان ذخائر سے رزق نکالنا انسانوں کی سعی و کاوش پر منحصر ہے۔ جو قوم صحیح خطوط پر (خدا کے قوانین طبیعی کے مطابق) محنت اور کوشش کرتی ہے اسے باافراط رزق ملتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتی اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے --- اور

(۳) اس طرح پیدا کردہ رزق کی تقسیم' انسانوں کے اجتماعی نظام کی رو سے ہوتی ہے۔ جس نظام میں رزق کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق رزق ملتا جائے' وہ نظام' مشیت خداوندی کے مطابق ہے کیونکہ اس میں "خدا کی ذمہ داری" پوری ہوتی چلی جاتی

ہے۔ جس نظام میں رزق کی تقسیم ناہموار ہوتی ہے---- یعنی جس میں بعض لوگوں کے پاس دولت کے انبار جمع ہوتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا---- وہ نظام مشیت خداوندی کے مطابق نہیں۔ اس میں "خدا کی ذمہ داریاں" پوری نہیں ہوتیں--- یاد رکھیے! انسانی دنیامیں خدا کی ذمہ داری' انسانی نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ "جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس طرح صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' اس بستی سے خدا اپنی حفاظت کی ذمہ داری اٹھالیتا ہے" اور خدا کی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا ہی احساس تھا جس کے لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ "اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مرگیا تو خدا کی قسم! عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی"۔

اگر حضرت عمرؓ بھی اس اسلام کے حامل ہوتے جو اس وقت ان حضرات کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے' تو وہ دجلہ کے کنارے' بھوک سے مرجانے والے کتے کے متعلق نہایت آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ جب تک وہ کتا زندہ رہا' خدا اسے رزق دیتا رہا۔ جب اس کی موت آگئی' خدا نے اس کا رزق بند کر دیا۔ اس کی بھوک کا مجھ سے کیا تعلق جو اس کی بازپرس مجھ سے ہو؟ اور یہی تھا (حضور نبی اکرمؐ کا پیش کردہ) وہ اسلام جسے دیکھ کر قریش کے نظام سرمایہ داری کے نمائندہ ابوجہل نے اپنے "خداؤں" کے حضور فریاد کرتے ہوئے (اقبال کے الفاظ میں) کہا تھا کہ

این مساوات' این مواخات اعجمی است
خوب میدانم کہ سلمانؓ مزدکی است

اور یہی کچھ آج بھی کہا جاتا ہے لیکن کہا جاتا ہے خود اسلام کا نام لے کر۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کردہ اسلام ہمارے دور ملوکیت یا سرمایہ داری کا اسلام ہے۔ اسی کو عجمی اسلام کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

(فروری ۱۹۶۶ء)

۷۔ اکتساب رزق کی صلاحیتوں میں فرق
(تقدیر۔ من یشاء۔ سخریا۔ کا صحیح مفہوم)

استفسار: "جناب بادشاہ گل بخاری نے ایک کتاب "حجیت حدیث" کے نام سے تصنیف کی ہے۔ اس میں وہ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ نبوت اور رسالت کی طرح رزق بھی وہبی طور سے ملتا ہے اور یہ کسبی چیز نہیں--- "رسول اور امیر میں فرق" کے زیر عنوان یہ عبارت درج ہے۔

"غرض رسالت کا معاملہ رزق کی طرح صرف خدا کی تقسیم پر موقوف ہے۔ **اھم یقسمون رحمت ربک نحن قسمنا بینھم معیشتھم** یعنی نبوت اور رسالت' رزق

کی طرح ربوبیت کا حق ہے۔ جب رزق کی تقسیم اس نے کسی کے حوالے نہیں کی،
اپنے ذمہ رکھی ہے، تو نبوت کی تقسیم بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے"

"مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار اس آیت کا اگلا ٹکڑا **فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجت لیتخذ بعضھم بعضا سخریا** بھی اس کے ساتھ جوڑ کر یہ استدلال عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ "خدا نے ازلی اور قدرتی طور سے بعض لوگوں کو بعض پر رزق میں فوقیت دی ہے اور یہ فوقیت اس لئے دی ہے تاکہ بعض بعض کو پکڑیں اور زبردستی پکڑ کر مسخر کریں۔ لفظ "سخریا" اس پر دال ہے۔"

"اگر اس آیت کو زیر بحث لا کر اس پر تفصیلی گفتگو ہو جائے تو بہت سارے لوگوں کے شکوک رفع ہو جائیں گے۔"

جواب :- جناب بادشاہ گل بخاری صاحب سے ہمارا تعارف نہیں لیکن فہم قرآن کریم کے سلسلے میں انہوں نے جس تاسف انگیز ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ انہی مکتبوں کے دستار فضیلت یافتہ ہیں جن کے نصاب میں قرآن شامل نہیں ہوتا۔ ہم نفس مضمون کی طرف تو بعد میں آئیں گے، پہلے یہ عرض کر دیں کہ ان صاحب نے وہبی ہونے کے اعتبار سے نبوت کو جو رزق کا ہم پلہ قرار دیا ہے تو اس سے انہوں نے نبوت جیسے عظیم اختصاص کو جس پست سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے، اس سے ہمیں افسوس ہی نہیں، بے حد قلق ہوا ہے۔ ان صاحب کا کہنا یہ ہے کہ رزق اسی طرح سے وہبی طور پر ملتا ہے جس طرح نبوت وہبی طور پر ملتی ہے (یعنی ملتی تھی)۔ اب دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے حصول رزق کی کیفیت کیا ہے۔

(۱) سورہ شوریٰ میں ہے **من کان یرید حرث الدنیا نوتہ منھا** (۴۲/۲۰) "جو شخص دنیا کی کھیتی لینے کا ارادہ کرتا ہے، ہم اسے وہ دے دیتے ہیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ متاع دنیا (جس میں لا محالہ رزق سب سے پہلے آئے گا) حاصل کرنے کے لئے انسان کا اپنا ارادہ شرط ہے یعنی رزق اسے ملے گا جو رزق لینے کا ارادہ کرے گا۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں بخاری صاحب سے کہ کیا نبوت حاصل کرنے کے لئے بھی یہی شرط ہوتی ہے یعنی نبوت اسے ملتی تھی جو نبوت لینے کا ارادہ کرتا تھا۔

(۲) سورہ جمعہ میں ہے۔

فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ ....(۶۲/۱۰)

(ابتغاء فضل اللہ کی آیتیں قرآن میں متعدد مقامات پر آئی ہیں۔

مولانا محمود الحسنؒ اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

پھر جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا"

اور اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

حضرت شاہ صاحبؒ (شاہ عبدالقادرؒ) لکھتے ہیں، "یہود کے ہاں عبادت کا دن ہفتہ تھا۔

سارا دن سودا منع تھا- اس لئے فرمادیا کہ تم نماز کے بعد روزی تلاش کرو اور روزی کی تلاش میں اللہ کی یاد نہ بھولو۔

یعنی "**ابتغاء فضل من اللہ**" کے معنی "روزی کی تلاش کرنا" ہیں- اس سے واضح ہے کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ تم .... رزق کو تلاش کرو ------ رزق اسی کو ملے گا جو اسے تلاش کرے گا- تلاش کے بغیر رزق نہیں مل سکے گا یعنی رزق سراسر اکتسابی شے ہے-

سوال یہ ہے کہ کیا نبوت کے لئے بھی تلاش شرط تھی؟ اور جو چیز تلاش کے بعد حاصل ہو' کیا اسے وہبی کہا جائے گا؟ نبی (اور خود نبی اکرمؐ) کے متعلق تو خدا نے یہ کہا ہے کہ **وما کنت تدری ماالکتاب ولا الایمان** (۵۲/۴۲) تو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے-"

(۴) انفاق رزق کے متعلق قرآن کریم میں بے شمار آیات آئی ہیں- سورہ بقرہ کے شروع میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ---- **ومما رزقنھم ینفقون** (۲/۳) "جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں"' یعنی اس میں سے دوسروں کو بھی دیتے ہیں- بعض آیات میں انفاق کا حکم بھی آیا ہے- اب سوال یہ ہے کہ کیا کسی نبی سے بھی ایسا کہا گیا ہے کہ جو نبوت ہم نے تمہیں دی ہے اس کا کچھ حصہ دوسروں کو بھی دیا کرو؟ اور جو چیز کسی انسان کو کسی دوسرے انسان سے ملے کیا اسے وہبی کہا جائے گا؟ "وہبی" تو وہ شے ہوگی جو کسی انساں کو' بلاکسب و ہنر اور بلاسعی و کاوش' براہ راست خدا کی طرف سے ملے- قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ رزق کے اس قسم کے وہبی ہونے کا عقیدہ کفار کا تھا جس کی تردید خدا نے کی- سورۃ یٰسین میں ہے کہ **واذا قیل لھم انفقوا مما رزقکم اللہ قال الذین کفروا للذین امنوا** جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اس میں سے دوسرے (ضرورت مندوں) کو بھی دیا کرو' تو یہ لوگ' جماعت مومنین سے کہتے ہیں----- **انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ** کیا ہم اسے کھانے کو دیں جسے اگر اللہ چاہتا تو خود کھانے کو دے دیتا- اس کے جواب میں کہا کہ (اے رسول! ان سے کہہ دو کہ)------ **ان انتم الا فی ضلال مبین** (۳۶/۴۷) "تم بالکل کھلی ہوئی گمراہی میں ہو-"

غور فرمایئے کہ جو عقیدہ کفار کا ہے اور جسے قرآن کھلی ہوئی گمراہی قرار دیتا ہے' یہ حضرات اسے (معاذ اللہ معاذ اللہ) ہم پلہ نبوت ٹھہرا رہے ہیں- کیا قرآن سے بے گانگی کا اس سے بڑا ثبوت کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟

ہم پھر دہرا دیں کہ ان صاحب نے کہا یہ ہے کہ رزق اسی طرح وہبی ہے جس طرح نبوت' اور رزق کے متعلق بھی ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کی رو سے' اسے حاصل کرنے کے لئے پہلے ارادہ شرط ہے اور پھر تلاش- جو شخص بھی رزق حاصل کرنے کا ارادہ کرے اور پھر حصول رزق کے لئے سعی و کاوش' اسے رزق مل جاتا ہے- اب اگر اس کے بعد' کوئی قادیانی صاحب یہ کہیں کہ میرزا صاحب نے بھی تو حصول نبوت کے لئے یہی کچھ کیا ہے تو فرمایئے کہ بادشاہ گل بخاری صاحب اس کا کیا جواب دیں گے؟

یہ ہے ان حضرات کا مبلغ علم قرآن کے متعلق اور یہ ہے ان کی پیش کردہ دلیل کی حقیقت!

------ ☆☆ -------

اب آیئے اصل موضوع کی طرف۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ وہ جسے چاہے بے حد و حساب دولت عطا کردے' جسے چاہے محتاج اور مفلس بنا دے۔ لہٰذا' کوئی ایسی تدبیر' ایسا نظام' جس سے محتاجوں کی محتاجی دور ہوتی ہو اور وہ ناداری سے صاحب رزق بن جائیں' خدا کی مشیت کے خلاف ہے' اس لئے خلاف اسلام۔ کسی غریب کو اپنی غریبی دور کرنے کی قطعاً" کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ایسا چاہنا اور ایسا کرنا' خدا سے برسرپیکار ہونے کے مترادف ہوگا اور اس کی دلیل (بقول ان کے) یہ ہے کہ خدا نے فرمایا ہے کہ **نحن قسمنا بینھم معیشتھم** (۴۳/۳۲) ان کا رزق' ان میں ہم تقسیم کرتے ہیں۔

اس قسم کے الفاظ کہ "ہم رزق کی تقسیم کرتے ہیں یا " **واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب** (۲/۲۱۲) یا **اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر** (۱۳/۲۶) وغیرہ' صرف رزق کے متعلق ہی نہیں آئے' بہت سے اور امور کے متعلق بھی آئے ہیں۔ مثلاً" دین کی بنیاد ہدایت پر ہے اور ضلالت (گمراہی) جہنم کی طرف لے جانے والی راہ ہے۔ قرآن کی اساسی تعلیم کے مطابق اس کا تعلق انسان کے اپنے اختیار و ارادہ اور عمل سے ہے۔ **قل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفرلا** (۱۸/۲۹) "ان سے کہہ دو کہ الحق تمہارے رب کی طرف سے آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔" یہ اور اس قسم کے دیگر ارشادات باری تعالیٰ اس بنیادی حقیقت پر شاہد ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں قرآن کریم میں اس قسم کی آیات بھی ملتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ **فیضل اللہ من یشاء ویھدی من یشاء** (۱۴/۴) یا **ومن یضلل اللہ فما لہ من ھاد** (۳۹/۲۳)۔ اگر ان آیات کے یہ معنی لئے جائیں کہ ہدایت اور گمراہی کے معاملہ میں انسان کے اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہیں' نہ ہی اس سے اس کی سعی و کاوش کا کوئی تعلق ہے۔ جسے خدا چاہے ہدایت دیدے اور جسے چاہے گمراہ کردے اور جسے وہ گمراہ کردے وہ پھر کسی طرح بھی راہ راست پر نہیں آسکتا' تو (اس مفہوم کے مطابق) خدا کا متعین کردہ سارا نظام رشد و ہدایت' جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے۔ خدا نے انسانوں کو اختیار و ارادہ دیا' پھر اپنی طرف سے انبیاء کرامؑ بھیجے --- ہر بستی میں رسول --- ہر قریہ میں نبی ----- ہر زمانہ میں پیغامبر ---- ان کے ساتھ خدا کی کتاب۔ کتاب کی طرف دعوت دینے والا خود رسول اور اس کی جماعت' ہدایت قبول کرنے والوں کے لئے بشارات' اس سے روگردانی کرنے والوں کے لئے عذاب۔ "من یشاء" کے اس مفہوم کی رو سے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے' یہ سارا سلسلہ رشد و ہدایت (معاذ اللہ) بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ یہ عقیدہ (کہ خدا جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے' انسان کے اختیار و ارادہ کا اس میں کوئی دخل نہیں) مشرکین کا ہے اور مبنی بر جہالت۔ سورہ الانعام میں ہے **سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اباء نا ولا حرمنا من شیی** "مشرکین کہیں گے (یا کہتے ہیں) کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے آباء و اجداد اور نہ

ہی ہم (خدا کی حلال کردہ چیزوں کو) حرام قرار دیتے۔" اس کے بعد کہا **کذالک کذب الذین من قبلھم** اس طرح حقیقت سے انکار اور صداقت کی تکذیب کچھ انہی کا شیوہ نہیں۔ ان سے پہلے بھی لوگ' اپنی غلط روش کے جواز میں اس قسم کی باتیں کیا کرتے اور اس طرح صداقت کو جھٹلایا کرتے تھے۔ **حتی ذاقوا باسنا** لیکن ان کے ایسا کہنے سے خدا کے قانون مکافات عمل میں کچھ فرق نہیں آجاتا تھا۔ ان کی غلط روش کا نتیجہ ان کے سامنے آجاتا تھا۔ خدا کا عذاب ان پر مسلط ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد فرمایا **قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا** ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس (اس عقیدہ جبر کی تائید میں) کوئی علمی دلیل بھی ہے؟ اگر ہے تو اسے پیش کرو۔ اور اس کے بعد خود ہی کہہ دیا کہ **ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون** (۶/۱۴۹) ان کے پاس کوئی علمی دلیل نہیں ہو سکتی۔ یہ محض اپنے ظن و قیاس کے پیچھے چلتے ہیں اور یونہی انکلیں دوڑاتے رہتے ہیں۔

ہم اس باب میں قرآن کریم کی اور بھی کئی آیات پیش کر سکتے ہیں' لیکن اس موضوع کا تعلق درحقیقت مسئلہ تقدیر سے ہے اور وہ بڑی تفصیل چاہتا ہے' اس لئے ہم اس کے بعد صرف ایک اور آیت سامنے لانا چاہتے ہیں جو ہمارے نزدیک سردست اکتفا کرے گی۔ سورہ النحل میں ہے **ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء** "اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا لیکن خدا جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔"

آیت کے اتنے ٹکڑے اور اس کے مروجہ ترجمہ اور مفہوم کی رو سے مترشح ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کا اس میں کوئی اختیار نہیں۔ اور جب انسان کا اس میں کوئی اختیار ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ نہ ہدایت پر چلنے والے کسی جزا کے مستحق ہو سکتے ہیں' نہ ضلالت پر گامزن کسی عذاب کے مورد۔ ان پر کسی قسم کی ذمہ داری ہی عائد نہیں ہو سکتی۔ لیکن آیت کا اگلا حصہ یہ ہے **ولتسئلن عما کنتم تعملون** (۱۶/۹۳) اور یقیناً" تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔" آیت کا یہ حصہ سورج کی طرح اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ " **یضل من یشاء ویھدی من یشاء** " کا قطعاً" یہ مفہوم نہیں ہو سکتا کہ ہدایت اور گمراہی کے معاملہ میں انسان کے اختیار و ارادہ اور سعی و عمل کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دے دے جسے چاہے گمراہ کر دے۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ اس قسم کے معاملات کے متعلق جہاں قرآن کریم میں "**قسمنا**" یا "**من یشاء**" وغیرہ الفاظ آئے ہیں' ان سے قطعاً" یہ مراد نہیں کہ ان چیزوں کے حصول میں انسان کی سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں۔ خدا جسے چاہے عطا کر دے' جسے چاہے ان سے محروم رکھے۔" "جسے چاہے عطا کر دے" کی استثناء صرف نبوت کے لئے ہے کیونکہ اس کے متعلق یہ بتا دیا گیا ہے کہ جسے منصب نبوت سے سرفراز کیا جاتا تھا اسے اس سے ایک ثانیہ پہلے تک اس کا علم تک نہیں ہوتا تھا کہ "کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے۔" نبوت کے علاوہ دیگر معاملات کے متعلق' "من یشاء" کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کے حصول کے لئے خدا نے اپنی مشیت سے قاعدے اور قانون مقرر کر دیئے

ہیں۔ جو ان قواعد و قوانین کے مطابق عمل کرے گا' اسے وہ چیز مل جائے گی۔ جو ان سے اعراض برتے گا' وہ اس سے محروم رہ جائے گا۔ چنانچہ رزق کی بست و کشاد کے متعلق فرمایا کہ **ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشتہ ضنکا ونحشرہ یوم القیمتہ اعمی** (۲۰/۱۲۴) اور جو شخص ہمارے "ذکر" سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت (روزی) تنگ ہو جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ یہاں سے واضح ہے کہ رزق کی تنگی نتیجہ ہوتی ہے احکام الٰہیہ سے اعراض برتنے کا۔ اس کی تفسیر سورہ الفجر میں ان الفاظ میں کر دی ہے کہ **واما اذا ما ابتلہ فقدر علیہ رزقہ** جب ہم انسان کو دوسری طرح کی گردش دیتے ہیں سو اس سے اس کا رزق تنگ ہو جاتا ہے۔ **فیقول ربی اھانن** تو وہ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے (یونہی) ذلیل کر دیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ (**کلا**------- ایسا مت کہو۔ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ اس کا دستور یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے رزق کشادہ کر دیا جس کا جی چاہے تنگ کر دیا۔ اس کے ہاں ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے اور ان کے مطابق انسان کے اعمال کا نتیجہ برآمد ہوتا رہتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ خدا نے یونہی تمہارا رزق تنگ کر دیا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ **بل لا تکرمون الیتیم** ؅ **ولا تحضون علی طعام المسکین** ؅ **وتاکلون التراث اکلا لما وتحبون المال حبا جما** (۸۹/۱۹-۲۰) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو اس کی تاکید نہیں کرتے تھے کہ محتاجوں کی روٹی کا انتظام کیا جائے۔ تم وراثت کے مال کو سارے کا سارا سمیٹ کر کھا جاتے تھے اور دولت کو جی بھر کر پیار کرتے تھے۔ (یہ الفاظ مولانا محمود الحسنؒ کے ہیں) یہ تھا تمہارا نظام معاشرت و معیشت 'جس کی وجہ سے تم پر یہ عذاب آیا ہے۔ سورہ النحل میں اس غلط نظام کو "کفران نعمت" سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ "خدا ایک مثال کے ذریعے بات سمجھاتا ہے۔ ایک بستی تھی جس کے باشندوں کو امن و اطمینان دونوں میسر تھے۔ ان کی طرف چاروں طرف سے رزق کھنچے چلا آتا تھا۔ **فکفرت بانعم اللہ** انہوں نے ان انعامات خداوندی سے کفران برتا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ **بما کانوا یصنعون** (۱۶/۱۱۲) یہ ان کے خود ساختہ باطل نظام معیشت کا نتیجہ تھا۔

اس کے برعکس فرمایا کہ **ولو انھم اقاموا التورتہ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم** اگر یہ اہل کتاب (اپنے اپنے وقت میں) اس نظام پر عمل پیرا ہوتے جو تورات اور انجیل میں دیا گیا تھا اور جسے اب قرآن میں دیا گیا ہے' **لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم** (۵/۶۶) تو ان پر اوپر سے بھی رزق کی بارش ہوتی اور وہ نیچے سے بھی ابل کر باہر آ جاتا۔

اب آیئے سورہ زخرف کی اس آیت کی طرف جسے (بقول مستفسر) جناب بادشاہ گل بخاری صاحب نے اپنے خود ساختہ مفروضہ کی تائید میں پیش کیا ہے۔ استفسار کے الفاظ یہ ہیں۔

> پیشوائیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار اس آیت کا اگلا ٹکڑا--- **فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجت لیتخذ بعضھم بعضا سخریا** (۳۲/

۴۴) بھی اس کے ساتھ جوڑ کر یہ استدلال عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ "خدا نے ازلی اور قدرتی طور سے بعض لوگوں کو بعض پر رزق میں فوقیت دی ہے اور یہ فوقیت اس لئے دی ہے تاکہ بعض، بعض کو پکڑیں اور زبردستی پکڑ کر مسخر کریں۔ لفظ سخریا اس پر دال ہے"

اس اقتباس میں جو الفاظ واوین ("........") میں آئے ہیں، ان کے متعلق ہمیں علم نہیں کہ وہ بادشاہ گل بخاری صاحب کے ہیں یا کسی اور کے، لیکن ان کا کہنے والا کوئی بھی ہو، مولوی صاحبان سب اس سے یہی مفہوم لیتے ہیں۔ اس مفہوم سے جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ۔

(۱) خدا خود فیصلہ کرتا ہے کہ زید کو امیر پیدا کیا جائے اور بکر کو غریب۔

(۲) پھر خدا زید کو اجازت دیتا ہے کہ وہ بکر کو زبردستی پکڑ کر مسخر کرے کیونکہ اسے خدا نے پیدا ہی اس مقصد کے لئے کیا ہے۔

آپ سوچئے کہ اس عقیدہ میں اور اس میں جس کی رو سے ہندو کہتے ہیں کہ برہمن برہما کے سر سے پیدا ہوتے ہیں اور شودر اس کے پاؤں سے اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ برہمن، شودروں سے زبردستی اپنی خدمت لیں، کچھ بھی فرق ہے؟ اس سے بھی آگے بڑھیے۔ غلام کے جواز میں دلیل یہ پیش کی جایا کرتی تھی کہ خدا بعض انسانوں کو آزاد پیدا کرتا ہے اور بعض کو غلام، تاکہ غلام آزاد لوگوں کے لئے بیگار کے کام سرانجام دیں۔ غلاموں کو آزاد لوگوں جیسا مقام دے دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی ٹیڑھے پاؤں کو سیدھا جوتا پہنا دیا جائے۔ وہ اس کے لئے سخت تکلیف دہ ہو گا! ہمارے ہاں اس آیت سے جو مطلب لیا جاتا ہے وہ نتیجہ کے اعتبار سے انسانوں کی پیدائشی تقسیم کو اسی مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ کیا یہی ہے اسلام کی تعلیم اور اسی کا نام ہے تکریم انسانیت اور مساوات آدمیت جس کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے؟

اس آیت میں سخریا کا مفہوم کیا ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، مکتب دیوبند کے ایک ممتاز عالم مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کے الفاظ میں سنئے۔ وہ اپنی کتاب "اسلامی معاشیات" میں پہلے اس آیت کا حسب ذیل ترجمہ لکھتے ہیں:

> ہم نے بانٹ دی ہے الحیوۃ الدنیا (پست زندگی) میں ان کی معیشت کو ان کے درمیان اور اونچا کر دیا ہے ہم نے بعض کو بعض سے مدارج و مراتب کے لحاظ سے (یہ اس لئے کیا گیا ہے) تاکہ انسانوں میں بعض بعضوں سے کام لیں۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> اس کا مطلب آج ہی نہیں، صدیوں پہلے، مشہور مفسر قرآن، القاضی البیضاوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے --- "بعض انسانوں میں بعض بعض سے اپنی حاجتوں میں کام

لیں اور اس ذریعہ سے باہم انسانوں میں باہمی الفت پیدا ہوتی ہے اور بعض بعض کے ساتھ مل گئے ہیں۔ عالم کے نظام کا انتظام اسی پر قائم ہے۔ (ص ۱۵۲)

(قرآن کے الفاظ اور اس عبارت میں "بعض بعض" کے معنی ہوتے ہیں--- "ایک دوسرے سے") آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی تمدنی زندگی میں مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں۔ انسانی صلاحیتوں میں اختلاف' تقسیم کار کے لئے ہے تاکہ معاشرہ کے تمام امور سرانجام پاتے رہیں۔ یہ ہے سُخریا کا مفہوم۔

اب آیئے **"ورفعنا بعضهم علی بعض"** کی طرف۔ یہ ظاہر ہے کہ مختلف افراد میں اکتساب رزق کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض کا رجحان نظری اور علمی ہوتا ہے' بعض کا عملی اور میکانکی۔ بعض میں ذہنی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے' بعض میں جسمانی قوت۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ صلاحیتوں کے اختلاف کے عوامل و اسباب کیا ہوتے ہیں۔ ہم اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں **"رفعنا بعضهم فوق بعض درجت"** کے معنی یہ نہیں کہ خدا ہر فرد کی صلاحیتوں کو (اس کی پیدائش سے پہلے ہی) خود متعین کر دیتا ہے اور وہ پھر کچھ ہی کرے' ان میں نہ تبدیلی ہو سکتی ہے نہ ترقی ---- یعنی جو بچہ شودر کے گھر میں جنم لیتا ہے وہ جو جی میں آئے کرے' ساری عمر شودر ہی رہتا ہے۔ یہ عقیدہ قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ اس نے تعین مدارج کے متعلق خود ہی کہہ دیا ہے کہ **ولکل درجت مما عملوا۔ ولیوفیهم اعمالهم وهم لا یظلمون**(۴۶/۱۹) ہر ایک کے مدارج' اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوتا۔ للذا' "رفعنا" (ہم مدارج بلند کرتے ہیں) میں (نا --- ہم) اسی قسم کا ہے جس قسم کا "ہم" --- رزق کے معاملہ میں --- قسمنا میں تھا اور جس کا مطلب یہ ہے کہ "ہم اپنے مقرر کردہ قاعدے اور قانون کے مطابق ایسا کرتے ہیں" اور خدا کا مقررہ کردہ قانون یہ ہے کہ اختلاف مدارج' اعمال کی نسبت سے ہوتا ہے۔

یہاں تک بات یوں ہوئی کہ افراد میں صلاحیتوں کا اختلاف معاشرہ میں مدارج کے اختلاف کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ معیار یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کام کس قدر اور کس انداز کا کرتا ہے۔ اس کے اسی کام کے اعتبار سے اس کا درجہ متعین ہوگا۔ اگر ایک معمار نہایت دیانت اور امانت سے اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے تو معاشرہ میں اس کا درجہ اس انجینئر سے بلند ہوگا جو کام چور اور بددیانت ہے۔

اگلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا صلاحیتوں کا اختلاف' امارت اور غربت کا معیار قرار پا سکتا ہے؟ یہ ہے اصل سوال اور نہایت اہم--- دنیا یہی کہتی ہے کہ جو زیادہ کماتا ہے وہ دولتمند ہے' جو کم کماتا ہے وہ غریب ہے۔ لیکن قرآن اس کا جواب کچھ اور دیتا ہے۔ وہ پہلے ان لوگوں کی ذہنیت کو سامنے لاتا ہے جو کہتے ہیں کہ جو زیادہ کماتا ہے وہ اپنی ساری کمائی کا مالک ہے۔ وہ اس میں سے (اگر اس کا جی چاہے تو) دوسروں کو بطور خیرات کچھ دے دے' ورنہ اپنی کمائی کا مالک وہ آپ ہے۔ قرآن اس ذہنیت کو سورہ النحل کی آیت نمبر ۷۱ میں بڑی عمدگی سے بیان کرتا ہے۔ یہ آیت بڑی اہم ہے اور عمیق غوروخوض کی متقاضی۔ ارشاد ہے **واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق** خدا کے قانون

مشیت کے مطابق اکتساب رزق کی استعداد مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہے' بعض میں کم بعض میں زیادہ۔ **فما الذین فضلوا برادی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم** جن لوگوں کو زیادہ استعداد حاصل ہوتی ہے وہ اپنی زائد کمائی کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کے ساتھ ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ **فھم فیہ سواء** وہ اس خیال سے ایسا نہیں کرتے کہ اس طرح تو چھوٹے بڑے سب برابر ہو جائیں گے ---- **افبنعمۃ اللہ یجحدون** (۱۶/۷۱) ایسا خیال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ یہ زیادہ استعداد خدا کی طرف سے بطور نعمت عطا ہوئی ہے (۱۶/۵۳)۔ یہ ذہنیت نظام سرمایہ داری کی پیدا کردہ ہے جس کا سب سے بڑا نمائندہ قارون تھا۔وہ کہتا تھا کہ **انما اوتیتہ علی علم عندی**(۲۸/۷۸) جو کچھ میرے پاس ہے یہ سب میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے اور قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت سارے فساد کی جڑ ہے (۳۹/۴۹)۔

مولانا مناظراحسن گیلانی (مرحوم) اس آیت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> "رزقی برتری چونکہ صفاتی و کمالاتی برتری کا نتیجہ ہوتی ہے' اس لئے اپنے کمالات کی بنیاد پر رزق کا زیادہ حصہ جن لوگوں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے وہ اس حصہ کو اپنے کمالات کی قدرتی قیمت سمجھتے ہیں اور اس کا اپنے آپ کو جائز حقدار یقین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا کوئی نہیں ہے جسے اپنے کمالات کی قیمت کی صورت میں زائد حصہ زیردستوں کے اعتبار سے اگر ملا ہو تو یہ خیال کر کے کہ جو کچھ مجھے ملا ہے' میرا نہیں ہے۔ اپنے زیردستوں کو واپس کر دے یعنی اس حصہ کا اپنے آپ کو حقدار قرار دے کر واپس تو کوئی نہیں کرتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اپنا جائز حق قرار دینے کے بعد دوسروں کو وہ عطا کر دے' دیدے۔ لوگ رد اور عطا میں فرق نہیں کرتے اسلئے طرح طرح کے مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ اگر وہ اس پر غور کریں کہ رد کے معنی واپس کرنے کے ہیں' پس رد اور واپسی تو اس چیز کی ہوتی ہے جس کا آدمی مالک ہی نہیں ہوا۔ اور عطا یعنی دینے کا مطلب یہ ہے کہ چیز تو میری ہے' میں تمہیں اس کا ہبہ کرتا ہوں۔ قرآن میں نفی رد کی کی گئی ہے نہ کہ ہبہ اور عطا کی ۔ ور ہبہ اور عطا کی نفی کیسے صحیح ہوگی جب کہ رات دن مالداروں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنا مال دوسروں کو عطا کرتے ہیں' البتہ یہ کوئی نہیں کرتا کہ جو قیمت اپنے کمال یا مہارت کی کسی کو ملی ہو' اسے یہ کہہ کر واپس کر دے کہ اس کا میں حقدار ہی نہیں ہوں' پھر لوں کیسے؟ (ص ۱۱۱)

قرآن' انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ زیادہ استعداد کے مالک اپنی زائد کمائی کو اپنا حق ہی نہ سمجھیں۔ ان کا حق سمجھ کر انہیں لوٹا دیں جن کی کم استعداد کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو اور اس طرح ضروریات پوری ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہو جائیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے (زائد کمائی والوں کے متعلق) کہا

ہے کہ **فی اموالھم حق معلوم للسائلین والمحروم** (۲۵-۲۴/۷۰) ان کی دولت میں محتاجوں اور محروموں کا حق ہے اور حق بھی ایسا جو ڈھکا چھپا نہیں' سب کو معلوم ہے۔ اور اس کی حد یہ ہے کہ **یسئلونک ماذا ینفقون - قل العفوا** (۲/۲۱۹) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کو دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ اس لئے کہ "زائد کمائی" پر تمہارا حق نہیں۔ حق ان کا ہے جن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام
اور اس کی ضروریات کے مطابق کفاف

یہ ہے معاشیات کا وہ زریں اصول جسے قرآن نے قائم کیا اور جسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً کر کے دکھایا۔ میدان جنگ میں ہر مجاہد (مومن) اپنی اپنی استعداد کے مطابق خدمات سرانجام دیتا تھا لیکن مال غنیمت کی تقسیم میں حضورؐ کا اصول یہ تھا کہ شادی شدہ کو دگنا حصہ ملتا تھا اور مجرد کو ایک' کیونکہ شادی شدہ کی ضروریات' مجرد سے زیادہ تھیں اور یہی تھا وہ اصول جس کے مطابق حضرت صدیق اکبرؓ نے وظائف کا تعین کیا تھا ---- اصول' خدمات کا معاوضہ نہیں تھا' ضروریات کا تقاضا تھا۔

یہ ہیں وہ اصول جن کے مطابق "خدا اپنے بندوں میں رزق کی تقسیم کرتا ہے۔" آپ نے غور فرمایا کہ بادشاہ گل بخاری اور اسی زمرے کے دیگر حضرات' (لغت ہائے حجازی کے قاروں ہوں تو ہوں لیکن) قرآن فہمی کے معاملہ میں کس قدر کورے ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ قرآن ان کے کسی کام ہی نہیں آتا (بجز ختم پڑھنے یا رمضان شریف میں ختم کرنے کے)۔ اسی لئے یہ ان کے نصاب تک میں داخل نہیں ہوتا۔ ان کا سارا کاروبار فقہ پر چلتا ہے اور فقہ عباسی ملوکیت کے زمانہ میں مرتب ہوئی اور سرمایہ دارانہ ماحول میں پروان چڑھی۔ اس لئے اگر وہ نظام سرمایہ داری کو "خدائی سند" عطا کرنے کیلئے غریبی اور امیری کو خدا کی غیر متبدل ازلی تقسیم نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ قرآنی اقدار و نظام تک پہنچنا ان بے چاروں کے بس کی بات ہی نہیں۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

مکتب و ملا و اسرار کتاب!
کور مادر زاد و نور آفتاب

(دسمبر ۱۹۶۹ء)

۸۔ اس فرق کے نتائج کو کیسے مٹایا جائے

(اجرت کا نظریہ نظام سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے)

سوال : قرآن شریف میں ہے کہ خدا نے مختلف افراد میں اکتساب رزق یعنی کمائی کرنے کی استعداد مختلف رکھی ہے۔ جب صورت یہ ہے تو پھر ایک کے پاس زیادہ دولت ہو سکتی ہے اور دوسرے کے پاس کم۔ اسی کو امیری اور غریبی

کہتے ہیں اور یہ تفاوت کمائی کی استعداد کے فرق کا فطری نتیجہ ہے- پھر اس فرق کو مٹایا کیسے جا سکتا ہے- جس کے پاس زیادہ دولت ہے اس سے زائد دولت لے کر دوسروں کو دے دینا زبردستی نہیں ہوگی؟ کیا اسلام میں اس کی اجازت ہوگی؟

جواب : ان امور پر غور و فکر کرنے کے سلسلے میں ہماری بنیادی دشواری یہ ہے کہ دنیا میں جو معاشی نظام رائج ہے وہ اس قدر پرانا اور عالمگیر ہو چکا ہے کہ اس نے ایک گونہ مسلمہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور ہم اس سے ہٹ کر سوچنے کے عادی ہی نہیں رہے- "کمائی" کا تصور اسی نظام کا پیدا کردہ ہے- آیئے ہم پہلے یہ دیکھیں کہ "کمائی" کہتے کسے ہیں؟

ایک مزدور دن بھر کام کرتا ہے اور اسے تین روپے ملتے ہیں- اس کے برعکس' ایک انجینئر کو سو روپیہ یومیہ مل جاتا ہے- اس اعتبار سے ہم کہیں گے کہ انجینئر' مزدور کے مقابلہ میں زیادہ کماتا ہے- لیکن سوال یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرتا ہے اور کس اصول کے مطابق کرتا ہے کہ مزدور کو تین روپے روز ملنے چاہئیں اور انجینئر کو سو روپیہ یومیہ؟ بادنے تدبر' یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اجرتوں (یا معاوضوں) کا یہ تعین طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کے مطابق ہوتا ہے- مزدوروں کی تعداد زیادہ ہے اور مانگ کم' اس لئے ان کی "قیمت" بہت کم پڑتی ہے- اس کے برعکس' انجینئروں کی تعداد کم ہے اور مانگ زیادہ' اس لئے ان کی "قیمت" زیادہ ہے- اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جائے' (یعنی مزدوروں کی تعداد طلب کے مقابلہ میں کم ہو جائے اور انجینئروں کی زیادہ) تو انجینئر کی کمائی تین روپے روز ہو جائے اور مزدور کی سو روپے یومیہ- (چنانچہ آجکل ہمارے ہاں انجینئر' ڈاکٹر' وکلاء کی تعداد جس نسبت سے زیادہ ہوتی جا رہی ہے اسی نسبت سے ان کی "کمائی" کم ہوتی جا رہی ہے) اس سے واضح ہے کہ "کمائی" فی ذاتہ ---- (INTRINSICALLY) کوئی شے نہیں' اسے معاشرہ طلب و رسد کے تناسب سے مقرر کرتا ہے- اس لئے "کمانے کی استعداد" کے بجائے اگر کچھ "بنانے" یا پیدا کرنے" کی استعداد کہا جائے تو یہ حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا- زمانہ قدیم میں جو بارٹر سسٹم (BARTER SYSTEM) رائج تھا (جس میں سکوں کے عوض خرید و فروخت کے بجائے اشیائے ضروریہ کا باہمی تبادلہ ہوتا تھا) اس میں "دولت کمانے" کا تصور نہیں تھا' ضروریات پوری کرنے کا اہتمام ہوتا تھا-

اس کے بعد' آپ تصور میں لایئے ایسے نظام کو جس میں معاشرہ کے تمام بچوں کو پرورش' تربیت اور تعلیم کے یکساں مواقع حاصل ہوں (مملکت خود اس کا انتظام کرے)- پھر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر "چھلنے" لگا دیئے جائیں جو مختلف بچوں کی ذہنی استعداد اور افتاد طبیعت کی چھان بین کرتے جائیں- اس طرح رکنے والے بچے رکتے جائیں' آگے بڑھنے والے آگے بڑھتے جائیں اور معاشرہ کی ضروریات کے مطابق' انہیں مختلف شعبوں کی تعلیم دی جائے- اس کے بعد "معاشرہ" تقسیم کار کے اصول پر مختلف کام' مختلف نوجوانوں کے سپرد کر دے- ان کا فریضہ' اپنا اپنا مفوضہ کام' بطریق احسن سرانجام دینا ہو- اس کام کے معاوضہ یا اجرت کا سوال سامنے ہی نہ آئے- وہ اپنا اپنا کام کریں اور

معاشرہ ان کی ضروریات زندگی پوری کرتا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ اس نظام کے مطابق معاشرہ کے تمام امور کس خوش اسلوبی اور حسن کاری سے تکمیل تک پہنچ جائیں گے اور وہ تمام خرابیاں کس طرح از خود دور ہو جائیں گی جو موجود نظام معیشت و معاشرت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ قرآن کریم کا منتہیٰ ایک ایسے نظام کا قیام ہے جس میں "کمانے" کی بجائے "کام کرنے" کا اصول کارفرما ہو۔

بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر تمام بچوں کو تعلیم و تربیت اور پرورش کے مواقع یکساں حاصل ہوں' تو جن بچوں میں زیادہ استعداد کی نمود ہوگی وہ ان کی اپنی کارگیری کا نتیجہ نہیں ہوگی۔ وہ ان میں بنیادی طور پر موجود ہو گی یا یوں کہیے کہ وہ ایسے عناصر کا نتیجہ ہوگی جن میں ان کے اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اسے اصطلاح میں "موہبت" (یعنی خدا کی طرف سے بلامزد و معاوضہ عطا کردہ) یا "اللہ کی نعمت" کہا جاتا ہے۔ قرآنی نظام اور موجودہ معاشی نظام میں یہی اصولی فرق ہے۔ قرآن' موجودہ معاشی نظام کو "قارونیت" سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب قارون سے کہا گیا کہ تجھے جو زیادہ دولت حاصل ہوئی ہے اسے دوسروں کی کمی پوری کرنے کے لئے کھلا رکھو' تو اس نے کہا کہ میں اسے دوسروں کو کیوں دے دوں **انما اوتیتہ علی علم عندی** (۲۸/۷۸) یہ دولت مجھے میری ہنرمندی اور چابکدستی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اس قارونی ذہنیت کے حاملین کے متعلق قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ اکتساب رزق کی استعداد میں مختلف افراد میں فرق ہوتا ہے' لیکن حیرت ہے کہ جن لوگوں میں یہ استعداد زیادہ ہوتی ہے' وہ اس کے ماحصل کو اپنے زیردستوں کی طرف نہیں لوٹاتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح گدھا گھوڑا سب برابر ہو جائیں گے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان کی اس ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ استعداد کی یہ زیادتی ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں خدا کی عطا کردہ ہے (۱۶/۷۱)۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا کی عطا کردہ نعمت ہے (۱۶/۵۳)۔ استعداد کا یہ فرق' زیادہ دولت کمانے اور اس کا مالک بن جانے کے لئے نہیں۔ یہ محض اس لئے ہے کہ معاشرہ کے مختلف (چھوٹے بڑے سب) کام چلتے رہیں (۴۳/۳۲)۔ جب ذہنیت یہ پیدا ہو جائے کہ استعداد کی زیادتی میری اپنی زرخرید یا پیدا کردہ نہیں' یہ موہبت ؁ خداوندی ہے' تو استعداد سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے' انسان اسے اپنی ملکیت نہیں سمجھتا۔ وہ اسے ان کی طرف لوٹا دیتا ہے جنہیں کم استعداد حاصل ہوتی ہے اور ایسا کرتے وقت اس کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ **لا نرید منکم جزاء ولا شکورا** (۷۶/۹) "اس کے لئے ہم تم سے نہ کسی قسم کا بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے متمنی ہیں" ----- ذہنیت کی یہ تبدیلی ایمان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مومن اور کافر میں بنیادی فرق ذہنیت (نفسیات) ہی کا ہوتا ہے۔

لیکن جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا اور کام کا معاوضہ' طلب و رسد کے اصول کے مطابق سکوں

؁ ہم اس وقت' اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ تفاوت استعداد کے لئے کون کون سے عوامل و عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ اس وقت ہم صرف اس نکتہ تک محدود رہتے ہیں کہ یہ چیز فرد متعلقہ کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ محنت اس کی اپنی ہوتی ہے۔ استعداد خود پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ محنت اور مناسب تعلیم و تربیت بچے کی بنیادی استعداد میں جلا پیدا کرتی ہے۔

میں ادا کیا جاتا ہے' قرآن کریم اس دور کے لئے بھی احکام و ہدایات دیتا ہے- مال کو کھلا رکھنے کی تاکید' اپنی ضروریات سے زائد' سب کچھ اجتماعی امور کے لئے صرف کر دینے کی خاطر دے دینے کا حکم' یہ بنیادی تصور کہ مومن اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے یا یہ کہ دولت کو اوپر کے طبقہ ہی میں گردش نہیں کرتے رہنا چاہیے وغیرہ وغیرہ' اسی نوع کے احکامات ہیں- اس سے وہ اس تفاوت کو ابھرنے نہیں دیتا جو اختلاف استعداد کی بنا پر (موجودہ معاشی نظام میں) کمائی کے فرق سے پیدا ہوتا ہے- اور جب عبوری دور کے بعد' قرآنی نظام اپنی آخری شکل میں قائم ہو جاتا ہے تو پھر یہ تفاوت خود بخود مٹ جاتا ہے-

اب رہا آپ کا دوسرا سوال' کہ کیا کسی سے زائد دولت لے لینا' جبر نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام ہے کیا اور مسلمان کسے کہتے ہیں- اسلام ایک سوسائٹی متشکل کرنا چاہتا ہے جس کے ممبروں کو مسلمان کہا جاتا ہے- اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط اور شرائط داخلہ قرآن کریم کے اندر مذکور ہیں- اسلام' ان قواعد و ضوابط اور شرائط و حدود کو عام کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ نوع انسانی میں سے جس کا جی چاہے ان شرائط کو قبول کرکے اس سوسائٹی کا ممبر بن جائے- اس میں کسی قسم کا جور واکراہ نہیں- اس میں ممبرشپ کی شرط اولین یہ ہے کہ ممبر بننے والا اس کا اعلان کرتا ہے کہ میں نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے (۹/۱۱۱)- اور اس کے قواعد و ضوابط میں لکھا ہوتا ہے کہ ممبروں کے پاس جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہوگا' وہ سوسائٹی (یا عالمگیر انسانیت) کی فلاح و بہبود کیلئے کھلا رکھا جائے گا (۲/۲۱۹)- اس سوسائٹی کی ممبرشپ قبول کرنے کا نام ذہنیت کی وہ تبدیلی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے-

اب آپ فرمایئے کہ اگر یہ سوسائٹی اپنے ممبروں سے زائد از ضرورت مال طلب کرتی ہے تو کیا اسے جبر کہا جائے گا؟ بالخصوص جب اس کے ممبروں کو اس کا بھی حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہیں اس کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں- اب ظاہر ہے کہ جب ایک شخص اس سوسائٹی کا ممبر رہے گا' اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی اس پر لازمی ہوگی- اس کی اجازت تو کوئی سوسائٹی بھی نہیں دے گی کہ اس کا ممبر رہتے ہوئے اس کے قوانین و ضوابط سے سرکشی برتی جائے- یہی وجہ تھی کہ خلیفہ اول' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک وہ زکوٰۃ کے اونٹ کی رسی تک ادا نہ کر دیں گے میں انہیں نہیں چھوڑوں گا-

لیکن جب نہ سوسائٹی ہو نہ اس کے ممبر---- کمرے کے باہر بس ایک سائین بورڈ لٹک رہا ہو' تو پھر تو کسی سے ماہانہ چندہ مانگنا بھی جبر کہلائے گا-

(جون ۱۹۶۹ء)

۹- صلاحیتوں کے فرق کی مزید وضاحت

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں- قرآن نے کہا تھا **فضل بعضکم علی بعض فی الرزق** ۱۶/۷۱---- طلوع

اسلام نے اس خلش کو کسی حد تک دور کیا لیکن "ذہنی صلاحیتوں کے اختلاف" کا مسئلہ اب بھی بڑی چبھن پیدا کرتا ہے۔ اگر میں غلط نہیں سمجھا تو طلوع اسلام بھی اس ذہنی اختلاف کو تسلیم کرتا ہے (یعنی اسے خدا کی دین سمجھتا ہے)۔ ذہن اس سے بغاوت کرتا ہے۔ براہ مہربانی اس سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں اور ممکن ہو تو --- تفصیلاً"۔ میرا خیال ہے کہ قدرت اپنے عطیات کی تقسیم میں بخیل نہیں۔ وہ ہر چیز مساوی دیتی ہے۔ انسان اسے اپنے اعمال سے کم یا زیادہ کر لیتا ہے اس لئے رزق میں فضیلت یا ذہنی فضیلت خدا کا عطیہ نہیں ہو سکتی۔ یہ فضیلت' وراثت' ماحول اور اعمال کی بنا پر ہوتی ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ یہ اکتسابی ہے وہبی نہیں۔

طلوع اسلام

طلوع اسلام بے شک ذہنی اختلاف کو تسلیم کرتا ہے' اس لئے کہ یہ ایک امرالواقعہ ہے جس کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس لئے اس اختلاف کا انکار' حقیقت کا انکار ہے۔ لیکن آپ نے اس کے بعد جو قوسین میں لکھا ہے (یعنی اسے خدا کی دین سمجھتا ہے) یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم جہاں جہاں قرآن کریم میں یہ لکھا پاتے ہیں کہ "خدا ایسا کرتا ہے" یا "خدا دیتا ہے" تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ایسا کچھ "وہبی طور پر" ہوتا ہے۔ اس میں انسان کے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔ خدا اپنے عالم امر میں جو کچھ کرتا ہے اس میں کسی کے اختیار' ارادہ' عمل' دخل' کسب و ہنر کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن جو کچھ وہ محسوس کائنات میں کرتا ہے' وہ سب کچھ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اور انسانی دنیا میں خدا کا قانون طبیعی' انسانی ہاتھوں سے بروئے کار آتا ہے۔ مثلاً" قرآن کا ارشاد ہے کہ خدا زمین سے رزق پیدا کرتا ہے۔ اب اگر کوئی قطعہ زمین بنجر پڑا ہو اور انسان اپنی کوشش سے اسے زراعت کے قابل نہ بنائے اور اپنی محنت سے ہل چلا کر اس میں کاشت نہ کرے' تو اس زمین سے رزق کبھی پیدا نہ ہوگا۔ للذا' خدا کے اس کہنے کا (کہ ہم زمین سے رزق پیدا کرتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ زمین سے رزق خدا کے قانون کے مطابق پیدا ہوتا ہے جس کے لئے انسانی سعی و کاوش کی ضرورت ہے۔ یا مثلاً" حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا کہ جب مجھے پیاس لگتی ہے تو خدا مجھے پانی پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو خدا مجھے شفا دیتا ہے' تو ظاہر ہے کہ نہ خدا' پیاس کے وقت' حضرت ابراہیمؑ کو خود آکر پانی پلاتا تھا' نہ ہی ان کی بیماری کا علاج براہ راست خود کرتا تھا۔ یہ سب خدا کے قانون کے مطابق' حضرت ابراہیمؑ کی اپنی کوشش سے ہوتا تھا۔ مقصد ہمارے کہنے کا یہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں (طبیعی کائنات کے سلسلہ میں) اس قسم کے الفاظ آئیں (کہ خدا یوں کرتا ہے یا یوں دیتا ہے) تو وہاں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ خدا "وہبی طور پر" ایسا کرتا ہے' انسان کے کسب و ہنر کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس قسم کی موہبت' صرف نبوت کے لئے مختص تھی (اور وہ سلسلہ ختم ہو گیا)۔

اب آیئے ذہنی صلاحیتوں کی طرف۔ اسے دو شقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ شق اول یہ کہ ایک قوم' دوسری قوم

کے مقابل میں بلند ذہنی صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے اور شق دوم یہ کہ ایک ہی قوم میں بعض افراد دوسرے افراد سے مختلف صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

پہلے شق اول کو لیجئے۔ ماہرین علم عمرانیات یا علم الانسان کی تحقیق یہ ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کی ابتداء ایک خطہ زمین (بحیرہ کیسپین کے اردگرد کے علاقہ) سے کی تھی۔ اس کے بعد وہ پھیلتے پھیلتے مختلف ممالک میں چلے گئے اور مختلف اقوام میں بٹ گئے۔ ان اقوام میں متعدد طبیعی عناصر و عوامل (مثلاً" جغرافیائی اور موسمی اثرات وغیرہ) کے اختلاف سے مختلف خواص پیدا ہو گئے جو پھر نسلی طور پر آگے منتقل ہوتے چلے گئے۔ یوں ایک قوم' دوسری قوم سے مختلف نظر آنے لگی اور ان میں صلاحیتوں کا اختلاف ابھر آیا۔ اس کے بعد تمدنی اور سیاسی اثرات سے مختلف اقوام' یا ایک ہی قوم کے مختلف گروہوں میں صلاحیتوں کا اختلاف شروع ہوا۔ مثلاً" زرخیز علاقوں میں بسنے والی قوم کو تھوڑی سی محنت سے ضرورت کے مطابق خوراک حاصل ہو گئی تو اسے مسائل زندگی پر فکری طور پر سوچنے کے لئے وقت اور فراغت مل گئی۔ اس سے اس کی ذہنی صلاحیتیں ابھرنی شروع ہو گئیں۔ اس کے برعکس' لوٹ مار پر گزارہ کرنے والی قوم میں جسمانی قوتوں نے زیادہ نشوونما پالیا یا قوم حاکم نے' محکوم قوم کو ایسا دبائے رکھا کہ اس میں انسانی صلاحیتیں ابھر ہی نہ سکیں۔ (جس علاقہ میں سکول نہ کھولنے دیا جائے' ظاہر ہے کہ وہاں کے رہنے والے جاہل رہیں گے اور یہی جہالت جب دو چار نسلوں تک متوارث چلتی جائے گی تو اس علاقہ کے لوگ وحشی کہلائیں گے جس طرح عورت کو ناقص العقل کہا جاتا ہے)۔

اب اقوام سے نیچے اتر کر افراد کی طرف آیئے۔ انسانی بچے کی ساخت اور اس کی طبیعی صلاحیتیں' خدا کے مقرر کردہ قوانین طبیعی کے مطابق مرتب ہوتی ہیں۔ جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جاتا ہے' یہ قوانین بے نقاب ہو کر سامنے آتی چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ جن اقوام نے ان قوانین کا علم حاصل کر لیا ہے وہ رحم مادر ہی میں جنین کی دیکھ بھال شروع کر دیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کے بچے ان اقوام کے بچوں کے مقابلہ میں جو ان قوانین کا علم نہیں رکھتیں یا ان کے مطابق عمل نہیں کرتیں' کہیں زیادہ عمدہ صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ ان کے ہاں پیدائشی اندھے'لولے لنگڑے' مختلف امراض کا شکار' کمزور و نحیف یا دماغی نقائص کے حامل بچے نسبتاً" بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ پیدائش کے بعد بھی بچوں کی طبیعی نشوونما کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہتا ہے۔ اس لئے وہ بچے تومند و توانا اور شگفتہ و شاداب' پروان چڑھتے ہیں۔

پیدائش کے بعد' بچوں کی صلاحیتوں پر ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے اور پھر تعلیم کا۔ وہ قومیں اس کا بھی خاص اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت (ان کے معیار کے مطابق) صحیح ہو۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ کسی بچے میں کوئی خاص جسمانی' ذہنی یا نفسیاتی نقص ہے تو وہ اس کے اسباب کی تحقیق کرتے ہیں اور اس کے بعد کوشش کرتے ہیں کہ اس بچے کا وہ نقص رفع ہو جائے اور آئندہ اس قسم کا نقص پیدا نہ ہو۔ بچوں میں ذہنی صلاحیتوں کے تفاوت کے اسباب یہی ہیں۔ اس کے بعد' ان صلاحیتوں کی نمود کے لئے مواقع بہم پہنچانے اور ان سے کام لینے کا سوال سامنے آتا ہے۔

زندہ قومیں یہ کچھ بھی خاص نظم و نسق اور ربط و ضبط کے مطابق کرتی ہیں۔
یہ ہے مطلب "**فضل بعدکم علی بعض فی الرزق**" ۱۶/۷۱ کا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اختلاف خدا کا پیدا کردہ اور انمٹ ہے۔ یہ قوانین خداوندی کی مطابقت یا ان سے انحراف کا فطری نتیجہ ہوتا ہے اور اگر ان قوانین سے انحراف کی وجہ سے کہیں پیدا ہو گیا ہے تو ان کی مطابقت سے اسے دور کیا جا سکتا ہے۔
یہ سب کچھ کہنے اور سمجھنے سمجھانے کے بعد بھی ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک بچہ جو کچھ بن کر پیدا ہوتا ہے' یا ابتدائی تعلیم اور ماحول کے اثرات سے جو کچھ اسے بنا دیا جاتا ہے' اس کا ذمہ دار وہ بچہ نہیں ہوتا۔ اس کا ذمہ دار معاشرہ ہوتا ہے۔ غلط معاشرہ میں' ایک بچہ (یا ایک فرد) ساری عمر' اپنی اس کمی یا کمزوری کی سزا بھگتتا رہتا ہے جس کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا ــــ معاشرہ ہوتا ہے۔ قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں کوئی بچہ (یا فرد) اپنی اس کمی یا کمزوری کی سزا نہیں بھگتتا جس کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا ــــ جس معاشرہ میں وہ (قرآن) اپنے انقلاب کا آغاز کرتا ہے' ظاہر ہے کہ اس میں' مختلف افراد میں اس قسم کے اختلافات موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان اختلافات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر لیتا۔ وہ انہیں تسلیم کرتا ہے (اور یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام بھی بہ حالات موجودہ' انہیں تسلیم کرتا ہے) لیکن وہ ایسے اصول دیتا ہے جنہیں عملاً" بروئے کار لانے سے کوئی فرد اپنے "ناکردہ گناہوں" کی وجہ سے (یعنی صلاحیتوں کے اس تفاوت کی وجہ سے) سزا میں ماخوذ نہیں ہوتا۔ اس باب میں اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ
(۲) **ولقد کرمنا بنی ادم** ۱۷/۷۰ ہر انسانی بچہ' محض انسان ہونے کی جہت سے' یکساں طور پر واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ صلاحیتوں کے تفاوت کا شرف انسانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔
(۲) **لکل درجت مما عملوا** ۴۶/۱۹ معاشرہ میں مدارج کا تعین' ہر فرد کے ان کاموں کی وجہ سے ہوتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیار و ارادہ اور سعی و کاوش سے کرتا ہے ــــ ایک محنتی اور دیانتدار جاہل' ایک فرض ناشناس اور بددیانت عالم سے کہیں زیادہ واجب العزت قرار پاتا ہے۔
(۳) ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہے اور معاشرہ اس کی ضروریات پوری کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی ضروریات بھی جو کسی ابتدائی نقص یا بعد کے حادثہ کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔
اس کے ساتھ ہی' یہ معاشرہ' ان افراد کی کمی کو پورا یا نقائص کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش اور آئندہ کے لئے ایسا انتظام کرتا ہے کہ بچوں میں اس قسم کے نقائص پیدا ہی نہ ہوں اور ان کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جائے (اسے نظام ربوبیت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو قرآن میں عطا کردہ راہ نمائی کی روشنی میں ہی قائم ہو سکتا ہے)۔
امید ہے اس وضاحت سے وہ چبھن دور ہو گئی ہوگی جس کی طرف ہمارے مستفسر نے اشارہ کیا ہے اور جو موجودہ غلط معاشرہ میں ہر قلب حساس کو وقف اضطراب رکھتی ہے۔ (فروری ۱۹۷۰ء)

۱۰۔ توکل علی اللہ کا "صوفیانہ" تصور

لائل پور سے شائع ہونے والے ہفتہ وار "المنبر" کی ۹ جون ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں' مولانا غلام رسول (قلعے والے)

مرحوم کے کوائف حیات شائع ہوئے۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے باکمال موحد بزرگ تھے۔ ان کا ایک واقعہ یوں درج ہے کہ وہ اکثر تبلیغی دوروں پر باہر تشریف لے جاتے اور مہینوں بعد گھر کی طرف لوٹتے۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولوی صاحب چار مہینے کے مذکورہ قسم کے تبلیغی دورے پر سے گھر واپس تشریف لائے تو بیوی نے کہا کہ اگر گھر میں بھینس نہ ہوتی جس کے دودھ وغیرہ سے بسر اوقات اور گزارہ ہوا ہے' تو ہم تو بھوکوں مر جاتے۔ آپ نے اسی وقت قصائی کو بلایا' بھینس کو ذبح کرایا' گوشت گاؤں میں تقسیم کرا کر خود پھر سفر کو نکل گئے۔ چار پانچ مہینے کے بعد آئے تو گھر والوں کو بخیرو عافیت دیکھا تو بیوی سے کہا کہ تمہارا خدا تو میں ذبح کر گیا تھا' اب تمہارا گزارہ کیسے ہوا۔"

یہ بزرگ بھی "موحد" تھے اور المنبر کا مسلک بھی (غالباً) اہلحدیث کا ہے۔ کیا ہم اس جریدہ سے اتنا دریافت کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم کا یہ عمل کونسی سنت رسولؐ اللہ کے مطابق تھا؟ اس رسول کی سنت کے مطابق جن کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ جب ایک بدو اپنا اونٹ باہر چھوڑ کر حاضر خدمت ہوا تو حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اونٹ کا کیا کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے اسے خدا کے توکل پر باہر چھوڑ دیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ **اعقل وتوکل** ---- جاؤ --- پہلے اونٹ کو رسی سے باندھو اور پھر خدا پر توکل کرو --

بر توکل زانوئے اشتر بہ بند!

اس کے جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ میاں! یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں۔ ان کے اتباع سنت کے پیمانے کچھ اور ہوتے ہیں' یعنی ان کے "برگ حشیش" شاخ طوبیٰ سے اترتے ہیں!

اسی "تصوف" نے تو قوم کو تباہ کر رکھا ہے۔ (جولائی ۱۹۶۷ء)

باب پنجم

تصوف

۱۔ کشف و الہام کی حقیقت

(میرزا غلام احمد کے دعاوی)

میں ایک عرصہ سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ کشف و الہام کے عقیدہ سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹ جاتی ہے۔ قرآن کریم سے اس کی کوئی سند اور شہادت نہیں ملتی اور یہ دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ اس سے پہلے، میرے اس پیش کردہ نظریہ کے خلاف کوئی ردعمل نہ ہوا۔ لیکن اب جو میں نے اپنی کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں اسے دہرایا اور بتایا کہ میرزا غلام احمد کس طرح انہی سیڑھیوں سے بتدریج دعویٰ نبوت تک پہنچ گئے تو "احمدی" حضرات کی طرف سے اس کے خلاف خاص ردعمل ہوا۔ انہوں نے اس کے خلاف مضامین بھی شائع کئے اور مجھے خطوط بھی لکھے۔ ان کے "دلائل" کا ملخص یہ ہے کہ بڑے بڑے صوفیاء کرام اور اولیاء عظام نے کشف والہام کے دعوے کئے ہیں۔ اگر اس قسم کے دعوے کی بنا پر میرزا صاحب کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جا رہا ہے، تو یہ فرمایئے کہ ان بزرگوں (حضرات) صوفیاء اور اولیا کے متعلق آپ کیا کہیں گے! طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت ——— (بابت فروری ۱۹۷۵ء) میں ان کے اس اعتراض کو واضح طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ میں نے ان میں سے بعض حضرات کے خطوط کا نجی طور پر جواب دیا لیکن چونکہ یہ اس اعتراض کی اشاعت عام کر رہے ہیں اور ہمارے ہاں کے عوام چھوڑ، خواص تک کا بھی مطالعہ ایسا وسیع نہیں کہ وہ از خود حقیقت تک پہنچ جائیں، اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ ان کی اس مغالطہ آفرینی کی کوششوں کی نقاب کشائی کر دی جائے۔

وحی خداوندی اور علم انسانی میں بنیادی فرق کے متعلق میں (اس سے پہلے متعدد مقامات پر) بالتفصیل لکھ چکا ہوں۔ اس جگہ اسے مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اس کا طریقہ، مشاہدہ، تجربہ، مطالعہ، افہام و تفہیم، تعلیم و تعلم، درس و تدریس وغیرہ ہے۔ بالفاظ دیگر، یوں سمجھئے کہ انسان کے حواس (SENSES) خارج سے کچھ معلومات حاصل کر کے انہیں ذہن تک پہنچاتے ہیں اور وہ ان پر غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ یہ اس فرد کا حاصل کردہ علم ہے۔ افراد انسانیہ از خود بھی اس طرح علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کے حاصل کردہ علم سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ انسانوں کے لئے حصول علم کا یہی طریق ہے۔ اصطلاح میں اسے ادراک بالحواس کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی ادراک بالحواس ہی کو علم قرار دیا ہے جب کہا ہے

کہ **لا تقف مالیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا (۱۷/۳۶)** "جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگ جایا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت، بصارت اور عقل و فکر، ہر ایک سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔" دوسری جگہ ان ذرائع علم (حواس) سے کام نہ لینے والے کو جہنمی اور حیوانات سے بھی زیادہ راہ گم کردہ کہا گیا ہے یعنی وہ لوگ کہ **لھم قلوب لا یفقھون بھا ز ولھم اعین لا یبصرون بھا ز ولھم اذان لا یسمعون بھا** "جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن اس سے کام نہیں لیتے۔ جو آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ جو کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ **اولئک کالا نعام بل ھم اضل** (۷/۱۷۹) "یہ لوگ، انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔" ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے بھی ذرائع حصول علم، حواس ہیں۔

لیکن اس نے اس باب میں ایک استثنا بتائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایک علم وہ بھی ہے جسے خدا اپنے منتخب بندوں کو براہ راست عطا کرتا تھا یعنی اس میں، اس شخص کی، جسے یہ علم عطا کیا جاتا تھا، سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ علم، ادراک بالحواس نہیں ہوتا تھا حتیٰ کہ جس برگزیدہ انسان کو یہ علم عطا کیا جانے والا ہوتا تھا اسے، اس سے ذرا پہلے، اس کا علم و احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے۔ اس علم کو وحی خداوندی کہا جاتا ہے اور جس برگزیدہ ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا، اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا جاتا۔ یہ علم (وحی) آخری مرتبہ، حضور نبی اکرمؐ کو عطا ہوا اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ سلسلہ وحی کے اس طرح بند کر دیئے جانے کو ختم نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ختم نبوت کے بعد، علم حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ادراک بالحواس رہ جاتا ہے۔ اسی علم کے ذریعے خود قرآن کریم پر غوروفکر کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے ان دونوں ذرائع علم (یعنی وحی اور ادراک بالحواس) کو نہایت واضح اور متعین طور پر بیان کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ اس نے نہ کسی اور ذریعہ علم کا ذکر کیا ہے نہ امکان بتایا ہے۔

اہل کتاب کے ہاں وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے انبیاء کرامؑ کو بذریعہ وحی خدا کی طرف سے ملی تھیں۔ جن کتابوں کو وہ آسمانی کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں.... ان میں وحی کا واضح اور منزہ تصور نہیں ملتا نہ ہی نبوت یا نبی کا متعین مفہوم سامنے آتا ہے۔ (مثلاً) یہودیوں کے ہاں حضرت موسیٰؑ کو بھی نبی مانا جاتا ہے اور یرمیاہ، دانیال، حزقیل وغیرہ کو بھی نبی کہہ کر پکارا جاتا ہے اور ان کی طرف منسوب صحائف بھی عہد نامہ عتیق میں شامل ہیں۔ حالانکہ یہ حضرات، ہیکل میں کہانت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ کہانت سے مفہوم تھا پیش گوئیاں کرنا اور لوگوں کی قسمت کا حال بتانا۔ انگریزی زبان میں نبی کا ترجمہ (PROPHET) اس اعتبار سے کیا جاتا ہے یعنی (PROPHECIES) کرنیوالا۔ بعد میں، جب یہودیت میں تصوف (MYSTICISM) در آیا تو باطنیت (یعنی داخلی واردات) ذریعہ علم قرار پایا گیا اور اس طرح ان کے ہاں کشف و الہام کا عقیدہ عام ہو گیا۔ عیسائی، حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ مانتے تھے۔ اسلئے ان کے ہاں بھی نبی یا وحی کا تصور واضح نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے سوانح حیات، ان کے شاگردوں

(متی' لوقا' مرقس وغیرہ) نے مرتب کئے تو انہیں رسول کہہ کر پکارا گیا۔ ان میں یوحنا (ST. JOHN) کی انجیل کو خاص طور پر (REVELATION) قرار دیا گیا اور اس کا ترجمہ "مکاشفہ" کیا گیا۔ ان مرتبین اناجیل کے بعد' ان کے ہاں (SAINTS) اولیاء کا سلسلہ جاری ہوا جن کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ انہیں خدا کی طرف سے علم حاصل ہوتا ہے۔ یوں ان کے ہاں کشف و الہام کا عقیدہ عام ہوا۔

نزول قرآن کے وقت' اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ہاں' وحی کا تصور بڑا مبہم لیکن کشف و الہام کا عقیدہ عام تھا۔ جگہ جگہ ان کے کاہن اور ولی مرکز عوام تھے جو باطنی علم رکھنے کے مدعی تھے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) قران کریم نے وحی کا نہایت واضح اور متعین تصور دیا اور اس کے سوا خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کے ہر عقیدہ کو ختم کر دیا۔ وحی کے بعد' علم صرف ادراک بالحواس کو قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ صدر اول میں' جب اسلام اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں موجود اور نافذ العمل تھا' کشف والہام کے الفاظ تک کہیں نظر نہیں آتے' نہ ہی امت مسلمہ میں سے کوئی اس کا مدعی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد جب اسلام میں غیر قرآنی تصورات' نظریات اور معتقدات کی آمیزش شروع ہوئی' تو تصوف نے بھی ہمارے ہاں جگہ پالی اور اس طرح کشف والہام کا عقیدہ بھی وجود میں آگیا۔ (تاریخ بتاتی ہے کہ) ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں) پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا' ابوہاشم عثمان بن شریک تھا' جس نے ۱۴۰ھ میں رملہ کے قریب پہلی خانقاہ قائم کی۔ ابوہاشم رہنے والا تو کوفہ کا تھا لیکن وہ نقل مکانی کر کے فلسطین میں آبسا تھا جو عیسائیوں کی خانقاہوں کا مرکز تھا۔ اس نے انہی سے یہ تصور لیا اور مسلمانوں میں مسلک تصوف کی طرح ڈال دی۔ (رملہ فلسطین میں واقع ہے) مسلک تصوف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ صوفیاء کرام (جنہیں اولیاء اللہ بھی کہا جاتا ہے) خدا سے براہ راست علم حاصل کرتے ہیں۔ اسے کشف والہام کہا جاتا ہے۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے علم کی صرف دو نوعیتیں بیان کی ہیں۔ ایک علم (یا ادراک) بالحواس اور دوسرے خدا سے براہ راست حاصل ہونے والا علم۔ اس (موخرالذکر) کو اس نے وحی سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی علم جس کا ذریعہ انسانی حواس نہ ہوں' بلکہ کہا جائے کہ وہ خدا سے براہ راست حاصل ہوتا ہے' وحی کی شق میں شامل ہوگا' خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ اس کا الگ نام رکھ لینے سے وہ وحی سے الگ نہیں ہو سکتا اور چونکہ وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا' اس لئے (حضورؐ کے بعد) یہ دعویٰ صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ کسی کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے۔ ایسا سمجھنا عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے۔

یہاں سے وہ پیچیدہ سوال سامنے آتا ہے جو ہمارے ہاں سخت الجھن کا باعث بنتا ہے اور جس سے فائدہ اٹھا کر "احمدی" حضرات مغالطہ آفرینی سے کام لیتے اور مرزا غلام احمد کے دعویٰ کو (صوفیاء کرام کے دعویٰ کی مثل قرار دے کر) عین مطابق اسلام ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلہ' میں سب سے پہلے' اور بنیادی طور پر' اسے سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب قرآن کریم کی رو سے' خدا سے براہ راست علم حاصل ہونے کا سلسلہ ختم ہو گیا' تو اس قسم کے علم حاصل ہونے کے دعویٰ کو کسی صورت میں صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کر دی جائے۔ جو بات

قرآن کریم کی رو سے غلط ہے' وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی طرف منسوب کر دینے سے بھی صحیح نہیں قرار پا سکتی- یہاں سے یہ سوال پیدا ہو گا کہ پھر ان صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے اس قسم کا دعویٰ کیا' یا جن کی طرف اس دعویٰ کو منسوب کیا جاتا ہے-

جہاں تک منسوب کئے جانے کا تعلق ہے' ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طرف اس قسم کے دعویٰ کی نسبت غلط ہے- اگر وہ حضرات قرآنی تعلیم کا علم رکھتے تھے تو انہوں نے کبھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا ہو گا- ان دعاوی کو ان کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے-

جن حضرات کے متعلق یہ ثابت ہو کہ انہوں نے فی الواقع ایسا دعویٰ کیا تھا' تو ان کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں اس باب میں غلط فہمی ہو گئی ہو گی- جسے انہوں نے "خدا کی طرف سے براہ راست علم" سمجھا وہ خدا کی طرف سے علم نہیں تھا- وہ ان کے اپنے تخیل کے پیدا کردہ تصورات تھے- بات یہ ہے کہ تصوف کے پرمشقت مراقبوں اور ریاضتوں سے انسانی دماغ کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں طرح طرح کے تصورات ابھرتے ہیں اور اس شخص کا جس قسم کا عقیدہ ہو' یہ تصورات وہی شکل اختیار کر لیتے ہیں- اسے' ان کے "باطنی مشاہدات" یا "واردات" سے تعبیر کیا جاتا ہے- عصر حاضر کی اصطلاح میں انہیں (HALLUCINATIONS) کہہ کر پکارا جاتا ہے- میں چاہتا تو اس سلسلہ میں بہت سے ارباب واردات کے بیان کردہ "باطنی مشاہدات" کی مثالیں پیش کر دیتا[ا]- لیکن (بغرض اختصار) میں' صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا- ایک عیسائیوں کے ایک بہت بڑے ولی (ST.MACARIUS) کا بیان اور دوسرے علامہ اقبالؒ کا تبصرہ- اول الذکر کا بیان ہے کہ جو تارک الدنیا زاہد اس قسم کی ریاضتوں کی منزلیں طے کر رہا ہے:-

> اسے ایک نور کی چادر اڑھا دی جاتی ہے- اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہنمائی کرتی ہے تاآنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے- اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رہتا- وہ دنیا داروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے' لیکن درحقیقت وہ تکمیل نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے اور تمام اسرار و رموز کے پردے اس کی آنکھوں سے اٹھتے جاتے ہیں اور آخر الامر وہ خود حقیقت مطلق میں جذب ہو جاتا ہے-

یہ ایک غیر مسلم عیسائی اہل تصوف کے مشاہدات کی کیفیت ہے- لیکن اگر آپ خود اپنے ہاں کے بڑے بڑے صوفیاء کرام کے مشاہدات کے بیانات پڑھیں گے تو وہاں بھی آپ کو یہی کچھ ملے گا- ان صوفیاء کرام کے مشاہدات کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے اس مقالہ میں جو اخبار (NEW ERA) کی ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا' لکھا تھا:-

---

ا- اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات' ولیم جیمس کی شہرہ آفاق کتاب -THE VARIETIES OF RELIGIOUS) (EXPERIENCE- کا مطالعہ کریں-

> آج کل مسلمان یونانی اور ایرانی تصوف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹاک ٹوئیاں مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ گردو پیش کے حقائق ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور توجہ اس نیلی، پیلی، سرخ روشنی پر جما دی جائے جسے "اشراق" کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و تواتر کے باعث ماؤف ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود ساختہ تصوف اور یہ فنائیت ----- یعنی حقیقت کو ایسے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود ہی نہ ہو، دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے روبہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

یہ مقالہ کافی طویل ہے جس کے آخر میں وہ کہتے ہیں:۔

> نوجوان مسلمانو! اس شعبدہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبدہ بازوں کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں پر پڑی ہوئی ہے۔ دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصلحتانہ انداز کی اس توحید کو اپنا لیا جائے جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے دھندلکے سے باہر نکلو اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آجاؤ۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان مدعیان کشف والہام میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو شعبدہ بازی اور فریب کاری سے کام لیتے ہیں۔ وہ ایک خاص مقصد کے تحت اس قسم کے دعوے کر کے لوگوں کو اپنے "پھندے میں پھنساتے ہیں۔" لیکن ان میں وہ بھی ہیں جو مراقبوں اور ریاضتوں کے پیدا کردہ تخیلات کو حقائق سمجھ لیتے ہیں اور نہایت "دیانت داری" سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے عطا کردہ علم و عرفان ہے۔ چونکہ نیتوں کا علم صرف خدا کو ہے اس لئے ہم ان حضرات کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ صادر کرنے کے بجائے صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں (جس کی تعلیم ہمیں خدائے تعالیٰ نے دی ہے) کہ **تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون** (۲/۱۳۴) "یہ وہ لوگ تھے جو (اپنے اپنے وقت میں) اس دنیا سے چلے گئے۔ جو انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے۔ جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔"

ان کا معاملہ ان کے خدا کے ساتھ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان کے دعویٰ کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ قرآن کریم کے خلاف تھا، اس لئے نہ وہ صحیح قرار پا سکتا ہے اور نہ ہی ہمارے (یا کسی اور کے) لئے سند۔ دین میں سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہے۔ جو لوگ ان بزرگوں کے کشف والہام کو مانتے ہیں، ان کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تعلیم نہیں۔ مسلمانوں میں (قرآنی تعلیم کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے) بے شمار ایسے

عقائد و رسوم' رواج پذیر ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں۔ انہی میں یہ عقیدہ بھی شامل ہے۔ یہ ان کی جہالت ہے' وہ کفروشرک نہیں جس کی بنا پر ایک شخص امت محمدؐیہ کے زمرہ سے کٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ جب قرآن کی تعلیم عام ہو جائے گی تو اس قسم کے عقائد ختم ہو جائیں گے۔ **جاء الحق وزھق الباطل**' (۱۷/۸۱) خدا کا ارشاد ہے۔

اب آیئے "احمدی" حضرات کی طرف۔ سب سے پہلے وہ' ان حضرات صوفیاء کرام کے اس قسم کے دعاوی کو پیش کر کے' یہ کہتے ہیں کہ جب آپ لوگ یہ مانتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے بعد' خدا سے براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے اور انہیں یہ علم حاصل ہوا تھا' تو مرزا صاحب نے اگر یہ کہہ دیا کہ خدا کی طرف سے اب بھی براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے' تو ان کے ایسا کہنے کی بنا پر آپ انہیں کس طرح کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دے سکتے ہیں۔ آپ ان کے اس دعویٰ کو (کہ انہیں بھی اس قسم کا علم حاصل ہوا تھا) سچا نہیں مانتے تو نہ مانئے' لیکن جو لوگ اسے سچا مانتے ہیں' انہیں آپ کس طرح خارج از اسلام ٹھہرا سکتے ہیں۔ یہ دعویٰ کہ حضور نبی اکرمؐ کے بعد بھی خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے' کس طرح "ختم نبوت" کی مہر کو توڑ دیتا ہے۔ اگر اس سے "ختم نبوت" کی مہر ٹوٹ جاتی ہے تو آپ ان ہزارہا صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کے متعلق کیا کہیں گے جو اس قسم کے علم کے جاری رہنے کا عقیدہ رکھتے اور اس علم کے حاصل ہونے کے خود مدعی تھی!

یہ ہیں وہ اعتراضات جو "احمدی" حضرات کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ جو حضرات اولیاء کرام کے کشف والہام پر عقیدہ رکھتے ہیں (اور یہ عقیدہ عام ہے) ان سے ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب نہ بن پڑتا ہے نہ پڑ سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے (نبی کریمؐ کے بعد) خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کا عقیدہ غلط ہے' اس لئے مرزا صاحب اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔

اس پر یہ حضرات کہتے ہیں کہ بہت اچھا۔ مرزا صاحب اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہی سہی' لیکن جو الاؤنس آپ' اس قسم کے دعویٰ کرنے والے حضرات صوفیاء کرام کو دیتے ہیں' وہی الاؤنس مرزا صاحب کو کیوں نہیں دیتے۔ انہیں کیوں کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔ اس کا جواب غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مرزا صاحب کی اپنی شائع کردہ کتابیں موجود ہیں' اس لئے ان کے دعاوی کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ نہ معلوم انہوں نے ایسا کہا تھا یا نہیں۔

(۱) ہم نے اوپر کہا ہے کہ اپنے "کشف" کو خدا کی طرف سے براہ راست حاصل ہونے والا علم سمجھنا' غلط فہمی ہے جس میں انسان "دیانتدارانہ" طور پر بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب کے معاملہ میں ایسا نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ان کے "الہامات" جس طرح سے شائع کئے گئے اس سے مقصد یہ تھا کہ "لوگ ان کے پیچ میں پھنس جائیں"۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

> اور یہ الہامات میری طرف سے اگر اس موقع پر ظاہر ہوتے جبکہ علماء مخالف ہو گئے تھے تو وہ ہزارہا اعتراض کرتے۔ لیکن وہ ایسے موقع پر شائع کئے گئے جبکہ یہ علماء میرے

موافق تھے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس قدر جوشوں کے ان الہامات پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ ایک دفعہ ان کو قبول کر چکے تھے اور سوچنے سے ظاہر ہوگا کہ میرے دعویٰ مسیح موعود ہونے کی بنیاد انہی الہامات سے پڑی ہے اور انہی میں خدا نے میرا نام عیسیٰ رکھا اور جو مسیح کے حق میں آیتیں تھیں وہ میرے حق میں بیان کر دیں۔ اگر علماء کو خبر ہوتی کہ ان الہامات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ کبھی ان کو قبول نہ کرتے۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ انہوں نے قبول کر لیا اور اس پیچ میں پھنس گئے۔ (اربعین نمبر ۲، ص ۲۱)

کیا اسے دیانتدارانہ غلط فہمی قرار دیا جائے گا؟

(۲) جو شخص دیانتدارانہ سمجھتا ہے کہ اسے خدا کی طرف سے الہامات ہوتے ہیں، وہ (منصور کی طرح) سولی پر چڑھ جائے گا لیکن ان الہامات کے اظہار و اعلان سے مجتنب نہیں رہے گا۔ مرزا صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ جب ان پر، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداس پور کی عدالت میں، زیر دفعہ نمبر ۱۰۷، مقدمہ دائر ہوا تو انہوں نے معافی نامہ داخل کر دیا جس میں اس امر کا اقرار کیا کہ وہ آئندہ اپنے الہامات کو شائع نہیں کریں گے۔

(تریاق القلوب، مصنفہ مرزا غلام احمد، ص ۱۳۰ بحوالہ
"ختم نبوت اور تحریک احمدیت" ص ۱۸۹)
تیسرا ایڈیشن، مئی ۱۹۸۷ء (بلا ترمیم)

(۳) مرزا صاحب کی ساری اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ ان پر انگریزوں کی حکومت کی اطاعت ازروئے اسلام، فرض ہے اور جہاد بالسیف حرام ہو چکا ہے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ اس موضوع پر انہوں نے اس شدومد سے لکھا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو اس سے پچاس الماریاں بھر جائیں۔ وہ ساری عمر "بحضور ملکہ معظمہ، جناب گورنر جنرل، اور بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر" عرضداشتیں اور محضر نامے بھیجتے رہے کہ انہیں ان خدمات جلیلہ کا صلہ دیا جائے۔ مخالفین سے ان کی حفاظت کی جائے اس لئے کہ یہ خود ان کا "خود کاشتہ پودا" ہے جس کی حفاظت اور نگہداشت ان کا فریضہ ہے۔

کیا ایسے شخص کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیانتدارانہ غلط فہمی کا شکار تھا!

(۴) یہ تو رہا "الاؤنس" نہ دینے کا سوال۔ اب آگے بڑھئے۔ صوفیاء کرام میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انہیں بذریعہ الہام، اوامر و نواہی دیئے جاتے ہیں جن پر شریعت متفرع ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ مرزا صاحب ہی کا تھا۔ چنانچہ وہ واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ:

یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے جس نے اپنی وحی کے ذریعے سے چند امر و نہی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا، وہی صاحب شریعت ہو گیا۔

میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔ (اربعین نمبر ۴، ص ۷)

(۵) صوفیاء کے الگ الگ مسلک ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اپنا الگ فرقہ نہیں بنایا۔ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ وغیرہ طریقت کے سلسلے ہیں، الگ الگ فرقے نہیں۔ جداگانہ فرقہ کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھتے، اپنی الگ نماز پڑھتے ہیں۔ چشتیہ، قادریہ وغیرہ سلسلہ سے منسلک الگ الگ نماز نہیں پڑھتے، سب مل کر نماز پڑھتے ہیں۔ ان کے برعکس، مرزا صاحب نے نہ صرف اپنا فرقہ الگ بنایا، بلکہ جداگانہ امت کی تشکیل کی۔ انہوں نے کہا۔

> پہلا مسیح صرف مسیح تھا اس لئے اس کی امت گمراہ ہو گئی اور موسوی سلسلہ کا خاتمہ ہوا۔ اگر میں بھی صرف مسیح ہوتا تو ایسا ہی ہوتا۔ لیکن میں مہدی اور محمد(صلعم) کا بروز ہوں۔ اس لئے میری امت کے دو حصے ہوں گے۔ ایک وہ جو مسیحیت کا رنگ اختیار کریں گے اور تباہ ہو جائیں گے۔ دوسرے وہ جو مہدیت کا رنگ اختیار کریں گے۔
> (الفضل، ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء)

انہوں نے اپنی امت کو حکم دیا کہ وہ کسی "غیراحمدی" کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔ کہا:۔

> مجھے خدا نے اطلاع دی ہے کہ تمہارے پر حرام ہے اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفر اور مکذب یا متردد کے پیچھے نماز پڑھو، بلکہ چاہئے کہ تمہارا وہی امام ہو جو تم میں سے ہو۔
>
> (اربعین نمبر ۳، ص ۳۴، حاشیہ)

نماز ہی نہیں، انہوں نے کہا "غیراحمدی" کا جنازہ پڑھنا بھی ناجائز ہے۔ انہیں اپنی لڑکی دینا بھی ناجائز۔۔۔ صاحبزادہ بشیراحمد کے قول کے مطابق:۔

> غرض ہر ایک طریقہ سے ہم کو حضرت مسیح موعود نے غیروں سے الگ کیا ہے اور ایسا کوئی تعلق نہیں جو اسلام نے مسلمانوں کے ساتھ خاص کیا اور پھر ہم کو اس سے روکا نہ گیا ہو۔
>
> (حکمتہ الفصل)

کیا صوفیاء کرام میں سے کسی نے بھی ایسا کیا ہے؟

(۶) صوفیاء میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جو میرے الہامات کو نہیں مانتا اور میری بیعت نہیں کرتا، وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ یہ "شرف" مرزا صاحب ہی کو حاصل ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ

> جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا کیونکہ میری نسبت خدا اور رسول کی پیش گوئی موجود ہے......... اب جو شخص مجھ کو باوصف صدہا نشانوں کے مفتری

ٹھہراتا ہے وہ مومن کیونکر ہو سکتا ہے۔ (حقیقتہ الوحی، ص ۱۶۳)

(۷) صوفیاء میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کا الہام قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتا ہے۔ یہ جرات مرزا صاحب ہی نے کی کہ

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم سے بند کیا گیا۔ (اربعین نمبر ۴، ص ۴۷)

واضح رہے کہ قادیانی (یعنی ربوی) اور لاہوری، دونوں گروہوں کے "احمدی" مانتے ہیں کہ مرزا صاحب نے تلوار کے جہاد کو منسوخ اور قطعی حرام قرار دیا ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں ملے گی)۔

--------☆☆------
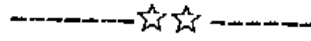
یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ وجوہات جن کی بنا پر، مرزا غلام احمد اور ان کے متبعین دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتے ہیں (اور قرار دیئے گئے ہیں)۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ان حضرات کا یہ کہنا کہ مرزا صاحب نے بھی کشف والہام کا دعویٰ اسی طرح کیا تھا جس طرح صوفیاء کرام اور اولیاء عظام، اس کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔ سو اگر وہ حضرات اس دعویٰ کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں پاتے تو مرزا صاحب کو ایسا کیوں قرار دیا گیا ہے۔ کس قدر تلبیس اور ابلہ فریبی پر مبنی ہے۔

ضمناً، کشف والہام کے سلسلہ میں مجھے جو خطوط موصول ہوئے ہیں، ان میں یہ تقاضا بھی کیا گیا ہے کہ تصوف کے موضوع پر تفصیلی مقالہ شائع کیا جائے جس میں وضاحت سے بتایا جائے کہ اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی اور مسلمانوں میں یہ کب اور کس طرح مروج ہوا۔ میں اس موضوع پر پہلے ہی کافی تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ میں نے پہلے "سلیم کے نام" تین خطوط میں اس پر بڑی شرح و بسط سے لکھا اور اب "شاہکار رسالت" میں بھی اس پر بحث کی۔ سلیم کے نام خطوط (اسی نام کی کتاب کی تیسری جلد میں) قریب بیس برس پہلے شائع ہوئے تھے اور شاہکار رسالت حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ (پرویز) (مارچ ۱۹۷۵ء)

۲۔ "چھٹی حس کیا ہوتی ہے؟

ایک صاحب پرویز صاحب کے نام اپنی طویل گرامی نامہ کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

ہاں! مجھے آپ کے ان افکار کے متعلق شک ہے جو تصوف کے بارے میں سامنے آئے ہیں۔ کیوں کہ موجودہ (PARK PSYCHOLOGY) اور قوت اشراق کے سائنٹیفک مطالعہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ذہن انسانی کو اللہ نے ماورائے حواس خمسہ کی قوت سے نوازا ہے اور (اس) چھٹی حس (یعنی) وجدان،

روحانیت یا مافوق الفطرت قوت سے انسانی ذہن محروم نہیں اور نہ کبھی رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی تحریر اور آپ کے قلم سے کچھ تبرکاً حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

جواب :- میں اس "چھٹی حس" کا منکر نہیں اور منکر ہو بھی کیسے سکتا ہوں جب میں نے اسے خود حاصل کر کے دیکھ لیا ہوا ہے۔ لیکن اس حس کا تعلق نہ "روحانیت" سے ہے نہ کسی مافوق الفطرت سرچشمہ سے۔ چند قاعدے اور چند مشقیں ہیں جن سے انسان جب اپنی قوت فکرو خیال' یاقوت ارادی کو نہایت شدت سے مرتکز (CONCENTRATE) کر لیتا ہے تو خود اس کی فکر ایک لطیف قوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی کا نام "چھٹی حس" ہے جسے سائیکلوجی میں وجدان (INTUITION) کہا جاتا ہے۔ (خود برگسان جو وجدان کا بہت بڑا حامی ہے' اسے ادراک ہی کی شکل کہہ کر پکارتا ہے)۔ اس فکری قوت کے پیدا کرنے کے لئے نہ کسی عقیدہ کی پابندی ضروری ہے نہ کفراور اسلام ہی کی تمیز۔ یہ ایک فنی ملکہ ہے جسے جو شخص چاہے (ان مشقوں کے ذریعے) پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی "مافوق الفطرت" راز بھی نہیں۔ (جب آپ کہتے ہیں کہ اس کا "سائنٹیفک طریق" سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے تو اس کے "مافوق الفطرت" ہونے کی تردید آپ خود ہی کر دیتے ہیں۔ کسی "مافوق الفطرت" عنصر کا مطالعہ سائیٹفک طریق سے نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس کا دائرہ فطرت تک محدود ہے۔ وہ اس سے باہر جا ہی نہیں سکتی)۔ بہرحال یہ "حس" فکر انسانی ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ عام حواس خمسہ سے الگ یا بلند اور لطیف ہوتی ہے' اس لئے لوگ اسے "فوق الفطرت" یا "روحانی" قوت سمجھ لیتے ہیں۔ تصوف کی ریاضتوں اور مراقبوں سے بھی یہی قوت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اسے تصوف کی ریاضتوں اور یوگ کی مشقوں سے پیدا کر کے دیکھا ہوا ہے۔

تصوف کا عقیدہ کشف والہام کا ہے جس کے معنی خدا سے براہ راست علم حاصل ہونا ہے۔ یہ عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے۔ خدا سے "براہ راست علم" صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو عطا ہوتا تھا جسے وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ اب کسی کو خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی کو ختم نبوت کہتے ہیں۔

وحی کے اتباع سے انسان میں پاکیزگی سیرت اور بلندی کردار پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا ارفع ترین اور مکمل ترین مقام وہ تھا جس پر نبی اکرمؐ فائز تھے اور جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وانک لعلی خلق عظیم** (۶۸/۴) "اے نبی! تو اخلاق کے عظیم مقام پر فائز ہے"۔ قرآن نے حضورؐ کی عظمت آپؐ کی اخلاقی بلندی کو قرار دیا ہے۔ یہی وہ سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی تھی جسے حضورؐ نے مخالفین کے سامنے اپنے سچا ہونے کی شہادت کے طور پر پیش فرمایا تھا جب کہا تھا کہ

فقد لبثت فیکم عمرا من قبله افلا تعقلون (۱۰/۱۶)

"میں نے اس سے قبل' اپنی زندگی تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں سمجھ سکتے کہ ایسی زندگی کسی جھوٹے انسان کی ہوتی ہے یا سچے کی"

یہی پاکیزگی سیرت و حسن کردار ہے جو حضور نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کے اتباع سے حاصل ہوتا ہے اور اس قسم کی سیرت و کردار کے حامل افراد پر مشتمل وہ جماعت (امت محمدیہؐ) ہوتی ہے جس کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوتا ہے جو اسلام کا مقصود اور دین کا منتہی ہے۔ اسلام کوئی "چھٹی حس" پیدا کرنے کے لئے نہیں آیا۔ وہ دنیا میں اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے آیا تھا جو ہر نوع غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ (پرویز)

(ستمبر ۱۹۷۴ء)

۴۔ پیش گوئیاں

(علم غیب، رسولؐ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا)

سوال :- "آپ نے میرے سابقہ استفسار کے جواب میں طلوع اسلام بابت ماہ مئی ۱۹۷۰ء میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ختم نبوت کا مسئلہ اس طرح واضح اور صاف ہو گیا ہے کہ اس باب میں کسی قسم کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں حیران ہوں کہ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق ہم اس قدر حساس واقع ہوئے ہیں (اور ہمیں ایسا احساس ہونا بھی چاہیے کیونکہ اسلام کی اصل بنیاد ہی ختم نبوت ہے) لیکن جس راستے سے یہ دروازہ کھولا جاتا ہے اس طرف ہماری نگاہ ہی نہیں جاتی۔ لاریب، یہ کشف و الہام کا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹتی ہے۔ **فجزاک اللہ احسن الجزاء**۔ اسی سلسلہ میں پیش گوئیوں کا سوال سامنے آتا ہے۔ میں شکرگزار ہوں گا اگر آپ اس کی بھی وضاحت فرما دیں کہ پیشین گوئیاں کرنے والوں کی پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

جواب :- کسی لمبی چوڑی بحث میں الجھے بغیر، تمہیداً" اتنا سمجھ لیجئے کہ:-

(۱) پیشین گوئی کرنے والے کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیب کا علم جانتا ہے (۲) "غیب کے علم" سے مراد ہے وہ علم جو سمع و بصر و فواد (حواس) کے ذریعے حاصل نہ ہو سکے۔

اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم میں ہے کہ غیب کا علم خدا کیلئے مخصوص ہے **انما الغیب للہ** (۱۰/۲۰) "ان سے کہہ دو کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے ہے"۔ دوسری جگہ ہے **قل لا یعلم من فی السموت والارض الغیب الا اللہ** (۲۷/۶۵) "ان سے کہہ دو کہ ارض و سماء (کائنات) میں خدا کے سوا کوئی نہیں جسے غیب کا علم حاصل ہو"

(۳) خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اور جس حد تک چاہتا ہے، غیب کا علم عطا کر دیتا ہے۔ **وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء** ص (۳/۱۷۸) اور خدا ایسا کرتا ہی نہیں کہ تمہیں غیب پر مطلع کر دے۔ ہاں، البتہ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اس مقصد کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

دوسری جگہ ہے **علم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول ......** (۷۲/۲۶-۲۷)
خدا عالم الغیب ہے۔ وہ اپنے غیب کا علم کسی شخص پر ظاہر نہیں کرتا بجز اس کے جسے وہ اس مقصد کے لئے چن لیتا ہے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ

(i) عالم الغیب خدا ہے۔

(ii) وہ صرف رسولوں کو غیب کا علم عطا کرتا تھا' کسی اور کو نہیں

(۴) رسولوں کو غیب کا علم وحی کے ذریعے ملتا تھا۔ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ مثلاً" حضرت مریمؑ کے کوائف حیات بیان کرنے کے بعد فرمایا **ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک** (۳/۴۳) یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم' اے رسول! تیری طرف وحی کرتے ہیں۔۔۔۔۔ داستان حضرت نوحؑ بیان کرنے کے بعد کہا **تلک من انباء الغیب نوحیھا الیک ما کنت تعلمھا انت ولا قومک من قبل ھذا** (۱۱/۴۹) اے رسول! یہ غیب کی باتیں ہیں جنہیں ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ اس سے پہلے انہیں نہ تو جانتا تھا نہ تیری قوم۔ یہی الفاظ تذکرہ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں دہرائے گئے ہیں یعنی **ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک.......** (۱۲/۱۰۲)

(۵) ان آیات سے واضح ہے کہ رسولوں کو غیب کا علم' بذریعہ وحی عطا ہوتا تھا۔ انہیں جن امور غیب کا علم بذریعہ وحی نہیں ملتا تھا' ان کا علم وہ از خود حاصل نہیں کر سکتے تھے اور واضح الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے تھے۔ خود نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے اعلان کرایا گیا کہ **قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب..... ان اتبع الا مایوحی الی** (۶/۵۰ تا ۱۱/۳۱) اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میں قطعاً" اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی اس کا دعویٰ کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ میں تو صرف اس کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے کہ **ولوکنت اعلم الغیب لا ستکثرت من الخیر وما مسنی السوء.......** (۷/۱۸۸) (ان سے کہہ دو کہ) اگر میں غیب کا علم رکھتا تو میں اپنے لئے ڈھیروں دولت جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف چھو تک نہ سکتی۔

(۶) یہ بات کہ کوئی شخص مستقبل کا علم نہیں رکھ سکتا' ان واضح الفاظ میں کہہ دی کہ **وما تدری نفس ماذا تکسب غدا وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر** (۳۱/۳۴) کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ اس کی موت کس خطہ زمین میں واقع ہو گی۔ علیم و خبیر صرف خدا ہے' اور کوئی نہیں۔

یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تصریحات کی موجودگی میں اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مستقبل کے حالات قبل از وقت بتا سکتا ہے (اسی کو پیشین گوئی کہتے ہیں) تو اس کا یہ دعویٰ' دو حالتوں سے خالی نہیں یعنی

(i) یا تو وہ اس کا مدعی ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے اور اسے یہ علم وحی کے ذریعے ملا ہے۔
(ii) اگر وہ ایسا دعویٰ نہیں کرتا تو وہ یہ کہتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ غیب کا علم خدا اور اس کے رسولوں کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ میری طرف دیکھو' میں رسول ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود میں غیب کی باتیں بتا سکتا ہوں۔
اس کے بعد' آپ خود سوچ لیجئے کہ ختم نبوت کے بعد پیشین گوئیاں کرنے والوں (اور ان کی پیشین گوئیوں پر کان دھرنے والوں) کا قرآن کریم کی رو سے مقام کیا ہے۔ یہ دعوائے رسالت نہیں تو اور کیا ہے؟

---------------- ☆☆ ----------------

یہاں تک ہم نے ان لوگوں کے متعلق بات کی ہے جو اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خدا سے براہ راست علم پا کر پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایسا دعویٰ کئے بغیر پیش گوئیاں کرتے ہیں (جیسا کہ عام طور پر اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے) سو ان کے متعلق اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی قیاس آرائیاں ہوتی ہیں جن میں سے بعض ٹھیک نکل آتی ہیں اور بعض غلط ثابت ہوتی ہیں۔ قرآن اسے **رجماً بالغیب** سے تعبیر کرتا ہے (۱۸/۲۲) یونہی اٹکلیں دوڑانا اور اندھیرے میں تیر چلانا۔

(جون ۱۹۷۰ء)

۴۔ پاکستان میں پیری مریدی کا اس قدر زور کیوں ہے؟

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد ملک میں پیری مریدی اور اس کے متعلقات قبر پرستی' گنڈا تعویذ وغیرہ کا بہت زور ہو گیا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے یہ چیزیں اور زور پکڑتی جاتی ہیں۔ اور حیرت یہ ہے کہ (اس سے پہلے یہ چیزیں بالعموم جہلا کے طبقہ تک محدود ہوتی تھیں' لیکن اب) یہ لکھے پڑھے طبقہ' بالخصوص سرکاری ملازمین میں بھی عام ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوع اسلام

یہ سوال' اس سے پہلے بھی' (ایک عرصہ ہوا) ہم سے پوچھا گیا تھا اور اس کا جواب طلوع اسلام کے صفحات میں دیا گیا تھا۔ ۲۔ لیکن اس کے بعد' یہ چیزیں وبائی امرض کی طرح اور شدت سے پھیل رہی ہیں۔ اس لئے اس سوال کا دوبارہ جواب دینا ضروری سمجھا گیا ہے۔
قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ :۔
(i) کائنات میں ہر شے کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔ قانون کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔

۲۔ ملاحظہ ہو قرآنی فیصلے' حصہ اول' صفحہ ۳۶۹' ایڈیشن سوم' مارچ ۱۹۹۲ء

(۲) اصول یہ ہے کہ **لیس للانسان الا ما سعی** (۳۹/۵۳) انسان اسی کا حقدار ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

(۳) یہی وجہ ہے کہ اس نے میسرہ کو حرام قرار دیا ہے۔ میسرہ کا عام ترجمہ جوا کیا جاتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ میسرہ کے معنی ہیں وہ دولت جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔

تشکیل پاکستان کے بعد' ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے' قوم نے اسے لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قوم نے بہ ہیئت مجموعی قاعدہ اور قانون کو بالائے طاق رکھ کر میسرہ کو اپنا شعار بنایا۔ قاعدہ اور قانون کے مطابق کام کرنے میں محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے اور انسان راتوں رات "سیٹھ" بھی نہیں بن سکتا۔ "لوٹ" میں یہ دونوں باتیں ممکن ہیں یعنی اس میں محنت کچھ کرنی پڑتی نہیں اور انسان شباشب لاکھ پتی بن جاتا ہے۔ یہ "مال غنیمت" (لوٹ کا مال) تو چند دنوں میں ختم ہو گیا لیکن قوم کو میسرہ کی ایسی لت پڑ گئی کہ اس نے اسی کو اپنا شعار زندگی بنا لیا۔ اب ہر شخص اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ اسے نہ محنت کرنی پڑے اور نہ ہی قانون اور قاعدہ کی پابندی اور وہ "سیٹھ" بن جائے راتوں رات۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خلاف قانون راستوں کی تلاش ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی (بدقسمتی سے) ملک کا نظام' سرمایہ داری قرار پا گیا۔ یہ نظام میسرہ کی بدترین شکل ہوتا ہے۔ اس سے پہلے' ہماری قوم محنت کش اور مزدور پیشہ تھی۔ اب لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص' ایک کمرے میں میز کرسی لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ نہ کہیں آتا ہے نہ جاتا' نہ محنت کرتا ہے نہ مزدوری۔ چار کاغذ ٹائپ کرتا ہے اور دس ٹیلیفونیں اور چھ ماہ کے بعد دیکھیے تو لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ اس سے ہر شخص کے منہ میں پانی بھر آیا اور انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ محنت' مشقت اور قاعدے قانون کی پابندی سے بمشکل روٹی ملتی ہے اور اس طریق سے انسان ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر امیر کبیر بن جاتا ہے۔ اس لئے کیوں نہ یہی راہ اختیار کی جائے۔

قوم کا یہ طبقہ حکومت کی مشینری کا کل پرزہ ہوتا ہے اور اس کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کو قانون کا پابند بنائے۔ جب اس طبقہ نے دیکھا کہ قانون شکنی سے اس قدر مفاد حاصل ہو رہے ہیں تو اس نے دل میں کہا کہ کیا قانون کی پابندی کے لئے ہم ہی رہ گئے ہیں؟ چنانچہ اس کے بعد اس نے بھی یہی روش اختیار کر لی۔ اب صورت یہ ہو گئی کہ افراد قوم خلاف قانون راہوں پر چلنے کے لئے ان کے پاس پہنچتے اور یہ ان کے ممد و معاون بن کر اس کی قیمت وصول کرتے۔ اس طرح انہوں نے بھی میسرہ سے اپنا حصہ لینا شروع کر دیا۔

ادھر "دنیاداروں" نے یہ روش اختیار کی اور اُدھر سے "روحانیت" کے مدعیوں کی طرف سے آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ آؤ! تمہیں ہم بتائیں کہ بلا محنت و مشقت مرادیں کس طرح پوری ہوتی ہیں! فلاں مجذوب' سٹہ کا نمبر بتاتے ہیں۔ فلاں حضرت صاحب کی دعا سے کاروبار میں "برکت" پیدا ہو جاتی ہے۔ فلاں بزرگ کے تعویذ سے' افسر مہربان ہو جاتا ہے۔ فلاں مزار پر حاضری دینے سے سب رکے ہوئے کام رواں ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میسرہ پسند' تن آسان' محنت سے جی چرانے والی' قانون شکنی کی عادی' قوم کے لئے اس آواز سے بڑھ کر جاذبیت اور کس میں ہو سکتی تھی۔

انہوں نے جوق در جوق ادھر کا رخ کر لیا۔ بزرگوں کے آستانوں پر ہجوم لگ گیا۔ خانقاہوں اور مزاروں پر مرادیں طلب کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ چنانچہ اب میسرہ کے لئے دوہرے راستے اختیار ہونے لگے۔ جب کوئی کام سامنے آیا پہلے یہ سوچا کہ فلاں افسر تک پہنچنے کا ذریعہ اور سفارش تلاش کی جائے۔ دوسری طرف یہ کہ خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے کسی بزرگ کا وسیلہ حاصل کیا جائے۔ اس سے اگلا قدم یہ کہ افسر متعلقہ کو اس قدر رشوت دی جائے اور حضرت صاحب کے حضور اسقدر نذرانہ گزارا جائے یا مزار پر منت مانی جائے۔ بادنٰی تعمق نظر آجائے گا کہ ان دونوں طریقوں میں فرق صرف الفاظ کا ہے' روح دونوں جگہ ایک ہی کارفرما ہے۔

یہ معاملات ذرا چھوٹے درجے کے آستانوں پر ہوتے ہیں' بڑی مسندوں پر بات اس سے آگے چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں فری میسنز یا روٹری کی قسم کی تنظیمیں ہوتی تھیں۔ ان کے ممبر بننے کا ایک بڑا فائدہ (اور دیسی ممبروں کے لئے شائد یہی ایک فائدہ) تھا کہ اس سے بڑے بڑے حکام کے ساتھ روابط پیدا ہو جاتے تھے (آجکل' اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی' لائنز کلب کے نام سے متعارف ہے)۔ بلند آستانوں اور درگاہوں کے مرشدان طریقت کے وابستہ داماں ہونے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ روابط پیدا ہو جاتے ہیں اور اس میں جو کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے وہ بہرحال' مذکورہ صدر کلبوں کے اخراجات سے کم ہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں' اس سے انسان معاشرہ کی نگاہ میں بھی "اللہ والا" بن جاتا ہے۔

قوم کو مزاج خانقاہیت میں پختہ تر کرنے کے لئے یہی اسباب و علل کچھ کم نہ تھے کہ محکمہ اوقاف نے' سمند ناز پہ اک اور تازیانہ کا کام کیا۔ اس سے پہلے' چند بڑی بڑی خانقاہوں اور مزاروں کو چھوڑ کر' باقی مزارات' دستبرد زمانہ کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مٹتے جارہے تھے۔ اس محکمہ نے اپنی حسن کارکردگی دکھانے کے لئے ان مٹتے ہوئے نشانات کو از سر نو زندہ کر دیا اور اس طرح قدم قدم پر نئی نئی درگاہیں ابھرنی شروع ہو گئیں۔ پھر اس محکمہ کی طرف سے ان "بزرگوں" کے کوائف حیات سے متعلق کتابیں مرتب اور شائع ہونے لگیں اور ظاہر ہے کہ ان کے کوائف حیات میں سب سے نمایاں حصہ ان کی کرامات کا ہوتا ہے۔ جب ان کی طرف اس قدر محیرالعقول کرامات منسوب ہونے لگیں تو پھر ان کے نشانات کے مرجع انام بن جانے میں کسر کونسی باقی رہ سکتی تھی؟ اس سے پہلے' مزاروں اور درگاہوں کے مجاور بالعموم جاہل بھی ہوتے تھے اور اخلاقی اعتبار سے بھی ان کی شہرت اچھی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے لوگ ان مراکز کی طرف زیادہ رجوع نہیں کرتے تھے۔ اب ان کی جگہ "سرکاری مجاوری" نے لے لی ہے جو سب پڑھے لکھے ہیں اور عام طور پر دانش ور شمار ہوتے ہیں۔ یہ حضرات ان مزاروں پر' اور ان سے متعلق اجتماعات میں' وہی حرکتیں کرتے ہیں جو اس سے پہلے جاہل مجاور کیا کرتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس محکمہ کے ملازمین اس باب میں مجبور ہیں۔ جب ان کا وزیر (منسٹر) کسی مزار کو غسل دے تو یہ بیچارے غسل کے پانی کو شیشیوں میں کیونکر نہیں بھریں گے؟ لیکن اس کا نتیجہ بہرحال یہ ہوتا ہے کہ جب عوام انہیں یہ کچھ کرتا دیکھتے ہیں تو ان کی نگاہوں میں ان خرافات کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ اسباب و علل جن کی بنا پر' پاکستان میں پیری مریدی' قبر پرستی اور خانقاہ نوازی کی روش

بڑھتی جا رہی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا علاج کیا ہے' تو

علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!

ان توہم پرستیوں کی بنیادی وجہ تو جہالت ہے۔ جہالت سے مراد ہے قرآن کی تعلیم سے ناواقفیت۔۔۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کو عام کیا جائے جس میں بتایا جائے کہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) "تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے"۔ یہ تصور ہی غیر اسلامی ہے۔ اسے ہم نے غیروں سے مستعار لیا تھا۔ قرآن کے نظام زندگی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ کشف و کرامات کی دینی حیثیت کچھ نہیں۔ مردوں کا اس دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ باقی رہے زندہ بزرگ' سو ان کی دعائیں اور نگاہیں بھی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتیں۔ یہ ہماری اپنی عقیدت مندی کی پیدا کردہ نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے جس سے ہم ان کا اثر لے لیتے ہیں۔ آپ انہیں اپنے جیسا انسان سمجھئے' پھر دیکھئے ان کا کوئی اثر آپ پر نہیں ہوگا۔ ۳۔ ان کی تو کیفیت ہے کہ

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خدا ست

چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

جہالت کے بعد' زندگی کے عملی معاملات آتے ہیں اور ان کا تجزیہ غور طلب ہے۔ آپ دیکھئے کہ انسان' اس قسم کے سہارے ڈھونڈتا کب ہے؟ صرف اس وقت جب اس کا کوئی کام رک جائے' جب اس پر کوئی مصیبت پڑ جائے' جب قاعدے اور قانون کے مطابق چلنے سے اسے کامیابی نہ ہوتی ہو۔

لہٰذا' اس کا علاج یہ ہے کہ معاشرہ کے نظام میں ایسی تبدیلی پیدا کی جائے جس سے کسی کا کوئی جائز کام رکے نہیں' جس سے کسی کی مصیبت تنہا اسی کی مصیبت بن کر نہ رہ جائے' جس سے قاعدے اور قانون کے مطابق ہر کام آسانی سے ہوتا چلا جائے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا وہ ارشاد اس قدر اہم اور عمیق ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ کا صحیح تصور نگاہوں کے سامنے لے آتا ہے۔ آپ نے لوگوں سے کہا تھا کہ

میں یہاں اس لئے ہوں کہ تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔

اور اس کی تشریح میں آپ نے فرمایا تھا کہ تم خدا سے اسی وقت دعا کرو گے جب تمہارا کوئی کام رک جائے گا۔ میرا فریضہ یہ ہے کہ میں دیکھوں کہ تمہارا کوئی کام رکے نہیں۔ جب تمہارا کام رکے گا نہیں تو تمہیں خدا کے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کسی مشکل کے حل کے لئے اگر تم خدا تک بات پہنچاؤ گے تو وہ درحقیقت میرے خلاف شکایت ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے قاصر رہا ہوں۔ اس لئے میں ایسا انتظام کروں گا کہ تمہیں خدا کے حضور میری شکایت کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

۳۔ پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ "پیر منیدیاں نوں کھاندا اے" یعنی پیر' انہی سے کچھ وصول کر سکتا ہے جو اسے پیر مانتے ہیں۔ آپ اسے پیر ماننا چھوڑ دیجئے' اس کی ساری بزرگی ختم ہو جائے گی۔ جس قبر کی عقیدت آپ کے دل میں ہوگی' وہ آپ کو عرش معلی سے بھی بلند نظر آئے گی۔ اس عقیدت کو دل سے نکال دیجئے' وہ اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔

اگر ایسا معاشرہ قائم کر دیا جائے تو پھر لوگوں کو اس قسم کے سہاروں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ باقی رہے وہ لوگ جو میسرہ کے لئے یہ کچھ کرتے ہیں تو ان کا علاج بھی اسی قسم کے معاشرہ کا قیام ہے۔ اسلامی معاشرہ میں' کسی شخص کی ضروریات زندگی رکی نہیں رہتیں اور ضرورت سے زائد کوئی شخص اپنے پاس رکھ نہیں سکتا۔ للذا' جس معاشرہ میں "سیٹھ" بننے کا امکان ہی نہ ہو' اس میں اس قسم کی "میسرانہ" حرکات کی نہ ضرورت رہتی ہے نہ گنجائش۔ اس وقت نہ توہم پرستی باقی رہتی ہے نہ ہوس زرپرستی------ یہ دونوں چیزیں درحقیقت غلط معاشرہ کی پیداوار ہیں۔ اسلام کے صدر اول میں' جب یہ معاشرہ قائم ہوا تھا' نہ کوئی پیر تھا' نہ خانقاہ۔ نہ قبروں پر چادریں چڑھائی جاتی تھیں نہ بزرگوں کے عرس ہوتے تھے۔ اس لئے کہ اس میں نہ کوئی بھوکا تھا نہ سیٹھ۔ ان خرافات کے ختم کرنے کا یہی عملی طریق ہے اور دین یہی سکھانے کے لئے آیا تھا۔ اسی سے انسان میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے جس سے وہ کسی خارجی سہارے کا محتاج نہیں رہتا۔ اقبال کے الفاظ میں :-

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا!
ہے بندہ آزاد خود اک زندہ کرامات

قرآن' اسی قسم کے آزاد بندے پیدا کرنے کے لئے آیا تھا جو اپنے معاملات کے لئے انسانوں کے آستانوں پر جھولی پھیلانے کے بجائے' صرف قانون خداوندی کے دروازے پر دستک دیتے تھے اور اس قانون کا اتباع ان کی ہر مشکل آسان کر دیتا تھا۔

(جولائی ۱۹۶۸ء)

۵۔ پیروں کی کرامات اور مزاروں کے غسل

روزنامہ "مشرق" (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۴ اپریل ۱۹۶۶ء میں حضرت بابا فرید الدین مسعودؒ گنج شکر کے حالات زندگی میں لکھا ہے:-

> آپ تمام دن مسجد میں عبادت کرتے اور سرشام ہی مسجد کے ایک خدمتگار رشید الدین مینائی کی مدد سے رسے کے ایک سرے کو اپنے پاؤں سے باندھ کر کنوئیں میں الٹے لٹک جاتے اور رشید مینائی رسے کا دوسرا سرا لمبی شاخوں والے درخت کی ایک ٹہنی سے باندھ دیتے جو کنوئیں پر چھتری ڈالے ہوئے تھا۔ صبح ہوتی تو مینائی انہیں باہر نکال لیتے۔ چالیس دن کے اس عمل نے آپ پر کمزوری کی کیفیت طاری کر دی۔ ناچار آپ نے چھڑی کا سہارا لے کر چلنا شروع کر دیا۔ ندائے غیبی آئی "اب ہمارا سہارا چھوڑ کر غیر کے سہارے پر اتر آئے ہو۔" فوراً چھڑی پھینک کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔

آگے چل کر لکھا ہے:

"آپ کو گنج شکر کہا جاتا ہے۔ اس کی توجیہہ میں کئی روایات ملتی ہیں۔ یہاں دو روایات درج کی جاتی ہیں:۔

اول :۔ آپ جنگل میں عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دوپہر پیاس کی شدت بڑھی تو آپ نے ایک کنواں تلاش کیا۔ کنوئیں میں جھانکنے سے معلوم ہوا کہ پانی زیادہ گہرا ہے اور بغیر مشکیزے اور ڈور کے کام نہیں بن سکتا۔ آپ یہی سوچ رہے تھے کہ اس اثناء میں دو ہرن ادھر آنکلے۔ جب وہ کنوئیں کی منڈیر پر آئے تو پانی قدرت الٰہی سے کناروں تک اچھل پڑا۔ جانوروں نے پانی پیا اور چلے گئے۔ آپ نے یہ تماشا دیکھا اور خود بھی پینے کیلئے بڑھے کہ پانی اپنی اصل جگہ پر پہنچ گیا۔ بڑے حیران ہوئے۔ غیب سے ندا آئی "تم نے مشکیزے اور ڈوری پر بھروسا کیا ہوا ہے۔ جانور میرے بھروسے پر آئے، سو میں نے انہیں پانی پلا دیا"۔ آپ ندامت کے ساتھ واپس تشریف لائے، اور چالیس روز تک چلہ کشی کی۔ چالیسویں روز بھوک پیاس نے ستایا تو زمین سے چند کنکر اٹھا کر منہ میں رکھ لیے۔ کنکر منہ میں رکھتے ہی وہ شکر میں تبدیل ہو گئے۔

دوم :۔ آپ کی والدہ بچپن میں آپ کے جانماز کے نیچے آپ سے چھپا کر شکر کی چند ڈلیاں رکھ دیتیں۔ ایک روز شکر رکھنا بھول گئیں۔ آپ نے جانماز پر نماز پڑھی اور بعد میں حسب معمول جانماز کا کونہ اٹھایا تو نیچے شکر پائی۔ ماں حیران رہ گئیں اور بارگاہ خداوندی میں سر بسجود ہو گئیں۔

اسی اخبار کے یکم مئی ۱۹۶۹ء کے ایڈیشن میں حضرت سلطان باہوؒ کے متعلق حسب ذیل واقعات شائع ہوئے ہیں:۔

آپ پیدائشی ولی تھے۔ رمضان المبارک میں سحری سے لے کر شام تک والدہ کا دودھ نہیں پیا کرتے تھے۔ آپ نے حصول معاش کی خاطر کوئی دنیاوی شغل اختیار نہیں کیا تھا۔ آپ نے دو مرتبہ بیل خرید کر کھیتی باڑی شروع کی لیکن ابھی فصل پکنے نہ پائی تھی کہ آپ اسی حالت میں سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فاقہ کی رات فقیر کے لئے معراج کی رات ہوتی ہے جس رات اسے اللہ تعالیٰ کا وصال ہوتا ہے۔

اور سنئے :۔ ۲ مئی ۱۹۶۹ء کے اخبار پاکستان ٹائمز میں ایک تصویر شائع ہوئی ہے جس کے نیچے لکھا ہے کہ میر غلام قادر صاحب، وزیر مغربی پاکستان، داتا صاحب کے دربار (یعنی مزار) کو غسل دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک خبر شائع ہوئی ہے جس میں اس غسل کی تفصیل دی گئی ہے اور لکھا گیا ہے کہ اس غسل کے وقت محکمہ اوقاف کے چیف

ایڈمنسٹریٹر صاحب بہ نفس نفیس موجود تھے اور اس محکمہ کی طرف سے غسل کے بعد لنگر تقسیم کیا گیا۔
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے!

(جون ۱۹۶۶ء)

۶۔ دیوبندی حضرات کی کرامات

ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ دیوبندی حضرات، پیری مریدی اور کشف و کرامات کو نہیں مانتے۔ اسی بنا پر انہیں، عرف عام میں "گلابی وہابی" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ حضرات بھی کشف و کرامات کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح عام "پیر پرست"۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(دارالعلوم) دیوبند سے شائع ہونے والے ماہنامہ "تذکرہ" کی فروری ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں "معارف و حقائق" کے عنوان سے حسب ذیل معارف و حقائق شائع ہوئے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے :۔

ویران مقامات کی آبادی :۔ جس زمانہ میں ملکہ کی تاج پوشی کا جلسہ ہوا تھا اس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ دہلی میں رہتے تھے مگر اکثر غائب رہتے تھے۔ جب دریافت کیا گیا کہ حضرت! آپ کہاں رہتے ہیں تو فرمایا کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ دہلی میں جس جس جگہ تمہارا قدم جائے گا ہم اس جگہ کو آباد کر دیں گے، اس لئے میں اکثر شہر اور حوالی شہر میں گشت کرتا ہوں تاکہ ویران مقامات آباد ہو جائیں۔

اور واقعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ جہاں جہاں آپ کے قدم پہنچے وہ تمام جگہیں آباد ہو گئیں (امیرالروایات)

جاڑا بخار کو آرام :۔ ایک مرتبہ نانوتہ میں جاڑا بخار کی بہت کثرت ہوئی۔ جو شخص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کی قبر سے مٹی لے کر باندھ لیتا بس اسے فوراً آرام ہو جاتا۔ چنانچہ لوگ اس قدر کثرت سے مٹی لے گئے کہ جب بھی قبر پر مٹی ڈالی جاتی ختم ہو جاتی۔ جب یہ کیفیت ہوئی تو ایک مرتبہ مولانا کے صاحبزادے نے قبر پر جا کر کہا کہ آپ کی تو کرامت ہوئی اور ہماری مصیبت ہو گئی۔ اگر اب کے کوئی اچھا ہوا، تو ہم مٹی نہ ڈالیں گے۔

پس اسی دن سے پھر کسی کو آرام نہیں ہوا اور لوگوں نے مٹی لے جانا بند کر دیا۔

عملیات پر اعتقاد:۔ ایک مرتبہ ایک شخص کا مقدمہ سہارنپور میں ڈپٹی ظہیر عالم کی عدالت میں پیش ہوا۔ وہ شخص عابد حسین صاحب دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مقدمہ میں کامیابی کا تعویذ مانگا۔ حاجی صاحب نے دے دیا اور فرمایا کہ جب عدالت میں جانا تو اس کو اپنی پگڑی میں رکھ لینا۔ وہ شخص جب عدالت میں اجلاس پر پہنچا اور ڈپٹی نے کچھ سوال کیا تو اس کو یاد آیا کہ تعویذ بھول گیا ہوں۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب سے کہا کہ ابھی ابھی ٹھہر جاؤ۔ میں دیوبند والے حاجی صاحب کا تعویذ لایا ہوں۔ اس کو لے آؤں تب پوچھنا۔ ڈپٹی صاحب یہ سن کر

ہنسے' کیونکہ وہ عملیات پر اعتقاد نہ رکھتے تھے۔

جب وہ شخص تعویذ لے آیا' تب کہا کہ اب پوچھو کیا پوچھ رہے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے کچھ سوالات کئے اور پھر اپنے خیال میں قصداً" اس مقدمہ کو بگاڑ دیا۔ مگر جب فیصلہ لکھ کر پڑھنے بیٹھے تو وہ موافق تھا۔ یہ دیکھ کر ڈپٹی صاحب بہت پشیمان ہوئے۔ حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت خواہ ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ عمل کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب وہ معمول پر اثر انداز ہوتا ہے تو اس کا دماغ صحیح نہیں رہتا اور جب دماغ صحیح نہیں رہتا تو کام بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

پانی کی جگہ سونے سے بھرا ہوا ڈول :- ایک بزرگ کو ایک روز عصر کی نماز میں دیر ہو گئی۔ دوڑے ہوئے وضو کے لئے کنوئیں پر گئے۔ کنوئیں کے اندر ڈول ڈالا تو پانی کی بجائے چاندی سے بھرا ہوا نکلا۔ ان بزرگ نے پھینک دیا اور جناب باری میں عرض کیا کہ مذاق نہ کر۔ مجھے تو نماز کو دیر ہوئی جا رہی ہے۔ پھر دوبارہ ڈول ڈالا تو اب کے سونے سے بھرا ہوا نکلا۔ پھر عرض کیا کہ مذاق نہ کر مجھے تو نماز سے دیر ہوئی جاتی ہے۔ اس وقت ان کو یہ الہام ہوا کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا تاکہ لوگ تم کو حقیر نہ جانیں۔ وہ بزرگ جولاہے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا آنکھیں بنوانے سے انکار:- حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں پانی اتر آیا' تو آنکھ بنانے والے حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ اجازت ہو تو ہم آنکھ بنا دیں' لیکن پانچ دن تک آپ کو احتیاط کرنا پڑے گی۔ سجدہ زمین کے بجائے کسی اونچی لکڑی پر کرنا ہو گا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ واللہ! ایک رکعت بھی ہم اس طرح پڑھنا منظور نہیں کر سکتے؟ حضورؐ کا ارشاد مجھے معلوم ہے کہ جو شخص ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑ دے گا وہ حق سبحانہ تعالیٰ سے اس طرح ملے گا کہ اس پر ناراض ہوں گے۔

(از در منثور)

(اپریل ۱۹۶۵ء)

۷۔ حکیم الامت' مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مجالس

مفتی محمد شفیع صاحب ۴؎ کے زیر سرپرستی' کراچی سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ البلاغ۔۔۔ اس کے مدیر' مفتی صاحب کے صاحبزادہ' محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔ اس میں ایک مستقل عنوان ہے' مجالس حکیم الامتؒ ' جس میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مجالس کے احوال و کوائف شائع کئے جاتے ہیں۔ اس کے مرتب خود مفتی محمد شفیع صاحب ہیں۔ اس ماہ نامہ کی مارچ ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں' اس مجلس کے احوال میں جو واقعات شائع کئے گئے ہیں' ان میں سے دو واقعات آپ بھی ملاحظہ فرما لیں۔ پہلے واقعہ کا عنوان ہے' "رحمت حق کا ایک عجیب واقعہ" وھو ھذا۔۔

۴؎۔ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (نومبر ۱۹۷۶ء)

ایک جاہل عورت مرنے کے وقت کچھ کلمات بول رہی تھی جو اس کے جاہل گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ وہ کسی مولوی صاحب کو بلا کر لائے اور کہا ذرا دیکھو یہ کیا بھونک رہی ہے۔۔۔ مولوی صاحب نے قریب جا کر سنا تو عربی زبان کے یہ کلمات اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔

ان ھذین الرجلین یقولان ادخلی الجنۃ

یہ دو آدمی یوں کہہ رہے ہیں کہ تو جنت میں داخل ہو جا۔

مولوی صاحب حیرت میں رہ گئے۔ گھر کے جاہل لوگوں کو بتلایا کہ اس کو تو جنت کی بشارت دی جا رہی ہے۔ اس کے اعمال کیا تھے جن کے بدلے میں اس کو یہ نعمت ملی۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو بالکل بے عمل بلکہ بدعمل عورت تھی۔ مولوی صاحب نے فرمایا غور کرو اس کا کوئی اچھا عمل اللہ کے نزدیک مقبول ہو گیا ہے' وہ کیا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد لوگوں نے بتلایا کہ اس کی خاص عادت یہ تھی کہ جب اذان ہوتی تو سب کام چھوڑ دیتی اور اذان کی طرف متوجہ ہو کر سنتی تھی۔ دوسروں کو بھی اس وقت بولنے نہیں دیتی تھی۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نام کی یہ عزت کرنا ہی اس کے کام آگیا جس نے دوسری برائیوں پر پانی پھیر دیا۔

اللہ جل شانہ کی اس رحمت عامہ کا یہ واقعہ نقل فرمانے کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے رحمت الہیہ کے متعلق انشا کا یہ شعر بہت پسند ہے۔۔

تصدق اپنے خدا کے جاؤں کہ مجھ کو آتا ہے پیار انشا
ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے یہ دمبدم عنایت

احقر جامع کہتا ہے کہ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد برزخ میں سب کی زبان خود بخود عربی ہو جائے گی کیونکہ وہی انسان کے وطن اصلی یعنی جنت کی زبان ہے۔ اسی میں اللہ کی سب کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ پھر انبیاء نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے امت کو سنائے ہیں۔ (کذا فی الاتقان للسیوطی)

دوسرے واقعہ کا عنوان ہے' حضرت قرشی کی ایک کرامت۔۔۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے:۔

جامع کرامات الاولیاء' طبع مصر میں ایک عجیب واقعہ حضرت قرشی مجذومؒ کا نقل کیا ہے کہ یہ بزرگ ولی اللہ جذامی تھے۔ اسی لئے نکاح نہیں کرتے تھے کہ دوسروں کو تکلیف ہوگی۔ مگر جوان تھے۔ طبعی تقاضے موجود تھے۔ ایک روز اس تقاضے کی بنا پر مریدوں کو کہا کہ اب ہم نے نکاح کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آپ پیغام دیں مگر اس

طرح کہ ہمارا پورا حال بیان کر دو۔ اگر کوئی عورت ان حالات کے باوجود نکاح کے لئے تیار ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ صبر کریں گے۔

ایک مرید اٹھا اور اپنے گھر گیا۔ اس کی ایک جوان بیٹی تھی' اس سے پیر صاحب کا پورا حال بیان کر کے نکاح کے متعلق پوچھا۔ لڑکی نے خوشدلی سے کہا کہ میں راضی ہوں۔ یہ مرید خوش ہو کر واپس آیا اور قرشی مجذومؒ سے کہا کہ میری لڑکی راضی ہے۔ آپ نے پھر پوچھا کہ تم نے اس کے سامنے میری پوری حالت بیان کر دی تھی یا نہیں؟ اس نے کہا' بالکل واضح کر کے بتلا دی تھی' مگر لڑکی نے کہا کہ میں ان کی خدمت گزاری کو دینی سعادت سمجھ کر قبول کرتی ہوں۔ چنانچہ نکاح ہو گیا۔

قرشیؒ صاحب کرامات و تصرفات تھے۔ لڑکی کی اس بلند حوصلگی کو سن کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ جب میں اس کے پاس جاؤں تو میری صورت تندرست اور حسین ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ جب گھر میں تشریف لے گئے تو ایک جوان رعنا کی صورت میں تھے۔ لڑکی نے ان کو دیکھ کر پردہ کر لیا اور کہا کہ تم کون ہو؟ قرشی مجذومؒ نے کہا کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ لڑکی نے جواب دیا کہ وہ تو مجذوم ہیں' تم وہ نہیں ہو۔ تب حضرت قرشی نے واقعہ کرامت کا ذکر کر کے بتلایا کہ اب میں جب بھی تمہارے پاس آؤں گا اسی صورت میں آؤں گا۔

لڑکی کی عالی حوصلگی دیکھئے۔ اس نے جواب دیا کہ افسوس! آپ نے میری نیت اور اس کے ثواب کو برباد کر دیا۔ میں نے آپ سے نکاح محض معذور سمجھ کر خدمت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے کیا تھا' دنیوی راحت اور خواہش نفسانی کے لئے نہیں۔ اب اگر اپنی اصلی صورت میں مجھے ملنا چاہتے ہیں تو میں خادمہ ہوں ورنہ مجھے طلاق دے دیجئے۔ حضرت قرشی یہ سننے کے بعد اپنی اصلی ہیئت و صورت میں آ گئے اور لڑکی ان کے ساتھ اسی حالت میں رہنے لگی۔

حکیم الامت' حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ارشاد فرمانے والے' مرتب کرنے والے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم' اور رسالہ کے مدیر' مولانا محمد تقی صاحب عثمانی۔

فبای الاء ربکما تکذبان

(اپریل ۱۹۷۰ء)

۸۔ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کی بیان کردہ کرامت

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور ممتاز عالم دین' مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اپنی خود نوشت سوانح حیات "نقش حیات" کی جلد دوم میں لکھتے ہیں:۔

(اسی تھانہ بھون کا دوسرا واقعہ) تینوں حضرات (حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب' مولانا گنگوہی' مولانا نانوتوی رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا ہے اور گرفتار کنندہ کے لئے صلہ (انعام) تجویز ہو چکا ہے۔ لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے ہیں۔ اور حضرت حاجی صاحب راؤ عبداللہ خاں رئیس تھانہ بھون کے اصطبل خانہ کی اندھیری کوٹھڑی میں مقیم ہیں۔ چاشت کی نماز کا وقت ہے (یعنی ۹ یا ۱۰ بجے صبح کا)۔ ایک روز اسی کوٹھڑی میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادہ سے مصلیٰ بچھایا اور جاں نثار حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں۔ راؤ عبداللہ خاں اعلیٰ حضرت کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید ہیں۔ گھر کے خوشحال زمیندار اور سرکار کے نزدیک باوجاہت شخص سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ حضرت پر جو الزام لگایا گیا ہے' اس کے قائم ہوتے ہوئے حضرت کے لئے اپنا مکان کھول دینا دنیاوی حیثیت سے کس درجہ خطرناک ہے۔ کیونکہ باغی کی اعانت بھی سرکاری بغاوت میں شمار ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی غلبہ حب دین اور فرط عشق میں اس درجہ مغلوب تھے کہ نہ مال کی پروا تھی نہ جان کی۔ خدا کی شان کہ جس وقت راؤ عبداللہ خاں حضرت کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھڑی سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازہ کے قریب پہنچے ہیں' تو سامنے سے دوش کو آتے دیکھا اور ہکا بکا کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ خدا جانے مخبر کون تھا اور کس بلا کا پتلا تھا جس نے عین وقت پر روپوشی کی کوٹھڑی تک معین کر دی تھی۔ چنانچہ دوش اصطبل کے پاس پہنچی اور افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں' گویا اپنے آنے کی وجہ کو چھپایا۔ جہاں دیدہ و تجربہ کار راؤ صاحب دور ہی سے تاڑ گئے تھے کہ "ایں گل دیگر شگفت" مگر "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔" اپنی جان یا عزت کے جانے' ریاست و زمینداری کے ملیامیٹ ہونے اور ہتھکڑیاں پڑ کر جیل خانہ پہنچنے یا پھانسی پر چڑھ کر عالم آخرت کا سفر کرنے کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ مگر فکر و رنج یا حزن و افسوس تھا تو یہ کہ ہائے غلام کے گھر سے اور آقا گرفتار ہو اور عبداللہ خاں کے گھر میں اس کا جان سے زیادہ عزیز شیخ پابہ زنجیر کیا جائے' مگر اس کے ساتھ ہی راؤ صاحب ایک جواں مرد' مستقل مزاج ' نہایت دلیر' قوی القلب راجپوت تھے۔ تشویش کو دل میں دابا اور چہرہ یا اعضا پر کوئی بھی اثر اضطراب کا محسوس نہ ہونے دیا۔ مسکرا کر جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ دوش کا افسر گھوڑے سے اترا اور یہ کہہ کر کہ میں نے آپ کے یہاں ایک گھوڑے کی تعریف سنی ہے اس لئے بلا اطلاع یکایک آنے کا اتفاق

ہوا۔ اصطبل کی جانب قدم اٹھائے۔ راؤ صاحب بہت اچھا کہہ کر ساتھ ہو لئے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔ افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نگاہ جماتا اور اس درجہ مطمئن پاکر کبھی مخبر کی دروغ گوئی کا غصہ اور گاہے اپنی ناکامی و تکلیف سفر کا افسوس لاتا تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اس حجرہ کی طرف بڑھا جس میں اعلیٰ حضرت کی سکونت کا مخبر نے پورا پتہ دیا تھا اور یہ کہہ کر کہ "اس کوٹھری میں کیا گھاس بھری جاتی ہے" اس کے پٹ کھول دیئے۔ راؤ عبداللہ خاں کی اس وقت جو حالت ہوئی ہوگی' وہ انہی کے دل سے پوچھا چاہیے۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلہ کا وقت آگیا اور پیمانہ حیات لبریز ہو کر اچھلا چاہتا ہے۔ اس لئے راضی برضاء الٰہی ہو کر جی ہاں کہا اور حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔ خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھئے کہ جس وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے' تخت پر مصلیٰ ضرور بچھا ہوا تھا۔ لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بکھرا ہوا پڑا تھا' مگر اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا پتہ بھی نہ تھا۔ افسر متحیر و حیران اور راؤ عبداللہ خاں دل ہی دل میں شیخ کی عجیب کرامت پر فرحاں و شاداں۔ کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ دریافت کرتا ہے نہ استفسار۔ کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی ادھر۔ آخر مخبر کی دھوکا دہی سمجھ کر بات کو ٹالا اور کہا کہ خاں صاحب! یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے۔ راؤ صاحب بولے' جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور وضو میں منہ ہاتھ دھویا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپ کے آنے سے دس منٹ قبل اسی کی تیاری تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا' آپ لوگوں کی نماز کے لئے تو مسجد ہے یا اصطبل کی کوٹھری۔ راؤ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ جناب مسجد فرض نماز کے لئے ہے اور نفل نماز ایسی ہی جگہ پڑھی جاتی ہے جہاں کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ جواب لاجواب سن کر افسر نے پٹ بند کر دیئے اور اصطبل کے چاروں طرف غائر نظر دوڑانے کے بعد باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو' یہ کلمات کہہ کر رخصت ہوا "راؤ صاحب! معاف کیجئے' آپ کو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑی اور پھر بھی ہمیں کوئی گھوڑا پسند نہ آیا"۔ راؤ عبداللہ خاں کی نظر سے دوش کے سوار جب اوجھل ہوئے تو واپس ہوئے اور کوٹھری کھول دی۔ دیکھا کہ اعلیٰ حضرت سلام پھیر چکے اور مصلے پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔"

(امداد المشتاق' ص ۲۹'۳۰ از تذکرۃ الرشید' ص ۷۶)

(فروری ۱۹۷۵ء)

باب ششم

علوم سائنس اور قرآن

۱۔ سائنس کیسے مسلمان ہوگی؟

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آجکل پاکستانی اخبارات میں ایک تحریک چلائی جا رہی ہے جس کا منشاء یہ ہے کہ سائنس کو مسلمان کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ مثلاً" یہ کہنے کے بجائے کہ دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن کے ملنے سے پانی کا ایک قطرہ بن جاتا ہے' یہ کہا جائے کہ

جب دو حصے ہائیڈروجن کے ساتھ ایک حصہ آکسیجن مل جائے تو خدا اس سے ایک قطرہ پانی پیدا کرتا ہے۔

اس طرح سائنس مسلمان ہو جائے گی۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

طلوع اسلام

جب کسی کشتی کا لنگر نہ رہے تو پانی کی لہریں اور ہوا کے جھونکے اسے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر لئے پھرتے ہیں اور اس کے کہیں پاؤں ہی نہیں ٹکتے۔ یہی حالت ہم پاکستانیوں کی ہو رہی ہے۔ اس مملکت کی کشتی کا لنگر قرآن کریم کو بننا تھا۔ اس کا یہ لنگر بن نہیں سکا اور اب یہ موجوں کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر --- ڈانواں ڈول پھر رہی ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اس کی اسی بے بسی کی آئینہ دار ہیں۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات کا نظم و نسق خدا کے مقررہ کردہ اٹل قوانین کے مطابق چل رہا ہے۔ سائنس' ان قوانین کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے اور اس کا طریق تجرباتی ہے۔ تجرباتی طریق کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک مفروضہ کو بطور نظریہ اپنے سامنے رکھ کر اس پر عمل شروع کرتی ہے۔ کچھ عرصہ کی تگ و تاز کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ وہ پھر دوسرا نظریہ لے کر اس کے پیچھے چلنے لگ جاتی ہے۔ اس طرح بار بار کی کوشش (TRAIL AND ERROR) کے ذریعے' کسی ایک قانون کو دریافت کر لیتی ہے۔ وہ اس طرح فطرت سے متعلق بعض قوانین خداوندی کو حتمی طور پر دریافت کر چکی ہے اور باقیوں کے دریافت کرنے کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ قوانین کس قدر ہیں اور سائنس کو ان تک پہنچنے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔ جو قانون خداوندی اس طرح سے دریافت ہو چکا ہو' اس کے متعلق ایسا کہہ دینے میں کہ "خدا یوں کرتا ہے" کچھ حرج نہیں۔ لیکن جو انکشافات ہنوز تجرباتی عمل کے مرحلہ میں ہیں' ان کے متعلق ایسا کہنا بڑا خطرناک ہے۔ مثلاً" ہمارے متقدمین نے

(یونانی تصور کے مطابق) یہ سمجھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس تصور کو ان الفاظ میں پیش کیا کہ خدا نے زمین کو ساکن پیدا کیا ہے اور سورج کو ایسا کہ وہ اس کے گرد گردش کرے۔ بعد کی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ یہ غلط ہے۔ زمین گردش کرتی ہے۔ اب صورت یوں ہو گئی کہ

(۱) دسویں صدی میں خدا نے زمین کو ساکن پیدا کیا تھا -- اور

(۲) بیسویں صدی میں خدا نے زمین کو متحرک پیدا کر دیا۔

اب خود سوچئے کہ یہ بات کیا بنی --- ہمیں کہنا چاہیے کہ اس وقت تک سائنس کے انکشافات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ....

اور اگر کسی معاملہ میں قرآن کریم نے کسی قانون فطرت کو خود بیان کر دیا ہے تو جب سائنس کا انکشاف اس نتیجہ پر پہنچے تو ہمیں کہہ دینا چاہیے کہ اس نے حقیقت (TRUTH) کو پا لیا ہے۔

لہٰذا، "سائنس کو مسلمان" بنانے کا یہ طریقہ نہیں۔ اسے "مسلمان" کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو یہ تعلیم دیں کہ

(۱) نظام فطرت خدا کے مقرر کردہ اٹل قوانین کے مطابق کارفرما ہے۔

(۲) فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان قوانین کو دریافت کیا جائے۔

(۳) جب ہم اس طرح فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیں، تو انہیں، نوع انسانی کی بھلائی کے لئے، ان مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنا چاہیے جنہیں خدا نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے۔ اس سے سائنس مسلمان ہو جائے گی۔

لیکن اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کہہ دینے سے کہ "یہ سب کچھ خدا کرتا ہے"، ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے اور ہماری سائنس بھی مسلمان، تو یہ وہ خود فریبی ہے جس کی نقاب کشائی قرآن نے بہت پہلے کر دی تھی۔ اس میں کئی ایک مقامات پر اس قسم کی آیات آتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

> اگر ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کس کے قانون کی زنجیروں سے مسخر ہیں، تو یہ کہیں گے کہ ایسا خدا ہی کرتا ہے۔ اگر ان سے پوچھو کہ بادلوں سے مینہ کون برساتا ہے اور اس طرح زمین مردہ کو زندگی کون عطا کرتا ہے، تو یہ جواب میں کہیں گے کہ خدا ہی ایسا کرتا ہے۔ (۲۹/۶۱-۶۳)

وہ اس قسم کے شواہد پیش کرنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ لوگ اسے تو تسلیم کرتے ہیں کہ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کارفرما ہیں، لیکن جب خود اپنی زندگی کی طرف آتے ہیں تو اس میں اپنے لئے آپ قوانین وضع کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ **فانی یوفکون** --- (۲۹/۶۱) یہاں پہنچ کر تم الٹے کہاں پھر جاتے ہو؟ اپنی زندگی کو خدا کے قوانین کے تابع کیوں نہیں رکھتے؟ دوسری جگہ ہے **قل فانی تسحرون** ان سے پوچھو کہ اس مقام پر تمہیں کیا دھوکا لگ جاتا ہے؟ یاد رکھو! محض اتنا کہہ دینے سے کہ خارجی کائنات میں خدا کی کارفرمائی ہے، تم خدا پرست

نہیں بن سکتے۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ کہ اس حقیقت کو عملاً" تسلیم کیا جائے کہ **وھوالذی فی السماء الہ وفی الارض الہ** (۴۳/۸۴) -- جس طرح خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کی حکمرانی ہے' اسی طرح انسان کی ارضی زندگی میں بھی اسی کے قوانین کی حکمرانی ہونی چاہیے۔

اصل یہ ہے کہ پاکستانی مسلمان کی زندگی بڑی قابل رحم ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ ؎

ہے دل شوریدہ غالب طلسم پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر' کہ کس مشکل میں ہے

یہ حالت پاکستانی مسلمان کی ہو رہی ہے۔ اس نے پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا' لیکن اس میں اسلامی قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے سے اس کی جان جاتی ہے ---- اس سے' مذہبی طبقہ سے ان کی پیشوائیت چھنتی ہے اور "دنیادار" طبقہ سے ان کے ذاتی مفاد۔ لہذا' یہ دونوں ہی نہیں چاہتے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی ہو ------ اب یہ سانپ کے منہ میں چھپکلی والا معاملہ ہے کہ نہ نگلی جائے' نہ اگلے بنے۔ یہاں کا مسلمان' نہ اسلام سے انکار کر سکتا ہے نہ اس کے قوانین کی حکمرانی اپنے اوپر نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ شعوری اور غیر شعوری طور پر' اس قسم کے سوانگ بھرتا رہتا ہے جس سے معلوم ہو کہ یہاں اسلام کا بڑا چرچا ہے۔ لیکن درحقیقت یہاں اسلامی قوانین بار نہ پانے پائیں --- ریل کے ڈرائیور سے کہو کہ وہ انجن میں قرآن شریف کا نسخہ رکھے۔ بس کے ڈرائیور بسم اللہ پڑھ کر بس چلائیں۔ ہوائی جہاز میں یہ اعلان کرتے وقت کہ جہاز فلاں وقت فلاں جگہ پہنچے گا' انشاء اللہ کہا جائے (تاکہ جہاز کا عملہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے)۔ اوقاف کے روپے سے خانقاہوں کی مرمت کرائی جائے۔ عرس دھوم دھام سے ہوں' پیروں فقیروں کے کشف و کرامات کے قصے شائع کئے جائیں۔ دارالعلوموں کو وظائف دیئے جائیں۔ ان کے فارغ التحصیل طلباء کو یونیورسٹی کے گریجوایٹوں کے برابر تسلیم کیا جائے۔ رمضان شریف میں شراب بند کر دی جائے اور اس کے احترام میں ہوٹلوں کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے جائیں۔ شب برات پر چینی کا کوٹہ ڈیوڑھا کر دیا جائے۔ غلاف کعبہ کے جلوس نکالے جائیں۔ قرات کی مجلسیں آراستہ کی جائیں۔ قرآن شریف کو لاکھوں روپے کے صرفہ سے قیمتی ریشم کے کپڑے پر سونے کے تاروں سے لکھا جائے۔ یا ہر وزیر' اپنے عہدہ کا حلف اٹھانے کے بعد' سیدھا کسی مزار پر سجدہ ریزی کے لئے حاضر ہو اور اپنی ہر تقریر کی تان اس پر توڑے کہ تمہیں اپنے آپ کو قرآن کے پیکر میں ڈھالنا چاہیے ---- یہ سب وہ "اسلامی جھنجھنے" ہیں' جن سے قوم کے بچوں کو بہلایا جاتا ہے کہ وہ اماں کو ستائیں نہیں۔ انہی میں اب اس کا اضافہ ہو رہا ہے کہ سائنس پڑھاتے وقت یوں کہو کہ خدا یوں کرتا ہے --- اگر یہ کر دیا گیا تو سائنس اسی طرح مسلمان ہو جائے گی جس طرح' جب جماعت اسلامی نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تھا تو کہدیا تھا کہ قرارداد مقاصد پاس کرنے سے مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ ؎

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بام بلندے

(فروری ۱۹۶۷ء)

۲۔ سائنس اور ایمان بالغیب

وسط جنوری ۱۹۶۸ء میں، لاہور میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کا موضوع تھا "سائنس اور اسلام"۔ اس مذاکرہ کی کوئی تفصیلی روئداد اخبارات میں شائع نہیں ہوئی۔ البتہ پاکستان ٹائمز کے "زینو" نے (اس اخبار کی ۲۰ جنوری کی اشاعت میں) اس پر تبصرہ کیا جس سے معلوم ہوا کہ مذاکرہ میں اس اہم ترین موضوع پر نہایت سطحی سی گفتگو ہوئی۔ ہمارے ہاں، بدقسمتی سے، ہو یہ رہا ہے کہ مختلف ادارے اس قسم کے اجتماعات کا انتظام کرتے ہیں اور محض گرمی سخن کے لئے عنوانات ایسے تجویز کر دیتے ہیں جو اپنے اندر بڑی کشش اور جاذبیت رکھیں لیکن ان میں حصہ لینے والے یا تو علوم متعلقہ کے ماہر نہیں ہوتے یا وہ (جیسا کہ "زینو" نے لکھا ہے) اس بحث کے لئے تیار ہو کر نہیں آتے۔ نتیجہ یہ کہ ایسے مذاکرات ذہنوں پر بڑا غلط اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر زیر نظر مذاکرہ کے موضوع --- سائنس اور اسلام --- کو لیجئے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اس میں شرکت کرنے والے حضرات، ایک طرف علوم سائنس کے ماہر ہوں اور دوسری طرف حقیقی اسلام پر بھی ان کی نگاہ بڑی غائر اور عمیق ہو۔ اس کے بعد یہ ممکن تھا کہ مذاکرہ کوئی مثبت نتیجہ مرتب کر سکتا، لیکن جو کچھ "زینو" نے لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (سوائے ایک آدھ کے) شرکائے مذاکرہ نے موضوع کے متعلق تو کوئی بنیادی بات نہ کی، البتہ اپنی اپنی پوزیشن کی مدافعت کرتے رہے۔

اس کے بعد، ۳۱ جنوری ۱۹۶۹ء کے پاکستان ٹائمز میں، ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب کی طرف سے ایک خط شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ہمیں "سائنس اور اسلام" کی بحث ہی نہیں چھیڑنی چاہیے کیونکہ ان دونوں میں کوئی تعلق ہی نہیں۔ "زینو" نے اس خط کا نہایت اچھا تعاقب اپنے اس تبصرہ میں کیا ہے جو ۲ فروری ۱۹۶۹ء کے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک دو ایک نکات ایسے ہیں جو مزید وضاحت چاہتے ہیں اور ان سطور کی تحریر کا جذبہ محرکہ یہی ہے۔

------- ☆☆ ------

ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط کے شروع میں لکھا ہے۔

> لیکن یہ مناسب نہیں کہ ہم سائنس اور اسلام میں باہمد گر تعلق پیدا کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے ماننے والے ایک مافوق الفطرت حقیقت پر ایمان رکھیں جسے قرآن نے ایمان بالغیب کہہ کر پکارا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایمان کا ترجمہ (FAITH) کیا ہے اور غیب کا ترجمہ (UN-SEEN) اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ

(ا) سائنس صرف عالم محسوس (یا عالم مشہود) سے بحث کرتی ہے اور وہ اپنے ہر دعویٰ کو علم اور تجربہ کی بنیادوں پر

پیش کرتی اور دلائل و براہین کی رو سے منواتی ہے۔ اس کے برعکس'

(۲) اسلام غیر مرئی حقیقتوں (عالم غیب) پر ایمان کی دعوت دیتا ہے اور

(۳) ایمان سے مراد ہے پیش کردہ صداقتوں کو بلا علم و عقل صحیح تسلیم کر لینا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بنیاد ہی غلط ہے اور اسے استوار کیا گیا ہے اسلام کے اس تصور پر جو (اقبال کی اصطلاح میں) "ایلہان مسجد" کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اور جسے بلا تنقید صحیح تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ تصور قرآن کا پیش کردہ نہیں' انسانوں کے خود ساختہ مذہب کا وضع کردہ ہے۔ اور جب اسلام کو (جو دین ہے) مذہب تصور کر لیا جائے تو اس میں اور دیگر مذاہب' مثلاً" عیسائیت' یہودیت' ہندومت وغیرہ میں بنیادی طور پر کچھ فرق نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط کے اخیر میں لکھا ہے کہ :-

> اسلام ایک فوق الفطرت حقیقت پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جو ایک عبد مومن (BELIEVER) کو جذباتی طور پر اس طرح متاثر کرتا ہے کہ وہ اس فوق الفطرت حقیقت کے حضور ایسی رسومات ادا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے' جن پر دلیل و برہان کی رو سے تنقید نہیں کی جا سکتی۔

سب سے پہلے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کریم کی رو سے "ایمان" کسی صداقت کو بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے مان لینے کا نام نہیں۔ اس کے نزدیک' کسی دعویٰ کو علم و عقل کے رو سے پرکھ کر' قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ ' علیٰ وجہ البصیرت صحیح تسلیم کرنے کو ایمان کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ

> **والذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخرو علیھا صما وعمیانا** (۲۵/۷۳)
>
> یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) آیات خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو ان پر بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے (انہیں عقل و فکر کی رو سے قبول کرتے ہیں)۔

وہ ارباب علم و عقل اور اہل ایمان کو مرادف المعنی قرار دیتا ہے' جب کہتا ہے کہ **فاتقوا اللہ یا اولی الالباب الذین امنوا** (۶۵/۱۰) اے ارباب عقل و فکر' یعنی اے ایمان والو! تم خدا کا تقویٰ اختیار کرو۔ فوق الفطرت حقیقتوں میں' سب سے سرفہرست اللہ کی ہستی ہے۔ اس کے متعلق رسولؐ اللہ سے کہا گیا کہ اعلان کر دو کہ **ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی** (۱۲/۱۰۸)- میں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ اب ظاہر ہے کہ جو دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جائے گی اسے بہرحال عقل و فکر اور دلائل و براہین کی رو ہی سے مانا جائے گا۔

فوق الفطرت (غیر مرئی) حقیقتوں میں دوسرا مقام حیات بعد الممات کا ہے' جسے آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ **کذالک یبین اللہ لکم الایات لعلکم تتفکرون فی الدنیا والاخرۃ**

(۲۲۰-۲/۲۱۹) اس طرح خدا تمہارے سامنے واضح "علامات" لاتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غوروفکر کر سکو۔ (محسوس علامات سے غیر مرئی حقیقتوں تک کیسے پہنچایا جاتا ہے' اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر عرض کریں گے۔ سردست آپ یہ دیکھئے کہ) قرآن کریم نے دنیائے محسوسات کے متعلق ہی نہیں' بلکہ اس کے ساتھ "آخرت" کے متعلق بھی غوروفکر سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ لہٰذا' قرآن کی رو سے' آخرت پر ایمان بھی اندھی عقیدت کی بناء پر نہیں لایا جاتا۔ اس صداقت کو غوروفکر کے بعد تسلیم کیا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان' کسی حقیقت کو بلا سوچے سمجھے' اور بلا دلیل و برہان' مان لینے کا نام نہیں۔ یہ' علم و بصیرت کی بناء پر صداقت پر یقین محکم کا نام ہے۔ ایمان کا ترجمہ (FAITH) نہیں۔ (CONVICTION) کا لفظ اس کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم قرآنی اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی کے ان الفاظ سے کر دیتے ہیں جو اس نے عیسائیت کے پیش کردہ تصورات کے لئے وضع کئے تھے۔ اس سے قرآن کا سارا مفہوم بدل جاتا ہے۔ اور تو اور' ہم نے اسلام کو بھی ایک (RELIGION) قرار دے رکھا ہے حالانکہ اسلام (RELIGION) نہیں' دین ہے اور دین کے لئے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں۔

"ایمان بالغیب" میں دوسرا لفظ غیب ہے جس کا ترجمہ(UN-SEEN)کیا جاتا ہے' قرآن کریم نے یہ لفظ (غیب) شہادۃ کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ اس لئے غیب' نامشہود کو کہیں گے۔ لیکن نامشہود کی دو شقیں ہیں۔ ایک تو وہ نامشہود حقیقتیں ہیں جو کبھی مشہود ہو کر سامنے نہیں آسکتیں جیسے ذات خداوندی۔ لیکن مشہود کی دوسری قسم ایسی حقیقتیں ہیں جو اگر آج غیر مشہود ہیں' تو ہو سکتا ہے کہ کل کو' جب انسان کا علم اور آگے بڑھے' وہ مشہود ہو جائیں۔ مثلاً" قرآن کریم' اقوام گزشتہ اور انبیاء سابقہ کے بعض حالات بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ **ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک** (۳/۴۴) یہ وہ "غیب" کی خبریں ہیں جنہیں ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں' تاریخ نے ہنوز ان واقعات پر پڑے ہوئے پردے نہیں اٹھائے تھے۔ اس لئے ان کا تعلق "غیب" سے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جب تاریخی انکشافات مزید ترقی کریں تو یہ واقعات تاریخ کے مشہود حقائق بن کر سامنے آجائیں۔ اس زمرہ میں فطرت کی وہ قوتیں بھی آجاتی ہیں جو ایک وقت میں نامشہود ہوتی ہیں لیکن جب علم انسانی آگے بڑھتا ہے تو وہ مشہود ہو جاتی ہیں۔ نامشہود کے مشہود ہونے کا یہی وہ طریق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

سنریھم ایا تنا فی الا فاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق (۴۱/۵۳)

ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ صداقت پر مبنی ہے۔

"غیب" کی ایک اور قسم بھی ہے جس کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ طبیب آپ کو ایک نسخہ لکھ کر دیتا ہے جو بڑا

بھی ہے اور اس کا تیار کرنا بھی بڑا دقت طلب ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسے پرہیز تجویز کرتا ہے جن سے آپ کو اپنے آپ پر کڑی پابندیاں عائد کرنی پڑتی ہیں۔ آپ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس نسخہ کے استعمال اور طبیب کی ہدایات پر عمل کرنے سے آپ کو شفا ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ کو طبیب کی صداقت پر ایمان ہے تو آپ ان تمام مشقتوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ اس کے بعد' نتائج بتا دیں گے کہ حکیم صاحب نے جو کچھ کہا تھا' بالکل ٹھیک تھا۔ لہٰذا' کسی فارمولا' کسی قانون' کسی ہدایت کے ان دیکھے نتائج پر یقین کرنے کا نام بھی ایمان بالغیب ہے۔ یہ غیب' نتائج سے مشہود بن جاتا ہے۔ دنیائے انکشافات کی ساری عمارت اسی ایمان بالغیب پر استوار ہوتی ہے۔

------ ☆ ☆ -------

اب آیئے سائنس کی طرف۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ

(۱) سائنس میں ایمان کو کوئی دخل نہیں۔ اور

(۲) سائنس کا تعلق صرف ان اشیاء سے ہے جنہیں عام طور پر "محسوسات" سمجھا جاتا ہے۔

علوم سائنس کی ساری بنیاد ان اساسی قوانین پر استوار ہوتی ہے جنہیں (AXIOMS) کہا جاتا ہے۔ ان قوانین کے متعلق کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کیوں ایسے ہیں' کائنات میں کیسے موجود ہیں اور کہاں سے آگئے ہیں۔ ان کے متعلق یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ موجود ہیں اور ایسے ہیں۔ انسان کو ان کا علم کیسے ہوا' اس کے متعلق مختلف نظریئے ہیں۔ ایک نظریہ کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قوانین خود انسان کی فطرت کے اندر موجود ہیں۔ دوسرے نظریہ کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان نے تجربات کے بعد انہیں دریافت کیا ہے۔ یہ دریافت کیسے بھی ہوئے ہوں' یہ حقیقت ہے کہ ان کے ایسا ہونے کے متعلق کوئی دلیل یا توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ بس یہ ایسے ہیں اور انہیں ایسا تسلیم کرنا ہوگا۔ ان قوانین پر ایمان لائے بغیر' سائنٹسٹ ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔

قانون کا سرچشمہ عالم نامشہود ہوتا ہے اور اس کے نتائج محسوسات کے پیکروں میں سامنے آتے ہیں۔ اس لئے قانون پر ایمان' نامحسوسات پر ایمان لانا ہے۔ اور اب تو سائنس ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھتے ہیں ان کی اصل و بنیاد غیر مرئی اور غیر محسوس دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ اب مادہ (MATTER) سمٹ کر توانائی محض (PURE ENERGY) بن کر رہ گیا ہے جو یکسر نامحسوس ہے۔ سر آرتھرایڈنگٹن ہمارے دور کا ایک عظیم عالم طبیعات گزرا ہے۔ وہ اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD) میں اس باب میں لکھتا ہے۔

> میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ سائنس کو اب اس امر پر اصرار نہیں رہا کہ حقیقت عبارت ہے محسوسیت سے۔ یوں بھی جہاں تک اس کے لغوی معنوں کا تعلق ہے' مادیت کا عرصہ ہوا خاتمہ ہو چکا ..... اب دنیائے سائنس کا رجحان اس طرف نہیں

> کہ ہر شے کو مادہ ہی کی ایک شکل قرار دیا جائے۔ مادہ کا رتبہ جہان طبیعات سے بہت نیچے گر گیا ہے۔ اس کا رجحان یہ ہے کہ ہر شے کو قانون فطرت کے عمل در آمد ہی کی ایک شکل ٹھہرائے اور قانون فطرت سے مراد کچھ ایسے قوانین ہیں جیسے ہندسہ' میکانیت اور طبیعات میں رائج ہیں ..... قانون سائنس کی یہی ہمہ گیر سیادت ہے جس کو آج کل مادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ص ۳۲-۳۱)

لہٰذا' سائنس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کا تعلق ان اشیاء سے ہے جنہیں ہم عام طور پر "محسوسات" کہتے ہیں' فرسودہ خیال ہے۔ سائنس' درحقیقت حصول علم یا ادراک حقیقت کے ایک خاص طریق کا نام ہے۔ اس طریق کی عمارت ان بنیادوں پر اٹھتی ہے کہ

(۱) یہ سارا سلسلہ کائنات' غیر متبدل قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

(۲) محسوس اشیاء کے مطالعہ اور مشاہدہ سے ان قوانین کی صداقت کا علم حاصل ہو جاتا ہے اور

(۳) جب اور جہاں ان قوانین پر عمل کیا جائے گا' وہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ سائنس کی یہ بنیادیں خود قرآن کی مہیا کردہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

> **وسخر لکم مافی السموت وما فی الارض جمیعا منہ** (۴۵/۱۳)
>
> کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' اسے ہم نے تمہارے لئے قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

اب رہا ان قوانین کو دریافت کرنے کا طریقہ' تو اس کے لئے قرآن نے "علم" کو لائینفک قرار دیا ہے۔ علم کی (DEFINITION) اس کے نزدیک کیا ہے' یہ بڑے غور سے دیکھنے کی چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> **ولا تقف مالیس لک بہ علم ط ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا** (۱۷/۳۶)
>
> جس بات کا تمہیں علم نہ ہو' اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت' بصارت اور قلب' ہر ایک سے اس کی بابت پوچھا جائے گا۔

آپ سوچئے کہ کیا "علم" کی یہ (DEFINITION) بعینہ وہی نہیں جسے سائنس پیش کرتی ہے۔ سماعت و بصارت سے مراد ہیں انسانی حواس (SENSES)_ ہمارے حواس' اشیائے کائنات کے متعلق معلومات (DATA) فراہم کرتے ہیں اور انسانی قلب (MIND) ان معلومات سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس کو سائنٹیفک طریق حصول علم کہا جاتا ہے۔ باقی رہا اس بات کا ٹسٹ کہ جس نتیجہ پر انسان پہنچا ہے وہ صحیح ہے یا غلط' تو قرآن نے اس کے لئے (PRAGMATIC TEST) تجویز کیا ہے۔ یعنی تم اس پر عمل کرو' نتائج خود بخود اس کی صحت و سقم کا ثبوت بہم پہنچا دیں گے۔ چنانچہ قرآن کریم میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ دین کا پروگرام پیش کر دینے کے بعد، آپ اپنے مخالفین سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اس کی صداقت پر اس طرح یقین نہیں کرتے تو اس کا دوسرا طریق یہ ہے کہ

یقوم اعملوا علی مکانتکم انی عامل ج فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبتہ الدار (۶/۱۳۶)

اے میری قوم! تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کئے جاؤ، میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ انجام کس کا اچھا ہوتا ہے۔

آپ دیکھئے کہ کیا حصول علم کا یہ طریق اور اس کی صحت کے پرکھنے کا یہ معیار، بعینہ وہی نہیں جسے آج سائنٹیفک طریق انکشافات کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن "علماء" کہتا ہی انہیں ہے جنہیں آج کی اصطلاح میں (SCIENTISTS) سائنس دان کہا جاتا ہے۔ سورہ فاطر میں ہے۔

کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا بادلوں سے بارش برساتا ہے تو اس سے انواع و اقسام کے پھل اور فصلیں اگتی ہیں۔ پھر پہاڑوں پر غور کرو کہ ان کی چٹانوں پر کس طرح رنگا رنگ کے خطے ہوتے ہیں، کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ۔

اور اسی طرح انسانوں، مویشیوں اور دیگر جاندار مخلوق کی بھی کتنی ہی قسمیں ہیں۔ (یہ حقائق تو سب کے سامنے ہوتے ہیں لیکن) ان کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت سے غوروخوض کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں "علماء" کہلانے کا حق ہے۔ (۳۵/۲۷-۲۸)

فطرت کے ان محسوس حقائق و شواہد کو قرآن نے "آیات" کہہ کر پکارا ہے اور اس میں ایک عظیم نکتہ پوشیدہ ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ غیر مرئی اور غیر مشہود حقیقتیں، محسوس طور پر ہمارے سامنے نہیں آسکتیں۔ ان کے ادراک کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ محسوس مظاہر (علامات) پر غوروفکر سے انسان غیر مرئی حقائق کے متعلق علم حاصل کرے۔ آپ رات کے وقت کسی صحرا میں کھڑے ہوں جہاں آبادی کا نام و نشان تک نہ ہو۔ آپ کو دور کہیں آگ نظر آئے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیں گے کہ وہاں کوئی انسان ہے۔ آگ اور انسان میں بظاہر کوئی تعلق نہیں، لیکن آگ علامت بنتی ہے اس امر کی کہ وہاں انسان ہے۔ اسی کو آیت کہتے ہیں۔ فطرت کے محسوس مظاہر، آیات بنتے ہیں فوق الفطرت نامشہود حقیقتوں کے۔ اسی سے ذہن انسانی کا رخ عالم مشہود سے عالم غیب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح طبیعی دنیا کے متعلق خدا کے مقرر کردہ اٹل قوانین ہیں، اسی طرح خود انسانی دنیا کے متعلق بھی غیر متبدل قوانین ہیں۔ جس طرح طبیعی دنیا کے قوانین کی پابندی سے تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی سے تخریب ہوتی ہے، اسی طرح انسانی دنیا سے متعلق قوانین کے مطابق نظام معاشرہ متشکل کرنے سے انسانیت آگے بڑھتی ہے اور ان کی خلاف ورزی سے اس کا ارتقاء رک جاتا ہے جس کا نتیجہ

فساد ہوتا ہے۔ قوانین فطرت کی طرح، انسانی زندگی سے متعلق قوانین بھی، انسانوں کے خود ساختہ نہیں، خدا ہی کے متعین فرمودہ ہیں۔ چونکہ مشاہدہ، مطالعہ اور تجربہ کی رو سے قوانین کے انکشاف میں بڑا لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے، اس لئے انسانی مشقت کو کم کرنے کے لئے، انسانی زندگی سے متعلق قوانین بذریعہ وحی عطا کر دیئے گئے۔ قوانین فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین میں یہ فرق، صرف ان معنوں میں ہے کہ ان کا علم کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کے سمجھنے اور پرکھنے کا طریقہ ایک ہی ہے، یعنی دونوں کو غور و فکر اور علم و بصیرت کی رو سے سمجھا جاتا اور عملی نتائج کے ذریعے پرکھا جاتا ہے۔ مغرب کی غلط نگہی یہ تھی (اور ہے) کہ اس نے قوانین فطرت کی اہمیت پر تو اس قدر زور دیا لیکن انسانی زندگی کے متعلق قوانین کو یکسر نظر انداز کر دیا اور معاشرہ کو اپنے خود ساختہ قوانین کے مطابق متشکل کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ وہ جہنم ہے جس میں دنیا اس وقت مبتلائے عذاب ہے۔ قرآن نے قوانین فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین دونوں کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ان کے امتزاج کا نام الدین ہے۔ ہم الدین کی (DEFINITION) ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ

> فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار خداوندی کے مطابق صرف کرنے کا نام الدین ہے

اس سے ظاہر ہے کہ قوانین فطرت (علوم سائنس) اور مستقل اقدار (وحی) کو الگ الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر ان میں ثنویت (DUALITY) پیدا کر دی جائے تو اس کا جو نتیجہ مرتب ہوگا اسے قرآن کے الفاظ میں سنئے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

> کیا تم الکتاب (ضابطہ قوانین) کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور اس کے دوسرے حصہ سے انکار کرنا چاہتے ہو؟ یاد رکھو! تم میں سے جو بھی ایسا کرے گا، اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیاوی زندگی میں ذلیل ہوگا اور اخروی زندگی میں شدید ترین تباہی میں مبتلا۔ (۲/۸۵)

سیکولر تصور حیات میں قوانین فطرت پر ایمان لایا جاتا ہے اور مستقل اقدار سے کفر برتا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

"مذہب" میں قوانین فطرت سے کفر برتا جاتا ہے اور (بزعم خویش) وحی خداوندی پر ایمان لایا جاتا ہے - اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔

اور دین میں قوانین فطرت اور مستقل اقدار خداوندی، دونوں پر ایمان لایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے لئے تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال پیچھے پلٹانا ہوگا۔

مغرب نے مستقل اقدار خداوندی کو فراموش کر رکھا ہے اور مسلمان صدیوں سے "مذہب" کا پیرو بن چکا ہے۔ دین نہ وہاں ہے نہ یہاں۔ (یہ قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے) جب تک انسان، دین پر عمل نہیں کرتا، انسانیت تباہیوں

سے نہیں بچ سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے' جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ ۔

مغرب زتو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

(مارچ ۱۹۶۸ء)

۴۔ کیا زمین متحرک ہے؟

ضلع پشاور سے ایک صاحب نے حسب ذیل استفسار بھیجا ہے۔

۱۔ موجودہ سائنس کہتی ہے کہ زمین گول ہے اور گھومتی ہے اور یہ کہ سورج ساکن ہے لیکن قرآن پاک میں لکھا ہے کہ سورج اپنی منزلیں طے کرتا ہوا ایک جھیل میں غیب ہو جاتا ہے۔ غالباً" جہاں ذوالقرنین کا قصہ ہے وہاں ہی یہ سب کچھ لکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ سائنس دان کہتے ہیں کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ کبھی چاند چھوٹا ہو جاتا ہے اور کبھی بڑا ہو جاتا ہے۔

مہربانی فرما کر اس سارے معاملہ پر ایک مفصل مضمون لکھیں اور بہتر ہو گا کہ آپ اس کو طلوع اسلام میں چھاپ دیں۔ اس پر لوگوں میں بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس کے متعلق ہمارے سکولوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے' قرآنی حقائق کے خلاف ہے۔ لہٰذا' اس سے متعلق نصاب کو بدلنا چاہئے۔

طلوع اسلام

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں کہ اس میں اس قسم کے امور کی تفصیل دی گئی ہو۔ لیکن وہ چونکہ اس خدا کی کتاب ہے جو خالق کائنات ہے' اس لئے اس میں اگر کسی جگہ ضمناً" ایسے امور کا ذکر آگیا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ حقیقت کے خلاف ہو۔

قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ سورج اپنی منزلیں طے کرتا ہوا ایک جھیل میں غائب ہو جاتا ہے۔ اس نے ذوالقرنین کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب اس نے مغرب کی طرف رخ کیا تو ساحل سمندر (بحیرہ اسود) تک جا پہنچا۔ وہاں تاحد نگاہ پانی ہی پانی تھا۔ اس لئے اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج سمندر میں غروب ہو رہا ہے۔ سمندر کے کنارے ایسے ہی نظر آیا کرتا ہے (۱۸/۸۶)۔

باقی رہا چاند اور سورج کا معاملہ' سو ان کے متعلق سورۃ یٰسین میں ہے **والشمس تجری لمستقر لھا ذالک تقدیر العزیز العلیم** (۳۶/۳۸) سورج اپنے مقررہ راستہ پر چلتا ہوا اپنے مستقر کی طرف جا رہا ہے۔ یہ اس خدا کے

مقرر کیے ہوئے پیمانے (قوانین فطرت) ہیں جو بڑے غلبہ اور علم کا مالک ہے۔ **والقمر قدرنٰہ منازل** (۳۶/۴۰) چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔ حتیٰ کہ تمام اجرام فلکی کے متعلق ہے **کل فی فلک یسبحون** (۳۶/۴۰)۔یہ سب اپنے اپنے مدار (ORBIT) میں تیزی سے تیر رہے ہیں۔ شمس اور قمر دونوں کے متعلق **دائبین** کہا (۱۴/۳۳) یعنی مسلسل حرکت میں رہنے والے۔

جہاں تک روشنی کا تعلق ہے' قرآن کریم میں ہے **جعل الشمس ضیاء والقمر نورا** (۱۰/۵)۔ ضیاء اور نور دونوں کے معنی روشنی کے ہیں۔ لیکن آئمہ لغت نے ان میں فرق یہ بتایا ہے کہ ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی کی ذاتی ہو اور نور اسے جو اس نے کسی سے مستعار لی ہو۔ قرآن نے سورج کی روشنی کو ضیاء سے تعبیر کیا ہے (یعنی اس کی ذاتی روشنی) اور چاند کی روشنی کو نور سے (یعنی دوسرے سے لی ہوئی روشنی)۔ سورہ الشمس میں ہے۔ **والشمس وضحھا والقمر اذا تلھا** (۹۱/۱-۲)۔ اس کے معنی ہیں چاند جو روشنی حاصل کرنے کے لئے سورج کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ چاند کی روشنی اپنی نہیں۔ وہ اسے سورج سے حاصل کرتا ہے۔

ان اشارات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ سائنس کے انکشافات نے جو کچھ اس وقت تک بتایا ہے وہ قرآن میں بیان کردہ حقائق کے مطابق ہے۔ لہٰذا' اس جہت سے اس نصاب میں تبدیلی کی ضرورت نہیں جو قرآن پر مشتمل ہو' لیکن زمین آسمان کے متعلق جو تعلیم ملا کے ہاں سے ملتی ہے' اس کی روشنی میں چاند سورج کے نہیں بلکہ سائنس کے تمام انکشافات کو دریا برد کر دینا پڑتا ہے۔ وہ ابھی تک زمین کو ساکن بتاتا ہے اور سورج کے متعلق کہتا ہے کہ وہ شام کو خدا کے عرش کے نیچے جا کر چھپ جاتا ہے جہاں سے اسے فرشتے دوسرے دن نکالتے ہیں۔ وہ سردی اور گرمی کے موسموں کے متعلق یہ تحقیق انیق پیش کرتا ہے کہ جب خدا نے جہنم کو پیدا کیا تو اس کا منہ باندھ دیا۔ جہنم نے شکایت کی کہ اس سے تو اس کا دم گھٹتا ہے۔ چنانچہ اسے اجازت دی گئی کہ وہ سال میں ایک مرتبہ سانس اندر کھینچے اور ایک مرتبہ باہر نکالے۔ جب جہنم سانس اندر کھینچتی ہے تو سردی کا موسم آجاتا ہے اور جب وہ اسے باہر نکالتی ہے تو گرمی کا موسم آجاتا ہے۔ اور قیامت یہ ہے کہ وہ ان باتوں کو اس ذات اقدس و اعظم (علیہ الصلوۃ والسلام کی احادیث بتاتا ہے جو علم انسانی کے افق بلند پر فائز تھی یا للعجب! اور جس شخص کی حمیت دینی اس کی اجازت نہ دے کہ وہ اس قسم کی باتوں کو حضورؐ کی طرف منسوب کرے' اسے منکر حدیث قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کور مادر زاد و نور آفتاب

۴۔ عالم افلاک ——— خارجی کائنات

(قرآن کریم اور روایات کی روشنی میں)

امریکہ کے خلاء نورد' چاند پر گئے' واپس آگئے اور اب وہاں کے سائنس دان ان اشیاء کا تجزیہ کرنے میں مصروف

ہیں جنہیں وہ وہاں سے ساتھ لائے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ابھی تک یہ بحثیں جاری ہیں کہ آیا انسان کے لئے ممکن بھی ہے کہ وہ چاند پر اپنے قدم رکھ سکے۔ چنانچہ اس دوران میں ہمیں متعدد استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں اس موضوع پر قسم قسم کی باتیں دریافت کی گئی ہیں ---- اور دریافت کی گئی ہیں علمی نقطہ نگاہ سے نہیں بلکہ' مذہبی زاویہ نظر سے۔ ان میں بعض استفسارات اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے بھی ہیں۔ لیکن جو کچھ پوچھا گیا ہے وہ ایسا مضحکہ انگیز ہے کہ وہ باعث حیرت بھی ہے اور وجہ ندامت بھی۔ اس سے بار بار احساس یہ ابھرتا ہے کہ

یاران تیزگام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالہ جرس کارواں رہے

ان استفسارات میں' بالواسطہ یا بلاواسطہ' قدر مشترک یہ ہے کہ اجرام فلکی کے متعلق' قرآن کریم نے کیا کہا ہے۔ اور ہم آج کی نشست میں' مختصر طور پر اسی سوال کا جواب پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے' یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کریم نہ سائنس کی کتاب ہے نہ فلکیات اس کا موضوع ہے۔ وہ سفر حیات میں انسان کو راہنمائی دیتا ہے اور ''آدمی'' کو ''انسانی سطح'' پر زندگی بسر کرنے اور اس طرح زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کا طریق بتاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے خالق کائنات' کائنات اور انسانی ممکنات کا ذکر ناگزیر ہے۔ اس میں ''ارض و سما'' کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسی ضمن میں کہا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس خدا کی کتاب ہے جو ارض و سما کا خالق اور علیم و خبیر ہے' اس لئے ہو نہیں سکتا کہ کارگہ کائنات کے متعلق کسی جہت سے بھی اس میں کوئی بات آئی ہو اور وہ حقیقت کے خلاف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے (یعنی قرآنی) دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں یہ بھی کہا ہے کہ **سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق** ہم خارجی کائنات اور انسانی دنیا (دونوں) میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تاآنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آ جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ مبنی برحقیقت ہے۔ **اولم یکف بربک انہ علی کل شی شھید** (۴۱/۵۳) یہ اس لئے کہ کائنات کی کوئی شے خدا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں اور یہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ جو کچھ کائنات کے متعلق کہے گا' حقیقت ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی علم جوں جوں رموز فطرت کو وانشگاف اور اسرار کائنات کو بے نقاب کرتا جائے گا' قرآن کی صداقت' حقیقت بن کر سامنے آتی جائے گی۔

دوسری بات یہ سمجھ لینے کے قابل ہے کہ قرآن کریم نے اپنی پہلی سورۃ میں' قصہ آدمؑ کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے تو وہ کسی فرد کی داستان نہیں بلکہ خود ''آدمی'' کے خواص' کیفیات اور ممکنات کا بیان ہے۔ اس تخلیق نو کے خلاف ملائکہ نے یہ اعتراض کیا کہ اسے کس خصوصیت کی بناء پر زمین میں صاحب اقتدار بنایا جا رہا ہے جب کہ اس کے ہیولٰی کے عناصر اس حقیقت کے غماز ہیں کہ یہ وہاں خوں ریزیاں کرے گا اور فساد انگیزیاں------ (۲/۳۰)۔ اس کے برعکس' ہم ہیں کہ **نسبح بحمدک ونقدس لک** (۲/۳۰) ''ہم تیری تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں''۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ **انی اعلم مالا تعلمون** ''ہم وہ کچھ جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے''۔ یہ

کہہ کر انہیں (معاذ اللہ) آمرانہ طریق سے خاموش نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کی وجہ بھی بتا دی گئی۔ اور وہ یہ کہ **وعلم ادم الاسماء کلھا** (۲/۳۱) آدمی میں' جملہ اشیائے فطرت کے متعلق علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اس تحصیل علم کی حیثیت محض نظری نہیں تھی۔ اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ فطرت کی قوتیں آدمی کے سامنے سجدہ ریز ہو گئیں۔ آدم مسجود ملائکہ بن گیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر یہ کہہ کر دہرایا ہے کہ **وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ** (۴۵/۱۳) ارض و سماوات میں جو کچھ ہے' خدا نے اسے اپنی طرف سے' تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ کارگہ کائنات کی ہر قوت کو مسخر کر لے۔ لہٰذا ' دنیا میں جب' جہاں اور جو انسان یا قوم' کوئی سائنٹیفک انکشاف اور اس طرح فطرت کی کسی قوت کو مسخر کرے گی تو اس کی یہ کوشش' ہمارے نزدیک درخور تبریک و تہنیت ہوگی کیونکہ اس سے ایک تو خدا کے اس دعویٰ کا عملی ثبوت سامنے آجائے گا' جسے اس نے ملائکہ کے سامنے پیش کیا تھا اور دوسرے قرآن کریم کے مبنی برحقیقت ہونے کی ایک اور دلیل واضح ہو جائے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انسان جو چاند پر پہنچا ہے تو عالم اسلامی میں اس تقریب پر چراغاں ہونا چاہیے تھا' لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب اس قوم کے سامنے خدا کی کتاب بے نقاب ہوتی اور یہ اس پر غور و فکر کرتی' کیونکہ جب اس نے کہا تھا کہ "ارض و سماوات کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے" تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ **ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون** (۱۳/ ۴۵) اس میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو غور و فکر سے کام لے۔ جو قوم عقل و فکر اور علم و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دے' اس کے لئے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا تو ایک طرف' تسخیر فطرت کی اہمیت کا سمجھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

(۲) اس تمہید کے بعد' ہم موضوع زیر نظر کی طرف آتے ہیں۔ قرآن کریم میں "ارض و سماوات" کے الفاظ بے شمار مقامات پر آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ارض کے معنی ہیں پستی او سماء کے معنی ہیں بلندی۔ لہٰذا' سماء کے معنی (ہمارے مفہوم کے مطابق) آسمان نہیں ہوگے۔ ہمیں جو کچھ اپنے اوپر دکھائی دیتا ہے وہ سب "سماوات" کے زمرہ میں آجائے گا ---- کرہ ارض کے اوپر فضا' چاند' سورج' ستارے' مرئی اور غیر مرئی' معلوم و نامعلوم' جملہ اجرام فلکی' سب ہمارے لئے سماء ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ ارض (پستی) اور سماء (بلندی) اضافی الفاظ ہیں۔ ہم جو کچھ اپنے اوپر دیکھتے ہیں وہ ہمارے لئے سماء ہے اور اس کے لئے ہم ارض ہیں۔ اور جو کچھ ہمارے نیچے ہے وہ ہمارے لئے ارض ہے اور ہم اس کے لئے سماء' یعنی ہر سماء کی ایک رض ہوتی ہے اور ہر ارض کا ایک سماء۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان مختصر الفاظ میں (نہایت جامعیت سے) بیان کر دیا کہ **اللہ الذی خلق سبع سموت ومن الارض مثلھن** (۶۶/۱۲) خدا وہ ہے جس نے متعدد سموت پیدا کئے اور ہر سماء کے مقابل میں ایک ارض۔ (عربی زبان میں سبع کا لفظ جہاں "سات" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے' وہاں اس سے مراد "متعدد" بھی ہوتے ہیں جیسے ہم اپنے ہاں کہتے ہیں کہ "میں نے تمہیں بیسیوں مرتبہ کہا ہے' سو بار تاکید کی ہے' ہزار بار منع کیا ہے"۔ ان الفاظ سے مراد' متعین طور پر بیس' سو یا ہزار نہیں ہوتا' بلکہ اس سے مقصد بکثرت یا متعدد بار ہوتا ہے۔ اسی

انداز سے عربی زبان میں' سات' ستر' سات سو وغیرہ الفاظ آتے ہیں)۔

(۳) قرآن کریم میں خدا کو **بدیع السموت والارض**(۲/۱۱۷) اور **فاطر السموت والارض** (۶/۱۴) کہا گیا ہے۔ **بدیع یا فاطر** کے معنی ہوتے ہیں وہ جو کسی کام کو پہلی مرتبہ کرے۔ لہٰذا' خدا کے بدیع اور فاطر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارض و سماوات (سلسلہ کائنات) کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ مادی کائنات' ازلی اور قدیمی نہیں۔ خدا نے اسے پیدا کیا ہے اور اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس سے پہلے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔

یہ ابتداء کے لئے ہے۔ جہاں تک انتہا کا تعلق ہے' قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کل **یجری لا جل مسمی**(۲/۱۳) یہ تمام اجرام' ایک مدت معینہ تک کے لئے محو خرام ہیں' یعنی یہ نہ ازلی ہیں نہ ابدی۔ ازلی اور ابدی ہونا صرف خدا کے لئے ہے' مخلوق کے لئے نہیں۔

(۴) تخلیق سماء کے متعلق ایک مقام پر ہے **وھی دخان** (۴۱/۱۱) ابتداء میں یہ دخان تھا۔ دخان دھوئیں' ابخرات اور گیس (GASEOUS MATTER) کو کہتے ہیں۔ یہ (NEBULA) کی وہ ہیئت ہے جس میں اجرام فلکی کی پہلے پہل نمود ہوئی تھی۔ پہلے یہ ہیولیٰ ایک ہی تھا' اس کے بعد اس میں سے "چھینٹے اڑے" اور مختلف اجرام الگ الگ ہوگئے۔ سورہ انبیاء میں ہے **اولم یرالذین کفروا ان السموت والارض کانتا رتقا ففتقنھما** (۲۱/۳۰) یہ لوگ جو قرآن کے دعاوی کی صداقتوں سے انکار کرتے ہیں' کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ارض و سموت پہلے ایک ہی ہیولیٰ تھے۔ پھر یہ پھٹ کر الگ الگ ہوئے۔ زمین کے متعلق دوسرے مقام میں ہے **والارض بعد ذالک دحھا** (۷۹/۳۰) اس کے بعد زمین کو اس طرح دور پھینکا جس طرح گوپیے سے پتھر کو زناٹے کے ساتھ دور پھینکتے ہیں۔ یہ کرے اس شدت اور تیزی کے ساتھ الگ ہوئے کہ **کل فی فلک یسبحون** (۲۱/۳۳) ان میں سے ہر ایک کرہ' اپنے اپنے مدار (ORBIT) میں' تیرتا چلا جا رہا ہے۔ زمین کی یہ کیفیت ہے کہ یہ تمہیں اپنے اوپر لئے اس انداز سے گھوم رہی ہے کہ تم آرام اور سکون سے بیٹھے رہتے ہو۔ تمہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ محو گردش ہے **تمید بکم** کے یہی معنی ہیں (۱۶/۱۵)۔

پھر یہ کرے' مختلف ادوار (STAGES) میں سے گزرے۔ قرآن کریم میں' **ستتہ ایام** آیا ہے (۱۰/۳) چھ مختلف ادوار۔ کہیں ان مراحل کو کلی طور پر **یومین** (دو مراحل) بھی کہا ہے (۴۱/۱۲)۔ ان میں سے ایک ایک **یوم**' ہزار ہزار (۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال (۷۰/۴) کا بتایا گیا ہے۔ (علم انسانی ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا کہ ان ادوار کو متعین کر سکے۔ سائنس کے مزید انکشافات ایک دن اس حقیقت کو بھی واضح کر دیں گے)۔

ان مراحل سے گزرنے کے بعد' زمین پر پانی کی نمود ہوئی اور پانی سے ہر جاندار شے وجود میں آئی۔ **وجعلنا من الماء کل شی حی** (۲۱/۳۰) زندگی کی نمود کے لئے تو پانی کافی تھا لیکن اس کی حفاظت کے لئے کچھ اور بھی درکار تھا۔ یہ وہ کرہ فضائی (ATMOSPHERE) ہے جس کے بغیر یہاں کوئی جاندار مخلوق باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے قرآن نے **سقفا محفوظا** کہہ کر پکارا ہے (۲۱/۳۲)۔ وہ چھت جو خود بھی محفوظ ہے اور ساکنان ارض کے لئے سامان

حفاظت بہم پہنچاتی ہے۔ کرہ فضائی ہمارے لئے کس کس قسم کے سامان حفاظت بہم پہنچاتا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ چاند اگرچہ زمین کا توام ہے لیکن اس پر زندگی کی نمود نہیں ہو سکی۔ یہ اس لئے کہ اس کے اوپر کرہ فضائی نہیں ہے۔ اگر ہمارے سر پر بھی یہ "سقف محفوظ" نہ ہوتی تو ہماری زمین بھی چاند کی طرح ویرانہ ہوتی۔

(۵) یہ اجرام اپنے ابتداء ہیولیٰ سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے مدار میں مصروف گردش ہو گئے' لیکن ان میں اس قسم کی باہمی کشش پیدا کی گئی کہ یہ فضا میں معلق ہیں۔ نہ گرتے ہیں نہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس کشش کو قرآن کریم نے غیر مرئی ستون (INVISIBLE PILLARS) کہہ کر پکارا ہے۔ سورہ الرعد میں ہے **اللہ الذی رفع السموت بغیر عمد ترونھا** (۱۳/۲) اللہ وہ ہے جس نے اجرام سماوی کو ایسے ستونوں سے بلندی پر تھام رکھا ہے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ "دیکھ نہیں سکتے" کہا ہے' "سمجھ نہیں سکتے" نہیں کہا۔

(۶) کائنات کا یہ سلسلہ اس قدر وسعت ناآشنا اور تحیر انگیز ہے کہ انسانی فکر اس کے کسی ایک ادنیٰ سے گوشے کو بھی بہ نگاہ تعمق دیکھے تو اس کا سر چکرا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تمام سلسلہ جس نظم و نسق کے ساتھ سرگرم عمل ہے' اس کی بنیاد کیا ہے؟ قرآن کریم نے اسے ایک لفظ میں سمو کر رکھ دیا ہے اور وہ لفظ ہے "خدا کا امر" ---- یعنی قانون خداوندی ---- یہ محیرالعقول کارگہ کائنات' قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ **والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ** (۷/۵۴) سورج' چاند' ستارے' سب خدا کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے قانون کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آتی **ولن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا** (۳۳/۶۲)۔ یہ قانون خداوندی کا محکم اور غیر متبدل ہونا ہے کہ انسان' زمین پر بیٹھا' محض حسابی قاعدے سے' ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے اور اس کا کوئی نشانہ خطا نہیں جاتا۔ یہ قانون اس قدر اٹل ہے کہ اس کے بھروسے پر' ایک خلانورد' اپنے جہاز سے باہر نکل کر' فضا میں ٹہلنے لگ جاتا ہے اور امریکہ کا کنٹرول اسٹیشن' دو لاکھ اسی ہزار میل کے فاصلے سے' نیچے بیٹھا' چاند پر جانے والے جہاز کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا اور خلانوردوں کو ہدایات دیتا ہے۔ اور یہ اس کے قانون ہی کی محکمیت ہے جس کے بل بوتے پر' زمین سے چھ کروڑ میل دور' فضائی جہاز' مریخ کی تصویریں ٹیلیویژن پر بھیج رہا ہے۔ یہ اس کے محکم قانون ہی کی کارفرمائی ہے جس سے یہ حالت ہے کہ **والشمس تجری لمستقرلھا** سورج اپنے مدار ہی کے گرد گردش نہیں کرتا' بلکہ (اپنے پورے نظام کو ساتھ لئے) کسی اور منزل کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے جو اس کا مستقر ہے۔ **ذالک تقدیر العزیز العلیم** (۳۶/۳۸) یہ اس خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق ہو رہا ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے اور اس کی قوت علم پر مبنی ہے۔ یہ اس کے قانون ہی کی کارفرمائی ہے کہ **والقمر قدرنہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم** (۳۶/۳۹) خدا نے چاند کے لئے منازل مقرر کر دی ہیں جن کی وجہ سے اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ پہلی رات ناخن کی طرح باریک سا ہمارے سامنے آتا ہے' آہستہ آہستہ مہ کامل بن جاتا ہے۔ پھر گھٹتے گھٹتے اسی طرح باریک سی ٹہنی کی طرح نظر آتا ہے۔

اور یہ اسی کا قانون ہے جس کے مطابق **لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر** کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ

سورج جیسا عظیم الجثہ کرہ اپنی حدود سے آگے بڑھ کر' چاند کے اوپر چڑھ جائے۔ **ولا الیل سابق النہار** نہ ہی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دن اور رات کی گردشیں الٹی ہو جائیں۔ **وکل فی فلک یسبحون** (۳۶/۴۰) ہر کرہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔ ان کروں کی غیر متبدل گردشوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں کیلنڈر مقرر کرتے ہیں جو انسان کی تمدنی زندگی کے لئے اس قدر ناگزیر ہے۔ **الشمس والقمر بحسبان ص** (۵۵/۵) چاند اور سورج نہایت محکم حسابی قاعدے کے مطابق چل رہے ہیں اور ان کی یہ منازل اس لئے مقرر کی گئی ہیں **لتعلموا عددالسنین والحساب** (۱۰/۵) تاکہ تم ان سے سالوں کی گنتی اور مختلف قسم کے حساب کر سکو (نیز ۱۷/۱۲)۔

(۷) قرآن کریم میں سورج کو ضیاء اور چاند کو نور کہا گیا ہے (۱۰/۵)۔ ویسے تو ضیاء اور نور دونوں کے معنی روشنی ہیں' لیکن لغت کی رو سے' عام طور پر ضیاء کسی کی اپنی روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس روشنی کو جسے کسی اور سے اکتساب کیا گیا ہو۔ سورہ الشمس میں اس کی وضاحت یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ **والشمس وضحھا** سورج اور اس کی روشنی **والقمر اذا تلھا** (۹۱/۱-۲) اور چاند جب وہ روشنی مستعار لینے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ وہ سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے اور بھکاریوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ کیسا حسین ہے یہ استعارہ' اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ چاند' جو لوگوں کی نگاہوں میں بقعہ نور ہوتا ہے' خود روشن نہیں بلکہ اپنی روشنی کے لئے سورج کا محتاج ہے۔ یہ سورج کی روشنی ہے جو اس سے منعکس ہوتی ہے۔

(۸) فلکیات کے ضمن میں قرآن کریم میں ایک آیت ہے ......

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس آیت کو درج کریں' اسے ذہن میں رکھئے کہ یہ آیت لوگوں کے سامنے چھٹی صدی عیسوی میں آتی ہے۔ اس زمانے میں فلکیات سے متعلق انسانی علم کی جو کیفیت تھی وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔

پھر جس شخصؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ دنیا تک پہنچتے ہیں وہ اس ملک کا رہنے والا ہے جو اس زمانے میں بھی' دیگر اقوام کے مقابلہ میں' علمی تحقیقات میں بہت پیچھے تھا۔ "علمی تحقیقات" تو ایک طرف' وہ لوگ زندگی کے عام حقائق سے بھی نا آشنا تھے۔

اور جس شخصؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں' وہ خود امی تھا' یعنی نزول قرآن سے پہلے' پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتا تھا۔ وہ شخصؐ اس زمانے میں' اور اس ملک میں' اعلان کرتا ہے کہ

ومن ایتہ خلق السموت والارض وما بث فیھما من دابتہ وھو علی جمعھم اذا یشاء قدیر۔ (۴۲/۲۹)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سموت کی تخلیق کی اور ان دونوں میں جاندار مخلوق کو پھیلا دیا۔ (اس وقت یہ سب الگ الگ ہیں لیکن) خدا اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اپنے قانون مشیت کے مطابق' جب چاہے' ان اجرام میں باہمی رابطہ پیدا کر دے (یا ان کی آبادیوں کو ملا دے)۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں، سرزمین عرب کا ایک امیؐ تو ایک طرف، ابھی کل تک، دنیا کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ زمین اور آسمانی کروں میں باہمی ربط و ضبط پیدا ہو سکتا ہے؟ اور یہ کہ آسمانی کروں میں زندگی کا امکان ہے؟ کیا یہ ایک آیت، اس دعویٰ کی مثبت دلیل نہیں کہ قرآن، کسی انسان کے فکر کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ ماورائے علم انسانی ہے۔ اسی کو وحی خداوندی کہتے ہیں۔ یہ عظیم حقیقت تو ایک طرف، اس زمانے میں تو یہ بات بھی کسی کے ذہن میں نہیں آسکتی تھی کہ آسمانی کروں کو انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس عہد میں تو انسان چاند سورج اور ستاروں کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ اور یہ کچھ ابھی کل تک ہوتا تھا اور آج بھی بعض مقامات پر ہو رہا ہے ---- یہ قرآن تھا جس نے ان لوگوں سے کہا کہ **لا تسجدو للشمس ولا للقمر واسجدوا اللہ الذی خلقھن** (۴۱/۳۷) سورج اور چاند کو سجدے مت کرو۔ ان کے سامنے مت جھکو۔ اس خدا کے سامنے جھکو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس نے اسے بھی واضح کر دیا کہ **لخلق السموت والارض اکبر من خلق الناس** (۴۰/۵۷) خارجی کائنات کی تخلیق، انسان کی پیدائش کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خدا کی کبریائی کی متقاضی تھی۔ لیکن چونکہ انسان کو عظیم قوتوں کا حامل بنایا گیا ہے، اس لئے یہ مسجود کائنات ہے، کائنات اس کی معبود نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اسے اجرام فلکی کے سامنے سجدہ ریز ہونا نہیں چاہیے۔ ایسا کرنا شرف انسانیت کی تذلیل ہے۔

(۹) بہرحال، یہ تھی اس زمانے میں انسان کی ذہنی اور علمی سطح۔ ظاہر ہے کہ ہمارے مفسرین حضرات بھی اسی زمانے کی پیداوار اور اسی ماحول سے متاثر تھے، اس لئے انہوں نے ان آیات قرآن کی تفسیر، اپنے دور کے رائج الوقت خیالات کے مطابق کی --- وہ یہی کر سکتے تھے۔ (مثلاً) ہمارے ہاں امام ابن کثیرؒ کی تفسیر بڑی قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے تخلیق ارض سموت کے سلسلہ میں مختلف آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ سے مروی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور کسی چیز کو پیدا نہیں کیا تھا۔ اور جب مخلوق کو رچانا چاہا تو پانی سے دھواں بلند کیا۔ وہ اونچا چڑھا اور اس سے آسمان بنائے۔ پھر پانی خشک ہو گیا اور اس کی زمین بنائی۔ پھر اسی کو الگ الگ کر کے سات زمینیں بنائیں۔ اتوار اور پیر کے دو دن میں یہ ساتوں زمینیں بن گئیں۔ زمین مچھلی پر ہے اور مچھلی وہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے **ن والقلم۔** مچھلی پانی میں ہے اور پانی صفاۃ پر ہے اور فرشتے پر اور فرشتہ پتھر پر اور یہ پتھر وہ ہے جس کا ذکر حضرت لقمان نے کیا ہے۔ یہ پتھر ہوا پر ہے۔ مچھلی کے ہلنے سے زمین کانپنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو گاڑ دیا اور وہ ٹھہر گئی۔
>
> (پارہ اول، اردو ترجمہ، ص ۷۹)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا- اس سے جو دھواں اوپر چڑھا اس کے آسمان بنائے جو ایک پر ایک' اس طرح سات ہیں اور زمینیں ایک کے نیچے ایک' اس طرح سات ہیں-

چوبیسویں پارہ (سورہ فصلت/حم سجدہ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں-

> ابن جریرؒ کی روایت میں ہے کہ یہودیوں نے حضورؐ سے آسمان و زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اتوار اور پیر کے دن اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا اور جتنے نفعے ان میں ہیں- اور بدھ کے دن درختوں کو' پانی کو' شہروں کو اور آبادی اور ویرانے کو پیدا کیا تو یہ چار دن ہوئے ...... جمعرات والے دن آسمان کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستاروں کو اور سورج' چاند کو اور فرشتوں کو پیدا کیا تین ساعت کے رہنے تک- (ص ۵۶-۵۵)

یہ حضرات' اپنے زمانے کے مروجہ خیال کے مطابق' اس نیلگوں فضا کو آسمان کہتے تھے جو ہمیں اپنے سر پر نظر آتی ہے- وہ اسے چوڑا اور ہموار سمجھتے تھے- اور سبع سموت سے مراد یہ لیتے تھے کہ اسی قسم کے سات آسمان' درمیانی فاصلوں کے بعد' اوپر تلے رکھے ہیں- چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ سورہ نازعات کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں-

> آسمان کو اس نے بنایا' یعنی بلند و بالا خوب چوڑا اور کشادہ اور بالکل برابر بنایا- پھر اندھیری راتوں میں خوب چمکنے والے ستارے اس میں جڑ دیئے- (ص ۸)

ہماری کتب تفاسیر میں زمین اور آسمان کے متعلق اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں- اس میں ان حضرات کا کوئی قصور نہیں- اس زمانے کی علمی سطح ہی ایسی تھی- اگر ہم اس زمانے میں ہوتے تو ہم بھی یہی کچھ لکھتے- ان حضرات کے مقابلہ میں ہماری پوزیشن اس لئے بہتر (ADVANTAGEOUS) ہے کہ ہمارے زمانے کی علمی سطح بلند ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہم رموز کائنات' فلہذا' قرآن کو سمجھنے کے زیادہ قابل ہو گئے ہیں-

ان تفاسیر نے جو خرابی پیدا کی ہے وہ ان کے اس قسم کے مندرجات کی وجہ سے نہیں' بلکہ ہمارے ہاں کے ایک غلط زاویہ نگاہ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے- یہ تفاسیر ہمارے دینی مکتبوں اور دارالعلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں اور ان کے متعلق عقیدہ یہ پیدا کر لیا گیا ہے کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے حرفاً حرفاً صحیح ہے- ان پر کسی قسم کی تنقید کرنا سخت گناہ ہے کیونکہ سلف صالحین کی اتباع ہی اصل دین ہے- معاملہ اگر یہاں تک ہی رہتا تو اس سے کسی نہ کسی طرح بچاؤ کی صورت نکل سکتی تھی ---- ہم میں وہ گروہ بھی تو ہے جو تقلید ائمہ کو جائز نہیں قرار دیتا --- لیکن معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا- ان (مفسرین) حضرات نے جو کچھ لکھا اس کے متعلق یہ نہیں کہا کہ وہ ان کے اپنے خیالات ہیں- کہا یہ کہ وہ تفسیر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ ہے- اس سے اصل دشواری پیدا ہوئی- ان مفسرین کے اقوال سے یہ کہہ کر اختلاف کرنے کی جرات کر لی جا سکتی تھی کہ وہ بالآخر ہمارے ہی جیسے انسانوں کے خیالات ہیں-

لیکن جب کہا یہ جائے کہ وہ خیالات ان حضرات کے اپنے نہیں' بلکہ خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی ہیں تو ان سے اختلاف یا تنقید کرنے کی جرات کس مسلمان کو ہو سکتی ہے؟ اس سے ان تفسیری اقوال نے' غیر متبدل دین کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب اگر کوئی علمی تحقیق یا سائنٹیفک انکشاف ان اقوال میں سے کسی کے خلاف جاتا ہے تو ہمارے ہاں عجیب صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ قدامت پسند طبقہ یا تو اس قسم کے مشاہداتی انکشاف ہی سے انکار کر دیتا ہے اور یا اس میں اور اپنے ہاں کے تفسیری اقوال میں مطابقت پیدا کرنے کی بے معنی کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف' جب نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ دیکھتا ہے کہ جن باتوں کو ان کے سامنے اسلام کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ علمی تحقیقات پر پوری نہیں اترتیں' تو وہ اسلام ہی سے متنفر ہو جاتا اور سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔ (مثلاً) حدیث کی مشہور کتاب ترمذی میں' حضرت عباسؓ کی ایک روایت میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک (۷۱) یا (۷۲) یا (۷۳) سال کی راہ ہے۔ اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

آپ سوچئے کہ جب اس روایت کو کالج کے کسی طالب علم کے سامنے پیش کیا جائے --- اور پیش کیا جائے یہ کہہ کر کہ حضور نبی اکرمؐ نے ایسا فرمایا ہے ---- تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ یہ (اور اسی قسم کی دیگر روایات) رسولؐ اللہ کے ارشادات ہو نہیں سکتے۔ یہ روایات وضعی ہیں ----اور یہ دعویٰ کوئی نیا نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں' مغازی' ملاحم اور تفسیر---- لیکن ہمارا قدامت پسند طبقہ ہے کہ زور دیئے جاتا ہے کہ ان تمام روایات کو رسولؐ اللہ کے ارشادات تسلیم کرو۔ اور جس کی غیرت ایمانی اور ذات رسالت مآبؐ کی عظمت کا احساس اسے ایسا کرنے سے روکے' اسے منکر حدیث اور نہ جانے کیا کیا قرار دے کر' حوالہ دارو رسن کرنے کے فتوے صادر کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ خرابی جو اس قسم کے تفسیری اقوال کو یہ حیثیت دے دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک ہم اپنے اس بنیادی نظریہ کی اصلاح نہیں کریں گے اس خرابی کے ازالہ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی اور ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے برگشتہ ہوتا چلا جائے گا۔

اب رہے وہ حضرات جو سائنس کے کسی انکشاف یا علمی تحقیق کے نتیجہ' اور اس قسم کے اقوال میں تطبیق کی کوشش کرتے ہیں' تو وہ معاملہ کو اور بھی مضحکہ انگیز بنا دیتے ہیں۔ مثلاً" ہمارے ہاں شق القمر کا معجزہ مشہور ہے (ہمیں حال میں جو استفسارات موصول ہوئے ہیں اور جن کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر میں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے)۔ ہمارے زمانے میں' سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کو بڑے سائینٹفک انداز سے پیش کرتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تفسیر (تفہیم القرآن) میں اس

بات سے تو انکار کیا ہے کہ یہ واقعہ حضور نبی اکرمؐ کے معجزہ کے طور پر ظہور میں آیا تھا، لیکن نفس واقعہ سے انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

> تمام روایات کو جمع کرنے سے اس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً (۵) سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جڑ گئے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

> معترضین اس پر دو طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اول تو ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں کہ چاند جیسے عظیم کرے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سیکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دور ہو جانے کے بعد پھر باہم جڑ جائیں۔ دوسرے وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ واقعہ دنیا بھر میں مشہور ہو جاتا۔ تاریخوں میں اس کا ذکر آتا اور علم نجوم کی کتابوں میں اسے بیان کیا جاتا۔

ان اعتراضات کو سامنے لانے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

> درحقیقت یہ دونوں اعتراضات بے وزن ہیں۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے، قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی لیکن موجودہ دور میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کی بناء پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دور تک چلے جائیں اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ آملیں۔

اس توجیہہ کو اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ میں پیش کر کے داد تحسین حاصل کر لینا تو آسان ہے، لیکن آپ اسے دنیا کے بڑے بڑے سائنس دان تو ایک طرف، سائنس کے کسی عام طالب علم کے سامنے پیش کیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اس کا کس طرح مذاق اڑاتا ہے۔ باقی رہا دوسرا اعتراض، تو اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں ـ

> رہا دوسرا اعتراض، تو وہ اس لئے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظہ کے لئے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ اس سے کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان

کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔ پوری روئے زمین پر اسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا' وہ اسے ثبت کر لیتے اور کسی مورخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا۔ تاہم' مالابار کی تاریخوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ اس رات وہاں کے ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علم نجوم کی کتابیں اور جنتریاں' تو ان میں اس کا ذکر آنا صرف اس حالت میں ضروری تھا جبکہ چاند کی رفتار اور اس کے گردش کے راستے اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی' اس لئے قدیم زمانے کے اہل تنجیم کی توجہ اس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں رصد گاہیں اس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔ (ترجمان القرآن' بابت مئی ۱۹۶۷ء' صفحہ ۱۵۱)

یہ ہے جو ہمارے ساتھ "مذہب اور سائنس" کی کشمکش کے سلسلہ میں ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم نے اپنے غلط نقطہ نگاہ میں تبدیلی پیدا نہ کی تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو یورپ میں ہوا ہے۔ نقطہ نگاہ میں تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کے حقائق کو اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق سمجھا جائے اور کسی فرد یا زمانے کے فہم قرآن کو حرف آخر اور قول فیصل قرار نہ دیا جائے۔ باقی رہیں تفسیری روایات' سو ان کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کا سا موقف اختیار کیا جائے' یعنی یہ کہا جائے کہ وہ وضعی روایات ہیں اور ان کی نسبت حضور نبیؐ اکرم کی طرف صحیح نہیں۔

(۱۰) یہ تو رہی ہماری غلط نگہی۔ دوسری طرف' اہل مغرب کی کج نظری بھی کچھ کم تباہی کا موجب نہیں۔ ان کا نظریہ زندگی یہ ہے کہ۔

(۱) یہ کائنات کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئی ہے اور طبیعی قوانین فطرت کی رو سے ازخود سرگرم عمل ہے - نہ اس کے پیچھے کوئی علیم و خبیر' صاحب اختیار و ارادہ ہستی ہے اور نہ ہی اس کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔

(۲) انسان بھی اسی کائنات کا ایک جزو ہے' اس لئے اس کی بھی تخلیق کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ ہی اس کی کوئی منزل - اس کی زندگی بھی طبیعی قوانین کے تابع رہتی ہے۔ ان سے الگ اور بالاتر کوئی قوانین نہیں۔ موت سے ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بس!

(۳) باقی رہی انسان کی تمدنی زندگی' سو اس کے لئے ہر قوم اپنے اپنے قوانین خود وضع کرے گی۔ ان قوانین کا بنیادی مقصد یہ ہوگا کہ وہ قوم کس طرح زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کر کے' باقی اقوام پر غلبہ و تسلط حاصل کر سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے مطابق، انسانی زندگی، حیوانی سطح کی رہ جاتی ہے اور اس کا قانون "جنگل کا آئین" جس میں ہر بڑی قوت کا مالک حیوان، کمزوروں کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ اب سوچئے کہ نظریہ زندگی ہو یہ، اور مختلف قوموں میں، حصول قوت کے لئے ریس (RACE) جاری ہو تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وہی جس کی رو سے آج یہ دنیا جہنم بن رہی ہے اور انسان اپنے ہی نہیں، خود اس کرۂ ارض کے مستقبل کے تصور سے سہمے چلا جاتا ہے۔ جس نسبت سے انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کئے جاتا ہے اسی نسبت سے انسانی قلوب خوف و ہراس کا نشیمن بنتے چلے جاتے ہیں۔

اس نظریہ زندگی کے خلاف، قرآن کریم نے، تسخیر کائنات کے لئے تاکید کے ساتھ، اس حقیقت کو بھی اتنی ہی، بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ بیان کیا ہے **ما خلقنا السماء والارض وما بینھما لاعبین** (۲۱/۱۶) ہم نے اس ارض و سما، اس کارگہ کائنات کو یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اسے ایک عظیم مقصد کے لئے بالحق پیدا کیا ہے **وخلق اللہ السموات والارض بالحق** (۴۵/۲۲)۔ بالحق پیدا کرنے کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ **ولتجزی کل نفس بما کسبت وھم لا یظلمون** (۴۵/۲۲) ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا بدلہ ملے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ دوسری جگہ ہے **لیجزی الذین اساء وا بما عملوا ویجزی الذین احسنوا بالحسنی** (۵۳/۳۱) تاکہ جو غلط روش اختیار کرتا ہے اسے اس کے کاموں کا بدلہ ملے اور جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے اس کے اعمال کے خوشگوار نتائج اس کے سامنے آئیں، یعنی تخلیق ارض و سموت کا ایک مقصد یہ ہے کہ انسان کا کوئی کام بلا نتیجہ نہ رہ جائے، خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں اس کے سامنے آجائے یا مرنے کے بعد کی زندگی میں۔ یہ خوشگوار نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں جب انسان اپنی تمدنی زندگی کو وحی خداوندی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھے --- یہ اقدار اب قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ ان میں بنیادی قدر یہ ہے کہ **ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** (۱۳/۱۷) وہی نظریہ زندگی، وہی نظام حیات، وہی قوت، وہی اقتدار بقا کا مستحق ہے جو تمام نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ یہی وہ نظریہ زندگی ہے جس میں انسان ہر قسم کے خوف و حزن سے مامون رہ سکتا ہے۔ اس لئے کہ جب (قصہ آدم کے تمثیلی بیان میں) آدم کے متعلق کہا تھا کہ اس میں، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ **فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** (۲/۳۸) جو خدا کی طرف سے عطا کردہ راہنمائی کا اتباع کرے گا، انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

بنا بریں، ہمارے سامنے تین گروہ آتے ہیں۔

۱۔ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار خداوندی کے مطابق نوع انسان کی منفعت کے لئے صرف کریں، انہیں جماعت مومنین کہا جائے گا۔

۲۔ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں صرف اپنے اقتدار کی خاطر کام میں لائیں، یہ مغرب کی خدا فراموش قومیں ہیں۔ انہیں مقام مومن نصیب تو نہیں ہو سکا لیکن مقام آدم تک ضرور پہنچ گئیں ---- اور

پہنچ رہی ---- ہیں --- اور

۳- جو فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہ کریں اور اپنی خوش فہمیوں کی دنیا میں مگن رہیں --- انہیں مقام مومن تو کجا' مقام آدمیت بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ **خسر الدنیا والاخرۃ ذالک ھو الخسران المبین** (۲۲/۱۱) ان کے حصہ میں حال اور مستقبل دونوں کی تباہی آتی ہے۔

اب آپ خود سوچ لیجئے کہ ہمارا شمار کس زمرہ میں ہوتا ہے۔

------ ☆☆ ------

آخر میں ایک اور حقیقت کا سامنے لانا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوگا جس کی طرف قرآن کریم نے نہایت لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ انسان اس وقت تو بڑے فخر و ناز سے آسمانی کروں کی طرف پرواز کرتا اور وہاں کے حقائق مستور کو بڑے طرب و نشاط سے واشگاف کرتا ہے۔ اسے سب سے زیادہ تلاش اس کی ہے کہ کسی کرہ میں زندہ آبادی مل جائے۔ لیکن اگر ایسا ہوا کہ وہ آبادی اس سے زیادہ ارتقاء یافتہ ہوئی' تو سوچئے کہ اس وقت انسان کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ اس لئے کہ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ **ولقد کرمنا بنی ادم** ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ **ولفضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا** (۱۷/۷۰) ہم نے انہیں (بنی آدم کو) اپنی مخلوق میں سے اکثر پر۔ فضیلت دی ہے۔ "تمام مخلوق" پر نہیں' مخلوق میں سے اکثر پر۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہیں ایسی مخلوق بھی ہے جو انسان سے افضل ہے۔ لہٰذا' ثریا پرواز اور کہکشاں گیر انسان کو ان کروں پر ذرا سنبھل کر قدم رکھنا چاہیے اور آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے کے بعد بھی اپنی خاک نشینی کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ (ستمبر ۱۹۶۹ء)

۶- اسلامی کیلنڈر

شمسی ------- یا ------- قمری

سوال :- کیلنڈر کو عام معاملات میں جو اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کاروبار اسی صورت میں چل سکتا ہے کہ آنے والی تاریخوں اور دنوں کا یقینی طور پر علم ہو۔ قمری کیلنڈر سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ کاروبار تو ایک طرف' اس سے اسلامی تہواروں تک کا بھی تعین نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ ازروئے اسلام قمری کیلنڈر رکھنے پر مجبور ہیں یا اسے شمسی کیلنڈر میں بدلا جا سکتا ہے؟

جواب:- قرآن مجید میں چاند اور سورج دونوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ حساب رکھنے کا ذریعہ ہیں **والشمس والقمر حسبانا** (۶/۹۷ و دیگر مقامات)۔ چاند کی رو سے حساب کے سلسلہ میں' کیلنڈر کے علاوہ' مدوجزر وغیرہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ ساحل سمندر کے رہنے والے کر سکتے ہیں۔ جہاں تک کیلنڈر کا تعلق ہے بدوی یا دیہاتی زندگی میں جب (اور جہاں) حساب رکھنے میں وقت ہو' چاند کی رو سے تاریخوں کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ایام میں عام طور پر چاند ہی کی رو سے حساب رکھا جاتا تھا۔ یہودیوں کے ہاں' نیز ایران اور ہندوستان میں قمری کیلنڈر رائج تھا۔ لیکن اس کیلنڈر میں ایک نقص یہ تھا کہ اس کی رو سے ہر سال' ایک خاص دن اسی موسم میں نہیں آتا تھا۔ موسموں کی تبدیلی سورج کی رو سے ہوتی ہے۔ اور قمری کیلنڈر ہر سال (قریب) دس دن پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہودی' ایرانی اور ہندی اپنے مذہبی تہواروں کو خاص موسموں میں منانا چاہتے تھے اور یہ چیز قمری کیلنڈر کی رو سے ممکن نہ تھی۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے انہوں نے کیا یہ تھا کہ وہ ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اضافہ کر کے' سال' بارہ کے بجائے تیرہ مہینے کا شمار کر لیتے تھے۔ اس طرح تہوار منانے میں ہر سال چند دنوں کا فرق تو ضرور پڑتا تھا' لیکن موسم وہی رہتا تھا۔ اور تیسرے سال کے بعد' پھر تہوار اپنے پہلے وقت پر آجاتا تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے عرب بھی' یہودیوں کے تتبع میں ایسا ہی کرتے تھے۔ ان کے ہاں کیلنڈر قمری تھا لیکن وہ ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کر کے' اسے شمسی کے برابر کر لیتے تھے اور اس طرح ان کے تہوار (بالخصوص حج' جو ان کا سب سے بڑا مرکزی اور قومی تہوار تھا) ایک ہی موسم میں آتے تھے۔

لیکن عربی معاشرہ میں ایک اور رسم بھی تھی۔ انہوں نے سال میں چار مہینے (ذی قعدہ' ذوالحجہ' محرم اور رجب) ایسے متعین کر رکھے تھے جن میں لوٹ مار اور جنگ و جدال منع تھا۔ انہیں حرمت کے مہینے کہا جاتا تھا۔ جب سال تیرہ مہینوں کا آتا تو حرمت کے مہینوں کا تعین مشکل ہو جاتا۔ یہ فریضہ کعبہ کے پجاریوں میں سے ایک قبیلہ کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ (جیسا کہ ہر جگہ پجاریوں کے ہاں ہوتا ہے) اپنے اس اختیار کا بڑا ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ وہ خاص مفادات کے پیش نظر ان مہینوں میں ردوبدل کرتے رہتے تھے (اسے اصطلاح میں نسئ کہا جاتا تھا۔ وہ لوند کے سال کے علاوہ' ویسے بھی ان مہینوں میں ردوبدل کر دیتے تھے)۔ فتح مکہ کے بعد جب حج کا اہتمام جماعت مومنین کے ہاتھ میں آیا تو (دیگر امور کے ساتھ) کیلنڈر میں بھی خاص اصلاح کی گئی۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہ فیصلہ کر دیا کہ :۔

ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللہ یوم خلق السموت والارض منھا اربعۃ حرم ذالک الدین القیم(۹/۳۶)

یاد رکھو! مہینوں کی تعداد بارہ ہے اور یہ اس قانون فطرت کے مطابق ہے جسے خدا نے تخلیق ارض و سما کے وقت سے نازل کر رکھا ہے۔ ان میں چار مہینے حرمت کے ہیں۔ یہی نظام محکم ہے۔

قانون فطرت کے مطابق' زمین' سورج کے گرد' قریب ۳۶۵ دن میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ اس کو ایک سال کہا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بارہ مہینوں میں ایک سال (یعنی زمین کا چکر) اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ۳۶۵ دنوں کو بارہ پر تقسیم کر کے مہینے مقرر کر لئے جائیں۔ یہ شمسی حساب ہی سے ہو سکتا ہے۔ قمری کیلنڈر کی رو سے سال کے قریب ۳۵۴ دن بنتے ہیں --- اس میں سورج کے گرد' زمین کا چکر پورا نہیں ہوتا۔ اس حساب سے ہمارا کیلنڈر شمسی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ہم نے سال کے مہینے بارہ کر لئے لیکن کیلنڈر قمری رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہمارے

تہوار مختلف موسموں میں آتے ہیں اور ہمارا سال بھی شمسی کے مقابلہ میں دس دن کم رہتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا کیلنڈر شمسی رکھ لیں تو یہ اسلام کے خلاف نہیں ہوگا' بلکہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہوگا۔ اس سے ہمارے تہوار بھی متعین موسموں میں آیا کریں گے اور وہ تمام دشواریاں بھی رفع ہو جائیں گی جو قمری حساب کی رو سے آئے دن پیش آتی رہتی ہیں۔ نیز اس سے "دین اور دنیا کی وہ ثنویت" بھی ختم ہو جائے گی جس کی رو سے ہمیں کاروبار کے لئے ایک قسم کا (شمسی) کیلنڈر استعمال کرنا پڑتا ہے اور "مذہبی امور" کے لئے دوسری قسم کا (قمری) کیلنڈر۔ ساری دنیا میں (غالباً) مسلمانوں کا کیلنڈر ہی ایسا ہے جو قمری بھی ہے اور اس میں لوند کا سال بھی نہیں آتا۔

باقی رہا چاند کی رو سے مذہبی تہواروں کا تعین' سو اس کے لئے اگر چاند دیکھنے کی شرط کی بجائے حسابی قاعدہ سے چاند نکلنے کا تعین کر لیا جائے تو کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نہ تو شمسی کیلنڈر پر رضامند ہوگی اور نہ ہی حسابی قاعدے سے قمری کیلنڈر کے تعین پر۔ اس لئے کہ اس سے ان کی اجارہ داری ختم ہو جاتی ہے اور انہیں ابتری پھیلانے کا موقع نہیں ملتا۔ امت کے فکر و عمل میں وحدت' مذہبی پیشوائیت کے لئے پیام مرگ ہوتی ہے۔ (جون ۱۹۶۶ء)

۶۔ کیا مردوں کی آنکھیں زندہ اندھوں کو لگائی جا سکتی ہیں؟

آج کل دنیا کے "ملحدوں اور دہریوں" نے بعد از کاوش و تحقیق بسیار' اس امر کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ مردے کے اعضاء (جو انسان کی موت کے بعد گل سڑ جاتے ہیں انہیں) زندہ انسانوں کے جسم میں پیوست کر کے' خلق خدا کو اس سے فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے' لیکن "خدا پرست" ان کے خلاف لٹھ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ .... "از روئے شریعت حقہ" ...... یہ عمل یکسر ناجائز ہے (جس طرح اس سے پہلے لاؤڈ سپیکر کا استعمال از روئے شریعت حرام تھا اور آج کوئی مسجد ایسی نہیں جس میں لاؤڈ سپیکر نصب نہ ہو)۔ اس کے حق میں دلائل کس قسم کے دیئے جاتے ہیں' وہ سننے کے قابل ہیں۔

...عت اسلامی کے ترجمان ایشیا کی ۲۴ مارچ کی اشاعت میں' ملک غلام علی صاحب' معاون امیر جماعت اسلامی' کے قلم سے ایک سوال کے جواب میں مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں :- [۱]

> اس بارے میں یہ بات سمجھ لیجئے کہ اسلام نے میت کی تکفین و تدفین کے بارے میں جو ہدایات دی ہیں' ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مردے کی تکریم اسی طرح ضروری ہے جس طرح زندہ کی۔

یہ ہوا' ان کے نزدیک' اسلام کا حکم۔ اس کے بعد ارشاد ہے:-

۱۔ واضح رہے کہ ملک غلام علی صاحب کا جواب مبنی ہے خود مودودی صاحب کے اس مضمون پر جسے انہوں نے رسائل و مسائل حصہ سوم (ص۲۹۷) پر شائع کیا تھا۔ اگرچہ ملک صاحب نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔

واضح احکام بے معنی نہیں ہیں۔ اگر ہم نے زندوں کے نفع کے لئے مردوں کے اعضاء کی قطع و برید کا دروازہ کھول دیا' تو پھر اس میں کوئی انتہا نہ رہے گی۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک وقت آئے جب مردے کے تمام اعضائے رئیسہ زندہ جسم میں تقلیم کئے جا سکیں۔ پھر اس وقت اس کی حدبندی مشکل ہو جائے گی کہ کس عضو کو مردے کے جسم پر باقی چھوڑا جائے اور کس کو کاٹ لیا جائے۔ بالکل ممکن ہے کہ مردے کی بوٹی بوٹی ہاتھوں ہاتھ اڑالی جائے۔ اگر مردے کی آنکھ کسی زندہ کی بینائی کی بحالی کے لئے درکار ہو گی تو اس کا دل' اس کا پتہ' اس کا جگر' اس کے گردے اور دیگر اعضاء کیوں قابل استعمال نہ ہوں گے اور ان سے سرجری کی وساطت سے کسی کی جان کیوں نہ بچائی جا سکے گی۔ اس کے بعد کون سی حد ہوگی جہاں آدمی رک کر یہ کہہ سکے گا کہ مردے کے ان اعضاء سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور مردے کہاں باقی رہ جائیں گے کہ ان کے احترام کے لئے ہدایات کی ضرورت ہو؟ ایسے مسائل میں جواز کے دروازے کھولنا درحقیقت فتنوں کے طوفانوں کے لئے راہ بنانا ہے۔ اس لئے میری رائے میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ یہ عمل اسلام کے کسی اصول کے مطابق مستحسن و پسندیدہ ہے۔

یعنی اگر کسی مردے کی آنکھوں سے ایک زندہ نابینا کو عمر بھر کے لئے بینائی مل سکتی ہے' تو اسے اس بینائی سے محروم رکھیے (اسے اندھے کا اندھا رہنے دیجئے)' کیونکہ اسے بینائی عطا کرنے سے ..... "مردے کی بے حرمتی"...... ہوتی ہے اور یہ چیز اسلام کے خلاف ہے! یعنی اگر اندھے کو آنکھیں مل جائیں' تو یہ اسلام کے خلاف ہوگا اور مردے کی آنکھیں گل سڑ کر بے کار چلی جائیں تو یہ عین مطابق اسلام ہوگا! ہم اس سلسلہ میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ۔

خدا اسلام کو اس کے ان دوستوں سے بچائے۔

(مئی ۱۹۶۸ء)

باب ہفتم
(عائلی زندگی)

۱۔ ترکہ میں مرد، عورت میں عدم مساوات؟

سوال : ۔ یہاں ایک مولوی صاحب خطبہ میں فرماتے تھے کہ آجکل یہ بھی ایک فتنہ پیدا ہو رہا ہے کہ عورتیں اور مرد انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ **للذکر مثل حظ الانثیین**(۴/۱۱)۔۔ یعنی ایک مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔ تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورتیں مردوں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ اس کا کیا جواب ہے۔

جواب : ۔ ان مولوی صاحب سے کہئے کہ اس آیت میں چار ہی لفظ آگے چل کر یہ کہا گیا ہے کہ **ولا بویہ لکل واحد منھما السدس** متوفی کے ماں اور باپ میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے۔ یہاں عورت اور مرد کا حصہ برابر بتایا گیا ہے۔ اسی طرح ذرا آگے چل کر کلالہ کی وراثت کے سلسلے میں ہے **ولہ اخ او اخت فلکل واحد منھما السدس** (۴/۱۲) اگر اس کے بھائی یا بہن ہوں تو ان میں سے ہر ایک کا حصہ چھٹا ہے۔ یہاں بھی مرد اور عورت کا حصہ یکساں بتایا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات کبھی قرآن کھول کر دیکھتے تک نہیں۔ بس کہیں سے ایک بات سن پاتے ہیں اور اسے لے دوڑتے ہیں اور پھر ان تنکوں کے پل پر سے ہاتھی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ کبھی قرآن کریم کا خود مطالعہ کریں، تو اس قسم کی باتیں کیوں کریں؟ ترکہ کی تقسیم کے حصوں کی حکمت کچھ اور ہے۔ اسے مرد یا عورت کی مساوات یا عدم مساوات کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لئے قرآنی فیصلے حصہ اول، باب ۱۲ اور ۱۴، ایڈیشن سوم مارچ ۹۲ء ملاحظہ کیجئے۔

(مئی ۱۹۶۵ء)

۲۔ نکاح کی غرض و غایت اور اس تقریب کی رسومات

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ازروئے قرآن،

۱۔ خاوند کے فرائض کیا ہیں؟

۲۔ بیوی کے فرائض کیا ہیں؟

۳۔ مروجہ شادیاں رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہیں اور لوگ غیر محسوس بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ نتیجہ یہ

ہے کہ یہ تقریب ایک ہنگامہ ہے، کم نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے اس تقریب کے کیا خدوخال ہیں۔

طلوع اسلام

قرآن کریم کی رو سے' نکاح ایک ایسے پیمان وفا کا نام ہے جس کی رو سے' ایک عاقل' بالغ' جوڑا باہمی رفاقت کا معاہدہ کرتا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس باہمی رفاقت سے وہ ایک دوسرے کی ذات کی نشوونما کا موجب بنیں اور ایک ایسے خاندان کی بنیاد رکھیں جو انسانی شرف و مجد کا حامل اور قرآنی پیغام کو آگے بڑھانے کا موجب ہو۔

قرآن نے اس رشتہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس سے میاں بیوی میں "مودت' رحمت اور سکینت" کے تعلقات استوار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جس رشتہ کی بنیاد' مودت' رحمت اور سکینت پر ہو' اس میں حقوق اور فرائض کے امتیازی حدود کیا ہوں گے؟ اگر اس رشتہ میں حقوق و فرائض کی فہرستیں مرتب ہوئیں تو وہ بزنس (کاروبار) ہو گا' سودائے محبت نہیں رہے گا۔ اقبالؒ تو اس پیام وفا کے متعلق یہاں تک کہتا ہے کہ۔

یک نگہ' یک خندۂ دزدیدہ' یک تابندہ اشک

بہر پیمان محبت نیست سوگندے دگر

اگر کسی نے حقوق و فرائض کا تعین کرنا ہے تو اس کے لئے قرآن کریم نے ان کی فہرست دینے کے بجائے ایک اصول بیان کر دیا ہے اور وہ یہ کہ

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (۲/۲۲۸)

بیوی پر جو ذمہ داری عائد کرو اس کے مثل اس کا ایک حق ہو جائے گا یعنی اس میں(RECIPROCITY) کا اصول کار فرما ہو گا۔------ جس قدر حقوق اسی قدر ذمہ داریاں اور جس قدر ذمہ داریاں اسی قدر حقوق۔

البتہ' انسان کی تمدنی زندگی اور عورت کو اولاد کی پیدائش اور پرورش کے سلسلے میں جو فرائض سرانجام دینے پڑتے ہیں' ان کے پیش نظر' یہ اصولی رہنمائی بھی دے دی گئی ہے کہ------- **الرجال قوا مون علی النساء** (۴/۳۴) عورتوں کو چونکہ اپنے طبیعی فرائض کی بجا آوری کے لئے کسب معاش کی فرصت نہیں مل سکتی اور مرد ان فرائض سے فارغ ہوتا ہے اس لئے گھر کے اخراجات کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہے۔ باقی رہے زندگی کے مختلف گوشے' سو ان میں مرد اور عورت دوش بدوش چلتے ہیں (دیکھئے ۳۳/۳۵)۔

جہاں تک اس کی تقریب اور اس کے ہنگامے کا تعلق ہے' سو یہ ایک معاشرتی سوال ہے۔ قرآن نے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں دی' نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔ یہ ایک معاہدہ ہے۔ جس طرح اور معاہدات طے پاتے ہیں' اسی طرح اسے بھی طے پانا چاہئے۔ اس خوشی میں اگر کوئی اپنے احباب کو شریک کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے (جسے دعوت ولیمہ کہا جاتا ہے' وہ عربوں کے ہاں ایک معاشرتی رسم تھی جس طرح عقیقہ ان کے ہاں کی رسم تھی۔)------لیکن اس سلسلہ میں جو کچھ ہمارے ہاں ہو رہا ہے' قرآن کی روشنی میں وہ یکسر اسراف ہے------ یہ

اسراف' اور وہ بھی اس قوم میں جو روٹی تک کے لئے دوسروں کی محتاج ہے' یا للعجب! اس سے امراء کی دولت برباد ہوتی ہے اور غریبوں کی لڑکیاں' محض (ان فضول رسموں کے لئے) پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے ماں باپ کے لئے استخواں شکن بوجھ' اور اپنے لئے آتش خاموش کی بھٹی بنی رہتی ہیں--- اور یہ سب کچھ' بلا کسی جرم و خطا کے' محض معاشرہ کی تباہ کن روش کی وجہ سے۔

جہاں تک مہر کا تعلق ہے' وہ ایک تحفہ ہے جو خاوند بیوی کو ازرہ محبت پیش کرتا ہے۔ اس کی مقدار و تعداد کی کوئی قید اور شرط نہیں۔ البتہ اس کی ادائیگی ضروری ہے---- خواہ نکاح کے وقت ہو یا اس کے بعد--- جہیز دینے کے لئے قرآن میں کوئی حکم نہیں۔ جو ہونے والا شوہر' جہیز طلب کرتا اور اس کی شرطیں عائد کرتا ہے وہ محبت و رفاقت کا مظاہرہ نہیں کرتا' سودے بازی کرتا ہے۔ اور جس رشتہ کی ابتداء ہی سودے بازی سے ہو' اس کا انجام معلوم!

بس یہ ہے نکاح ازروئے قرآن!--- باقی سب کچھ ہماری خود ساختہ زنجیریں ہیں جن میں ہم اپنے آپ کو خود ہی جکڑتے ہیں اور پھر ساری عمر روتے رہتے ہیں۔ (مئی ۱۹۶۷ء)

عائلی زندگی سے متعلق بعض نکات "قرآنی فیصلے" حصہ اول' باب ۱۴ ایڈیشن سوم' مارچ ۱۹۹۲ء میں بھی آچکے ہیں۔ انہیں بھی ایک نظر دیکھ لیں۔

۳۔ شادی کے لئے کس کی رضامندی ضروری ہے؟
محبت کی شادی (LOVE MARRIAGE) کسے کہتے ہیں!

سوال :۔ آج کل اخبارات میں ایک بحث چل رہی ہے کہ شادی کے لئے' لڑکی اور لڑکے کی رضا مندی ہونی چاہئے یا ان کے ماں باپ کی رضا مندی بھی۔ اخبارات میں (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) یہ بحث کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ رہی۔ اس باب میں صحیح صورت کیا ہے؟

جواب :۔ قرآن کریم کی رو سے' نکاح' عاقل' بالغ لڑکے اور لڑکی کی رضا مندی سے معاہدہ استوار کرنے کا نام ہے لہٰذا' لڑکے اور لڑکی کی رضا مندی کے بغیر نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ اب رہی ماں باپ کی رضا مندی' سو قانونی طور پر یہ لازمی نہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے کی صورت مغربی معاشرہ سے مختلف ہے۔ اس کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ مغرب میں لڑکا اور لڑکی اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نکاح ہو یا نہ ہو' بالغ ہونے کے بعد' اولاد کا ماں باپ سے اور ماں باپ کا اولاد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس لئے وہاں شادی کے لئے' ماں باپ کی رضا مندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس' ہمارے معاشرہ میں' یہ رشتہ لڑکی اور لڑکے کا ہی نہیں ہوتا' بلکہ دو خاندانوں کا رشتہ ہوتا ہے۔ لڑکا اس لڑکی کا شوہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے خاندان کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ اسی طرح لڑکی بھی شوہر کے خاندان کا ایک فرد بن جاتی ہے۔ اب سوچئے کہ اس لڑکی یا لڑکے نے جس خاندان کا فرد بننا ہے' اس خاندان کو اس باب میں کچھ کہنے کا حق ہونا چاہئے یا نہیں؟ کسی خاندان کی رضا مندی کے بغیر' کسی فرد کو اس کا جزو بنا دینا' جو دور رس نتائج پیدا کر سکتا ہے

وہ ظاہر ہیں۔

علاوہ بریں' جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے' ہمارے معاشرہ میں' اس کا تعلق اپنے اہل خاندان سے عمر بھر تک رہتا ہے۔ شادی کے بعد جب بھی اس پر کوئی آفت آتی ہے تو اسے (خواہ وہ تین چار بچوں کی ماں بھی کیوں نہ بن چکی ہو) اپنے میکے ہی میں سہارا ملتا ہے۔ کتنے واقعات ہمارے سامنے ہیں جن میں' شادی شدہ لڑکیوں کو' اپنے بچوں سمیت' باقی عمر' میکے میں گذارنی پڑتی ہے۔ جب صورت یہ ہے کہ بچی کی مصیبت کا بوجھ اس کے والدین پر (بھی) پڑتا ہے تو کیا والدین کو اتنا اطمینان نہیں کر لینا چاہئے کہ جس گھر میں لڑکی جا رہی ہے وہاں اس کے لئے مصیبت کا کم سے کم امکان ہے۔

اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کہتے ہیں کہ ہم شادی کے بعد آزادانہ زندگی بسر کریں گے۔ ماں باپ کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ تو اس کے بعد' ان کی شادی کے لئے بے شک ان کے ماں باپ کی رضا مندی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن اس باب میں کم از کم لڑکی کو یہ حقیقت اپنے سامنے رکھنی چاہئے کہ ہمارے معاشرہ میں' زندگی میں بیسیوں مقامات ایسے آتے ہیں جہاں عورت کو کسی سہارے یا حفاظت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ سہارا اور حفاظت بہترین اور باعزت طور پر ماں باپ کے گھر ہی میں مل سکتے ہیں۔ اگر وہ اس گھر سے اپنے تعلقات منقطع کر رہی ہے تو اسے اس کے عواقب کو سامنے رکھنا چاہئے۔ بلکہ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جس خاوند کو معلوم ہو کہ اس کی بیوی کا اس کے سوا کوئی سہارا نہیں' نہ ہی اس کے لئے کوئی اور حفاظت کا مقام ہے' تو وہ اس کی اس احتیاج کا جس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا کرتا ہے' کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں۔ اس قسم کے واقعات ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں۔

لہٰذا' ہمارے معاشرہ کی لڑکیوں کو' اپنے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہئے' یعنی (۱) جس جگہ اس کی اپنی رضا مندی نہ ہو وہاں اسے شادی کرنی ہی نہیں چاہئے۔ لیکن (۲) اپنی پسند کے ساتھ یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ اس میں اس کے والدین (یا اہل خاندان) کی پسند بھی شامل ہے۔ یہی طریق' بحالات موجودہ' انسب ہے۔ علاوہ بریں' شادی کے معاملہ میں انہی کا مشورہ صائب ہو سکتا ہے جنہیں متاہل زندگی کا عملی تجربہ ہو۔ یہ وہ ندی ہے جس میں اترے بغیر تیرنا نہیں سیکھا جا سکتا۔ اس لئے تنہا اپنی رائے یا ان کی رائے کو جنہیں ہنوز شادی کا عملی تجربہ نہ ہو' کافی نہیں سمجھ لینا چاہئے۔ یہ آراء آپ کو غلط راستے پر ڈال سکتی ہیں۔

---

(۲) سوال : آج کل ہمارے ہاں (LOVE MARRIAGE) کا بڑا چرچا ہے۔ یہ کیا بلا ہوتی ہے؟

جواب : یہ "خوبصورت بلا"[۱] ہوتی ہے۔

مغرب کی بے راہ روی نے' جنسی ہیجان کو (LOVE) کا نام دے کر' عجیب قسم کی خود فریبی (یا فریب دہی) کی طرح ڈال رکھی ہے۔ وہاں یہ لفظ اب کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ دو چار برس

[۱] آغا حشر مرحوم کے ایک ڈرامے کا نام تھا۔

ادھر کا ذکر ہے' انگلینڈ سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں ایک مشہور شخصیت کی حرامکاری کی رنگین داستانیں بڑی تفصیل سے بیان کی گئی تھیں- اس کتاب کا نام رکھا گیا تھا (THE GREATEST LOVER OF THE WORLD)_ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ وہاں (LOVER) کسے کہتے ہیں اور (LOVE) کیا ہوتی ہے- اس مفہوم میں یہ لفظ اب ہمارے ہاں بھی عام ہو رہا ہے- یہاں بھی کسی کے (LOVE AFFAIRS) سے مراد اسی قسم کے ناجائز تعلقات کی داستانیں ہوتی ہیں- آیئے ہم ذرا اس کا تجزیہ کریں-

ایک نوجوان' کسی لڑکی میں کچھ قلبی اور ذہنی (یعنی انسانی) خوبیاں دیکھتا ہے جنہیں وہ پسند کرتا ہے- وہ جوں جوں ان خوبیوں پر غور کرتا ہے' اس کی پسندیدگی بڑھتی جاتی ہے- وہ اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ پاتا ہے اور بالآخر' اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کے رفیق زندگی بن سکیں تو سفر حیات نہایت خوشگوار ہو جائے- آپ دیکھیں گے کہ اس نتیجہ تک پہنچنے میں اس کے جذبات کو دخل نہیں ہوگا- اس میں اس کی قوت فکر (REASONING) کار فرما ہوگی- نتیجہ اس کا یہ کہ وہ اپنی اس پسندیدگی میں (خواہ وہ کتنی ہی شدت تک کیوں نہ پہنچ جائے) کبھی اپنے ہوش و حواس نہیں کھوئے گا- وہ کبھی ایسی حرکتیں نہیں کرے گا جس پر دنیا ہنسے- اگر ایسی صورت پیدا ہو کہ وہ اس سے شادی نہ کرسکے تو وہ کبھی پاگل نہیں ہو جائے گا' نہ ہی خود کشی کرے گا- (ہوسکتا ہے کہ ان خوبیوں کے ساتھ فریق ثانی کی جسمانی خوبصورتی بھی وجہ پسندیدگی ہو' لیکن یہ ثانوی چیز ہوگی- یہ پسندیدگی ایسی ہی ہوگی جیسے ہم تاج محل یا گلاب کے پھول کو پسند کرتے ہیں)-

اس کے برعکس' آپ کسی لڑکی کی صرف جسمانی ساخت سے مسحور ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ آپ کی ہو جائے- یہ خالص جنسی ہیجان ہے- اسے (LOVE) کہہ کر اپنے آپ کو اور معاشرہ کو دھوکا نہیں دینا چاہئے- آپ دیکھیں گے کہ اس میں آپ کی قوت فکر (REASONING) کو کوئی دخل نہیں ہوگا- یہ کشش خالص جنسی جذبات پر مبنی ہوگی اور جوں جوں بڑھتی جائے گی آپ اپنا دماغی توازن کھوتے چلے جائیں گے- اگر وہ آپ کو نہیں مل سکتی تو ہوسکتا ہے کہ آپ پاگل ہو جائیں یا خود کشی کرلیں- یہی وہ (جنسی ہیجان پر مبنی)"LOVE" ہے جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ ع

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!

یہ وہ "دماغی خلل" ہے جس کی شدت سے (MATING SEASON) میں بیل' اس دروازے کو ٹکریں مارا کرتا ہے جس کے اندر گائے بندھی ہو- اس یکسر حیوانی ہیجان کو مقدس تصور کرنا (LOVE کو بڑا مقدس جذبہ سمجھا جاتا ہے) یا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنا' حیوانیت کو تقدس کا لبادہ اوڑھانا ہے-

پوچھا جاسکتا ہے کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ یہ کشش' لڑکی کی خوبیوں کی بنا پر ہے یا اس کا جذبہ محرکہ جنسی ہیجان ہے- سو اس کی موٹی سی پہچان یہ ہے کہ اگر آپ کا جی یہ چاہتا ہے کہ اس لڑکی کے جسم سے لمس کیا جائے تو یہ خالص جنسی ہیجان ہے- جنسی ہیجان میں جسمانی کشش ہوتی ہے اور شدت سے جسمانی لمس کی خواہش---- آپ نے

دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں "محبت کے گیتوں" میں "گلے سے لگا لوں" اور "سینے سے لپٹا لوں" کی کس قدر بھرمار ہوتی ہے۔ یہ سب جنسی ہیجان کے مظاہرے ہیں جس کی آخری شکل کو "ہم آغوشی" کی "مہذب" اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (جس جسمانی خوبصورتی میں یہ خواہش پیدا نہ ہو، اس میں جنسی جذبہ کا دخل نہیں ہوتا۔ کسی کی بیٹی یا بہن کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اس کے جسم کے ساتھ جسم لگانے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں آئے گا)۲۔

اگر اس دماغی خلل (یا جنسی ہیجان) میں لڑکی لڑکا، دونوں مبتلا ہیں تو اس سے اس فریب کا پردہ اور بھی دبیز ہو جائے گا۔۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال کے افسانوں کو ہمارے ہاں کس قدر "تقدیس" حاصل ہو چکی ہے۔ یہ سب ہمارے "دماغی خلل" کا نتیجہ ہے۔ انہی کا اعادہ اب ہمارے ہاں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں ہو رہا ہے۔ وہ جب اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اسے (LOVE MARRIAGE) قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ اس (LOVE) کی عمر اتنی ہی ہوتی ہے جتنی جنسی ہیجان کی شدت کی۔ اس کے بعد، جب یہ آندھی اتر جاتی ہے تو یہ "فریفتگان" ایک دوسرے میں کوئی ہم آہنگی نہیں پاتے۔ پہلے آپس میں بے رغبتی پیدا ہوتی ہے، پھر ایک دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور یوں اس (LOVE MARRIAGE) کی ہنڈیا بیچ چوراہے پھوٹتی ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ (LOVE) کے یہ مظاہرے جنسی ہیجان کا نتیجہ تھے، یہ بھی ہے کہ جس شخص میں قوت رجولیت نہ ہو (یعنی وہ IMPOTENT ہو) اس میں اس قسم کی (LOVE) کے جذبات کبھی بیدار نہیں ہوتے۔

اس دماغی خلل کی بدترین شکل وہ ہوتی ہے جس میں لڑکا یا تو پاگل ہو رہا ہو اور لڑکی اس کی طرف مائل نہ ہو بلکہ اس سے گریز اور نفرت کرے۔ آپ سوچئے کہ اس صورت میں یہ خواہش اور کوشش کہ وہ لڑکی میری ہو جائے، کس قدر بہیمانہ ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ یہی کچھ کوئی گنوار اور غیر مہذب نوجوان کرے تو اسے معاشرہ اغوا (یا اغوا کی کوشش) سے تعبیر کرتا ہے اور وہی کچھ "مہذب" نوجوان کرے تو اسے (LOVE) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ (LOVE) یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ لڑکی، بیوی بننے کے بعد، اس سے اور نفرت کرتی ہے اور کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔ لیکن یہ صاحب اسے زبردستی اپنے ساتھ باندھے رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں (I LOVE HER)۔ اس درندہ سے کوئی پوچھے کہ تمہیں اس حیوانی ہیجان کو (LOVE) کہتے ہوئے شرم نہیں آتی!

لیکن اس نوجوان سے کیا کہا جائے۔ محبت کی یہ روش تو ہمارے "بزرگوں" سے چلی آرہی ہے۔ ہماری (غزل کی) ساری شاعری اسی قسم کی محبت کی مظہر ہے۔ تفصیل میں جانے کے لئے، تو اس پر کتابوں کی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن انحصار کو لیجئے تو غالب نے اسے ایک مصرعہ میں سمو کر رکھ دیا ہے جب کہا ہے کہ

۲۔ واضح رہے کہ بچے کو پیار سے چومنا یا گلے لگانا۔ یا اپنی جوان بیٹی کو شفقت کے ساتھ بانہوں میں لے لینا "جسمانی لمس" میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس میں آپ وہ لذت محسوس نہیں کریں گے جو اس لڑکی کے ساتھ جسمانی لمس سے کریں گے، جس سے آپ کو 'LOVE' ہے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

اور اس کے بعد بڑی سادگی سے پوچھتے ہیں کہ

یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے!

حضرت! ماجرا اس کے سوا کیا ہے کہ آپ اس سے زبردستی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے اس زبردستی کو خاموشی سے برداشت کرتی رہتی ہے اور جب آپ کی طرف سے نوبت پیش دستی تک جاتی ہے تو ادھر سے دھول دھپا شروع ہو جاتا ہے ۳۔ آپ اسے بے وفا کہتے ہیں' ستم کوش کہتے ہیں' جفا پیشہ قرار دیتے ہیں' اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ کس بنیاد پر؟ اس پر کہ جب ہم اس سے محبت کرتے ہیں تو وہ ہم سے محبت کیوں نہیں کرتی۔ آپ نے محبت کی اس منطق کو ملاحظہ فرمایا؟ منطق یہ ہے کہ جس سے ہم محبت کریں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہم سے محبت کرے' خواہ ویسے اسے ہم سے نفرت ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی اس نفرت کا ثبوت خود ان کے اپنے پاس ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ اسے یہ "رقیب روسیاہ" کہتے ہیں۔ پہلے کوشش کی جاتی ہے کہ ان دونوں میں کسی طرح چشمک ہو جائے۔ اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو رقیب روسیاہ کی موت کی دعائیں مانگی جاتی ہیں اور جب یہ بھی نہیں ہوتا تو پھر انتہائی بے غیرتی سے اس مفاہمت پر اتر آتے ہیں کہ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ہماری ساری غزل کی شاعری کی بنیاد (THEME) ہی یہ ہے' اس لئے اگر آج کا نوجوان کسی معصوم لڑکی کو زبردستی اپنی گرفت میں لانا' اور لانے کے بعد جبراً" اپنے قابو میں رکھنا چاہتا ہے' تو وہ اپنے انہی "بزرگوں" کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ لیکن یہ طرح ہمارے مشرقی شعراء اور ادباء نے ڈالی ہو یا اب مغرب سے مستعار لی گئی ہو--- صاف الفاظ میں' جنسی بے راہروی کے سوا کچھ نہیں--- اور جن الفاظ میں اس کا اظہار کیا جاتا ہے وہ اس جنسی ہیجان کا زندہ ثبوت ہوتے ہیں۔ جس "محبوبہ" کی تعریف یہ کہہ کر کی جائے کہ

بہار بستر و نوروز آغوش

اس سے "محبت" کے دعویٰ کو جنسی ہیجان نہیں تو اور کیا کہا جائے گا۔ یہ حضرات اس جذبہ کا اظہار شعر میں کرتے تھے۔ ہمارا آج کا نوجوان اس کا اظہار سیٹیاں بجا بجا کر کرتا ہے۔ نام اس کا دونوں ہی (LOVE) رکھتے ہیں۔

یہ سارے تصورات ہماری جنسی بد نہادی کے دور کے پیدا کردہ تھے۔ انہیں اب مغرب کی ہوسناکیوں نے اور جلا دے دی ہے اور آج اس بے حیائی کا نام (LOVE) رکھ لیا گیا ہے جس سے انسانیت کی نگاہیں جھک جائیں۔ ہمارا پرانا معاشرہ اس شاعری کی داد دے کر ذہنی لذت حاصل کرتا تھا۔ نوجوانوں نے اسے عملی شکل دے دی۔ ہمارے شعراء کی روحیں' ان سعادت مند نوجوانوں کے ایسے "کامیاب عشق" پر یقیناً" داد کے ڈونگرے برساتی ہوں گی کہ شاباش بیٹو۔

۳۔ دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

یہ ہے ہمارے عزیز! اس (LOVE MARRIAGE) کی حقیقت---- جس معاشرہ نے اپنے نوجوانوں کو نہ صحیح تعلیم دی ہو' نہ ان کی صحیح تربیت کی ہو' دوسری طرف ان کے سامنے اسلام وہ پیش کیا جائے جو ہمارے جنسی بد نہادی کے دور کا پیدا کردہ ہے اور جس میں جنسی تعلقات کی ایسی ایسی شکلوں کے لئے جواز کے فتوے دے دیئے جاتے ہیں' جن سے حیاء کی نظریں زمین میں گڑ جائیں' اس میں اس قسم کی بے حیائیاں عام نہیں ہوں گی تو اور کیا ہوگا۔ اور یہ تو ابھی ابتدا ہے---

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

لیکن اس ضمن میں ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر کوئی "حرمزدگی" کرنا چاہتا ہے تو اسے (کم از کم) "حرمزدگی" سمجھے اور کہے---- اسے (LOVE) کا "مقدس نقاب" تو نہ اوڑھائے۔ لیکن اگر ان کے مقدس بزرگ جبری اختلاط کو شرعی جواز کی سند تک عطا کردیں اور ان کے شعراء اسے محبت کہہ کر پکاریں' تو یہ اسے (LOVE) سے کیوں نہ تعبیر کریں!

ایں خانہ ہمہ آفتاب است!

یاد رکھئے! (MARRIAGE) کہلانے کا مستحق صرف وہی رشتہ ہے جس کی بنیاد قلبی اور ذہنی خصوصیات و تصورات کی ہم آہنگی ہو۔ اگر یہ بنیاد ابتداء ہی میں نہیں' تو وہ (MARRIAGE)' (MARRIAGE) نہیں۔ اور اگر (MARRIAGE) کے بعد وہ رشتہ باقی نہیں رہا تو اس کے بعد' وہ (MARRIAGE) بھی باقی نہیں رہتی۔

(ستمبر ۱۹۶۸ء)

۴۔ عورتوں کا زبردستی خاوند بنے رہنا!

(کیا اس قسم کا اختلاط جائز قرار پاسکتا ہے؟)

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب فکر و صاحب قلم بزرگ نے ایک نہایت اہم اور اس کے ساتھ ہی نہایت نازک سوال دریافت کیا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ

ان کے ہاں ایک میاں بیوی میں ایسا اختلاف پیدا ہوا ہے جس نے ایک پیچیدہ صورت پیدا کردی ہے۔ بیوی نہایت شریف' سمجھ دار' تعلیم یافتہ اور متین اور سنجیدہ ہے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد اس نے دیکھا کہ اس میں اور اس کے شوہر میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ اس کے برعکس' اس میں ایسی عادات خبیثہ ہیں جن سے ہر شریف انسان کی طبیعت ابا کرے۔ بیوی نے کافی عرصہ تک کوشش کی کہ اس شخص میں کچھ اصلاح ہو جائے---- لیکن بے سود۔ بالآخر' اس نے خاوند سے کہا کہ ہمیں خوش

۴؎ اس سلسلہ میں اس سے اگلا عنوان ملاحظہ فرمایئے۔

اسلوبی سے الگ ہو جانا چاہئے لیکن وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ بیوی نے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن عدالت نے بعض قانونی اسقام کی بنا پر نکاح کی تنسیخ نہ کی۔ اس پر اس نے تنگ آکر خود ہی علیحدگی اختیار کرلی تو خاوند نے حقوق زنا شوئی کی بازیابی (RESTITUTION OF CONJUGAL RIGHTS) کا دعویٰ کردیا اور عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ اب وہ محترمہ کہتی ہیں کہ ان حالات میں، خاوند کے ساتھ جنسی اختلاط سے اس کے اندر عجیب قسم کی نفسیاتی الجھن پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی طبیعت مانتی ہی نہیں کہ اس قسم کا جبری اختلاط جائز قرار پاسکتا ہے۔ وہ یوں سمجھتی ہے جیسے اس کے ساتھ "زنا بالجبر" کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ وہ پوچھتی ہے کہ اس قسم کے جنسی اختلاط کو کیا کہا جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ سوال کس قدر اہم اور نازک ہے۔ ملا کا تو صاف جواب ہوگا کہ جب تک نکاح منسوخ نہیں ہوتا، خاوند کو اختلاط کا حق حاصل ہے اور بیوی پر اس کے حکم کی تعمیل فرض ہے۔ لیکن وہ محترمہ قرآن کی عدالت سے جواب مانگتی ہے۔ اس جواب تک پہنچنے سے پہلے، ایک تمہید کی ضرورت ہے۔

نزول قرآن سے پہلے، مرد اور عورت کے تعلقات کی ایک صورت یہ تھی کہ مرد، عورتوں کو جنگ سے پکڑ کر لے آتے یا بازار سے خرید کر اور پھر اس کے ساتھ جنسی اختلاط قائم رکھتے۔ اس عورت کو لونڈی کہا جاتا جو مالک کو چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتی تھی، یعنی اس کے ساتھ جنسی اختلاط بلا اس کی رضا مندی کے ہوتا تھا۔ وہ اس کے لئے مجبور تھی، البتہ جب مالک کا جی بھر چکتا تو وہ اسے کسی دوسرے کو دے دیتا، یا فروخت کردیتا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں عورت کو کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ کلی اختیار مرد کو تھا۔

یا یہ سلسلہ وہاں کے رسم و رواج کے مطابق، نکاح کے ذریعے قائم ہو جاتا۔ نکاح میں بھی عورت کی رضا مندی محض رسمی ہوتی تھی۔ لیکن یہ رسمی رضا مندی بھی اس کے بعد ختم ہوجاتی تھی۔ یا تو وہ نکاح مدت العمر کے لئے ہوتا تھا اور اگر ایسا نہیں تھا تو عورت کو چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایسی مشکلات میں سے گزرنا پڑتا تھا جن کے پیش نظر وہ اس مرد کے ساتھ مجبوراً" زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے دیتی تھی۔۔۔ مرتی کیا نہ کرتی؟

قرآن آیا اور اس نے انسانیت کش، حیا سوز طریق کو باطل قرار دیا اور کہا کہ ازدواجی تعلق باہمی رفاقت کا ہے اور رفاقت کے لئے ہر قسم کی ہم آہنگی اور یک جہتی ضروری ہے۔ اس رفاقت کا ایک مقصد بقائے نسل انسانی بھی ہے، لیکن اس سے مقصود صرف بچے پیدا کرنا نہیں، بلکہ بچوں کو ضروری تعلیم و تربیت سے "انسان" بنانا بھی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب میاں بیوی کے تعلقات رفاقت کے ہوں۔ جب میاں بیوی میں باہمی رفاقت نہ رہے تو رشتہ ازدواج کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب رشتہ ازدواج ہی باقی نہیں رہتا تو جنسی اختلاط کا سوال کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ رشتہ ازدواج کے اس طرح ختم ہو جانے کے بجائے، اس نے معاشرتی اغراض کے پیش نظر

ایک قاعدہ مقرر کردیا جسے طلاق کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح اس رشتہ کے شروع میں' استوار کرنے کے لئے مرد اور عورت کی رضا مندی کی ضرورت تھی' اسی طرح اسے قائم رکھنے کے لئے بھی دونوں کی رضا مندی ضروری ہے۔ جس طرح یہ صورت ہے کہ اگر فریقین میں سے کوئی ایک' اسے برقرار رکھنے پر رضا مند نہ رہے تو یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس میں جبر کا سوال نہ ابتداء میں تھا' نہ بعد میں۔ قرآن کریم نے اس رشتہ کی استواری (یا معاہدہ) کے لئے

(۱) مردوں کی رضا مندی یہ کہہ کر ضروری قرار دے دی کہ

فانکحوا ما طاب لکم من النساء (۴/۳)

اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کرو۔

(۲) عورتوں کی رضا مندی یہ کہہ کر ضروری قرار دے دی کہ

لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا (۴/۱۹)

تمہارے لئے یہ قطعاً" حلال نہیں کہ تم عورتوں کی مرضی کے بغیر زبردستی ان کے مالک بن جاؤ۔

اس کے بعد اس نے کہہ دیا کہ اس رضا مندی کے یہ معنی نہیں کہ جب ایک دفعہ تم نے رضا مندی کا اظہار کردیا تو اس کے بعد تمہارا کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔۔۔ یعنی اس کے بعد تمہاری رضا مندی رہے یا نہ رہے' تمہیں بہر حال' اس رسی میں جکڑے رہنا ہوگا۔ قطعاً" نہیں۔ اس نے کہا کہ یہ رضا مندی تو ایک ایک سانس کی رضا مندی ہے۔ جب بھی تم میں سے کسی فریق کی رضا مندی نہ رہے' یہ معاہدہ کالعدم قرار پا جائے گا۔ اس طرح اس نے مرد اور عورت کو (اس معاہدہ کے سلسلہ میں) برابر کے فریق قرار دے کر' شرف و احترام انسانیت کی حسین بنیاد رکھ دی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے غلامی کا دروازہ بند کرکے' لونڈیوں کا وجود بھی ختم کردیا۔

یوں عورت کی رضا مندی کے بغیر جنسی اختلاط کا سوال باقی نہ رہا۔

قرآن نے اس رضا مندی کو کس قدر اہمیت دی تھی' اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ ابتدائے اسلام میں جب مکہ کی وہ مسلمان عورتیں جو اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ آگئیں' اس جذبہ کے تحت کہ فکر و نظر کی ہم آہنگی ختم ہوجانے کے بعد ازدواجی رشتہ باقی نہیں رہ سکتا' تو خدا نے ان کے اس فیصلہ پر صاد کیا اور قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ان کا ان خاوندوں کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اور اسلامی معاشرہ سے کہہ دیا کہ ان کے خاوندوں نے جو کچھ ان پر خرچ کیا ہے وہ انہیں واپس لوٹا دو اور انہیں اپنے ہاں بصد عزت و احترام رکھو۔

---------○---------
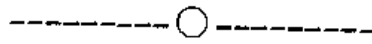
قرآن نے یہ کیا۔ لیکن جب اس کے بعد' مسلمانوں کے عہد ملوکیت میں' جنسی ہوسناکی اور بد نہادی کی رسیاں دراز ہونے لگیں تو انہوں نے قرآن کو لپیٹا خلافوں میں' اور پہلے' اپنے حرم میں لونڈیاں لے آئے اور اس کے بعد

معاہدۂ نکاح کا ایسا حلیہ بگاڑا جس سے (قرآن کی نص صریح کے خلاف) عورت کا زبردستی مالک بنے رہنا' عین حلال قرار پاگیا اور کہہ دیا کہ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے جس وقت اس کی رضا مندی نہ رہے' نکاح کا رشتہ فسخ کردے لیکن عورت کو اس کا حق حاصل نہیں۔ اسے اس کے لئے' عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا اور عدالت نے اپنے دروازے پر قسم قسم کی حیلہ جوئیوں کے اتنے اتنے بڑے تالے ڈال دیئے جن کا کھولنا عورت بیچاری کے بس کی بات نہ ہو۔ یوں عورت کو پھر سے اسی مقام پر لاکھڑا کردیا گیا جس پر وہ قرآن نازل ہونے سے پہلے تھی' یعنی اس کی رضا مندی ہو یا نہ ہو' مرد کو اس سے جنسی اختلاط کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ اس سے انکار کرتی ہے تو اس پر قانون کا کوڑا برسا دیا جاتا ہے۔ سوچئے کہ اس قسم کا کوئی قانون' خدا اور رسولؐ کی منشاء کے مطابق ہو سکتا ہے؟

ہمارے یہی قوانین اب تک چلے آرہے تھے کہ پاکستان میں بعض با حمیت حلقوں کی طرف سے ان کے خلاف آواز بلند ہوئی اور حکومت نے' ان میں ترمیم و تنسیخ کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ طلوع اسلام نے اس سلسلہ میں مسلسل کوشش کی کہ یہ قوانین قرآن کی منشاء کے مطابق از سرنو مرتب ہو جائیں جن کی رو سے' کوئی عورت نہ کسی مرد سے اپنی مرضی کے خلاف نکاح کرنے پر مجبور کی جائے اور نہ ہی وہ اپنی مرضی کے خلاف اس کے نکاح میں رہنے کے لئے مجبور ہو' یعنی جس طرح مرد کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے اس معاہدہ کو فسخ کردے' اسی قسم کا حق عورت کو بھی مل جائے تاکہ اسے اس کی مرضی کے خلاف جنسی اختلاط پر مجبور نہ کردیا جائے۔ طلوع اسلام نے بڑی جدوجہد کی لیکن قانون وضع کرنے والے حضرات صرف اتنی سی ترمیم پر رضا مند ہوئے کہ نکاح نامہ کے فارم پر ایک شق یہ بھی رکھ دی گئی کہ

> کیا شوہر نے عورت کو طلاق کا حق تفویض کردیا ہے' اور اگر کردیا ہے تو کن شرائط کے ماتحت۔

یعنی طلاق کا حق تو بدستور خاوند کے پاس ہی رہا' لیکن اسے اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاہے تو نکاح کے وقت اسے بیوی کو تفویض کردے۔ چنانچہ اب صورت یہ ہے کہ

(۱) جن نکاں ناموں میں اس سوال کے سامنے لکھ دیا جاتا ہے کہ "بلا مشروط تفویض کردیا گیا" ان میں' عورت کو فسخ نکاح میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ وہ جب جی چاہے اپنے اس حق کا استعمال کرکے' معاہدۂ نکاح فسخ کرسکتی ہے۔ (اس کے لئے عائلی قوانین۵۔ میں طریق کار مذکور ہے) لیکن

(۲) جن نکاح ناموں میں ایسا نہیں لکھا جاتا یا جو نکاح ہی ان قوانین کے نافذ ہونے سے پہلے عمل میں آچکے تھے' ان میں فسخ نکاح کے لئے عورت کو عدالت میں جانا پڑتا ہے اور وہاں مرد (انتقاماً) ایسا کیچڑ اچھالتے ہیں کہ اس شریف زادی کو اپنا

۵۔ یہ ۱۹۶۱ء کے عائلی قوانین کہلاتے ہیں۔

دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض تو تنگ آکر اپنے دعویٰ ہی سے دستبردار ہوجاتی ہیں اور اکثر صورت میں' قانونی موشگافیوں کی بنا پر' فیصلہ عورت کے خلاف صادر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد عورت' جنسی اختلاط پر رضا مند نہ ہو تو پھر حقوق زنا شوئی (CONJUGAL RIGHTS) کا ڈنڈا اس کے سر پر ہوتا ہے۔ (ہم تو سمجھتے ہیں کہ جنسی اختلاط کو بطور استحقاق طلب اور حاصل کرنا بجائے خویش ایسا حیا سوز تصور ہے جسے شرف انسانیت برداشت نہیں کرسکتا)۔

------------ ○ -----------

اس پس منظر میں آپ میاں بیوی کے ان جنسی تعلقات کا جائزہ لیجئے جس کی مثال شروع میں دی گئی ہے۔ اس میں عورت اس مرد کے ساتھ جنسی اختلاط کے لئے مجبور کردی جاتی ہے جس سے اسے سخت نفرت ہوتی ہے۔ ہم (اپنی واجب الاحترام خواتین--- ماؤں' بہنوں' بیٹیوں--- سے بصد معذرت) عرض کریں گے کہ آپ سوچئے کہ جسے (RAPE) کہتے ہیں' کیا وہ یہی نہیں ہوتا کہ عورت سے اس کی مرضی کے خلاف' جبراً'' جنسی اختلاط کا ارتکاب کیا جاتا ہے؟ اس میں اور اس مثال میں فرق اتنا ہی ہے تا کہ اس میں' اس جبری فعل کو ہمارا مروجہ قانون (RAPE) نہیں کہتا۔ لیکن کیا یہ ضرور ہے کہ جس چیز کو کسی ملک کا مروجہ قانون ناجائز قرار نہ دے' وہ عدالت خداوندی میں بھی ناجائز قرار نہ پائے؟ اب سوال یہ ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ سو اس کا ذمہ دار معاشرہ کا غلط قانون ہے جو عورت کو جکڑ کر' باندھ کر ایسی حالت میں رکھ دیتا ہے جس سے اس کی غیرت بغاوت کرتی ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اس سے معصیت کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔

اے اس معاشرہ میں بسنے والو! خدا کے غضب سے ڈرو!

------------ ○ -----------

لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ہمارے ہاں کتنے گھرانے ایسے ہیں جن میں بیوی خاوند کے ہاتھوں تنگ آچکی ہوتی ہے۔ وہ اس سے نفرت کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی بیوی بن کر رہنے پر مجبور ہوتی ہے؟ کس بات نے مجبور؟ اس بات سے کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے تو کھائے کہاں سے اور جائے کہاں؟ (ہم پھر بصد معذرت عرض کرتے ہیں کہ) معاشرہ میں جو بدنصیب عورتیں جسم فروشی کے لئے مجبور ہوجاتی ہیں' کیا ان کی مجبوریاں اسی قسم کی نہیں ہوتیں؟ کیا وہ بھی (یا ان میں سے اکثر) اقتصادی احتیاج یا عدم حفاظت کی وجہ سے ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں ہوتیں؟ اگر اس قسم کی مجبوری کے تحت جنسی تعلق ناجائز قرار پاتا ہے تو ایسی ہی مجبوری کے ماتحت' گھر میں رہنے والی عورت کے ساتھ جنسی تعلق کس طرح جائز قرار پا جائے گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس تعلق کو بھی مروجہ قانون' جائز قرار دیتا ہے لیکن کیا انسانیت کی عدالت (جس کے میز پر خدا کی کتاب ہوتی ہے) عورت کے احساسات کے پیش نظر' ان دونوں میں کچھ بھی فرق کرے گی؟ یہی ہیں وہ انسانوں کے خود وضع کردہ قوانین جنہوں نے ہمیں دنیا میں کہیں

منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا اور ہمارے ساتھ خود اسلام کو بھی رسوا کردیا۔

یہ تو رہیں بے چاری مجبور و مقہور عورتیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ جو مرد--- یہ جانتے ہوئے کہ ان کی بیوی ان کے ساتھ رہنے پر قطعاً" رضا مند نہیں--- انہیں باندھ کر رکھتے ہیں اور اس طرح ان سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں' کیا وہ انسان کہلانے کے مستحق ہیں؟ انسان تو ایک طرف' وہ حیوان کہلانے کے بھی مستحق نہیں۔ حیوانات میں جبری جنسی اختلاط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور پھر یہ سوچئے کہ عورتوں کو اس طرح مجبور رکھ کر جو اولاد پیدا کی جائے گی--- یعنی جو بچے ایسی ماؤں کی آغوش میں پرورش پائیں گے جو اس قسم کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوگی--- ان بچوں کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوگی؟

شاید آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جو عورتیں معاشی احتیاج یا عدم حفاظت کی بنا پر ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں' ان کی مشکل کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ اس کا حل بھی قرآن نے بتایا ہے۔ اس نے سلسلہ ازدواج کے منقطع کئے جانے کے سلسلہ میں جو احکام دیئے ہیں' ان میں عورت سے کہا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کرتے وقت اس خیال سے مت گھبراؤ کہ میں کھاؤں گی کہاں سے اور جاؤں گی کہاں؟ **ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا لا و یرزقہ من حیث لا یحتسب** (۶۵/۲-۳) جو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرے گا' خدا اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دے گا اور اس مقام سے سامان زندگی عطا کرے گا جس کا وہ خیال بھی نہیں کر سکتی--- ظاہر ہے کہ اس قسم کی ذمہ داریاں جو خدا اپنے اوپر لیتا ہے' انہیں وہ حکومت پورا کرتی ہے جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے' یعنی یہ معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ ایسا انتظام کرے کہ یہ عورتیں نہ محتاج رہنے پائیں نہ غیر محفوظ--- آپ نے غور فرمایا کہ قرآن' عورتوں کو جبری اختلاط سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا کیا انتظامات تجویز کرتا ہے؟ جو معاشرہ ایسا انتظام نہیں کرتا' اس قسم کے خلاف انسانیت افعال شنیعہ کی تمام ذمہ داری اس کے اوپر عائد ہوتی ہے۔ کیا معلوم ان معصوم پابند سلاسل خواتین کی خاموش آہیں' اس معاشرہ پر کس قسم کی آگ بن کر برسیں! اور ہمارے ہاں تو یہ آگ بجلی بن کر برس رہی ہے جس سے عائلی زندگی جہنم بن رہی ہے۔

یہ معاشرہ یہ کہہ کر اس جرم کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا کہ اس نے ان جرائم کو قانوناً" جائز قرار دے رکھا ہے۔ یاد رکھئے! سنکھیا' سنکھیا ہی رہتا ہے خواہ اسے قانوناً" قند ہی قرار دے دیا جائے--- سنکھیا اور قند کے پرکھنے کا معیار' خدا کی کتاب ہے نہ کہ معاشرہ کے مروجہ قوانین۔

------------ ○ ------------

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اس کے لئے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اس وقت قانونی طور پر صورت یہ ہے کہ

(۱) عائلی قوانین کے مطابق' نکاح نامہ کے فارم میں ایک شق یہ بھی ہوتی ہے کہ

کیا شوہر نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کردیا ہے؟ اگر کردیا ہے تو کن شرائط

کے ماتحت؟

اگر اس شق کا جواب "ہاں" میں لکھ دیا جائے (یعنی بلا مشروط تفویض کردیا گیا ہے) تو پھر بیوی کے لئے کسی درندہ صفت خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوسکتی۔

(۲) لیکن اگر اس شق کے سامنے کچھ نہیں لکھا گیا یا جواب نفی میں لکھا گیا ہے' یا نکاح عائلی قوانین کے نافذ ہونے سے پہلے (یعنی ۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء سے پہلے) عمل میں آچکا تھا تو پھر بیوی کو فسخ نکاح کے لئے عدالت میں جانا ہوگا۔ "قانون تنسیخ نکاح" میں بہت سی وجوہات دی ہوئی ہیں جن کی بناء پر عدالت فسخ نکاح کا فیصلہ دے سکتی ہے۔ لیکن اس میں عورت بے چاری کو بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں--- دشواریاں ہی نہیں' مرد کی طرف سے وضع کردہ خواریاں بھی--- یہی وہ دشواریاں اور خواریاں ہیں جن کے پیش نظر یہ مظلوم بیچاریاں' ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتی ہیں لیکن کچہری میں جانے کی جرات نہیں کرتیں۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ موجودہ قانون کی جگہ ایسا قانون نافذ کر دیا جائے جس کی رو سے' نکاح کا معاہدہ کالعدم کرنے کا جیسا حق خاوند کو ہے' ویسا ہی بیوی کو حاصل ہو۔ اس قسم کا قانون نہ صرف بڑا معقول اور مبنی پر عدل و انصاف ہے' بلکہ قرآن کریم کے بھی عین مطابق ہے۔ جس معاہدہ کے استوار کرنے میں فریقین مساوی سطح پر ہوں' اسے فسخ کرنے میں بھی انہیں مساوی سطح پر ہونا چاہئے۔ لہٰذا' جیسا قانون مرد کے لئے' ویسا ہی عورت کے لئے ہونا چاہئے۔ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ' جب (عائلی قوانین کی تدوین کے زمانے میں) یہ ترمیم طلوع اسلام کی طرف سے پیش کی گئی تو اس کی کس قدر مخالفت ہوئی تھی--- ظاہر ہے کہ یہ مخالفت مردوں ہی کی طرف سے تھی (اور بدقسمتی سے ملا بھی سب مرد ہی ہوتے ہیں)۔ مردوں کی حالت عجیب ہے۔ جب ان کے سامنے عورتوں کے حقوق کا ذکر آئے تو "عورت" سے ان کا خیال صرف بیوی کی طرف جاتا ہے-- اور ظاہر ہے کہ جو عورت بیوی کی حیثیت سے مرد کی گرفت میں آچکی ہو' مرد اس کے لئے "حقوق کی تائید" کیسے کرے گا--- بقول اقبالؒ

دل شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

"عورت" سے ان کا دھیان اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی طرف نہیں جاتا۔ مرد' عورت پر حکومت کے جذبہ کے نشے میں بدمست ہوکر' کس طرح ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ہمارے ہاں اکثریت ان باپوں کی ہے جن کی بیٹیاں' دوسرے گھروں میں' انہی مشکلات میں گرفتار ہیں اور ان کے غم میں خود باپ بھی گھلتا رہتا ہے اور ہزار جتن کرتا ہے کہ اس سے چھٹکارا کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لیکن جب انہی باپوں کے سامنے اس قسم کی معقول تجویز آتی ہے تو ان کے ذہن میں پھر اپنی بیوی آجاتی ہے اور وہ اس کی مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں---- اس کی مخالفت کرتے ہیں اور پھر بیٹیوں کی مصیبتوں کا رونا رونے لگ جاتے ہیں۔ آپ نے اس سے بڑھ کر بیوقوف قوم بھی دیکھی ہے؟ عائلی قوانین کے زمانے میں ہمیں اس کا عملی تجربہ ہوا۔ ہماری اس تجویز کی مخالفت ان مردوں کی طرف سے

بھی ہو رہی تھی جن کی بہنیں اور بیٹیاں خود اسی مصیبت کا شکار تھیں۔

لیکن اس سے زیادہ موجب حیرت و تاسف یہ حقیقت تھی کہ ہم نے اچھی اچھی پڑھی لکھی خواتین کے سامنے بھی جب یہ تجویز پیش کی تو انہوں نے اس سے اتفاق کیا--- بلکہ ہمیں بڑے بڑے دلسوز واقعات بھی سنائے جن میں عورتیں اس قسم کی مصیبتیں بھگت رہی تھیں--- لیکن اس کے باوجود' کسی نے اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔

(نوٹ : یہ شذرہ ستمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب (اواخر ۱۹۷۶ء میں) حکومت کی طرف سے حقوق نسواں کمیٹی مقرر ہوئی ہے جو عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے سفارشات مرتب کر رہی ہے۔ طلوع اسلام ان سفارشات کی تائید کرتا ہے اور مذہب پرست طبقہ کی طرف سے حسب سابقہ ان کی مخالفت ہو رہی ہے)۔

------------ ○ ------------

۵- نابالغ لڑکی کی شادی

(مودودی صاحب کا فتویٰ)

راولپنڈی سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

ترجمان القرآن' بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کے صفحہ ۸۹ پر مودودی صاحب رقمطراز ہیں کہ

"اس جگہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق عدت کا سوال اس عورت کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے جس سے شوہر خلوت کرچکا ہو۔ کیونکہ خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں سرے سے کوئی عدت ہے ہی نہیں (الاحزاب۔ ۴۹)۔ اس لئے ایسی لڑکیوں کی عدت بیان کرنا جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو' صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کردینا جائز ہے' بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز کو قرآن نے جائز قرار دیا ہو' اسے ممنوع قرار دینے کا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا"۔

خط کشیدہ الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مودودی صاحب صغر سنی کے نکاح کا جواز پیش کرتے ہوئے نابالغ لڑکی سے خلوت صحیحہ کرنے کو بھی جائز اور درست قرار دے رہے ہیں اور اس بہیمانہ فعل کو قرآنی سند کا سہارا دینے کی کتنی ناپاک جسارت کی گئی ہے۔ مفکر اسلام کی اس تفہیم قرآنی کے سلسلہ میں طلوع اسلام میں تبصرہ فرمایا جائے تاکہ جمہور مسلمان ان کی قرآن فہمی' تدبر فی الدین اور اجتہادی بصیرت کو ملاحظہ فرما کر اپنی عاقبت کو سنوارنے کا بروقت انتظام کرسکیں اور سید صاحب

کے تفقہ فی الدین کا طنطنہ اور غلغلہ سب پر آشکارا ہو جائے۔

طلوع اسلام

سوال مودودی صاحب کی قرآن فہمی' تدبر فی الدین' اجتہادی بصیرت اور ان کے طنطنہ اور غلغلہ کا نہیں۔ اصل سوال اس نفسیاتی مرض کا ہے جس میں اس قسم کے حضرات بد قسمتی سے مبتلا ہوجاتے ہیں جس سے ان کی ذہنیت مسخ ہوجاتی ہے اور وہ اس قسم کے فتوے دیتے رہتے ہیں کہ

۱۔ جنگ میں دشمن کی جو عورتیں قید ہو کر آئیں انہیں سپاہیوں میں تقسیم کردیا جائے۔ وہ ان سے بلا نکاح اور بلا قید تعداد' جنسی تعلقات قائم کریں اور جب جی بھر جائے تو انہیں کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیں۔ یا

۲۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ سمندر میں جہاز غرق ہو جائے تو اس کی سواریوں میں سے ایک مرد اور ایک عورت بچ کر کسی جزیرے میں جا اتریں تو وہ وہاں عارضی "نکاح" کرکے جنسی اختلاط کرتے رہیں۔ یا

۳۔ جو شخص اپنے جنسی جوش سے مغلوب ہو کر استمنا بالید (MASTURBATION) کرلے تو خدا اسے سزا نہیں دے گا۔ یا

۴۔ کفار کی جو لڑکیاں کم سنی میں وفات پا جائیں گی وہ جنت میں حوریں بن کر مومنین کے تصرف میں آجائیں گی۔

(مودودی صاحب کے ان ارشادات عالیہ کے حوالے ہمارے پاس موجود ہیں)

اسی قبیل سے صغر سنی کے نکاح کے جواز کا فتویٰ ہے۔ لیکن مقام تاسف ہی نہیں بلکہ مقام مرگ یہ ہے کہ اس کے لئے یہ حضرات کبھی حضرت عائشہؓ کی مروسی کے وقت کی عمر نو سال قرار دیتے ہیں اور کبھی قرآن کی آیات سے کھیل کھیل کر اس کے جواز کی سندیں لاتے ہیں اور ایسا کرتے وقت نہ حضورؐ کی عظمت شان کا احساس ان کے دامن گیر ہوتا ہے' نہ خدا کا خوف!

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ مطلقہ کی عدت تین حیض ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن عورتوں کو حیض نہ آرہا ہو' ان کی عدت کس طرح شمار کی جائے۔ اس کے لئے سورۃ الطلاق میں فرمایا کہ

و الّٰئِی یئسن من المحیض من نساء کم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر و الّٰئِی لم یحضن (۶۵/۴)

تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہوچکی ہوں' اگر ان کی عدت کے شمار کرنے میں تمہیں شبہ لاحق ہو' تو ان کی عدت (تین حیض کے بجائے) تین مہینے شمار کرلو۔ یہی صورت ان عورتوں کے سلسلہ میں بھی ہوگی جنہیں حیض نہ آرہا ہو۔

جن عورتوں کو حیض نہیں آرہا' ان کی دو شکلیں ہوں گی۔

۱۔ وہ عورتیں' جو اس قدر عمر رسیدہ ہوچکی ہوں کہ انہیں حیض آنا بند ہوگیا ہو۔ یا

۲- وہ عورتیں جن کی عمر تو ایسی ہو جس میں بالعموم حیض آیا کرتا ہے لیکن کسی عارضہ کی وجہ سے انہیں حیض نہ آرہا ہو۔

ان دونوں شکلوں میں عدت کا شمار حیض کے بجائے مہینوں سے ہوگا۔

مودودی صاحب **لم یحضن** کا ترجمہ کرتے ہیں--- "ایسی لڑکیاں جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو"--- ہم پوچھتے یہ ہیں کہ **لم یحضن** کا یہ ترجمہ کس قاعدے کی رو سے کیا گیا ہے؟ اس کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ جنہیں حیض نہ آسکا ہو یا حیض نہ آرہا ہو۔ اس آیت سے صغر سنی کے نکاح اور نابالغ لڑکی کے ساتھ خلوت کا جواز ثابت کرنا' قرآن سے مذاق کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ قرآن کریم نے نکاح کے لئے "جوانی کی عمر" خود بتا دی ہے (دیکھئے ۴/۶ : ۶/۱۵۳ : ۱۷/۳۴)۔ واضح رہے کہ مودودی صاحب کو خود اعتراف ہے کہ ایسی صورتیں ہوتی ہیں جن میں عورتوں کو (سن یاس سے پہلے ہی) حیض بند ہو جاتا ہے یا بے قاعدگی سے آتا ہے۔ حتیٰ کہ "ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عورت کو عمر بھر حیض نہیں آتا"۔ (ترجمان القرآن' بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء ص۸۹)۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ یہ کہ ان سے یہ سوال پوچھا گیا کہ ایک نوجوان لڑکے کی منگنی ایک کمسن لڑکی سے کردی گئی ہے۔ وہ اپنی جنسی خواہش پر ضبط نہیں کرسکتا۔ تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ

> اس لڑکے کے خاندان نے ایک جوان آدمی کو ایک کمسن لڑکی کے ساتھ منسوب کرکے اپنی نادانی کا پورا پورا ثبوت دے دیا ہے۔
>
> (رسائل و مسائل' جلد دوم' ص۲۰۲)

کون ان سے پوچھے کہ جب کمسن لڑکی کے ساتھ نکاح اور خلوت کی اجازت (بقول ان کے) خود خدا نے دے دی ہے' تو کمسن لڑکی کے ساتھ منگنی کردینے کو نادانی قرار دے کر آپ خدا پر معترض نہیں ہو رہے؟ دیکھا آپ نے جادو کس طرح سر پر چڑھ کر بولتا ہے؟

آپ نے اب سمجھ لیا ہوگا کہ یہ حضرت عائلی قوانین ...... (۱۹۶۱ء)..... کو منسوخ کرانے کے در پے کیوں ہیں؟ اس لئے کہ ان قوانین کی رو سے' نابالغ لڑکی (یا لڑکے) کی شادی کی اجازت نہیں۔ اور یہی پابندی ان حضرات پر شاق گزرتی ہے۔ یہاں (خدانکردہ) ان حضرات کی خود ساختہ شریعت کے قوانین نافذ ہونے دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ کیا کیا چیزیں آپ کے سامنے آتیں اور "خدا اور رسولؐ کے نام پر" آپ سے منوائی جاتی ہیں!

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے!

۶- دارالعلوموں کے نقاب میں فحاشی کی تعلیم

ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ اٹھتے بیٹھتے اس مقدس وعظ کو دہراتا رہتا ہے کہ ملک میں فحاشی کا سیلاب بڑھتا

جا رہا ہے۔ قوم کا نوجوان طبقہ جو اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتا۔۔۔ یا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد باہر نکلتا ہے۔۔۔ وہ فحش نگاری، فحش گوئی، فحش بینی اور فحش جوئی کا رسیا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کی غلط تعلیم، بیرون ملک سے درآمد ہونے والا عریاں لٹریچر اور ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سنیما کے جنسی محرکات ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے خلاف آئے دن جہاد کا اعلان کرتا رہتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فحاشی بڑی مخرب اخلاق شے ہے اور ہر وہ حرف و صوت یا نقش و تمثال جو ان جذبات میں تحرک و ارتعاش پیدا کرنے کا موجب ہو، قابل احتراز ہے۔ لیکن ہمارا مذہب پرست طبقہ جس انداز سے فحاشی کی مخالفت کرتا ہے، اس سے وہ یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فحاشی کا سرچشمہ "دنیاوی" تعلیم اور اس کے تضمنات ہیں۔ جو تعلیم ان کے مکاتب اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے، اس سے عفت فکر و نظر کے پیکر اور عصمت قلب و نگاہ کے مجسمے تیار ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات نہایت پاکیزہ اور تصورات انتہائی مقدس ہوتے ہیں۔ لیکن آیئے اور ذرا دیکھئے کہ ان دینی مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کی کیفیت کیا ہے؟ اور یہ کیفیت کسی "مسٹر" کی زبان سے نہ سنئے۔ اس کے بیان کرنے والے مولانا عبدالغفار حسن ہیں جو (جماعت اسلامی سے اعتزال کے بعد) مدینہ یونیورسٹی میں قیام پذیر ہیں۔ ان کا ایک مضمون (یا خط) ہفتہ وار المنبر کی ۲۶ اگست کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> "گزشتہ ماہ المنبر کا شمارہ ملا جس میں حضرت عبداللہ غزنویؒ کی سوانح عمری کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے۔ حضرت موصوف کے یہ الفاظ کتنے بصیرت افروز ہیں۔
>
> از خواندن ابیات و شنیدن آں پرہیز کلی باید کرد کہ محققین نوشتہ اند کہ زناء زبان است۔

ایک طرف یہ پاکیزہ نقطہ نظر ہے، دوسری طرف ہمارے ہاں کے درس نظامی میں سبعہ معلقہ اور متنبی جیسی فحش اور عشقیہ اشعار و قصائد پر مشتمل کتابیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھائی جاتی ہیں۔ عام طور پر چونکہ دینی مدارس کا انتظام مساجد میں ہوتا ہے، اس لئے بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ محراب و منبر بھی ان اشعار و قصائد کی شرح و تفسیر سے گونج اٹھتے ہیں اور طلباء بھی اپنی جلوت و خلوت میں مزے لے لے کر جھوم جھوم کر ان کو پڑھتے ہیں اور اپنی دبی آگ کو بھڑکانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ تماشا یہ ہے کہ استاد اگر دینی غیرت اور شرم و حیا کی بنا پر ان کتابوں کے فحش اشعار کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو طلبہ بضد ہوتے ہیں کہ ہم ان اشعار کے ترجمے اور شرح و تفصیل سے محظوظ ہو کر ہی رہیں گے۔

چوں فسق از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

غور طلب امر یہ ہے کہ یہی اشعار یا ان کا منظوم ترجمہ ریڈیو پر کوئی مغنیہ پڑھ کر سنا دے تو کس بنا پر اسے مخرب اخلاق اور شرم و حیا کے منافی قرار دیا جاسکتا ہے؟ فرق صرف اتنا ہے کہ ریڈیو کی اس قسم کی نشریات اپنا وسیع حلقہ

رکھتی ہیں اور شراب دو آتشہ سہ آتشہ کی شکل میں معاشرہ کے فساد کا ذریعہ بنتی ہیں۔ عربی مدارس کی فضا میں حلقہ سامعین انتہائی محدود ہوتا ہے۔ لیکن افسوسناک صورت احوال یہ ہے کہ یہ زہران کو پلایا جاتا ہے جو آئندہ قوم کے مرشد اور دینی رہنما بننے والے ہیں اور ساقی کا منصب ان کو حاصل ہے جو تقویٰ اور دینی علم سے بہرہ ور ہیں۔

اس قسم کی کتابوں کو جزو ایمان بنانے کے بارے میں عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ عربی زبان اور قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لئے ان کتابوں کو پڑھنا پڑھانا ناگزیر ہے۔

یہ جواب چند وجوہ سے قابل غور ہے۔

دیوان متنبی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے اشعار بطور سند پیش کئے جاسکیں۔ یہ تو اس دور کی یادگار ہے جبکہ عجمی تخیلات اور اسالیب کلام' عربی ادب میں سمو دیئے گئے تھے۔ اس سے انکار نہیں کہ اس میں بعض حکیمانہ اشعار بھی ہیں۔ ان سے استفادہ اگر ضروری خیال کیا جاتا ہے تو اس کتاب کے منتخب اشعار پڑھا دینے مناسب ہوں گے۔ باقی رہی "سبعہ معلقہ"' تو اس کے ہر قصیدے میں سے موزوں اشعار کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ درجہ تخصص میں اسے مطالعہ میں رکھا جائے تاکہ جاہلی ادب اور اسلامی ادب کا فرق واضح ہوسکے۔

افسوس ہے کہ ہمارے مدارس میں یہ کتاب عام طور پر تیسرے یا چوتھے سال میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان درجات میں اکثر طلبہ نو عمر ہوتے ہیں۔ ان اشعار سے ان کے اخلاق پر انتہائی برا اثر پڑتا ہے۔

ایک صاحب کا واقعہ ہے کہ انہوں نے دو نو عمر طالبات کو "عالم عربی" کی تیاری کی غرض سے "سبعہ معلقہ" پڑھانا شروع کی۔ جب امرء القیس کے فحش اشعار پڑھانے کی نوبت آئی تو شرم و حیا کی بنا پر زبان ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ آخر کار' انہوں نے اس مشغلے کو خیرباد کہا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ بعد میں ان طالبات نے "عالم عربی" کے امتحان کے لئے مدرسۃ البنات لاہور (سابق جالندھر) میں داخلہ لیا۔ سنا ہے کہ وہاں من وراء حجاب (پس پردہ) مرد اساتذہ طالبات کو درس دیتے ہیں۔ نہ معلوم وہ کس طرح ان اشعار کو نگلواتے ہوں گے۔

مولانا صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں

> یہ تفصیل حصہ نظم کے بارے میں عرض کی گئی ہے۔ اب حصہ نثر کا حال ملاحظہ ہو۔ ہمارے ہاں پاک و ہند کے مدارس میں حصہ نثر کے لئے نفحۃ الیمن اور مقامات حریری تجویز کی گئی ہیں۔ ان میں جو حکایات اور افسانے درج ہیں ان سے انتہائی گھٹیا کردار سامنے آتا ہے۔ حریری کے افسانے زیادہ تر گداگر واعظ کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ کیا اس قسم کی تحریروں سے طلبہ اچھا تاثر لے سکتے ہیں۔

طلوع اسلام

مولانا صاحب نے اپنی تنقید کو صرف عربی ادب کی دو چار کتابوں تک محدود رکھا ہے۔ اگر یہ جرات سے کام لے

کر کتب فقہ کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرما دیتے اور مزید ہمت کر کے' ان کے کچھ اقتباسات پیش کرتے' تو پھر اس کا صحیح اندازہ ہو تا کہ ان مکتبوں اور مدرسوں میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس سے کس قسم کے ذہن تیار ہوتے ہیں۔ ہم ان سے عرض کریں گے کہ زیادہ نہیں تو عالم گیری' ہدایہ' شرح وقایہ' در مختار وغیرہ سے وضو' غسل' روزہ یا نکاح سے متعلق ابواب کے دو دو' چار چار مسائل سامنے لا کر بتائیں کہ ان سے نوجوان (اور بالعموم مجرد) طالب علموں کے دل میں کس قسم کے جذبات انگڑائیاں لیتے ہیں۔ یا کوئی اور صاحب ہمت بزرگ ایسا کر سکیں تو یہ قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ (اکتوبر ۱۹۶۶ء)

--------○--------

۷۔ بیویوں کو مارنا

(ایسا صرف عدالت کر سکتی ہے)

ایک صاحب نے ایک طویل خط لکھا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ سورۂ نساء میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں اپنی بیویوں کی طرف سے سرکشی کا خوف ہو تو تم انہیں سمجھاؤ۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو انہیں خواب گاہوں سے الگ کر دو۔ اور اگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو تو--- **واضربو ھن**(۴/۳۴) تم انہیں مارو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خاوند کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ایسی صورت میں بیوی کو مار بھی کر سکتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب کہتے ہیں کہ یہ حق عدالت کو حاصل ہے۔ اگر وہ عورت کو مجرم پائے تو اسے بدنی سزا دے سکتی ہے۔ انفرادی طور پر ہر ایک کو حق حاصل نہیں کہ وہ اٹھ کر بیوی کو مارنا شروع کر دے۔ یہ پرویز صاحب کی اپنی رائے ہے جو قرآن حکیم کے حکم کے خلاف ہے۔

جواب : محترم مستفسر صاحب کا یہ اعتراض قرآن کریم کے اسلوب و انداز سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ قرآن کریم نے متعدد جرائم کی سزا تجویز کی ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا کہ یہ سزا عدالت کی طرف سے دی جا سکتی ہے۔ قرآن میں عدالت یا نظام عدل کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ مثلاً" سارق (چور) کی سزا کے سلسلہ میں فقط اتنا کہا ہے کہ---- **فاقطعوا ایدیھما** (۵/۳۸) چور' عورت ہو یا مرد' ان کا قطع ید کر دو۔ یا زانی اور زانیہ کی سزا کے سلسلہ میں یہ کہا ہے---- **فاجلدوا کل واحد منھما مائتہ جلدۃ**(۲۴/۲)------ زانی عورت ہو یا مرد' انہیں سو کوڑے مارو۔ بہتان تراشی کی سزا کے سلسلہ میں بھی---- **فاجلدو ھم**(۲۴/۴) کہا ہے' یعنی انہیں اسی کوڑے لگاؤ۔ لواطت یا سحاقت کے ضمن میں کہا ہے----**فاذو ھما** (۴/۱۶)---- انہیں مناسب سزا دو۔ جرم فحاشی کے سلسلہ میں کہا ہے----**فامسکو ھن** (۴/۱۵) انہیں پابند مسکن کر دو۔ آپ نے دیکھا کہ ان احکام میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ ملزم کو عدالت میں پیش کرو۔ عدالت فیصلہ کرے کہ وہ مجرم ہے یا نہیں۔ اور جرم ثابت ہونے پر عدالت ہی اسے سزا دے جس کا نفاذ حکومت کی طرف سے ہو۔ اب سوچئے کہ اگر ان احکام کے الفاظ کے پیش نظر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان سزاؤں کا حق ہر ایک کو دیا گیا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ **والسارق**

والسارقتہ فاقطعوا ایدیھما کا یہ مطلب ہے کہ جس شخص کو تم چوری کرتے دیکھو اس کا ہاتھ کاٹ دیا کرو؟ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ عدل کا اصول بیان کرتا ہے۔ نظامِ عدل کو امت کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔ عام جرائم تو ایک طرف، وہ حکومت کے خلاف بغاوت جیسے سنگین جرم کے سلسلہ میں بھی عدالت کا ذکر نہیں کرتا، صرف باغیوں کی سزا کا ذکر کرتا ہے (۵/۳۳)۔ لیکن عدالت کا ذکر نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔

کسی شخص کا کسی کو مارنا پیٹنا۔۔۔۔۔ خواہ وہ جرم کی پاداش ہی میں کیوں نہ ہو۔۔۔۔۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ اگر آپ (مثلاً) کسی جیب تراش کو پکڑ کر پیٹنے لگ جاتے ہیں اور اس سے اس کا دانت ٹوٹ جاتا ہے، تو اسے اگر جیب تراشی کے جرم کی سزا ملے گی تو آپ کو اس ضربِ خفیف یا شدید کے جرم کے ارتکاب کی سزا ملے گی۔ اس لئے کہ آپ نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ آپ کا کام تھا کہ اس جیب تراش کو حوالہ پولیس کرتے۔

جب عام قانون یہ ہے تو بیویاں بیچاری ہی ایسی جنس مظلوم ہیں کہ خاوندوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں اور انہیں مارنا پیٹنا شروع کر دیں۔ لہٰذا، جس طرح **فاقطعوا** ؟۔ **یا۔ فاجلدو** کے معنی یہ نہیں کہ تم ان کے ہاتھ کاٹ دو یا انہیں کوڑے مارنے لگ جاؤ، بلکہ یہ معنی ہیں کہ عدالت انہیں اس قسم کی سزا دے۔ اسی طرح سورۂ نساء میں **واضربوھن** کے معنی بھی یہ نہیں کہ تم اسے خود ہی مارنے لگ جاؤ۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ عدالت مجاز انہیں بدنی سزا بھی دے سکتی ہے۔

--------○--------

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میاں بیوی کے تنازعہ کو عدالت میں لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری پرائیویٹ زندگی کی تشہیر ہو جائے۔۔۔۔۔۔ اسے کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں اول تو یہ گذارش ہے کہ جب قرآن کریم متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ عدالت یا حکم کے ذریعے کرانے کا حکم دیتا ہے تو اس میں پرائیویٹ اور پبلک لائف کا کیا سوال ہے۔ میاں بیوی کے اختلافی معاملات کے سلسلہ میں ثالث مقرر کرنے کا حکم اسی سورۂ نساء میں ہے (۴/۳۵)۔۔۔۔۔۔ اس میں تو پھر بھی شاید زیادہ پرائیویٹ باتیں سامنے نہ آئیں۔ وہ بیوی کے خلاف سنگین تہمت کے سلسلہ میں "لعان" تجویز کرتا ہے (۲۴/۶-۸)۔۔۔۔۔ جو بہر حال، عدالت ہی میں ہو گا۔ اس میں واضح الفاظ میں الزام ثابت کرنے یا اس سے بریت کی کوشش کی جائے گی۔ پرائیویٹ زندگی کی اس سے بڑھ کر تشہیر اور کیا ہو گی۔

اس اعتراض کا جذبۂ محرکہ دراصل یہ ہے کہ ہمارے سامنے موجودہ حکام یا کونسلوں کے چیئرمین ہوتے ہیں جن کے سامنے ہماری پرائیویٹ زندگی کا پیش ہونا موجب تشہیر ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم جو مومنین کو حکم یا حاکم تجویز کرتا ہے ان کی صورت میں اس قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ وہ تو افرادِ ملت کے رازوں کے امین اور فریقین کے مشفق بزرگ ہوتے ہیں۔

(جنوری ۱۹۶۷ء)

-------○-------

۸۔ اہل کتاب کی عورتوں سے شادی
(حضرت عمرؓ کے ایک حکم کی وضاحت)

میں نے اپنی کتاب------ شاہکار رسالت-------- کے باب متعلقہ قانون سازی کے تحت لکھا ہے کہ

قرآن کریم نے مسلمانوں کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ہاں کا کھانا حلال قرار دیا ہے' لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی عورتوں سے' یہ کہہ کر' نکاح کو ممنوع قرار دے دیا کہ یہ عورتیں' مسلمانوں کے معاشرہ میں فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں۔
(صفحہ ۲۷۹)ایڈیشن چہارم (بلاترمیم) ۱۹۸۷ء۔

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ بڑا مشہور ہے۔ لیکن ایک صاحب نے ایک تفصیلی خط کے ذریعہ اس کی وضاحت چاہی' جس کا میں نے خط کے ذریعہ جواب دیا۔ چونکہ سوال اور جواب عموی اہمیت کا حامل ہے' اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اسے طلوع اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ اس لئے بھی' کہ میں نے شاہکار رسالت میں' اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ لیکن اب محسوس ہوا کہ ہو سکتا ہے کہ اس اجمال سے' بعض دیگر قارئین کے دل میں بھی اس قسم کا سوال پیدا ہوا۔ لہٰذا' اس کی وضاحت ضروری ہے۔

ان صاحب نے اپنے خط میں ایک طویل اصولی سی تمہید کے بعد جو اعتراض کیا ہے وہ بالاختصار یہ ہے۔

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایک بشر کو' چاہے وہ خود صاحب کتاب ہی کیوں نہ ہو' یہ حق حاصل ہے کہ قرآن کی کسی بات کو معطل کر دے یا ممنوع قرار دے۔ قرآن کے کسی قاعدہ سے استنباط تو ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں اصل حکم باقی رہتا ہے' لیکن قاعدہ اور حکم کو ممنوع قرار دینا' میں سمجھتا ہوں' بالکل غلط ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ کا علم ناقص ہے۔ (نعوذ باللہ) کیا اس سے خدا کی حکمت پر حرف نہیں آتا کہ ایک ایسے مسئلہ کی اجازت دی' جس میں فتنہ روپوش تھا...... ' جبکہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اللہ علیم اور حکیم ہے۔ کیا اس سے خود قرآن مجروح نہیں ہوتا؟..... کیا اس سے کھلی اجازت نہیں ملتی کہ جو امیر آئے' مصلحتاً اس میں تغیر و تبدل کر دے' چاہے وقتی ہی کیوں نہ ہو؟ کیا اس سے **لا تبدیل لکلمت اللہ** کی تردید نہیں ہوتی؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کی تابعداری کی بجائے قرآن کو اپنے تابع بنایا جائے۔ کیا اس سے جماعت اسلامی والے سچے ثابت نہیں ہوتے جو جھوٹ (حرام) کو مصلحتاً جائز قرار دیتے ہیں؟

میں نے اس کا حسب ذیل جواب دیا ہے:۔

"محترمی! السلام علیکم!

آپ کا تفصیلی گرامی نامہ وصول ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ آپ نے ایک وضاحت طلب نکتہ کے متعلق ازالہء شکوک کے لئے مصنف کی طرف رجوع کیا ورنہ آجکل تو یہ روش عام ہو رہی ہے کہ مصنف کی عبارات سے (غلط یا صحیح) خود ہی کوئی نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے اور پھر اسے مصنف کی طرف منسوب کر کے اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ آپ نے جو سوال دریافت فرمایا ہے' اس کا جواب تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے۔

۲:۔ قرآن کریم میں بعض امور کو حرام یا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور بعض کو حلال یا جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دینے کا کسی کو حق یا اختیار حاصل نہیں۔ لیکن حلال کی صورت میں ایک بنیادی نکتہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ حلال کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اس کی اجازت دی ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ اس کا حکم نہیں ہے کہ تم ایسا ضرور کرو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو یہ معصیت خداوندی ہو گی۔ اس کی انفرادی مثال عام ہے۔ ہم بیسیوں ایسی حلال چیزیں نہیں کھاتے جو ہمیں پسند نہ ہوں' جن سے ہمیں طبعاً" نفرت ہو' جو ناخوشگوار ہوں یا ہمارے مزاج اور طبیعت کے موافق نہ ہوں۔ ہم ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتے' صرف خدا کی عطا کردہ اجازت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے۔ قرآن کریم نے حلال کے ساتھ یہ طیب کا اضافہ کیا ہے' تو طیب میں یہ تمام باتیں شامل ہیں' جن کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔

۳:۔ یہ تو انفرادی مثال تھی۔ اسی کی اجتماعی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ برسات کے موسم میں یا بعض وبائی امراض کے زمانہ میں' گورنمنٹ بعض چیزوں کے استعمال کو حکماً" اور قانوناً" ممنوع قرار دے دیتی ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ حالات کا تقاضا ایسا ہے کہ خدا کی اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ خدا کو اسکا علم نہیں تھا کہ بعض حالات میں ان چیزوں کا استعمال مضر ہو گا۔ یہ اعتراض اس صورت میں پیدا ہو سکتا تھا جب خدا یہ حکم دیتا کہ جو کچھ ہم نے حلال قرار دیا ہے' اسے ہر شخص کو کھانا ہو گا اور ہر حال میں کھانا ہو گا۔ اس نے ایسا نہیں کہا۔ اس نے اس کی اجازت دے دی جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا کرنا ممنوع نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ معصیت نہیں ہو گی۔

اسی قسم کی ایک مثال آج کل ہمارے ہاں رائج ہے۔ حکومت نے ہفتہ میں دو دن' حلال جانوروں کا ذبیحہ اور ان

کا گوشت فروخت کرنا تھا" ممنوع قرار دیا ہوا ہے۔ مصالح کلی کے پیش نظر ایسا کرنا بھی حلال کو حرام قرار دینا نہیں۔
لیکن اس قسم کا اجتماعی فیصلہ صرف حکومت مجاز کر سکتی ہے' افراد نہیں خواہ ان کی حیثیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

۴:- اب آیئے نکاح کی طرف۔ پہلے انفرادی مثال لیجئے۔ چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح حلال ہے' یعنی اس کی اجازت ہے۔ اگر کوئی لڑکا اپنی چچا زاد بہن کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تو اس کا یہ اعتراض قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح حرام ہے' تو یہ قرآن کی مخالفت ہو گی۔

اب اسی مثال کی اجتماعی حیثیت سامنے لایئے۔ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح حلال ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ اگر کوئی اہل کتاب قوم میں یہ سازش شروع کر دے کہ اپنی لڑکیوں کو مسلمانوں کے ساتھ نکاح کے ذریعہ جاسوس بنا کر بھیج دے اور اسلامی مملکت کو اس کا علم یا اندازہ ہو جائے' تو امت کے مصالح کلی کے پیش نظر اسے اس کا اختیار ہو گا کہ وہ ان حالات میں اس اجازت پر پابندی عائد کر دے۔ یہ نہ تو حلال کو حرام قرار دینا ہو گا اور نہ ہی معصیت خداوندی۔ یہ صرف خدا کی ایک عطا کردہ اجازت سے فائدہ نہ اٹھانے کا فیصلہ ہو گا۔ جب یہ مصلحت باقی نہیں رہے گی یہ پابندی اٹھا دی جائے گی' لیکن اس قسم کا اجتماعی فیصلہ اسلامی حکومت ہی کر سکتی ہے' کوئی فرد نہیں۔ ایسا ہی حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ عیسائی حکومتیں اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگ گئی تھیں۔ اس قسم کی عورتوں نے اسلامی مملکتوں کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے' تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ لیکن جہاں اس قسم کی مضرت کا احتمال نہ ہو' وہاں اس کی اجازت پر پابندی کی ضرورت نہیں ہو گی۔

۵:- مجھے امید ہے کہ اس صراحت سے اس نکتہ کی وضاحت ہو گئی ہو گی اور آپ کا شبہ بھی رفع ہو گیا ہو گا۔ اس سے عند المصلحت جھوٹ بولنے یا فریب دینے کا شرعی جواز نہیں نکل سکتا۔ جھوٹ بولنا یا فریب ممنوع ہے۔ ان کی صورت یہ نہیں کہ خدا نے یہ کہا ہو کہ جھوٹ بولنا یا فریب دینا حلال ہے۔ تمہارا جی چاہے' جھوٹ بول لیا کرو تو جی چاہے تو نہ بولا کرو۔ یہ ہے فرق' حلال اور حرام یا جائز اور ممنوع میں!

اگر کوئی نکتہ مزید وضاحت کا متقاضی ہو تو مجھے مطلع فرمایئے گا۔

والسلام

مجھے امید ہے کہ اگر کسی صاحب کے دل میں حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کے متعلق اسی قسم کا شبہ پیدا ہوا ہو گا' تو اس کی وضاحت سے وہ شبہ زائل ہو گیا ہو گا۔

(پرویز)

(اکتوبر ۱۹۷۵ء)

۹۔ طلاق اور خلع

(عدالتوں کا دائرۂ اختیار)

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ گذشتہ قریب ڈیڑھ ماہ سے' اخبار پاکستان ٹائمز کے جمعہ کے ایڈیشن میں' سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت تک اس کی چھ قسطیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی وہ سلسلہ اختتام پذیر نہیں ہوا۔ سوال زیر غور یہ ہے کہ کیا قانون شریعت کی رو سے' عدالت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ عورت کو اس کے خاوند کی نارضامندی کے باوجود' خلع دلا دے۔ یہ فیصلہ فاضل جسٹس ایس۔ اے رحمٰن صاحب نے لکھا ہے اور اس میں جس تفصیل سے بحث کی گئی ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس میں کس قدر کاوش اور محنت کرنی پڑی ہے اور اس پر ان کا کس قدر وقت صرف ہوا ہے۔

اس کے بعد یہ صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ کیا ہمارا قانون شریعت ایسا ہی ہے کہ اس کی رو سے' اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے (کہ عدالت عورت کو خلع دلا سکتی ہے یا نہیں) اس قدر کاوش کرنی پڑتی ہے۔ پھر جب اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ یہ مقدمہ گذشتہ سات سال سے چل رہا ہے اور اسے عدالت ماتحت سے لے کر عدالت عالیہ تک کے تمام مراحل طے کرنے پڑتے ہیں' تب جاکر یہ اصولی فیصلہ ہوا ہے کہ عدالت اس کی مجاز ہے' تو یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کی رو سے اس کی پوزیشن کیا ہے؟

جواب آپ کو صرف اس ایک قانون شریعت کی پیچیدگی کو دیکھ کر اس قدر حیرت ہوئی ہے۔ یہ سارے کا سارا ہی ایسا ہے۔ اس میں کسی معمولی سے معمولی معاملہ کے متعلق بھی دو ٹوک فیصلہ نہیں ملے گا۔ ہمارے قانون شریعت کی پیچیدگیوں اور ژولیدگیوں کے متعلق (بے چارے) ان ججوں سے پوچھنا چاہئے جنہیں اس کی رو سے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ اور پھر تماشا یہ کہ جتنی مرتبہ بھی کسی معاملہ کو زیر بحث لایئے' ہر بار اس میں سے نئی نئی شاخیں ابھرتی چلی آتی ہیں اور حرف آخر کہیں جاکر بھی نہیں ملتا۔

اس کے برعکس' قرآن کی رو سے' دیکھئے تو یہ بات دو فقروں میں طے ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے' نکاح کو فریقین (میاں بیوی) کے مابین معاہدہ قرار دیا ہے۔ جس طرح معاہدہ کرنے کے لئے فریقین میں سے ہر فریق صاحب اختیار ہوتا ہے' اسی طرح معاہدہ کو ختم کرنے کے لئے بھی ہر فریق یکساں طور پر صاحب اختیار ہوتا ہے۔ اس میں فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ معاہدہء نکاح طے تو پا جاتا ہے انفرادی طور پر' لیکن اسے فسخ کرنے میں چونکہ فریق ثانی کے مفاد کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے' اس لئے قران کریم نے کہا ہے کہ اس کے لئے معاشرہ کے نظام عدل کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اس طرح فسخ معاہدہ کو قرآن کی اصطلاح میں طلاق کہتے ہیں (طلاق کے معنی کسی پابندی سے آزاد ہو جانے کے ہیں)۔ یہ طلاق (آزادی) جس طرح (عدالت کی رو سے) مرد حاصل کر سکتا ہے' اسی طرح عورت حاصل کر سکتی ہے۔

مرد کی طرف سے "طلاق" اور عورت کی طرف سے "خلع" کی تفریق قرآنی نہیں۔ قرآن میں تو خلع کا لفظ تک نہیں آیا۔ (اس حقیقت کو جسٹس رحمٰن صاحب نے اپنے فیصلے میں بھی تسلیم کیا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، فسخ نکاح کے معاملہ میں، میاں اور بیوی کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔۔۔۔ پاکستان ٹائمز' مورخہ ۶۷-۲-۲۴)
اگر ہمارے قوانین شریعت کی، قرآن کریم کی رو سے، از سرنو تدوین ہو جائے تو یہ تمام مشکلات دور ہو جائیں۔

-------○-------

ان امور کی مزید وضاحت طلوع اسلام' بابت اکتوبر ۱۹۷۸ء میں کی گئی تھی۔ وہ بھی قابل توجہ ہے۔

-------○-------

۱۰۔ طلاق کے قرآنی احکام

طلوع اسلام کی ایک سابقہ اشاعت میں ہم نے عورت کی بے بسی کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا تھا' اس سلسلہ میں ہمیں بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان میں جن اہم امور کا ذکر آیا ہے' انہیں ہم متعلقہ مقامات پر سامنے لائیں گے۔ ان میں سے ایک مشترکہ سوال کا جواب اس جگہ دیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں طلاق کے متعلق کیا احکام ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ نکاح، عاقل، بالغ، مرد اور عورت کے باہمی معاہدہ کا نام ہے جس میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں، یعنی یہ دونوں اپنی رضا و رغبت اور پسند سے، ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں۔ مرد کی طرف سے رضامندی کے لئے کہا گیا کہ **فانکحوا ما طاب لکم من النساء** (۴/۳) "جو عورتیں تمہیں پسند ہوں تم ان سے شادی کرو"۔ اور عورتوں کی رضامندی کے متعلق کہا کہ **لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا** (۴/۱۹) "تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن بیٹھو"۔

اس سے واضح ہے کہ مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی میں جب بھی ایسی صورت پیدا ہو جائے' کہ بیوی خاوند کے لئے (**ما طاب**) نہ رہے' یعنی وہ اسے پسند نہ کرے یا عورت کے دل میں مرد کی طرف سے کراہت پیدا ہو جائے' تو ان کی ازدواجی زندگی باقی نہیں رہ سکتی۔ اسی کو طلاق کہتے ہیں' یعنی نکاح کی قید سے آزاد ہو جانا۔ آپ نے غور فرمایا کہ عورت کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ **لا یحل لکم** یعنی جب عورت کے دل میں خاوند کی طرف کراہت پیدا ہو تو وہ خاوند کے لئے حلال ہی نہیں رہتی۔ اس باب میں خاوند اور بیوی دونوں کی پوزیشن یکساں ہے۔ کسی کو کوئی امتیازی حق حاصل نہیں!

۲۔ چونکہ بعض اوقات ہو سکتا ہے کہ کسی چھوٹی سی بات پر میاں بیوی میں شکر رنجی یا کشیدگی پیدا ہو جائے اور وہ غصہ میں آکر ازدواجی زندگی منقطع کرنے کی ٹھان لیں۔ اس قسم کی کشیدگی دور نہیں ہو سکتی جب تک کوئی تیسرا آدمی درمیان میں نہ پڑے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے ایک مصالحتی کوشش تجویز کی ہے' یعنی ایک نمائندہ خاوند کا اور ایک بیوی کا (۴/۳۵)۔ یہ لوگ میاں بیوی میں مصالحت کی کوشش کریں۔ واضح رہے کہ یہ صرف مصالحتی بورڈ ہے۔ انہیں

اس کا حق حاصل نہیں کہ یہ میاں بیوی کے علیحدگی کے فیصلے کو مسترد کر سکیں۔ اگر ان میں مصالحت ہو جائے تو ہو المراد' ورنہ سلسلہ مناکحت منقطع ہو جائے گا۔

۳۔ اس سلسلہ کے انقطاع (یعنی طلاق) کی صورت میں بعض امور اور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً" نکاح کے وقت عورت کو مہر دیا گیا یا اس کے بعد خاوند نے اسے زیورات یا کوئی جائیداد دی۔ ایسی (شاذ) صورتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ ایک عورت ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے کسی مرد سے شادی کر لے اور جب یہ کچھ حاصل کر لے' تو پھر اس سے سلسلہء مناکحت منقطع کرلے۔ ایسے معاملات کے تصفیہ کے لئے عدالت درمیان میں آجاتی ہے۔ یعنی عدالت کا یہ کام نہیں کہ وہ فیصلہ کرے کہ طلاق ہونی چاہئے یا نہیں۔ اس کا کام یہ فیصلہ کرنا ہے کہ طلاق کی صورت میں اگر کسی فریق کو ناحق نقصان پہنچتا ہے' تو اسے اس نقصان سے بچایا جائے۔

۴۔ مندرجہ بالا مقصد کے لئے اگر عدالت دیکھے کہ مرد سلسلہء نکاح منقطع کرنا چاہتا ہے تو فیصلہ دے دے گی کہ مرد نے جو کچھ بیوی کو دیا تھا' وہ اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتا (۴/۲۰)۔ لیکن اگر عورت بے حیائی کی مرتکب ہوئی ہو اور یہ چیز وجہ طلاق ہو تو پھر عدالت' مرد کو کچھ دلا سکتی ہے (۴/۲۰)۔ اگر یہ صورت نہیں تو مرد کے لئے قطعاً" یہ جائز نہیں کہ جو کچھ اس نے عورت کو دیا ہے' اس میں سے کچھ واپس لینے کے لئے عورت کو باندھ رکھے۔ یعنی اسے رکھنا بھی نہ چاہے' لیکن اسے تنگ کرے کہ وہ اس سے ان چیزوں میں سے کچھ واپس لے لے جو اسے دی تھیں۔ عدالت اس امر کا بھی فیصلہ کرے گی (۴/۲۰)۔

۵۔ اگر عدالت دیکھے کہ عورت' علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہے' بایں نیت کہ جو کچھ وہ مرد سے لے چکی ہے' اُسے ہتھیالے' تو وہ اس عورت سے کچھ واپس دلا سکتی ہے (۲/۲۲۹)۔

۶۔ بس یہ ہیں ازدواجی رشتہ کے انقطاع سے متعلق قرآنی احکام۔ ان احکام سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے قطعاً" یہ صورت نہیں کہ :-

(i) مرد جب جی چاہے طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر اس رشتہ کو ختم کر دے اور عورت کو اس کے لئے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں۔ (عورت کے طلاق حاصل کرنے کے لئے خلع کا لفظ تک قرآن میں نہیں آیا) ...... رشتہ نکاح تو (مصالحت کی کوشش کی ناکامی کے بعد) منقطع ہو جائے گا خواہ اسے مرد منقطع کرنا چاہے یا عورت۔ عدالت' ان کے اس فیصلہ کے عواقب سے متعلق امور کا فیصلہ کرے گی۔

(ii) نہ ہی قرآن سے یہ ثابت ہے کہ طلاق کا حق صرف مرد کو حاصل ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنا یہ حق عورت کو تفویض کر سکتا ہے۔

۷۔ چونکہ سوال صرف طلاق سے متعلق قرآنی احکام کا ہے' اس لئے ہم یہاں طلاق کے بعد انہی میاں بیوی میں دوبارہ نکاح' عدت' مہر' نان نفقہ' حضانت (یعنی اولاد کس کی تحویل میں رہے گی) سے متعلق احکام درج نہیں کئے۔ جو حضرات ان احکام کو دیکھنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع شدہ' پرویز صاحب کی کتاب "قرآنی قوانین" کا مطالعہ فرما لیں۔

(اکتوبر ۱۹۶۸ء)

باب ہشتم

(فرقہ بندی!)

۱- فرقے نہیں، مکاتب فکر

(ابلہ فریبی کی نئی سازش)

طلوع اسلام، برسہا برس سے، قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتا چلا آرہا ہے جن میں، فرقہ بندی کو شرک اور کفر بتایا گیا ہے۔ اور رسولؐ اللہ سے، بالفاظ صریح کہا گیا تھا کہ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کرلیں، ان سے تیرا کوئی واسطہ نہیں (ملاحظہ فرمایئے ۳۲-۳۱/۳۰، ۶/۱۶۰، ۳/۱۰۴)۔ یہ (اور اسی قبیل کی دیگر آیات) اس قدر واضح اور بین ہیں کہ مولوی صاحبان کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں۔ اب انہوں نے اپنی خفت مٹانے کے لئے ایک نیا حربہ وضع کیا ہے، یعنی وہ اپنے فرقوں کو "فرقے" نہیں "مکاتب فکر" کہتے ہیں اور اس طرح عوام کو یہ دھوکا دینے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی ان آیات کا اطلاق "مکاتب فکر" پر نہیں ہوتا، فرقوں پر ہوتا ہے۔ ان کی یہ مذموم کوشش اتنی بڑی جعلسازی ہے جس پر علم روتا اور دیانت ماتم کرتی ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ مکتب فکر اور فرقہ میں کیا فرق ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے حقائق کائنات پر غور و فکر کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ بار بار تاکید کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب مجرد حقائق پر غور و فکر کیا جائے گا تو اس میں مختلف ادوار میں، اور ایک ہی دور میں، مختلف مفکرین کے نتائج فکر میں اختلاف ہوگا۔ فکری (فلسفیانہ) اختلافات عصر قدیم و جدید، مشرق و مغرب، مسلم و غیر مسلم وغیرہ میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے اختلاف مسلمان مفکرین کے ہاں بھی رونما ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن اس اختلاف سے امت میں تفرقہ پیدا نہیں ہوگا۔ ان فلاسفرز کے اختلاف کو مکاتب فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) کہا جاتا ہے۔

ان کے برعکس، فرقوں کی کیفیت یہ ہے کہ ایک گروہ، احکام شریعت پر ایک طرح سے عمل کرتا ہے، دوسرا گروہ دوسرے طریق سے۔ اور چونکہ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے طریق عمل کی بنیاد ایک خاص عقیدہ پر رکھتا ہے، اس لئے عقیدہ اور عمل، فرقہ کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اس طرح امت، عملی طور پر، مختلف گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ یہ ہے جسے قرآن کریم نے "دین میں فرقہ" سے تعبیر کیا ہے۔ **ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم.....** (۳۲-۳۱/۳۰) **ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء ....** (۶/۱۶۰) دین میں تفرقہ، مذہبی فرقوں سے پڑتا ہے اور اس کی زندہ شہادت وہ تفرقہ ہے جو موجودہ فرقوں کی وجہ سے امت میں پیدا

ہوچکا ہے۔ اس فرقہ بندی کو قرآن کریم نے شرک' کفراور رسولؐ اللہ کے ساتھ انقطاع تعلق سے تعبیر کیا ہے۔

اب آپ سوچئے کہ موجودہ فرقوں کو مکاتب فکر کی اصطلاح سے تعبیر کرکے' یہ کہنا کہ ان پر قرآنی آیات کا اطلاق نہیں ہوتا کتنی بڑی خود فریبی یا ابلہ فریبی ہے۔ اس فریب سے آپ اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں' عوام کو دھوکا دے سکتے ہیں' لیکن خدا کو تو دھوکا نہیں دے سکتے۔ "رام داس" کا محض نام "عبدالرحمٰن" رکھ دینے سے' وہ مشرک سے مومن نہیں ہوسکتا۔ مذہبی فرقے' مکاتب فکر (سوچ کے مختلف طور طریق) نہیں ہوتے' مختلف سبل (چلنے کے مختلف راستے) ہوتے ہیں اور جب ایک امت' چلنے کے مختلف راستے اختیار کرے گی تو اس میں تفرقہ خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ دین' امت کو ایک سبیل (راستہ) پر چلاتا ہے' فرقے اس کے لئے مختلف راہیں تجویز کر دیتے ہیں اور اسی سے قرآن کریم نے منع کیا تھا جب کہا تھا کہ **وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه** یہ ہے میرا سیدھا راستہ' سو تم اسی ایک راستہ کا اتباع کرو۔ **ولا تتبع السبل** مختلف راستوں کا اتباع مت کرو۔ **فتفرق بکم عن سبیله** (۶/۱۵۴) ایسا کرو گے تو یہ مختلف راستے تمہیں' خدا کے راستے سے ہٹا کر الگ الگ کر دیں گے۔ مذہبی فرقے وہ سبل متفرقہ ہیں جو امت کو خدا سے دور ہٹا کر الگ الگ راہوں پر چلاتے ہیں اور اس لئے مشرک ہیں۔ توحید سے امت ایک راستے پر چلتی ہے۔ اس سے اس کی وحدت قائم رہتی ہے۔ جونہی امت فرقوں میں بٹی' اس کی وحدت ختم ہوئی اور جب وحدت امت ختم ہوئی تو توحید بھی باقی نہ رہی' شرک آگیا۔ (مئی ۱۹۷۲ء)

---------- ○ ----------

۲۔ مزید وضاحت

طلوع اسلام کے ایک دیرینہ صاحب علم قاری کا مراسلہ قابل توجہ ہے۔

"جیسا کہ آپ کو علم ہے طلوع اسلام سے میرا قدیمی رابطہ ہے۔ اس نے ہمارے مروجہ غیر قرآنی عقائد و مسالک کی جس طرح نشاندہی کی ہے ان میں سے ہر کوشش مستحق ستائش ہے۔ لیکن میرے نقطہ نگاہ سے اس نے فرقوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن شریف تو ہم سب کے سامنے تھا لیکن یہ امر موجب صد تاسف ہے کہ ہماری اس طرف کبھی نگاہ ہی نہ گئی کہ اس نے فرقہ بندی کو بہ نص صریح شرک قرار دیا ہے اور رسولؐ اللہ سے کہا ہے کہ اسلام میں فرقہ پیدا کرنے والوں سے تیرا کوئی واسطہ نہیں۔ میرا خیال تھا کہ ان نصوص قرآنیہ کو اس طرح اجاگر کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے مذہبی راہ نما (علماء کرام) خدا کے خوف سے لرز اٹھیں گے اور فرقہ بندی سے تائب ہو جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ مذہب کی گرفت اس قدر سخت اور ذاتی مصلحتیں اس قدر جاذب ہوتی ہیں کہ وہ واضح دلائل سامنے آجانے کے بعد بھی باطل پرستی کو چھوڑ کر حق کی طرف آنے ہی نہیں دیتیں۔ اس کے لئے واقعی بڑی جرات ایمانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بایں ہمہ' آپ کے دلائل اس قدر مسکت تھے (یا یوں کہئے کہ قرآنی نصوص اس قدر بین تھیں) کہ ان سے ان کا کوئی جواب بن نہیں پڑتا تھا' اس لئے یہ حضرات بالکل خاموش تھے۔ لیکن' جیسا

کہ آپ نے لکھا ہے' جب یہ حضرات طلوع اسلام کے پیہم اصرار سے تنگ آگئے تو ابلیس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ تم کہو کہ ہم فرقے نہیں' مکاتب فکر ہیں- چونکہ یہ ابلیسی دلیل ان کے لئے بہت بڑا سہارا بن رہی تھی' اس لئے یہ اس سے بہت خوش ہوگئے- چنانچہ اب ہر طرف سے اسے اچھالا جا رہا ہے- گویا یہ محض لفظوں کی تبدیلی سے (بقول طلوع اسلام' رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ کر) خدا کو (معاذ اللہ) فریب دے رہے ہیں کہ دیکھ لو! ہم آپ کی گرفت سے کس طرح بچ گئے- ہمارے فرقے بھی بدستور قائم رہے اور ہم آپ کے غضب سے بھی محفوظ ہوگئے--- میں سمجھتا ہوں کہ خدا فریبی یا (بالفاظ صحیح) خود فریبی کی اس سے بدتر مثال شاید کہیں اور مل سکے- گویا ان کی الگ الگ نمازیں' جداگانہ مسجدیں (جنہیں سورۂ توبہ میں کفر اور دشمنان خدا کی پناہ گاہیں قرار دیا گیا ہے) سب "فکری اختلاف" ہیں' عملی تفریق نہیں! ان سے کوئی پوچھے کہ اگر یہ محض فکری اختلافات ہیں تو قرآن شریف نے جس چیز کو "تفریقا" بین المومنین" (سورۂ توبہ' آیت ۱۰۷) اور "فرقوا دینھم" (سورۂ روم' آیت ۳۲) سے تعبیر کیا ہے' وہ کیا ہے؟ اس کی کوئی مثال دیجئے تاکہ مکتب فکر اور فرقہ بندی کا فرق سامنے آسکے-

میں ان سے ایک اور سوال کرنا چاہتا ہوں- حدیث شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

> بنی اسرائیل کی قوم بہتر (۷۲) فرقوں میں منقسم ہوگئی تھی- میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں منقسم ہوگی جن میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہو گا' باقی سب دوزخ میں جائیں گے- (مشکوۃ' جلد اول)

اس حدیث کو تمام فرقے صحیح تسلیم کرتے اور اپنے فرقہ کو جنتی (اور دوسرے فرقوں کو دوزخی) ثابت کرنے کے لئے بطور سند پیش کرتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی پیش کرتے ہیں- سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے موجودہ فرقے مکاتب فکر ہیں' ان میں فرقہ کوئی نہیں' تو حضورؐ نے جن تہتر (۷۳) فرقوں کا ذکر فرمایا ہے وہ کون سے ہیں؟ اور اگر فرقہ کوئی بھی نہیں تو پھر حضورؐ کے اس ارشاد کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ مسلمانوں میں دین سے برگشتہ کرنے والے اس قدر عقائد اور اعمال کس طرح وجود میں آگئے- اس کا سبب کیا تھا- اب سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مذہبی پیشوا محض اپنی قیادت (لیڈر شپ) قائم رکھنے کے لئے ان باطل عقائد کی نگاہ فریب تاویلات سے عوام کو گمراہ کرتے رہے- قرآن شریف نے اسی لئے ان گمراہ کرنے والے مذہبی پیشواؤں کو مورد الزام ٹھہرایا ہے- یہی ہیں وہ مذہبی لیڈر جن کے متعلق عوام' خدا سے عرض کریں گے کہ

> **ربنا انا اطعنا سادتنا و کبراء نا فاضلونا السبیلا** (سورۂ احزاب- آیت ۶۷)
>
> اے پروردگار ہمارے! ہم نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور اکابر کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں صحیح راستے سے گمراہ کردیا-

اور یہی ہیں وہ مذہبی پیشوا جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

قیامت کے دن وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا تھا (سورۂ نحل۔ آیت ۲۵)۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ان حضرات کا قرآن شریف کے ان ارشادات پر ایمان ہی نہیں۔ ورنہ ہو نہیں سکتا کہ دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے ارشادات پر ایمان' تو پھر اس قدر واضح نصوص کی موجودگی میں انسان' محض الفاظ کی تبدیلی سے مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ یہ (فرقوں کو مکاتب فکر کہنے سے) الفاظ کی تبدیلی ہی تو ہے جس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

اسماء سمیتموھا انتم و اباء کم

(سورۂ یوسف۔ آیت ۴۰)

کچھ نام ہیں جو پہلے تمہارے آباء و اجدا نے رکھ لئے اور اب تم رکھ رہے ہو۔

ما انزل اللہ بھا من سلطن (ایضاً")

انہیں خدائی سند تو حاصل نہیں

خدا نے فرقہ بندی کہا **(فرقوا)** انہوں نے ان کا نام مکاتب فکر رکھ لیا۔ جس طرح مشرکین عرب' اپنے بتوں کا نام لات اور منات اور جبل اور عزیٰ رکھ کر کہتے تھے کہ ہم انہیں اللہ تو نہیں کہتے۔

ہم اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں کہ خدا سے دعا کریں کہ وہ ان لوگوں کو اتنی جرات ایمانی عطا کر دے کہ یہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ سکیں۔ بہرحال' آپ جس جہاد میں مصروف ہیں اسے جاری رکھئے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ والسلام (اکتوبر ۱۹۷۵ء)

۳۔ فرقہ اہل قرآن ـــــ گمراہ ترین فرقہ

ہماری تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ خدا کی کتاب پر ایمان رکھنے والی قوم (مسلمانوں) میں جب اور جہاں بھی خدا کی کتاب کی آواز بلند کرنے کی کوشش کی گئی' اس قوم کی طرف سے اس کی سخت، مخالفت ہوئی اور اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ زمانے کے تقاضوں کی بنا پر ہمارا دور' قرآنی پیغام کی طرف متوجہ ہونے کے لئے سابقہ ادوار کے مقابلہ میں زیادہ آمادہ تھا۔ انہی حالات کے پیش نظر طلوع اسلام نے یہ منصب اختیار کیا کہ قرآن کی آواز کو بے غل و غش قوم (اور دنیا) کے سامنے پیش کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہونی تھی اور اس مخالفت میں مذہبی پیشوائیت نے ہر اول دستے کا کام دینا تھا۔ چنانچہ یہ مخالفت ہوئی اور اب تک ہو رہی ہے' اگرچہ اس کا زور دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے لیکن اس راستے میں جو سب سے بڑی روک ثابت ہوا وہ ایک نیا فرقہ

تھا جس نے اسی زمانے میں جنم لیا اور جو (بدقسمتی سے) اپنے آپ کو قرآن کی طرف منسوب کرتا ہے یعنی فرقہ اہل قرآن۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ اس فرقہ کے بانی (مولوی عبداللہ چکڑالوی مرحوم) کی نیت یہی تھی لیکن عملاً" ہوا یہ کہ یہ قرآن کے راستے میں سب سے بڑی روک بن گیا۔ ہم نے اس فرقہ کا کبھی تفصیلی جائزہ نہیں لیا اس لئے کہ اسے چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ مولوی عبداللہ مرحوم کی وفات کے بعد ہی ان کے معتقدین ادھر ادھر بکھر گئے اور ان کی حیثیت محض انفرادی رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ان میں باہمدگر ایسے اختلافات نمودار ہو گئے کہ ان کی توانائیاں ایک دوسرے کے ساتھ الجھ کر ضائع ہو گئیں۔ (کوئی ایک نماز کا قائل' کوئی تین کا' کوئی پانچ کا' کوئی تین روزوں کا' کوئی نور کا' کوئی مہینہ بھر کا' کسی کے نزدیک انڈہ حلال' کسی کے نزدیک حرام **وقس علی هذا**) اب ان کے کچھ افراد سمٹ سمٹا کر لاہور میں جمع ہو گئے ہیں جو ماہنامہ بلاغ القرآن کے ذریعے اپنی ہستی کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں' لیکن یہ بھی چند دنوں کا کھیل ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ جس نظریہ میں زندہ رہنے کی قوت نہیں ہوتی مرور زمانہ اسے از خود ختم کر دیتا ہے۔ ان کے حالات کے پیش نظریہ فرقہ ایسی اہمیت کا حامل نہیں کہ اس کا خصوصیت کے ساتھ نوٹس لیا جائے۔ لیکن بعض اوقات ان کی طرف سے ایسی شرر فشانیاں ہوتی ہیں جن کا ازالہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو کبھی کبھی اس فرقہ کا تذکرہ طلوع اسلام کے صفحات میں آجاتا ہے۔

۲۔ یہ فرقہ فکری اور عملی' ہر دو لحاظ سے ایسی بنیادوں پر استوار ہے جن میں مسلمانوں کے باقی فرقوں میں سے کوئی بھی ان سے اشتراک نہیں رکھتا۔ یعنی:۔

(ا) ان کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر احکامات آئے ہیں' ان کی تمام جزئیات اور تفصیلات بھی قرآن مجید نے خود متعین کر دی ہیں۔ جہاں تک ہماری معلومات ہماری رہنمائی کرتی ہیں اس سے پہلے کسی فرقہ نے بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا۔

(۲) ان کا سب سے بڑا "کارنامہ" یہ ہے کہ یہ تین وقتوں کی نماز کے قائل ہیں۔ ہماری تحقیق کی رو سے اس سے پہلے مسلمانوں کے کسی فرقے نے ایسا نہیں کیا۔

ہم اس مقام پر بلاغ القرآن والوں کے مسلک پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ اس عقیدہ کے ماننے والوں میں سے بعض افراد نماز کے علاوہ روزہ' زکوۃ' حرام' حلال وغیرہ کے معاملات میں بھی ایسی ایسی نرالی باتیں کرتے ہیں جن کا اس سے پہلے کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔

فکری اور عملی لحاظ سے مندرجہ بالا دو امور کی بنا پر ہی ان میں اور مسلمانوں کے دوسرے فرقوں میں ایک ایسی خلیج حائل ہے جس کے پر ہونے کا امکان ہی نہیں۔

(۳) اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اس فرقہ نے خود قرآن مجید کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ اس ضمن میں پہلے دو ایک مسلمات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(ا) قرآن کریم کی رو سے امت مسلمہ میں فرقہ بندی شرک اور خدا کے عذاب کا موجب ہے۔
(۲) قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔
(۳) شق نمبر ۲ کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر فکرو عمل کی بنیاد قرآن ہو تو امت میں اختلاف و تفریق (فرقہ بندی) پیدا نہیں ہو سکتی۔ (قرآن کے بنیاد بننے کی عملی شکل کیا ہے' اس کے متعلق آگے چل کر بات کی جائے گی)۔
(۴) امت میں مختلف فرقے ہیں' لیکن ان میں سے کسی کا دعویٰ یہ نہیں کہ ان کے فکرو عمل کی بنیاد قرآن خالص ہے۔ نظری طور پر قرآن کو سب مانتے ہیں' لیکن عملاً" ان میں سے بعض احادیث کو اپنے مسلک کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور بعض فقہ کو۔ لہذا' ان کے باہمی اختلافات کے متعلق یہی کہا جائے گا (اور یہی کہا جاتا ہے) کہ ان کی وجہ روایات اور فقہ کا اختلاف ہے۔ قرآن مجید پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا۔
(۵) لیکن فرقہ اہل قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے عمل کی بنیاد قرآن خالص ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان کے عمل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہو۔
(۶) لیکن ان کے عمل کی کیا کیفیت ہے' اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ بھی نماز کے اوقات کے سلسلہ میں جو (ان کے دعویٰ کے مطابق) ان کا امتیازی کارنامہ ہے۔ اسے ذرا غور سے سنیے۔
(ا) اس فرقہ کے بانی مولوی عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) قرآن خالص سے ثابت کرتے ہیں کہ نماز پانچ وقتوں کی ہے (ملاحظہ ہو ترجمۃ القرآن از مولوی عبداللہ چکڑالوی' پارہ نمبر ۴' صفحہ ۶۳ و دیگر مقامات)۔
(ب) اور اس فرقہ (یا عقیدہ) کے متبع' بلاغ القرآن والے' اسی قرآن خالص سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نماز تین وقتوں کی ہے۔ اب پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ جب قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے پانچ وقتوں کی نماز بھی ثابت ہو جاتی ہے اور تین وقتوں کی بھی' تو اس کے اس دعویٰ کے متعلق کیا کہا جائے گا کہ **ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا** (۴/۸۲) "اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے" (اور یہ تو صرف ایک مسئلہ اوقات صلوٰۃ کے متعلق ہے۔ اگر دیگر مسائل کو بھی دیکھا جائے تو نہ معلوم ان میں کس قدر باہمی اختلافات ملیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق یہ دعویٰ ہو کہ وہ قرآن سے ثابت ہے)۔ یہ ہے ان حضرات کا وہ مسلک جس نے قرآن مجید کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ اس سے اس کا بنیادی دعویٰ ہی (معاذ اللہ) باطل ہو جاتا ہے۔
۴۔ قارئین شاید یہ معلوم کرنے کے بھی متمنی ہوں کہ یہ حضرات' نماز وغیرہ کی تفاصیل قرآن خالص سے کس طرح نکالتے ہیں۔ اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔
سورۂ قصص میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو انہیں جو ہدایات دیں'

ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہاں کسی سے ڈرنا نہیں' مضطرب و بے قرار نہیں ہونا۔ پوری دل جمعی اور اطمینان سے اپنی بات پیش کرنا۔ اس کے لئے کہا کہ **واضمم الیک جناحک من الرھب** (۲۸/۳۲) خوف کی حالت میں اپنے بازو سمیٹ لینا۔ پرندہ خوف سے پھڑپھڑاتا اور اڑتا ہے۔ حالت امن میں وہ اپنے بازو (پر) سمیٹ لیتا ہے یہیں سے یہ محاورہ ہے۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) اس آیت کو لکھ کر اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

اپنے ہاتھ کہنیوں تک ایک دوسرے کے اوپر جمع کر کے اپنے سینے سے ملا لو۔ یہ عاجزی کی صورت ہے۔

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ نماز میں ہاتھ سینے سے باندھنے چاہئیں۔

یہ ہے وہ طریق جس سے یہ لوگ قرآن مجید سے احکام قرآن کی تفاصیل اور جزئیات نکالتے ہیں۔ اب سوچئے کہ اس سے انہوں نے قرآن مجید جیسی کتاب عظیم کو کس طرح بازیچہ اطفال بنا دیا ہے!

یہ ہے وجہ جو طلوع اسلام کہتا چلا آرہا ہے کہ یہ فرقہ قرآن مجید کے راستے میں سب سے بڑی روک بن کر کھڑا ہو گیا اور اس وجہ سے یہ اس فرقہ کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن اس فرقہ کی حالت عجیب ہے اور یہ بات بھی غور سے سننے کے قابل ہے۔

ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت نے دیکھا کہ ہمارے زمانے میں عوام کو مشتعل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے مخالف کے متعلق کہہ دیا جائے کہ "یہ تین نمازوں اور نو روزوں کا قائل ہے۔" چنانچہ انہوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام یہی کہتا ہے۔ اس کے جواب میں طلوع اسلام کو کہنا پڑا کہ یہ مسلک اہل قرآن کا ہے' طلوع اسلام کا نہیں۔ طلوع اسلام کا اہل قرآن سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس سے ان کا اطمینان ہو جاتا لیکن (ہم نہیں کہہ سکتے کہ کن مصالح کی بنا پر) بلاغ القرآن والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام اور ہم ایک ہی ہیں۔ بس بعض معاملات میں یونہی ذرا ذرا سا فروعی فرق ہے۔ اس سے طلوع اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو ایک حربہ (LEVER) ہاتھ آگیا اور انہوں نے عوام میں مشہور کرنا شروع کر دیا کہ دیکھو! اہل قرآن والے خود یہ کہتے ہیں کہ ہم اور طلوع اسلام ایک ہی ہیں۔ بلاغ القرآن والوں کی طرف سے طلوع اسلام کے خلاف یہ اتنی بڑی سازش ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

حال ہی میں (طلوع اسلام کنونشن میں پیش کردہ) ایک مقالہ بہ عنوان "تین نمازوں اور نو روزوں کے پس پردہ کیا ہے"--- میں صاحب مقالہ محمد اسلام صاحب نے بتایا کہ یہ مسلک اہل قرآن کا ہے' طلوع اسلام کا نہیں۔ اس پر بلاغ القرآن نے اپنی وسوسہ اندازی کی سلگتی آگ میں پھونکیں مارنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۷۴ء میں "معاصر عزیز' طلوع اسلام" کے متعلق لکھا ہے کہ:

بلاغ القرآن اور طلوع اسلام ایک ہی راہ کے دو راہ رو ہیں۔ دونوں کی ایک ہی منزل ہے۔ امن عالم کا قیام بذریعہ نظام ربوبیت' یہ دونوں اس ایک ہی شاہراہ پر محو سفر ہیں۔ لیکن طلوع اسلام اپنے رفیق سفر کے ساتھ کچھ کھچا کھچا اور روٹھا روٹھا رہتا ہے۔ (صفحہ

۳۱)۔

ہم ببانگ دہل اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ نہایت مکروہ قسم کا جھوٹ ہے' فریب ہے' انتہائی بددیانتی پر مبنی وسوسہ انگیزی ہے۔ امن عالم کا قیام بذریعہ قیام نظام ربوبیت دجل و فریب کا پردہ ہے۔ طلوع اسلام اور بلاغ القرآن کی نہ راہ سفر ایک ہے' نہ منزل ایک۔ نہ یہ دونوں رفیق سفر ہیں نہ ہم نوا۔ اس کے برعکس' طلوع اسلام کی منزل بھی بلاغ القرآن سے مختلف ہے اور راستہ بھی اس سے یکسر الگ اور ان دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ طلوع اسلام' فرقہ اہل قرآن اور اس کے نقیب بلاغ القرآن کے ساتھ "کچھ کھچا کھچا اور روٹھا روٹھا سا" نہیں رہتا' اعلانیہ اس کی مخالفت کرتا اور اس کی انتہائی گمراہ کن نظریات کی تردید کرنا اپنا قرآنی فریضہ سمجھتا ہے۔ ہم بلاغ القرآن سے واضح الفاظ میں کہیں گے کہ وہ اپنی اس فریب کارانہ روش سے مجتنب رہے۔ یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔

آخر میں احتیاط" ہم طلوع اسلام کا مسلک دہرا دینا چاہتے ہیں تاکہ اس کے اور بلاغ القرآن کے مسلک کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجائے۔ طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ:۔

۱۔ قرآن نے (باستثنائے چند) اپنے احکام اصولی طور پر بیان کئے ہیں' ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ کیونکہ احکام کی طرح ان کی جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا مقصود نہیں تھا۔ قرآن کا منشا یہ تھا کہ ان جزئیات کو وہ قرآنی نظام متعین کرے جو اس کے احکام کو عملاً" نافذ کرنے کے لئے قائم ہو۔ اس نظام کو سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا اور حضورؐ کے بعد یہ خلافت علیٰ منہاج نبوت کی شکل میں سامنے آیا۔

۲۔ جب خلافت علیٰ منہاج نبوت قرآنی احکام کو (مع ان کی جزئیات کے) نافذ کرے گی تو امت میں اختلاف اور فرقہ سازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ یہ امت' امت واحدہ رہے گی۔

۳۔اس وقت امت میں بہت سے فرقے ہیں جن میں باہمی اختلاف ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ خلافت علیٰ منہاج نبوت موجود نہیں۔ ان اختلافات اور تفرقات کے مٹانے کی واحد صورت یہ ہے کہ امت میں پھر سے اسی خلافت کا قیام عمل میں آجائے۔ طلوع اسلام اس کے لئے کوشاں ہے۔ یہ حکومت اپنا تمام کاروبار قرآن مجید کی حدود کے اندر رکھتے ہوئے سرانجام دے گی۔

۴۔ اس وقت (جبکہ وہ خلافت قائم نہیں) مسلمانوں کے مختلف فرقے جس جس طریق سے مختلف احکام اسلام پر عمل کرتے ہیں' ویسا کرتے رہیں۔ کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرے یا کسی نئے طریق کو رائج کرے۔ طلوع اسلام اس کی تلقین کرتا ہے اور اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔ نماز کی تفصیلات کی بھی یہی صورت ہے۔ جن جن اوقات میں اور جن جن تفصیلات کے ساتھ مختلف فرقے اسے ادا کرتے چلے آرہے ہیں' ہم ان میں ردو بدل کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے' نہ کوئی طریق وضع کرنے کا حق۔

آپ سوچئے کہ اگر (اہل قرآن کے نظریہ کے مطابق) ہر شخص کو اس کا حق دے دیا جائے کہ وہ جس طرح جی چاہے احکام و ارکان اسلام کی تفصیلات مرتب کر کے اپنا الگ فرقہ بنا لے' تو امت میں (جس میں پہلے ہی اتنے فرقے

موجود ہیں) کس قدر تشتت و انتشار پیدا ہو جائے اور جب ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مسلک کو قرآن کی طرف منسوب کرے تو خود قرآن کے متعلق دنیا کیا کہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ مولوی عبد اللہ چکڑالوی (مرحوم) کے بعد جو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے (اہل قرآن) پیدا ہوئے' ان کی آواز کسی نے نہیں سنی ورنہ (دنیا کی نظروں میں) اس وقت تک (معاذ اللہ) قرآن مجید کی دھجیاں اڑ چکی ہوتیں۔

اس کا یہ بھی مسلک ہے کہ مسلمانوں میں جس قدر ایسے عقائد و رسوم رائج ہیں ان کی نشان دہی کی جائے' لیکن اس بنا پر نہ تو اپنا الگ فرقہ بنایا جائے اور نہ ہی اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا جائے۔ کفر و اسلام کے تعین کا حق اسلامی حکومت کو حاصل ہے نہ کہ افراد یا فرقوں کو۔

اس مختصر سے تعارف سے آپ دیکھ لیجئے کہ کیا طلوع اسلام اور فرقہ اہل قرآن ایک ہی راستہ کے راہی اور ایک ہی منزل کے مسافر ہیں یا ان کی راہیں بھی مختلف ہیں اور منزلیں بھی ایک دوسرے سے متضاد! (جنوری ۷۵ء)

------O------

نوٹ:- یہ شذرہ جنوری ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے "فرقہ اہل قران کی گمراہیاں" کے عنوان سے ایک تفصیلی مقالہ سپرد قلم فرمایا' جو طلوع اسلام' بابت جون ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس مقالہ کا مطالعہ فرمالیں۔

۴۔ پرویزی فرقہ کوئی نہیں

(ہمارے مذہب پرست طبقہ کی فریب دہی)

(سابق) سرحد کے ایک گاؤں سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کچھ دنوں سے ایک مولوی صاحب "پرویزی فرقہ" کے خلاف بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ یہ فرقہ کونسا ہے اور اس کے عقائد کیا ہیں؟

طلوع اسلام

آپ نے بھارت (ہندوستان) کی سیاست کا مطالعہ کیا ہے؟ ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ ان کے جس خلاف قانون اقدام کے خلاف پاکستان نے صدائے احتجاج بلند کرنی ہوتی ہے' وہ پہلے ہی وہ الزام خود پاکستان کے سر تھوپ کر' چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ (مثلاً) وہ کسی دریا کا پانی بند کر لیں گے اور اس کے ساتھ ہی وہائی مچانا شروع کر دیں گے کہ پاکستان دریاؤں کا پانی بند کر رہا ہے۔ ہم تباہ ہو گئے' ہم مارے گئے **وقس علی ذالک**۔

کچھ ایسی ہی کیفیت مولوی صاحبان کی ہے۔ طلوع اسلام پہلے دن سے اس حقیقت کو پیش کر رہا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے' اسلام میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ **ولا تکونوا من المشرکین ۝ من اللذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا ط کل حزب بما لدیھم فرحون**۔ (۳۰/۳۱-۳۲) مسلمانو! دیکھنا' تم (ایمان لانے کے بعد پھر) مشرکوں میں سے نہ ہو جانا' یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں

فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ (فرقہ بندی میں ہوتا یہ ہے کہ) ہر فرقہ اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس نے رسول اللہ سے کہ دیا کہ **ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا" لست منھم فی شیء** (۶/۱۶۰) جو لوگ دین میں فرقے بنالیں اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھیں' اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

طلوع اسلام' شروع سے حضرات علماء کرام سے دریافت کرتا چلا آرہا ہے کہ قرآن کریم کی ان واضح تصریحات کی روشنی میں' مسلمانوں میں فرقوں کا وجود کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ان حضرات کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اپنی مدافعت کی ترکیب سوچی اور مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام خود ایک فرقہ کا ترجمان ہے جس کا نام پرویزی ہے۔ انہوں نے عوام کو اس پیچ میں الجھا کر اپنا پیچھا چھڑایا۔ یہ ہے حقیقت اس "پرویزی فرقہ" کی جس کا دنیا میں کوئی وجود نہیں۔

فرقہ اس طرح بنتا ہے کہ لوگ کسی شخص کے قول کو دین میں سند اور حجت سمجھیں یا دوسرے مسلمانوں سے الگ نماز' روزہ وغیرہ کی کوئی شکل اختیار کریں۔ جہاں تک پرویز صاحب کا تعلق ہے' وہ اپنی ہر کتاب میں اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا امکان ہے۔ میری کوئی بات نہ حرف آخر ہے نہ کسی کے لئے سند اور حجت۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کے افراد قرآن کریم پر غور کر کے اسے سمجھیں۔ جو لوگ ان کی پیش کردہ فکر سے متفق بھی ہوتے ہیں' وہ بھی انہیں قرآن کریم کے ایک مفکر سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو قرآن کریم کے ایک طالب العلم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے۔

جہاں تک نماز روزہ وغیرہ کا تعلق ہے' طلوع اسلام سیکڑوں مرتبہ اعلان کر چکا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے جس جس طریق سے' اسلام کے ان ارکان پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں' کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرے یا ان کی ادائیگی کی کوئی نئی شکل وضع کرے۔ چنانچہ طلوع اسلام کی پیش کردہ فکر سے متفق احباب کو بھی آپ کبھی نہیں دیکھیں گے کہ وہ کسی خاص وضع کی نماز پڑھتے ہوں۔ لیکن اس کے باوجود' مولوی صاحبان کہتے چلے جائیں گے کہ طلوع اسلام والے ' تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کے قائل ہیں۔ اس پروپیگنڈہ میں جماعت اسلامی کے افراد پیش پیش ہوتے ہیں۔ یہ سب جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ نہ پرویزی کوئی فرقہ ہے' نہ طلوع اسلام کے کوئی الگ عقائد ہیں' نہ ہی یہ روزہ نماز کی کوئی مختلف شکل تجویز کرتا ہے۔ اس کا مشن' کوئی فرقہ بنائے بغیر' قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنا ہے اور بس۔

(جولائی ۱۹۶۸ء)

۵- فرقے کی پہچان کیا ہے؟

ایک صاحب لکھتے ہیں:-

طلوع اسلام کے خلاف مولوی صاحبان کا ایک اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ "پرویزی فرقہ" کا رسالہ ہے۔ جب ان سے کہئے کہ پرویزی فرقہ کوئی نہیں تو وہ رٹ لگائے جاتے ہیں کہ نہیں، پرویزی فرقہ ہے! کیا آپ بتائیں گے کہ فرقہ کی پہچان کیا ہے اور طلوع اسلام کس طرح کوئی فرقہ نہیں؟

طلوع اسلام

فرقے کی پہچان بڑی آسان ہے اور وہ یہ کہ ہر فرقہ دوسروں سے الگ نماز پڑھتا ہے۔ لہٰذا، جو لوگ اپنی نماز الگ پڑھیں، سمجھ لیجئے کہ وہ الگ فرقہ سے متعلق ہیں۔ اکثر تو ہر فرقہ کی نماز ہی مختلف ہوتی ہے۔ لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ نماز دوسروں سے مختلف نہ ہو، لیکن وہ لوگ الگ نماز پڑھیں۔ مثلاً جب "احمدی" اپنے آپ کو مسلمانوں کا فرقہ شمار کراتے تھے، تو وہ نماز تو وہی پڑھتے تھے جو حنفی مسلمان پڑھتے ہیں، لیکن نماز پڑھتے تھے دوسروں (حتیٰ کہ حنفیوں) سے الگ۔

فرقوں کی یہ علامت ہماری وضع کردہ نہیں، قرآن کریم کی بیان فرمودہ ہے۔ خود رسول اللہؐ کی زندگی میں، مدینہ میں ایک الگ مسجد تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس مسجد کے تعمیر کرنے والوں نے نہ اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا تھا، نہ ہی انہوں نے کوئی نئی نماز وضع کر لی تھی۔ لیکن ان کا (الگ مسجد بنانے کا) یہ جرم اس قدر سنگین تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کو فرو کرنے کیلئے سخت ترین الفاظ میں تاکید کی۔ اس نے کہا کہ یہ مسجد نہیں، ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے، جو خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہیں **(ارصاداً لمن حارب اللہ و رسولہ ۱۰۷/۹)**۔ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ ان لوگوں نے اسلام کو چھوڑ کر کفر نہیں اختیار کر لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، قرآن کریم نے ان کی اس مسجد سازی کو کفر قرار دیا (۹/۱۰۷) اور حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ تم اس میں قدم تک نہ رکھنا **(لا تقم فیہ ابداً)** اور اس کے بعد کہا یہ مسجد ان لوگوں کو جہنم میں لے جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ جرم کیا تھا، جس کی پاداش میں ایسا کچھ کہا گیا۔ سنئے اور غور سے سنئے۔ یہ جرم تھا **(تفریقاً بین المومنین** ۹/۱۰۷) مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا۔ اور اس کی علامت کیا تھی؟ الگ مسجد! یہی وہ فرقہ سازی ہے جسے قرآن کریم نے یہاں کفر اور دوسرے مقام پر شرک کہہ کر پکارا ہے (۳۰/۳۱)۔ جب تک اسلام، دین کی شکل میں رہا، امت میں کوئی فرقہ پیدا نہ ہوا۔—— یاد رکھئے! وحدت امت، دین کی بنیادی شرط ہے۔ اگر یہ وحدت باقی نہ رہے تو پھر دین باقی نہیں رہتا۔ وہ دیگر مذاہب کی طرح مذہب بن جاتا ہے۔ ان فرقوں میں سے بہت سے مٹ مٹا گئے اور بہت تھوڑے سے باقی رہ گئے۔ اس کے بعد جدید فرقہ سازی کی وبا ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے ہمارے زمانے میں پھر سر نکالا۔ پہلے "احمدیوں" نے (اپنے آپ کو ایک فرقہ کی حیثیت سے متعارف کرا کر) الگ نماز پڑھنا شروع کی اور اس کے بعد فرقہ اہل قرآن نے ایک الگ نماز ایجاد کی اور باقی فرقوں سے الگ نماز پڑھنے لگے اور اس کے لئے اپنی الگ مسجد بھی تعمیر کر لی۔ "احمدیوں"

کے غیر مسلم قرار پا جانے سے ان کا شمار مسلمانوں کے فرقوں میں نہ رہا۔ وہ "فرقہ" یوں ختم ہو گیا۔ باقی رہے "اہل قرآن" سو وہ چند دنوں کا کھیل ہے۔ اس فرقہ میں باقی رہنے کی سکت نہیں۔ یہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ جو باقی فرقے چلے آ رہے ہیں، بحالات موجودہ، ان کے مٹ کر امت واحدہ بن جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر ہماری کوئی ایسی مملکت وجود میں آگئی جس نے اسلام کو پھر سے دین کی شکل میں متمکن کر دیا، تو اس وقت اس امت متفرقہ کا امت واحدہ میں تبدیل ہو جانے کا امکان ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو پھر اسلام، دین کی شکل اس قوم میں اختیار کرسکے گا جو پہلے پہل مسلمان ہو گی اور قرآن مجید کی بنیادوں پر مملکت قائم کرے گی۔ ہمارا ایمان ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا، کیونکہ خدا کا اعلان ہے کہ یہ دین، غالب آکر رہے گا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ جو طلوع اسلام، فرقہ سازی کو (ازروئے قرآن) شرک قرار دیتا ہو، کیا وہ خود ایک فرقہ بنائے گا؟ جو لوگ "پرویزی فرقہ" کی رٹ لگاتے ہیں، آپ ان سے پوچھئے کہ اس مبینہ فرقہ کے لوگ کونسی الگ نماز پڑھتے ہیں اور ان کی علیحدہ مسجد کونسی ہے! الگ مسجد بنانا تو ایک طرف، اس باب میں طلوع اسلام کی احتیاط کا تو یہ عالم ہے کہ یہ اپنی کنونشن میں بھی جلسہ گاہ یا قیام گاہ میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ شرکاء سے تاکید کرتا ہے کہ وہ قرب و جوار کی مساجد میں جاکر نماز پڑھیں۔ لیکن اس کے باوجود، یہ حضرات "پرویزی فرقہ" کی رٹ برابر لگائے جائیں گے۔ اس کی خاص وجہ ہے۔

جب سے مسلمانوں میں فرقے پیدا ہونے شروع ہوئے، یہ آواز طلوع اسلام کی طرف سے پہلی بار بلند ہوئی کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ سازی شرک ہے۔ اس سے پہلے ہوتا یہی تھا (اور اب بھی یہی ہو رہا ہے) کہ ہر فرقہ، دوسرے فرقوں کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرتا تھا اور اپنے آپ کو صحیح اسلام کا پابند اور "ناجی" قرار دیتا تھا۔ جب طلوع اسلام کی طرف سے یہ آواز بلند ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس کی مخالفت تمام فرقوں کی طرف سے ہونی تھی۔ اس کی مخالفت تو ان سب نے کی---- لیکن طلوع اسلام کی طرف سے قرآن کریم کی جو آیات پیش کی جاتی تھیں (جن میں اس نے فرقہ بندی کو کفر اور شرک قرار دیا ہے) ان کا جواب، ان سے نہیں بن پڑتا تھا۔ بالآخر، انہوں نے زچ ہو کر، اس کا علاج یہ سوچا کہ مشہور کر دیا جائے کہ طلوع اسلام کا بانی پرویز ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے۔ طلوع اسلام اس پر بھی قرآن کریم کی آواز بلند کرنے سے نہ رکا اور ان حضرات سے کہتا رہا کہ اس بحث کو چھوڑیئے کہ طلوع اسلام ایک فرقہ ہے یا نہیں۔ آپ یہ فرمایئے کہ، قرآن کریم کی رو سے، فرقہ سازی شرک ہے یا نہیں اور جو امت فرقوں میں بٹ جائے، کیا اس میں اسلام اپنی اصلی شکل میں باقی رہ سکتا ہے؟ اس کا ان کے پاس گالیوں کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔ جب یہ اس طرح سخت تنگ آگئے تو کوئی نہایت ہوشیار سیاسی ذہن آگے بڑھا اور اس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ تم کہو کہ مسلمانوں میں کوئی فرقہ ہے ہی نہیں۔ یہ سب مختلف "مکتب فکر" ہیں۔ فرقہ کا نام مکتب فکر رکھا اور اس فریب نفس یا ابلہ فریبی سے مطمئن ہو گئے کہ ہم اس الزام سے بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ ان کی بدستور الگ الگ نمازیں ہیں، الگ الگ مساجد، الگ الگ شریعت۔ لیکن اس کے باوجود یہ فرقے نہیں، مکاتب فکر ہیں---- اور طلوع

اسلام جس کی نہ کوئی الگ نماز ہے' نہ الگ مسجد' نہ الگ شریعت' نہ کوئی الگ دعویٰ' فرقہ ہے! یا للعجب!

یہاں تو اس قسم کے فریب نفس سے اپنے آپ کو دھوکا دیا جا سکتا ہے' لیکن معلوم نہیں' ان حضرات کو اس دن (یوم ظہور نتائج) کا بھی احساس ہے یا نہیں' جس کے متعلق فرمان خداوندی ہے کہ **یوم لا ینفع الظلمین معذ رتھم .....**(۴۰/۵۲) جب اس قسم کا فریب نفس کوئی کام نہیں دے گا---- مرنے کے بعد جو ایسا دن آئے گا' تو وہ اپنی جگہ (برحق) رہا- ہم ان خود فریبوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ فرقوں کا نام مکاتب فکر رکھ لینے سے کیا آپ کے وہ جھگڑے ختم ہو گئے جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں؟

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ (اور نمازیں تو چھوڑیئے! کیا) آپ کے ان "مکاتب فکر" نے گذشتہ عید کی نماز بھی ایک جگہ مل کر پڑھی ہے؟ کیا آپ نے کفر کے وہ فتوے واپس لے لئے ہیں جو آپ نے ایک دوسرے فرقے کے خلاف لگائے تھے؟

(فروری ۱۹۷۶)

------ ○ ----

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

پہلا باب

مذہبی پیشوائیت کا اسلام

۱۔ مولانا حضرات کے اسلام کا نقشہ

نوائے وقت' بابت ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء میں' (جماعت اسلامی کے) سید اسعد گیلانی صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "نظامِ مصطفیؐ کیا ہے؟"۔ انہوں نے پہلے یہ بتایا ہے کہ اسلام کے دانا دشمنوں نے اس نظام کی کس قدر بھیانک تصویر پیش کی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ اس کے نادان دوستوں نے اس کا نقشہ کس قسم کا کھینچا ہے۔ اس ضمن میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> اسلام کے نادان دوستوں نے اور بھی ستم ڈھایا۔ انہوں نے اسلام کے خلاف اندر کی غلط گواہی پیش کی۔ ان میں سے بیشتر اسلامی حکومتوں کے دور میں مرتّب کردہ نصابِ قانون کے فتویٰ ساز تھے جو اسلام کو بحیثیت نظامِ زندگی نہ جانتے تھے بلکہ اس کے قانون فوجداری اور دیوانی کے ماہرین تھے۔ ان کے پاس محض ضوابط حدود اور وراثت کے مسائل اور مسلمان حکومتوں میں عدالتی نصابوں کے چارٹ تھے۔ وہ ہر مسئلے کو قانونِ سزا اور احتساب کی نظر سے ہی دیکھتے تھے۔ مسلمان حکومتوں کے زوال کے بعد اسلامی نظامِ تعلیم کے نام سے مسلمانوں کا یہی فوجداری اور دیوانی نظامِ قانون باقی رہ گیا اور وہ بدلے ہوئے حالات سے بے نیاز اسی نظامِ قانون کو حالات' ماحول اور فضا سے بے نیاز ہو کر اسی انداز میں بیان کرتے رہے۔ گویا اسلامی نظام کی ساری فضا' سارا اخلاق اور سارے رفاہی ادارے تو موجود تھے بس اس کا قانونِ فوجداری ہی نافذ کرنے کی دیر تھی کہ اسلامی نظام کی بہار پورے معاشرے میں ہر طرف لہریں لینے لگے گی۔ چونکہ یہی حضرات اپنی اس ناکافی تعلیم' محدود نگاہ' حالات حاضرہ سے بے خبر دل و دماغ کے ساتھ اسلام کی نمائندگی کرتے' اس کے قوانین کے از سرِ نو اجراء کا مطالبہ کرتے اور اسلامی دور کے گن گاتے تھے' اس لئے فطری طور پر اسلامی نظام یا نظامِ مصطفیؐ کی حقیقی تعبیر کے مُفسّر انہیں کو قرار دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبوں'

وعظوں، تقریروں اور بیانوں میں جو اسلامی نظام کا نقشہ پیش کیا وہ بڑا ہی بھیانک نقشہ ہے۔ اگرچہ وہ اپنے ذہن اور نفسیات کے مطابق اسلام کی خدمت اور تبلیغ ہی کرتے تھے لیکن اسلام کی رحمت اور برکات سے ناواقف لوگ ان کے سزاؤں سے معمور وعظ اور بیانات سن سن کر تھر تھر کانپتے تھے اور انہیں اپنی پیٹھوں پر بات بات پر کوڑے برستے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اسلام کے ان نادان دوستوں نے اسلامی نظام یا نظامِ مصطفیٰؐ کی جو تصویر پیش کی وہ یہ تھی کہ امربالمعروف کے محکمے کے تحت ڈنڈا بردار اور کوڑے بار مشرّع کارکنوں کا ایک جتھہ گلی گلی پھرے گا۔ جس کا ٹخنہ ننگا نہ پائے گا اس کے ٹخنے پر ڈنڈے پڑیں گے۔ جو نماز میں لاپروائی کرے گا اسے جوتے مار مار کر نماز پڑھائی جائے گی۔ جس کی ڈاڑھی نہ ہوگی اس پر سنّتِ رسولؐ کی خلاف ورزی کے جرم میں کوڑے برسیں گے۔ چوروں کی قطاریں ہاتھ کٹواتی علیٰحدہ کھڑی ہوں گی۔ زانیوں کو دوسری طرف سنگسار کیا جارہا ہوگا۔ شرابی کسی اور چوراہے پر پٹ رہے ہوں گے۔ نوجوانوں اور بے پردہ عورتوں کو پکڑ پکڑ کر ہرچوراہے میں ان کے سر مونڈے جا رہے ہوں گے۔ بے پردہ عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر گھروں میں بند کیا جا رہا ہوگا۔ جا بجا ٹکٹکیاں لگی ہوں گی۔ مجرم ان پر ٹنگے ہوئے کوڑوں کی مار کھا رہے ہوں گے۔۔۔ اور دہشت زدہ عوام کا ہجوم ہاتھوں میں تسبیاں لئے اندر ہی اندر خوف زدہ یہ سارے مناظر دیکھ رہا ہوگا۔ مٹھائی کی دکانیں بند کرکے صرف حلوے کی دکانیں کھلی رکھی جائیں گی۔ عدالتوں کا کام صرف لوگوں کو کوڑے لگوانا اور ہاتھ کٹوانا ہوگا۔ باقی کام واجبی سا ہوگا۔

اس نقشہ کا ایک گوشہ خالی رہ گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر یہ ناتمام رہ جاتا ہے۔ محترم گیلانی صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ اسے بھی اپنے پیش کردہ نقشہ میں شامل کرلیں۔

وہ یہ ہے :۔

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رُونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً" منحرف ہوچکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کرکے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدّت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور

پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کردیا جائے گا۔

("مرتد کی سزا" از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔
اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن ص۷۶)

اسعد گیلانی صاحب، جماعت اسلامی کے ایک ممتاز رکن ہیں، اس لئے انہیں اس نقشہ کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہونا چاہئے، نہ ہی اسے اپنے نقشہ میں شامل کرنے پر کوئی اعتراض۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس نقشہ کے مرتب کا شمار اسلام کے دانا دشمنوں میں کریں گے یا نادان دوستوں میں۔ (ستمبر ۱۹۷۷ء)

مکرر

گیلانی صاحب نے یہ تنقید جولائی ۱۹۷۷ء میں کی تھی۔ شروع ۱۹۷۹ء میں یہ تمام قوانین جن کے خلاف انہوں نے ایسی سخت تنقید کی تھی، "شرعی حدود" کے نام سے پاکستان میں نافذ ہوگئے اور جماعتِ اسلامی نے شادیانے بجا بجا کر ان کا استقبال کیا اور غلغلہ بلند کیا کہ للہ الحمد۔ ہزار سال کے بعد پھر سے اسلام کا احیاء ہوگیا ہے۔ ان قوانین کی تفصیل اگلے باب میں ملے گی۔

---------------○---------------

۲۔ قرآنِ مجید کے نادان دوست

(اسوۂ ابراہیمیؑ کی تاریک تصویر)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، ایلوپیتھک ڈاکٹر ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی (اپنے تصوّر کے مطابق) قرآنِ کریم کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے "خدّام القرآن" کے نام سے ایک انجمن کی بھی تشکیل کی ہے۔ قرآنِ مجید کے لئے اپنی زندگی وقف کردینا بہت بڑا عملِ خیر ہے اور مستحقِ ستائش، لیکن اصل سوال خدمتِ قرآن کے لئے زندگی وقف کردینے کا نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی وہ خدمت کس قسم کی ہے جس کے لئے زندگی وقف کی گئی ہے۔ اس "خدمت" کی ایک مثال اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے زیرِ ادارت و اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ میثاق کی جنوری ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ـــــ "سعی بین الصفا و المروہ" ـــــ اس میں تحریر ہے:۔

> حضرت اسماعیلؑ ابھی شیر خوار ہی تھے کہ ان کی سوتیلی والدہ سارہؓ نے گھریلو جھگڑے کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کو مجبور کیا کہ وہ بی بی ہاجرہؓ کو گھر سے نکال دیں۔ اس بات پر حضرت ابراہیمؑ نہایت رنجیدہ و کبیدہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً آپ کو اطلاع دی کہ رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جیسے سارہؓ کہتی ہیں، ویسے ہی کرو۔ اسحاقؑ و اسماعیلؑ

تیری ہی اولاد ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کو ہاجرہؓ کے فرزند دل پسند سے ایک عظیم قوم بنانی ہے۔ اس ارشادِ ربّانی پر سیکڑوں میل کا سفر طے کرکے حضرت ابراہیمؑ نہایت صبر و حلم۔۔۔ استقامت و تحمل کے ساتھ اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہؓ کو کشاں کشاں بہ ہزار مشکل حجاز کی ایک وادی میں لے کر پہنچے جس کو وادیٔ بطحا یا وادیٔ بکّہ بھی کہتے تھے۔ یہ وہ وادی ہے جہاں اب مکۃ المکرمہ واقع ہے۔ یہ آبادی اس وقت انتہائی غیر آباد اور ویران تھی۔ تپتے ہوئے صحرا کی یہ بے آب و گیاہ وادی جہاں انسان زندگی کے بدلے موت کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے چاروں طرف نوکیلے' تپتے اور چمکتے پہاڑ تھے جو نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے۔ صحرا کی وسعت حد نگاہ تھی۔ نہ چرند نہ پرند' سبزہ کا نام و نشان نہیں ماسوائے ریت کے تودوں کے یا سراب کے۔ دُور دراز تک پانی کا نام نہ تھا۔ بادِ صرصر کے تھپیڑے العطش العطش پکارتے تھے۔

الغرض اس وادی میں کوہِ صفا و مروہ کے پاس ان دو بے کس' نحیف اور بے بس جانوں کو مختصر زادِ راہ کے ساتھ چھوڑ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کی۔ واپس لوٹنے لگے تو بی بی ہاجرہؓ نے نہایت غمگین لہجہ میں پوچھا' ابراہیمؑ! ہمیں کس کے سپرد کرکے جا رہے ہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا' "اس خدا کے جو دونوں جہان کا وارث ہے اور پالنے والا ہے"۔ ہاجرہؓ نے کہا' بیشک پھر آپ جاسکتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کا اپنے ایک بیٹے (حضرت اسماعیلؑ) کو شام سے منتقل کرکے مکّہ میں بسانا دینِ خداوندی کے ایک عظیم پروگرام کی نہایت اہم بنیادی کڑی تھی۔ (ہم اس وقت اس نکتہ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے) یہ کوئی ہنگامی یا اتفاقی واقعہ نہیں تھا۔ لیکن جس طرح یہ واقعہ مندرجہ بالا مضمون میں بیان کیا گیا ہے' (واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں یہ واقعہ یوں نہیں آیا۔ یہ تورات کا افسانہ ہے) اس کی رُو سے بات یوں سامنے آتی ہے کہ

۱۔ اس واقعہ کا محرک (معاذ اللہ) دو سوکنوں کا باہمی جلاپا تھا جس کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی ایک بیوی نے انہیں "مجبور کیا" کہ وہ دوسری بیوی اور اس کے شیر خوار بچے کو گھر سے نکال دے۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ اس پر بہت رنجیدہ ہوئے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ تم رنجیدہ نہ ہو۔ اپنی بیوی کی بات مان لو۔

یہ تو ہوا اس واقعہ کا محرک قصّہ۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ ایک شخص (اور شخص بھی کوئی عام آدمی نہیں بلکہ خدا کا ایک عظیم المرتبت پیغمبرؑ) دو بے کس' نحیف اور بے بس جانوں کو جن میں ایک شیر خوار بچہ ہے' ایک ایسی وادی میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے جو انتہائی غیر آباد اور ویران تھی۔ تپتے ہوئے صحرا کی یہ بے برگ و گیاہ وادی جہاں انسان زندگی

کے بدلہ موت کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے چاروں طرف نوکیلے، تپتے پہاڑ تھے جو نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے۔ صحرا کی وسعت حد نگاہ تھی۔ نہ چرند نہ پرند۔ سبزہ کا نام و نشان نہیں۔ ماسوائے ریت کے تودوں کے یا سراب کے دور دراز تک پانی نہ تھا۔ بادِ صرصر کے تھپیڑے العطش العطش پکارتے تھے۔ اس مقام پر خدا کا یہ پیغمبرؑ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو صرف ایک مشکیزہ پانی کا دے کر چلا گیا اور انہیں تنہا چھوڑ گیا۔ ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ غیر مسلم (یا ہماری نئی نسل کے نوجوان) جب اس "واقعہ" کو پڑھیں گے تو وہ خدا کے اس پیغمبرؑ کے متعلق کس قسم کا تصور قائم کریں گے۔ اور جب ان سے کہا جائے گا کہ خود خدا نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا تو وہ ایسے خدا کے متعلق کیا کہیں گے؟ جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے، قرآنِ کریم میں یہ واقعہ درج نہیں۔ یہ تورات کا افسانہ ہے جو ہماری کتب روایات و تفاسیر میں راہ پاگیا ہے اور ہمارے "خدام القرآن" اسے آنکھیں بند کرکے نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ یہ قرآن کی خدمت ہے یا اس کی (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) مذمّت! (فروری ۱۹۷۷ء)

۳۔ کشف المحجوب میں وضعی روایات

(حضرت داؤدؑ سے متعلق افسانہ)

ذیل کا خط ملاحظہ فرمائیں:۔

مسلمانوں کے تمام فرقوں کا حضرات انبیاء کرامؑ کی عصمت پر اتفاق ہے۔ لیکن بعض اوقات ہمارے اسلاف کی تحریروں میں ایسی چیزیں سامنے آجاتی ہیں جن سے ان کی عصمت داغدار ہوتی نظر آتی ہے۔ اگلے دن حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "کشف المحجوب" کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک عجیب چیز نظر سے گزری اور راقم اپنی کم علمی کی بنا پر اس کی کوئی تاویل نہ کرسکا۔ آپ کو تحریر کر رہا ہوں کہ اگر اس کی کوئی تاویل ہوسکتی ہے تو مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے محل کی چھت پر سے اپنے ایک پڑوسی، اوریاہ حتّی کی بیوی کو برہنہ نہاتے دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہوگئے۔ پھر اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے۔ اور جب وہ حاملہ ہوگئی تو انہوں نے اس کے شوہر کو بنی عمون کے مقابلے میں جنگ پر بھیج دیا اور فوج کے سالارِ اعلیٰ کو حکم دیا کہ اسے ایسی جگہ متعین کرے جہاں سے وہ زندہ نہ بچ سکے۔ جب وہ مارا گیا تو داؤد علیہ السلام نے اس کی بیوی سے باقاعدہ شادی کرلی۔ اور شادی کے بعد اس کے بطن سے حضرت سلیمان علیہ السلام پیدا ہوئے۔[۱] (نعوذ باللہ من ہذا البہتان)

ظاہر ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے ایک معصوم نبی پر بہتان ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کا ذکر تو کجا، اشارہ بھی نہیں ملتا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان تفصیلات نے ہماری بعض کمزور روایات میں جگہ پالی ہے اور ہمارے مفسّرین ان

۱۔ عہد نامہ عتیق۔ سیموئیل نمبر ۲۔ باب نمبر ۱۲ - ۱۱۔

احادیث کو جانچے بغیر اللہ تعالیٰ کے انبیاءؑ پر اس قسم کے بہتان تسلیم کرلیتے ہیں۔ خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مدینہ کے منافقین اور یہودیوں نے کچھ ایسا ہی جھوٹا الزام لگایا کہ آپؐ نے حضرت زیدؓ بن حارث کی بیوی حضرت زینب بنت جحشؓ کو (جو رشتے میں آپ کی سگی پھوپھی زاد بہن تھیں) کو برہنہ حالت میں دیکھ لیا تھا اور ان پر عاشق ہوگئے تھے۔ پھر حضرت زیدؓ سے طلاق دلوائی اور اپنے نکاح میں لے آئے (نعوذ باللہ من ہذا البہتان)۔ قرآنِ حکیم نے خود اس واقعہ کی واضح الفاظ میں تردید کی ہے اور فرمایا کہ جب ناتفاقی کی بنا پر حضرت زیدؓ اور زینبؓ میں ان بن ہوگئی اور حضرت زیدؓ نے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلعم نے آپ کو ایسا کرنے سے روکا۔ لیکن جب حضرت زیدؓ نے، اس کے باوجود، اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو حضورؐ نے ان سے نکاح کرلیا۔

لیکن کشف المحجوب میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت محمد صلعم پر کافروں اور منافقوں کے لگائے ہوئے ان الزامات کو صحیح مان کر درج کردیا گیا ہے۔ کشف المحجوب کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

> تو جب فعل حق مضاف ہو بندہ کی طرف تو بندہ بخود قائم ہوتا ہے اور جب بندہ کا فعل حق کی طرف مضاف ہو تو بندہ بحق قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی نظر مبارک وہاں پڑی جہاں پڑنی نہ چاہئے تھی، یعنی ایک عورت پر جو اوریا کی عورت تھی۔ جسے دیکھا وہ ان پر حرام تھی۔ اور جب بندہ بحق قائم ہوگیا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر تو آپ کی بھی پڑی، اس طرح زیدؓ کی بیوی پر مگر وہ بیوی زیدؓ پر حرام ہوگئی۔ اس لئے کہ وہ نظر جو داؤد علیہ السلام کی تھی وہ محل صحو میں تھی اور یہ نظر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی یہ محل سکر[۲] میں تھی۔
>
> (کشف المحجوب ترجمہ ابوالحسنات سید محمود احمد قادری، شائع کردہ المعارف گنج بخش روڈ لاہور، پہلا ایڈیشن ۱۳۹۴ھ، صفحہ ۳۵۲)

کشف المحجوب کے بہت سے اُردو ترجمے ہیں اور ان میں یہ عبارت "صوفیہ کے مختلف مکاتب و مذاہب کے باب" میں فرقہ طیفورہ کے ذیل میں ہر کتاب میں ملتی ہے۔ ہم نے ابوالحسنات قادری صاحب کا حوالہ اس لئے دیا ہے کہ ان کے عقیدت مندوں کے دعوٰی کے مطابق اسے خود حضرت داتا صاحب کی منظوری حاصل ہے۔ میں یہ عبارت پڑھ کر حیران ہوا تو کسی صاحب نے بتایا کہ میاں محمد طفیل، امیر جماعت اسلامی پاکستان نے بھی کشف المحجوب کا ترجمہ کیا ہے اور نوٹ بھی لکھے ہیں۔ انہوں نے ضرور اس کی کوئی تشریح فرمائی ہوگی۔ لیکن جب میں نے اس نسخہ کو دیکھا تو اس نے میری پریشانی میں اور اضافہ کردیا کیونکہ انہوں نے مذکورہ بالا عبارت سمیت بہت سی عبارتیں حذف کردی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں یہ چیزیں قرآن اور اسلامی تعلیمات کے خلاف نظر آئی ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ جس کتاب کو وہ تعمیرِ سیرت کے لئے مرتّب فرما رہے تھے، ایسے مقامات کے بارے میں کچھ وضاحت فرمادیتے۔

۲۔ صحو کے معنی ہوش مندی اور سکر کے معنی مدہوشی۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس بارے میں میری پریشانی دور فرمائیں۔ (پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

طلوع اسلام

محترم .... نے 'کشف المحجوب' کا ایک اقتباس دیکھا اور ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہم نے تصوف کے لٹریچر میں جو کچھ دیکھا ہے اگر کہیں وہ ان کے سامنے آجائے تو نہ معلوم ان کی کیا حالت ہو!

کیا جانئے کیا کرتا' کیا دیکھتا' کیا کہتا
زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

.... صاحب ان "ارشاداتِ عالیہ" کی تاویل کی فرمائش کرتے ہیں۔ انہیں شاید علم نہیں کہ یہ حضرات خدا سے براہِ راست علم حاصل کرکے (جسے کشف و الہام یا باطنی علم سے تعبیر کیا جاتا ہے) اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے کسی "بندے بشر" کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ ان کی کوئی تاویل کرسکے یا ان سے سند کا مطالبہ کرسکے۔ ایسے سوالات کا ان کے ہاں سے جواب یہ ملتا ہے کہ

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی!

قرآنِ کریم اس لئے آیا تھا کہ نوعِ انسانی کو شخصیت پرستی کی پستی سے نکال کر' خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے شرف و مجدِ انسانیت کے مقامِ بلند پر لے جائے۔۔۔ حضورؐ نے اپنی عملی زندگی سے ایسا کرکے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد' مسلمانوں نے قرآن کا دامن بھی چھوڑ دیا اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور ان کا دین' مذہب' ایمان' مسلک و مشرب' سب شخصیت پرستی قرار پاگیا۔ چنانچہ اب قوم گلے گلے تک شخصیت پرستی کے دلدل میں غرق ہے۔ چونکہ شخصیت پرستی سے انسان کی عقل و فکر کی صلاحیتیں سلب ہوجاتی ہیں اور وہ یکسر جذباتی ہوجاتا ہے' اس لئے وہ بڑا ذکی الحس TOUCHY ہوتا ہے اور حقائق کا سامنا کرنے کی اس میں برداشت نہیں رہتی۔

یہ ہے وہ مقام جس پر ہم آج کھڑے ہیں۔ لہٰذا' ان حالات میں' اپنے لٹریچر پر تنقیدی نگاہ ڈالنے اور اسے قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھنے اور اسوۂ حسنہ کے معیار پر جانچنے کا کام بڑا ہمت طلب ہے۔ آپ اس باب میں ایک انگلی اٹھایئے اور پھر دیکھئے کہ آپ بھڑوں کے کتنے چھتوں میں پتھر دے مارتے ہیں۔ طلوع اسلام کے ساتھ یہی تو ہوا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

(اپریل ۱۹۷۸ء)

۴۔ ڈاڑھی

(سنت رسولؐ کا معاذ اللہ استہزاء)

پشاور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ صدائے اسلام کی ۲۱ جولائی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں عنوانِ بالا کے تحت ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے :۔

حضرت مولانا عبدالعزیز، خطیب زراعتی فارم ساہی وال، فرمایا کرتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں ایک بڑے عالم رہا کرتے تھے۔ جماع کے بعد تہجد کے وقت جب وہ غسل کرتے تو پیرانہ سالی کے سبب ان پر کپکپی طاری ہوجاتی اور وہ کہتے شریعت نے خواہ مخواہ غسل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر غسل کا حکم نہ ہوتا تو کیا حرج تھا۔ وفات کے بعد ان کو مکہ معظمہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ مدت کے بعد ان کی قبر، ہڈیاں نکالنے کے لئے کھودی گئی تو دیکھا کہ ایک عورت کی لاش ہے۔ لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ مولوی صاحب تو عالم باعمل اور نیک آدمی تھے لیکن غسل کے بعد مذکورہ بالا الفاظ کہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ واقعی یہ اس کی سزا ہے۔ اندازہ فرمائیں کہ شریعت کی تحقیر کا کیا انجام ہوا! ع

غور سے سن داستان ان کی!

حجاج میں سے ایک شخص نے اس عورت کی لاش پہچانی اور کہا کہ یہ انگلستان کی رہنے والی تھیں اور مسلمان ہوچکی تھیں --- اس کے خاندان کے سب افراد عیسائی تھے۔ چنانچہ ان کی نشان دہی پر انگلستان ایک عالم صاحب گئے اور عورت کے والدین سے ملے اور اس کے والدین کو ساتھ لے کر اس عورت کی قبر اکھاڑی گئی تو دیکھا کہ مولوی صاحب کی لاش موجود ہے جن کو مکہ معظمہ میں دفن کیا گیا تھا۔ اس روح فرسا واقعہ سے ڈاڑھی منڈے عبرت حاصل کریں اور ڈاڑھی کا استہزاء و تضحیک چھوڑ دیں ورنہ اُمّتِ محمدیہؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں محشور نہ ہوں گے۔ (جون ۷۸ء)

۵۔ تصوف کی ریاضتیں

(حضرت بابا فرید گنج شکرؒ)

روزنامہ مشرق (لاہور) کی ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شائع شدہ ایک مقالہ میں تحریر ہے :-

حضرت بابا صاحب (بابا فرید الدین گنج شکرؒ) بارہ برس تک صائم رہے۔ اس عرصہ میں نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ گلے میں ایک کاٹھ کی روٹی ڈال رکھی تھی۔ جب بھوک غلبہ کرتی تو آپ روٹی پر دانت مارتے۔ بارہ سال کی ریاضت کے بعد جب والدہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے لکڑی کے سہارے کو بھی برا منایا اور کہا کہ ابھی تم پر نفس غالب ہے۔ جاؤ

اور بغیر چوبی روٹی کے صائم رہو۔ چنانچہ انہوں نے کاٹھ کی روٹی پھینک دی اور پھر بارہ سال تک صائم رہے۔

انہی کے متعلق روزنامہ جاوداں کی اشاعت بابت ۲۴ فروری ۱۹۷۱ء میں کہا گیا ہے :۔

آپ نے بہت سخت سے سخت مجاہدے کئے' چلہ معکوس بھی کاٹا' یعنی بارہ سال کنویں میں لٹک کر نماز معکوس ادا کی (اس کا طریقہ یہ ہے کہ چلہ کرنے والا رات کو پاؤں میں رسی باندھ کر کنوئیں میں الٹا لٹک جاتا ہے اور عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ ناقل)۔
جواہر فریدی میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں' حال ریاضت اور استغراق درجۂ فنا میں یہاں تک پہنچے کہ چڑیوں اور جانوروں نے آپ کے پاؤں اور وجود مبارک میں گھونسلے بنا لئے تھے۔ (جون ۱۹۷۸ء)

---------------○---------------

مولانا احمد رضا خان (مرحوم) کی وصیّت

بریلوی فرقہ کے بانی' مولانا احمد رضا خان (مرحوم) نے اپنی وفات سے دو گھنٹے پہلے جو وصیتیں فرمائیں ان میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ ان کی وفات کے بعد' ان کی فاتحہ میں کس کس قسم کی چیزیں رکھی جائیں۔ فرمایا:۔

اعزہ سے اگر بطیب خاطر ممکن ہو تو فاتحہ ہفتہ میں دو تین بار ان اشیاء سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز' اگر بھینس کا دودھ ہو' مرغ کی بریانی' مرغ پلاؤ' خواہ بکری کا ہو' شامی کباب' پراٹھے اور بالائی' فرنی' ارد کی پھریری دال مع ادرک و لوازم' گوشت بھری کچوریاں' سیب کا پانی' انار کا پانی' سوڈے کی بوتل' دودھ کا برف۔
(وصایا شریف نمبر۸' مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور۔
بحوالہ دھماکہ' ص۱۹) (جون ۷۸ء)

---------------○---------------

۷۔ کوّا حلال ہے یا حرام

ہمارے مولانا حضرات کس قسم کی مہمات مسائل کو حل کرنے میں مصروف رہتے ہیں' اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمالیجئے۔ راولپنڈی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ انصاف کی ۲۶ اگست ۷۶ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ:

ضلع سرگودھا میں ہزاروی گروپ سے متعلق مولوی صاحبان نے یہ ثابت کیا کہ کوا حلال ہے اور پھر اس نظری فتویٰ کو عملی شکل دینے کے لئے کوے ذبح کئے اور ان کا گوشت پکا کر کھایا۔ اس کے بعد اب مختلف فرقوں میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ کوا حلال ہے یا حرام۔ (جون ۷۸ء)

۸۔ جمعہ کی تعطیل

جماعت اسلامی کے ترجمان "ہفت وار ایشیا کی ۲۸ نومبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت کے اداریہ کا عنوان ہے — "شریعت نافذ، لیکن جمعہ کی تعطیل نہیں ہو سکتی"۔— اس میں تحریر ہے:-

محترم وزیراعظم نے بڑی تحدی کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ یہاں پر شریعت نافذ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسی شریعت نافذ ہے کہ جمعہ کی تعطیل بھی نہیں ہو سکتی۔

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کے نزدیک جمعہ کی تعطیل، شریعت کا لازمی جز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تحریر ہے کہ:

جمعہ کی تعطیل نظامِ شریعت کا ایک حصہ نہیں ہے لیکن یہ جمہوریہ اسلامیہ اور اس کی تہذیب و ثقافت کی ضروری علامت ہے۔

جمعہ کی تعطیل نظامِ شریعت کا حصہ بھی نہیں، لیکن اگر جمعہ کی تعطیل نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں نظامِ شریعت نافذ نہیں! ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہئے!

اور سنئے! اسی پرچہ میں، آگے چل کر "جمعہ یا اتوار" کے عنوان سے، سید عبدالقدوس ہاشمی صاحب کا ایک مقالہ درج ہے۔ اس میں تحریر ہے:-

خدا اور رسولؐ کے حکم کے بموجب امت اسلامیہ کے ہر فرقہ اور جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز جمعہ کے بعد کاروبار حرام ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کی خلاف ورزی ہے۔

اس کے بعد اگلی سطر میں کہا گیا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعد ختم نمازِ جمعہ، کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے۔

یعنی— اللہ تعالیٰ نے بعد نماز، کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے اور "امت اسلامیہ کے ہر فرقہ اور جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ بعد نماز کاروبار حرام ہے" کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کی خلاف ورزی ہے۔

شریعت کے ساتھ اس قسم کا مذاق، انہی حضرات کے لئے مخصوص ہے۔ خدا کا حکم تو واضح ہے کہ نماز سے پہلے بھی کاروبار کرو اور نماز کے بعد بھی۔ صرف نماز کے لئے کاروبار بند کرو۔ (سورۂ جمعہ، آیت نمبر ۱۰، ۶۲/۱۰)

(جنوری ۷۷ء)

۹۔ اتّباعِ سنّت کا صلح کل طریق

اس اقتباس کو غور سے پڑھئے:

مولانا محترم سے ایک صاحب نے آمین بالجہر کے اثبات کے بارے میں سوال کیا۔ مولانا محترم نے فرمایا: حدیث کی کتابوں میں آمین بالجہر کا ثبوت بھی ملتا ہے اور خاموشی سے آمین کہنے کا بھی' لیکن میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر ایک آدمی ایک ثابت شدہ سنّت پر عمل کر رہا ہو اور اس کے مقابلے میں دوسری بھی ثابت شدہ سنتیں ہوں تو ایک مسلمان کو دوسری ثابت شدہ سنتوں پر بھی ضرور عمل کرنا چاہئے اگرچہ وہ زندگی میں ایک بار ہی کیوں نہ ہو۔ ایک بار زور سے آمین کہنے کا قائل ہے' اسے کبھی آہستہ بھی کہنی چاہئے تاکہ دونوں سنتوں پر اس کا عمل ہو جائے۔ بس یہ کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی سنت ایسی نہ رہ جائے' جس پر آدمی عمل نہ کرسکا ہو۔ (ایشیا' ۳۰ مارچ ۱۹۷۵ء)

کیا فرماتے ہیں علماءِ اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ مودودی صاحب کے اس نسخہ کے بارے میں؟ کیا وہ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں؟...... لیکن ہماری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ آمین بالجہر یا خفی کے معاملہ میں تو مودودی صاحب کا پیش کردہ طریق قابلِ عمل ہوسکتا ہے---- کبھی یوں کرلیا کبھی ووں---- لیکن سوال یہ ہے کہ اگر پاکستان کی اسلامی مملکت میں' سنّتِ رسول اللہ کی رُو سے ملکی قوانین مرتب ہوئے تو ظاہر ہے کہ وہ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ کیا اس وقت بھی ہر شخص کو اجازت ہوگی کہ وہ کبھی ایک قانون پر عمل کرے اور کبھی (اس کے برعکس) دوسرے قانون پر۔ اور اس طرح ساری زندگی ان مختلف قوانین پر عمل کرتا رہے تاکہ کوئی ایسی سنت نہ رہ جائے جس پر وہ عمل نہ کرسکا ہو۔ (فروری ۱۹۷۷ء)

۱۰۔ دین اور مذہب میں فرق

(روس میں مذہبی آزادی)

روسی سفارت خانہ (متعینہ کراچی) کی طرف سے ایک گشتی خبرنامہ موصول ہوا ہے جس کے ساتھ ایک مقالہ خصوصی بھی منسلک ہے جس کا عنوان ہے---- سویت یونین میں تمام مذاہب کو مکمل آزادی حاصل ہے---- اس میں انہوں نے لکھا ہے:

سویت یونین میں مسلمانوں کی انجمنوں کی بڑی تعداد کا تعلق سُنّی فرقے سے ہے۔ وہاں

مساجد میں روزانہ نمازوں کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے اور عید کی نمازیں بھی ہوتی ہیں۔ مسلمان اپنی عیدیں بڑے ہی اہتمام سے مناتے ہیں۔ عید کے دن ہزاروں مسلمان مساجد میں جمع ہوتے ہیں۔ ماسکو کی مسجد میں عید کے موقع پر عموماً" پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان نماز ادا کرتے ہیں ..... سوویت یونین کے مسلمان اپنے عقائد کے مطابق ساری مذہبی رسمیں ادا کرتے ہیں۔ مثلاً" عقیقہ' شادی اور نماز جنازہ وغیرہ..... مسلمان خاندانوں میں شادیاں اسلامی عقائد کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ سویت یونین کے مسلمان فریضہ حج بھی ادا کرتے ہیں...... سویت یونین کے مدرسوں اور مسلم اکیڈیمی میں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے..... مسلم بورڈوں کی طرف سے جنتریاں اور فتوے شائع کئے جاتے ہیں۔

اس قسم کی تفاصیل کے بعد آخر میں لکھا ہے

مذاہب کو مکمل مساوات حاصل ہے اور انہیں عبادت کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ ان کی عبادت گاہوں کے تقدس کی ضمانت دی گئی ہے۔ مذہبی زندگی کے تعلق سے انہیں مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہ چیز اس اصول کے عین مطابق ہے کہ سوویت یونین میں ریاست کو مذہب سے علیٰحدہ کردیا گیا ہے۔

آپ ہمارے ہاں کے علمائے کرام سے پوچھئے۔ وہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ اس قسم کی مذہبی آزادی سے اسلام کے تقاضے پورے نہیں ہوجاتے۔ اسلام میں مذہب کو ریاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہی علماء حضرات تحریکِ پاکستان کے دوران کیا فرمایا کرتے تھے؟ وہاں کا ہندو' مسلمانوں کو اس قسم کی پوری مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا تھا جس کا ذکر روسی سفارت خانہ کے مقالہ میں کیا گیا ہے۔ یہ علماء حضرات (جنہیں نیشنلسٹ علماء کہا جاتا تھا اور جو بالعموم دیوبند سے متعلق تھے) یہ کہتے تھے کہ مذہب کی اس قسم کی آزادی کے بعد' اسلام کے تقاضے پورے ہوجاتے ہیں۔ اس لئے مسلم لیگ کا علیٰحدہ مملکت کا مطالبہ اسلام کا تقاضا نہیں۔ ان کے برعکس' علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ اسلام محض عقائد' عبادات یا رسومات کی آزادی کا نام نہیں۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کے نفاذ کا نام ہے اور یہ مقصد اپنی آزاد مملکت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ آپ اس بحث کو دیکھئے جو دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ (مرحوم) کے مابین ۱۹۳۸ء میں چھڑی تھی اور جسے حضرت علامہؒ نے "معرکۂ دین و وطن" کہہ کر پکارا تھا۔ یہ علماء حضرات آخری وقت تک مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد ہجوم کرکے اس طرف آگئے۔ اور اب یہ اس مطالبہ میں پیش پیش ہیں کہ مذہب کو ریاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے مملکت کا اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو۔ (ستمبر ۱۹۷۷ء)

۱۱- ثابت کرو کہ قرآن وہی ہے

"قرآنی فیصلے"" جلد چہارم' باب اول میں لکھا گیا تھا کہ مودودی صاحب نے نئی نسل کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے کس طرح ایک نیا شگوفہ چھوڑا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سات زبانوں میں قرآن نازل کیا اور اسے انہی سات زبانوں میں رسول اللہ نے امت کو دیا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ان میں سے چھ زبانوں کے قرآن کے نسخوں کو جلا دیا اور صرف ایک زبان کے قرآن کو باقی رہنے دیا جو مسلمانوں میں رائج ہے۔ ہم نے اس پر لکھا تھا کہ مودودی صاحب کی اس سازش سے اسلام سینوں سے جاتا رہے گا۔ اسلام کے معنی ہیں اس صداقت پر ایمان کہ قرآنِ مجید جس شکل میں اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور رسول اللہ نے امت کو دیا' وہ اپنے حروف' الفاظ' آیات' سورت' ترتیب کے ساتھ' اسی شکل میں' مکمل اور غیر متبدل و غیر محرف' ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر اس حقیقت یا اس کے کسی جزو میں' ذرا سا بھی شبہ لاحق ہو جائے' تو ایمان باقی نہیں رہتا۔

ہمیں قارئین طلوع اسلام (سندھ) میں سے ایک صاحب کا خط موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہاں "مولانا مودودی کے چاہنے والوں میں سے ایک صاحب" نے کہا کہ..... "تم ثابت کرو کہ قرآن شریف' جیسا آج کتابی صورت میں موجود ہے رسول اللہ نے اسی طرح امت کو دیا تھا"۔ گویا مودودی صاحب کی سازش کا تیر ٹھیک ٹھکانے پر لگا..... اور ان کے معتقدین نے یہ سوال کرنا شروع کردیا ہے کہ تم ثابت کرو کہ موجودہ قرآن وہی ہے جسے رسول اللہ نے امت کو دیا تھا۔

ہم نے ان صاحب کو جواب میں لکھا تھا کہ اس قسم کا سوال اگر کوئی غیر مسلم کرے تو اس کا جواب اور انداز سے دیا جائے گا۔ اگر کوئی ایسا شخص پوچھے جس کا قرآن پر ایمان ہو اور وہ صرف اپنی معلومات کے لئے دریافت کرنا چاہے تو اس کا جواب خود قرآن مجید سے دیا جائے گا۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک (جنہوں نے یہ سوال پوچھا ہے) چونکہ مودودی صاحب کے سوا کوئی سند اور حجت نہیں ہوسکتی' اس لئے ان کے سامنے مودودی صاحب ہی کی تحریر پیش کرنی چاہئے۔ مودودی صاحب اپنی تفسیر' تفہیم القرآن' جلد اول کے مقدمہ (ص ۳۰۰ ایڈیشن ۱۹۵۱ء) میں لکھتے ہیں۔

> کوئی شک نواز قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بلا کسی کمی بیشی کے ٹھیک وہی ہے جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا تو یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔

اس پر مودودی صاحب کے معتقدین اور مصاحب تو نہ جانے کیا کہیں گے لیکن جن لوگوں کی آنکھوں پر عقیدت مندی یا مفاد پرستی کے رنگین چشمے نہیں چڑھے ہوئے' وہ یقیناً" یہ پوچھیں گے کہ کیا رسول اللہ نے اسی ایک قرآن کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا یا ان سات قرآنوں کو پیش کیا تھا جن میں سے چھ کو (بقول مودودی صاحب) حضرت عثمانؓ نے

(معاذ اللہ) تلف کروایا تھا۔ اگر ان سات قرآنوں کو پیش کیا تھا تو یہ کہنا کس طرح صحیح ہوگا کہ جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے یہ ٹھیک وہی ہے' جسے رسولؐ اللہ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا؟ (فروری ۱۹۷۷ء)

۱۲۔ ہمارا منشور قرآن ہے

(مفتی محمود صاحب کا اعلان)

نوائے وقت بابت ۲۴ ستمبر ۱۹۷۷ء میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے :-

> پاکستان قومی اتحاد نے اعلان کیا ہے کہ ملک میں قرآنِ مجید کا نظام نافذ کرنے کی جدوجہد اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ آج یہاں نشتر پارک میں ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے قرآنِ پاک کا ایک نسخہ ہاتھوں میں تھام کر کہا کہ کراچی کے باحمیت شہریوں نے مجھے یہ نسخہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہی کتاب مقدس ہمارا منشور ہے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی منشور پیش نہیں کیا جاسکتا۔ میں یہی عظیم منشور آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ برسرِاقتدار آنے کے بعد ہم اس پر عمل کریں گے۔

(اس کے دو ایک دن بعد انہوں نے فرمایا تھا کہ ہمارا منشور زیرِ ترتیب ہے اور مجلسِ عمل کی منظوری کے بعد شائع کیا جائے گا)۔ (جنوری ۱۹۷۸ء)

۱۳۔ تقلیمِ اعضاء ناجائز ہے

(اندھوں کو بینائی مت دو)

ہمارے دور میں میڈیکل سائنس نے اس حد تک ترقی کرلی ہے کہ ایک مردہ انسان کی (بیکار) آنکھ کو زندہ اندھے انسان کی آنکھ میں پیوست کرکے اسے بینا (دیکھنے والا) بنا دیا جاتا ہے۔ یہ انسانیت پر بہت بڑا احسان ہے۔ لیکن ہمارے تاریکی پسند حضرات کے نزدیک ایسا کرنا خلافِ اسلام اور شریعت کی رُو سے ناجائز ہے۔ کوئی دس سال ادھر کی بات ہے' جماعت اسلامی کی طرف سے یہ فتویٰ صادر ہوا تھا کہ اسلام کی رو سے' مردوں کے اعضاء کی زندہ انسانوں مین پیوستگی ناجائز ہے۔ (ایشیاء' ۲۴ مارچ ۶۸ء بحوالہ قرآنی فیصلے' جلد چہارم' باب ششم)۔ اب (مولانا) احتشام الحق صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ

> شریعت اسلامی کی رو سے ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں چڑھانا تو

جائز ہے مگر ایک بدن کے اعضاء کی پیوند کاری دوسرے بدن کے ساتھ اسلام میں ناجائز ہے۔

(روزنامہ جنگ کراچی، ۲۳ جنوری ۱۹۷۸ء)

سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب!

ضمناً"۔۔۔۔۔ آپ نے دیکھا کہ ان دونوں فتووں میں کہا یہ گیا ہے کہ "شریعتِ اسلامی کی رُو سے" اور "اسلام کے نزدیک"۔۔۔۔۔ سند اور حوالہ نہ جماعت اسلامی والوں کے نزدیک ضروری ہے، نہ مولانا احتشام الحق صاحب کے لئے۔۔۔۔ یہ حضرات خود ہی اسلام اور شریعت ہوتے ہیں۔ (مارچ ۱۹۷۸ء)

۱۴۔ شیشم کے درخت کے ساتھ نکاح

روزنامہ سیاست (لاہور) کی اشاعت ۳۱ جنوری ۱۹۷۸ء میں شائع شدہ ذیل کی خبر پڑھ کر ہنسئے بھی اور روئیے بھی:۔

> سیالکوٹ ۱۰ جنوری (نمائندہ خصوصی) گذشتہ روز سمبڑیال کے قریب تحصیل ڈسکہ کے گاؤں کلوں میں ایک مردہ خاتون کا شیشم کے درخت کے ساتھ نکاح پڑھوایا گیا۔ اس واقعہ کے عینی شاہد...... ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک شخص...... کی چالیس سالہ دختر کا بغیر شادی کے انتقال ہوگیا۔ چنانچہ جب میت کو جنازگاہ پہنچایا گیا تو لوگوں نے جنازہ پڑھنے سے انکار کردیا کہ چونکہ اسلام میں جو مرد یا عورت بغیر نکاح کے فوت ہو جائے اس کا جنازہ جائز نہیں ہوتا۔ لہٰذا، اس عورت کا جنازہ جائز نہیں ہوسکتا۔ اس پر متوفیہ کے ورثا نے جنازگاہ ہی میں اس علاقہ کے مولوی......... سے عورت کا نکاح شیشم کے درخت سے پڑھوایا اور اس موقع پر آئے ہوئے لوگو کو چاول پکا کر کھلائے گئے جس کے بعد اس کا جنازہ پڑھا کر دفن کردیا گیا۔

یوں تو آپ اس خبر کو "جہالت" سے تعبیر کرکے جھٹک دیں گے لیکن اس میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسئلہ یہ بتایا گیا ہے کہ جو مرد یا عورت بلا نکاح فوت ہو جائے، اسلام کی رد سے اس کا جنازہ جائز نہیں۔ یہ بات اس گاؤں کے جہلا تک محدود نہیں۔ آپ بڑے بڑے جید علماء اور اقامتِ دین اور نظامِ اسلامی کے مدعیوں کی زبان سے صبح شام اس قسم کے الفاظ سنیں گے کہ "اسلام میں اس کی اجازت نہیں"" اسلام کی رُو سے ایسا جائز نہیں، شریعتِ اسلامی کا حکم یہ ہے وغیرہ۔ یعنی یہ حضرات کبھی یہ نہیں بتائیں گے کہ کس نے ایسا کہا ہے۔ اس حکم کا حوالہ کیا ہے،

اس کی سند کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے فرما دیا بس وہی سند ہے۔ اگر کوئی اس سے انکار کرے تو وہ منکرِ اسلام ہے' ملحد ہے' بے دین ہے۔ یہ لوگ ان اصطلاحات کو دانستہ مبہم رکھتے ہیں۔ اگر آپ ایسا کہنے والوں کو سند اور حوالہ دینے کا پابند بنا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ کتنے اُلجھاؤ صاف ہو جاتے ہیں اور ان لوگوں کے "اسلامی احکام" کی قلعی کس طرح کھل جاتی ہے۔

اور خبر میں دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ علاقہ کے مولوی صاحب نے متوفیہ کا نکاح شیشم کے درخت سے پڑھایا۔ یہ ہے نمونہ ان مولوی صاحبان کے اسلام کا جو کہتے ہیں کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو تاکہ ہم یہاں اسلامی نظام نافذ کر سکیں!

(مارچ ۱۹۷۸ء)

۱۵- سود نہیں' منافع

ہمارے زمانے میں اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ اس قدر اہم کہ سیاست بھی اس کے تابع ہے۔ اقتصادیات میں سرِفہرست بینکاری ہے اور بینکاری کا دار و مدار سود پر ہے۔ ہمارے ہاں جب اقتصادیات کو "مسلمان کرنے" کا سوال سامنے آیا تو اس باب میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ بینکوں کو بلا سُود کیسے چلایا جائے؟ اس پر بہت کچھ کہا گیا' بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن کوئی بات بنتی دکھائی نہ دی۔ چونکہ ساری دنیا میں مشہور کیا گیا تھا کہ اس مسئلہ کا حل اسلام پیش کرتا ہے' اس لئے اقوامِ عالم بڑی بے تابی سے منتظر تھیں کہ دیکھیں اسلام اس کا حل کیا بتاتا ہے۔ ایک عرصہ کی کد و کاوش کے بعد' بانی جماعت اسلامی' مودودی صاحب نے اس مسئلہ کا حل پیش کر دیا۔ پاکستان ٹائمز کے نمائندہ نے ان سے اس مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا:-

> سماجی اور اقتصادی ترقی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ بلاسود اقتصادی نظام کا نفاذ ہے۔ اس طرح ترقی کے فوائد سے عوام براہ راست مستفیض ہوں گے۔

انہوں نے بلا سود بینکاری کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:-

> روپیہ جمع کرانے والوں کو سود دینے کے بجائے بینک ایسے اقتصادی منصوبے تیار کریں گے جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حق دار ہوں گے اور یہ بینکوں کا اپنا مفاد ہو گا کہ وہ دیکھیں کہ جو بھی اقتصادی منصوبہ تیار ہو وہ نفع بخش اور قابل عمل ہو (ایشیا' ۵ نومبر ۱۹۷۸ء)۔

یعنی اس وقت بینک جو کچھ سود کے نام سے دیتے ہیں' اسے منافع کہہ دیا جائے تو یہ اسلامی ہو جائے گا۔

(جنوری ۱۹۷۹ء)

دوسرا باب

شرعی قوانین

۱- اصلاح مجرّد قوانین سے نہیں ہوسکتی۔

(سعودی عرب کی معاشرتی حالت)

طلوعِ اسلام شروع سے کہتا چلا آرہا ہے کہ مجرد اسلامی قوانین کے نفاذ یا "شرعی سزاؤں" کے اجرا سے نہ کوئی مملکت اسلامی ہوسکتی ہے نہ معاشرہ حقیقی معنوں میں مسلمان۔ اس کے لئے قلب و نگاہ میں تبدیلی ہونا ضروری ہے جسے قرآنِ کریم نفسیاتی تبدیلی کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت ان سزاؤں کے نفاذ کا بڑی شدّت سے مطالبہ کئے جاتی ہے۔ اس مطالبہ کی تائید میں وہ یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ سعودی عرب میں ان سزاؤں کے نفاذ کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جرائم ختم ہوگئے ہیں۔ ہم سعودی عرب کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی کے ترجمان، ہفتہ وار مجلّہ ایشیا کا یکم جنوری ۱۹۷۸ء کا پرچہ ہمارے سامنے آگیا جس میں عنوان بالا کے تحت، محمد امین ریاض صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس کے متعلقہ اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں :-

> اصولی طور پر یہ سمجھ لینے کی بات ہے کہ اسلامی قوانین کا اجرا اگرچہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کام کے بطریق احسن نبھ جانے کے لئے ایک مدّت، محنتِ شاقّہ اور بڑے تدبّر کی ضرورت ہے۔ لیکن مجرد اسلامی قوانین کے اجرا سے انقلاب نہیں آجائے گا۔ اگر اسلامی نظام و قانون نافذ کرنے سے مراد اس قانونی اور اجتماعی ڈھانچے کا مہیا کرنا ہے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو تو یہ قطعاً" لازمی نہیں ہے کہ اس ڈھانچے کے مہیا ہو جانے کے ساتھ ہی معاشرے میں وہ انقلاب بھی برپا ہو جائے اور وہ تبدیلیاں رونما ہو جائیں جو اسلام کا مطلوب حقیقی ہیں کہ لوگ نیک اور متقی ہو جائیں۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ پر عمل ہر سُو نظر آنے لگے۔ چوریاں اور قتل ختم ہو جائیں گے یا ہر طرف دودھ کی نہریں بہیں گی۔ اس کی جیتی جاگتی مثال سعودی عرب کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔ اس ملک میں اجتماعی اور قانونی ڈھانچہ الحمد للہ ابھی تک اسلام کی اساس پر ہے، لیکن تجربے کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اسلامی انقلاب کی جتنی ضرورت سعودی عرب کو ہے شاید پاکستان کو بھی نہیں۔ کیونکہ اس قانونی ڈھانچے کے

باوجود، یہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو دوسری دنیا میں ہو رہا ہے۔

سعودی معاشرے کے تنزل کی داستان، محض زیبِ داستان کے لئے نہیں ہے، بلکہ چند سال کے گہرے مشاہدے کی بنا پر میں نے یہ بات کہنے کی جرأت کی ہے۔ اخلاقی انحطاط کو دیکھتے ہوئے دل لرز اٹھتا ہے اور بے ساختہ ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں کہ اے ربِ ذوالجلال! اس سرزمین کو ہر شر سے محفوظ فرما دے کہ اسے تیرے جلّ شانہ اور تیرے حبیب صلعم کے گھر سے نسبت ہے آمین۔ یہ انحطاط پذیر سعودی معاشرہ، اس حقیقت کی موجودگی میں کہ یہاں قوانین کی اساس اسلام پر ہے، ہر کسی کے سامنے کھلی کتاب کی طرح موجود ہے۔ ذہن اس بات کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ انحطاط اگر رُک سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ قرآن (یہاں غالباً" ایک لفظ مٹا ہوا ہے طلوع اسلام) کی روشنی سے عوام کے قلوب کو منور کیا جائے۔ عمل کو ابھارنے کے لئے ان پر پیہم محنت کی جائے۔

اس کے بعد لکھا ہے:۔

اسلام میں اصل مقصود قانون کو تبدیل کرنے سے زیادہ انسانوں کو تبدیل کرنا ہے اور یہ تبدیلی ڈنڈے کے زور سے پیدا نہیں ہوتی، قلوب اور اذہان میں انقلاب سے ہی یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھنا چاہے تو ڈنڈے کے زور سے اسے نماز کا عادی نہیں بنایا جاسکتا۔ لیکن اس کے برعکس، جو نماز پڑھتا ہے وہ شیروں کی کچھار اور تختۂ دار پر بھی نماز سے غافل نہ ہوگا۔ لہٰذا، حقیقی اور پائیدار تبدیلی اوپر کے بجائے نیچے سے ہی ممکن ہے۔ اوپر سے آنے والی تبدیلی خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے اور نیچے سے آنے والی تبدیلی بدر میں جان لڑا کر سرفراز ہوتی ہے۔ ہاتھوں میں اٹھے جام ٹوٹتے ہیں، شراب گلیوں میں بہتی ہے، خود حاضر ہو کر اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ (فروری ۱۹۷۸ء)

۲۔ شرعی سزائیں کن حالات میں دی جاسکتی ہیں؟

(از ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم)

تعزیرات کے باب میں سب سے پہلے اس باقاعدہ کلیہ کو ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اور دوسری شرعی حدیں صرف اسی جگہ نافذ کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہیں جہاں مملکت کا نظم و نسق اسلامی اصولوں پر ہو اور

تمدن و معاشرت کی ترتیب و تنظیم اس طرز پر کی گئی ہو جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اسلام کے اصول اور قوانین ناقابلِ تجزیہ ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض اصول اور قوانین تو نافذ کئے جائیں اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔

مثلاً" زنا اور قذف[1] کی حدود کو لیجئے۔ نکاح و طلاق اور حجاب شرعی کے اسلامی قوانین اور اخلاق صنفی کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے ان حدود کا نہایت گہرا ربط ہے جسے منفک نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے زانی اور قاذف کے لئے ایسی سخت سزائیں مقرر ہی اس سوسائٹی کے لئے فرمائی ہیں جس میں عورتیں بن سنور کر بے محابا نہ پھرتی ہوں، جس میں برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں اور عشق و محبت کے افسانے اور شہوانی جذبات کو دائماً" متحرک کرنے والے تماشے رائج نہ ہوں، جس میں نکاح کے لئے پوری آسانیاں ہوں اور فسخ و تفریق اور طلاق و خلع کے اسلامی احکام ٹھیک ٹھیک نافذ کئے جاتے ہوں۔ ایسی سوسائٹی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اس میں معاشرت کا جو معتدل نظام قائم کیا گیا ہے اس کی حفاظت کے لئے سخت سزائیں مقرر کی جائیں۔ اور اتنی سخت سزائیں اس حالت میں ہرگز نامنصفانہ نہیں ہیں جبکہ جائز ذرائع سے صنفی خواہشات کی تسکین آسان کردی گئی ہو اور معاشرت کے ماحول کو بدکاری کی سہولتوں اور غیر معمولی اسباب تحریک سے پاک کردیا گیا ہو۔ ان حالات میں صنفی جرائم کا ارتکاب صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جو غایت درجہ کے بدطینت ہوں اور جن کے شر سے خلق اللہ کو محفوظ رکھنے کے لئے نہایت عبرت ناک سزاؤں کے بغیر چارہ نہ ہو۔

لیکن جہاں حالات اس سے مختلف ہوں، جہاں عورتوں اور مردوں کی سوسائٹی مخلوط رکھی گئی ہو، جہاں مدرسوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور تفریح گاہوں، خلوت اور جلوت میں ہر جگہ جہاں مردوں اور بنی ٹھنی عورتوں کو آزادانہ ملنے جلنے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا ہو، جہاں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہوں اور ازدواجی رشتے کے بغیر خواہشات کی تسکین کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بھی موجود ہوں، جہاں معیار اخلاق بھی اتنا پست ہو کہ ناجائز تعلقات کو کچھ بہت معیوب نہ سمجھا جاتا ہو، ایسی جگہ زنا اور قذف کی شرعی حد جاری کرنا بلاشبہ ظلم ہوگا۔ اس لئے کہ وہاں ایک معمولی قسم .....(NORMAL TYPE) کے معتدل مزاج اور سلیم الفطرت آدمی کا بھی زنا سے بچنا مشکل ہے اور ایسے حالات میں کسی شخص کا مبتلائے گناہ ہونا یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ غیر معمولی قسم (ABNORMAL TYPE) کا اخلاقی مجرم ہے۔ رجم اور کوڑوں کی سزا درحقیقت ایسے گندے حالات کے لئے اللہ نے مقرر ہی نہیں کی ہے۔

اسی پر حد سرقہ کو بھی قیاس کرلیجئے کہ وہ صرف اس سوسائٹی کے لئے مقرر کی گئی ہے جس میں اسلام کے معاشی تصورات اور اصول اور قوانین پوری طرح نافذ ہوں۔ قطع ید اور اسلامی نظم معیشت میں ایسا رابطہ ہے جس کو منقطع نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں یہ نظم معیشت قائم ہو وہاں قطع ید ہی عین انصاف اور عین مقتضائے فطرت ہے۔ اور جہاں یہ نظم معیشت نہ ہو وہاں چور کا ہاتھ کاٹنا دوہرا ظلم ہے۔ حقیقت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا، اس ظالم سوسائٹی کے لئے مقرر

۱۔ قذف سے مراد کسی عورت یا مرد پر زنا کی تہمت لگانا ہے اور قاذف وہ شخص جو ایسی تہمت لگائے۔

ہی نہیں کی گئی ہے جس میں سود جائز ہو' زکوٰۃ متروک ہو' انصاف قیمتاً' فروخت کیا جاتا ہو' ٹیکسوں کی بھرمار سے ضروریات زندگی نہایت گراں ہوگئی ہوں' اور تمام ٹیکس چند مخصوص طبقوں کے لئے سامانِ عیش فراہم کرنے پر صرف ہوتے ہوں۔ ایسی جگہ تو چوری کے لئے ہاتھ کاٹنا ہی نہیں بلکہ قید کی سزا بھی بعض حالات میں ظلم ہوگی۔

عام طور پر اسلامی قانونِ فوجداری کو سمجھنے میں لوگوں کو جو وقت پیش آتی ہے اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اپنے پیشِ نظر تو رکھتے ہیں سوسائٹی کے اس غلط نظام کو جو اس وقت دنیا کے متمدن ممالک میں قائم ہے اور پھر چوری' زنا' قذف اور شراب نوشی جیسے "عامتہ الورود" جرائم کا موازنہ قطع ید' رجم اور کوڑوں کی سزاؤں سے کرکے رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موازنہ میں ان کو اسلام کی سزائیں سخت اور ہولناک ہی نظر آئیں گی کیونکہ نیم شعوری طور پر وہ خود سمجھتے ہیں کہ جو حالات اس نظامِ حیات نے پیدا کر رکھے ہیں ان میں چوری ایک عام چیز ہونی ہی چاہئے۔ زنا میں بکثرت مردوں اور عورتوں بلکہ بچوں اور بوڑھوں تک کو مبتلا ہونا ہی چاہئے۔ آئے دن مشتبہ طریقوں سے ملنے والے جوڑوں کے متعلق بری خبریں مشہور ہونی ہی چاہئیں۔ بری صحبتوں میں نوخیز نسلوں کو بری عادتیں پڑنی ہی چاہئیں۔ لہٰذا' ان کا دل یہ سوچ کر پریشان ہوجاتا ہے کہ اگر ان حالات میں اسلامی قانون فوجداری رائج کردیا جائے تو شاید کوئی پیٹھ بھی کوڑوں سے نہ بچ سکے' ہزارہا آدمیوں کے ہاتھ روزانہ کٹنے لگیں اور ہر روز سیکڑوں آدمی سنگسار کئے جائیں۔

بلاشبہ ان کا یہ خوف بالکل بجا ہے۔ اس بیہودہ سوسائٹی کے بیہودہ نظام کو باقی رکھ کر اسلام کے قوانین میں سے محض اس کے قانون فوجداری کو نافذ کردینا ہمارے نزدیک بھی ویسا ہی ظلم ہوگا جیسا وہ خیال کرتے ہیں۔ مگر جس غلطی کو وہ محسوس نہیں کرتے وہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے سوسائٹی کے اس بیہودہ نظام کو' جس کی بیہودگیوں سے وہ مایوس ہوچکے ہیں ایک فطری حالت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ فطری حالت نہیں ہے' بلکہ شیطنت کے غلبہ نے اس غیر فطری حالت کو عالم انسانی پر مسلط کردیا ہے اور اس حالت کا باقی رہنا بجائے خود ایک ظلم عظیم ہے۔ آپ اسلام کے نظامِ اجتماعی کو من حیث الکل قبول کرکے اس ظلم کا انسداد کیجئے۔ پھر آپ پر خود روشن ہو جائے گا کہ زنا اور قذف اور چوری اور شراب نوشی انسان کے عام اور فطری جرائم نہیں ہیں اور انسانوں کی کثیر تعداد کا ان میں مبتلا ہونا متوقع نہیں ہے۔ جو اجتماعی حالات اسلام پیدا کرتا ہے ان میں صرف غیر معمولی قسم کے چند افراد ہی ان افعالِ قبیحہ کا ارتکاب کرسکتے ہیں اور ان کے لئے صحیح تدارک رجم اور کوڑے اور قطع ید ہی ہوسکتے ہیں۔ (تفہیمات' حصہ دوم' ص ۸۳-۲۸۰' اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن)

---○---

(۲) مودودی صاحب اپنے مندرجہ بالا مقالہ کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

اس سلسلے میں اپنے دلائل دیتے ہوئے میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قانونِ فوجداری کی دفعات اس مملکت کے لئے ہیں جس میں پورا اسلامی نظام

زندگی قائم ہو نہ کہ اس مملکت کے لئے جس میں سارا نظام کفر کے طریقوں پر چل رہا ہو اور صرف ایک چوری یا زنا کی سزا اسلام کے قانون سے لے لی جائے۔ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا عین انصاف ہے، اگر ملک کا معاشی نظام بھی اس کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو، اور یہ قطعی ظلم ہے، اگر ملک میں اسلام کے منشا کے خلاف سود حلال اور زکوۃ متروک ہو اور حاجت مند انسان کی دستگیری کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اس ساری گفتگو میں سے اگر کوئی شخص صرف اتنی سی بات نکال لے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کو یہ شخص ظلم کہتا ہے تو آپ خود ہی سوچئے کہ اس کی سخن فہمی کا ماتم کیا جائے یا دیانت کا۔ (رسائل و مسائل، حصہ چہارم، ص۱۹-۱۸، اشاعت اول)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اس وقت اگر کوئی مسلمان حکومتِ اسلام کے تمام احکام و قوانین اور اس کی ساری اصلاحی ہدایات کو معطل رکھ کر اس کے قوانین میں سے صرف حدودِ شرعیہ کو الگ نکال لے اور عدالتوں میں ان کو نافذ کرنے کا حکم دیدے، تو جو قاضی یا جج کسی زانی یا سارق یا شاربِ خمر پر حد جاری کرنے کا حکم دے گا، وہ تو ظالم نہیں ہوگا، البتہ وہ حکومت ضرور ظالم ہوگی جس نے شریعتِ الٰہیہ کے ایک حصے کو معطل اور دوسرے حصے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایسی حکومت کو اس آیتِ قرآنی کا مصداق سمجھتا ہوں جس میں فرمایا گیا ہے:

افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا و یوم القیمہ یردون الی اشد العذاب (۲/۸۵)

کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور روزِ قیامت وہ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں۔

جہاں تک میں نے شریعت کو سمجھا ہے اس کے نظام میں اصلاح، سدِّباب، ذرائع اور تعزیر کے درمیان ایک مکمل توازن قائم کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ ہر پہلو سے تزکیۂ اخلاق اور تطہیرِ نفوس کی تدابیر ہمیں بتاتی ہے۔ دوسری طرف وہ ایسی ہدایات ہمیں دیتی ہے جن پر عمل درآمد کرکے ہم بگاڑ کے [illegible] کی روک تھام کرسکتے ہیں۔ اور تیسری طرف وہ تعزیرات کا ایک قانون ہمیں دیتی ہے تاکہ تمام اصلاحی و انسدادی تدابیر کے باوجود، اگر کہیں بگاڑ رونما ہو جائے تو سختی کے ساتھ اس کا تدارک کردیا جائے۔ شریعت کا منشا اس پوری اسکیم کو متوازن طریقے سے نافذ کرکے ہی پورا کیا جاسکتا ہے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کے کسی جز کو ساقط اور کسی کو نافذ کرنا حکمتِ دین کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے جواز

میں یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ جس جز کو ہم نافذ کر رہے ہیں اس کے نفاذ کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ اس استدلال کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکیم کا مرتب کردہ نسخہ کسی اناڑی کے ہاتھ آجائے اور وہ اس کے بہت سے اجزاء میں سے صرف دو چار اجزاء نکال کر کسی مریض کو استعمال کرائے اور اعتراض کرنے والے کا منہ بند کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کرے کہ جو اجزاء میں استعمال کرا رہا ہوں وہ سب حکیم کے نسخے میں درج ہیں۔ اس کی اس دلیل کا جواب آخر آپ یہی تو دیں گے کہ بندۂ خدا! حکیم کے نسخے میں جو مصلحات اور بدرقے درج تھے ان سب کو چھوڑ کر تو صرف سمیات مریض کو استعمال کرا رہا ہے اور نام حکیم کا لیتا ہے کہ میں اس کے نسخے سے علاج کر رہا ہوں۔ حکیم نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرے نسخے میں سے جس جز کو چاہے چھانٹ کر نکال لے اور جس مریض کو چاہے کھلا دے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شریعت' آیا اپنے نفاذ کے لئے مومن و متقی کارکن چاہتی ہے یا فاسق و فاجر لوگ اور وہ لوگ جو اپنے ذہن میں اس کے احکام کی صحت کے معتقد تک نہیں ہیں؟ اس معاملے میں بھی محض جواز اور عدم جواز کی قانونی بحث مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ مجرد قانونی لحاظ سے ایک کام جائز بھی ہو تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حکمت دین کے لحاظ سے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ کیا حکمت دین کا تقاضا ہے کہ احکام شرعیہ کا اجراء ایسے حکام کے ذریعہ سے کرایا جائے جن کی اکثریت رشوت خور' بدکردار اور خدا و آخرت سے بے خوف ہے اور جن میں ایک بڑی تعداد عقیدتاً" مغربی قوانین کو برحق اور اسلامی قوانین کو غلط اور فرسودہ سمجھتی ہے؟ میرے نزدیک تو اسلام کو دنیا بھر میں بدنام کر دینے اور خود مسلم عوام کو بھی اسلام سے مایوس کر دینے کے لئے اس سے زیادہ کارگر نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کے ہاتھوں احکام شریعت جاری کرائے جائیں۔ اگر چند بندگان خدا پر بھی جھوٹے مقدمے بنا کر سرقے اور زنا کی حد جاری کر دی گئی' تو آپ دیکھیں گے کہ اس ملک میں حدودِ شرعیہ کا نام لینا مشکل ہو جائے گا اور دنیا میں یہ چیز اسلام کی ناکامی کا اشتہار بن جائے گی۔

(رسائل و مسائل' حصہ چہارم' اشاعت اول' ص۲۷۴-۲۷۸)

---------------○---------------

ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ احکام شریعت کو فوراً" نافذ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

> اب اگر ہم اسلامی قانون کو از سرِ نو قائم کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں' بتدریج ہی ہو گی۔ (ایضاً" ص۲۵۲)

---------------○---------------

طلوع اسلام

مودودی صاحب کی ان تصریحات کی روشنی میں' فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مملکتِ پاکستان کے

حالات ایسے ہیں کہ یہاں قوانین شریعت فوری طور پر نافذ ہو سکیں؟

فروری ۱۹۷۹ء

رابطۃ العالم الاسلامی کی تنبیہہ

شیخ محمد محمود حافظ، رابطۃ العالم الاسلامی، مکہ مکرمہ، کے سربر آوردہ علماء میں سے ہیں اور رابطہ کے علمی و دینی ترجمان "ماہنامہ رابطۃ العالم الاسلامی" کے رئیس التحریر، یعنی چیف ایڈیٹر ہیں۔ آپ نے موجودہ معاشرے میں شرعی قوانین کے نفاذ کے بارے میں اس ماہنامہ کے تازہ شمارہ بابت صفر ۱۳۹۹ھ کے اداریئے میں رابطۃ العالم الاسلامی کا مؤقف ان الفاظ میں پیش کیا ہے:-

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج اسلامی قانون کے نفاذ کے مطالبے نے ایک اہم اسلامی شعار کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ اور بہت سے اسلامی اور عربی ممالک، اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے عملی کوششیں کر رہے ہیں۔ اگر مسلمان اس دنیا میں قوت اور عزت چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ان کے لئے لازمی ہے۔ آج مسلمان جن مصیبتوں اور دکھوں میں مبتلا ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ ظاہری طور پر تو دین اسلام سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں لیکن دین کو اپنے دنیاوی معاملات میں عملی طور پر اپنانے سے دور ہیں۔ اسلامی قانون کی تطبیق ہمارے ایمان اور اعتقاد کے مطابق ہونی چاہئے جو قول و عمل دونوں کا نام ہے۔ ہم یہاں اعتقاد اور ایمان کے بارے میں کسی فقہی یا فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ کیونکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ الحمد للہ ہر مسلمان اسلام پر بطور عقیدہ و عمل ایمانِ کامل رکھتا ہے۔

دریں حالات، اسلامی قانون کے نفاذ کے بارے میں مسلمانوں کے عملی تردّد کے پیشِ نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم اسلامی عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر اپنی زندگی کے روزمرّہ کے مشاغل اور کاروبارِ حیات میں اسلامی نظام کی بنیادی باتوں کو کیوں نہیں اپناتے۔ یہ سوال جیسا بھی ہے ایک منطقی سوال ہے کیونکہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم اپنے اعتقاد کے مطابق اس پر عمل بھی کریں، ورنہ ہمارے مؤقف میں تضاد ہو گا۔ اسلامی قانون کے نفاذ کے حالیہ مطالبوں کو جب میں ایک اسلامی مقصد و شعار قرار دیتا ہوں ——— جس کے نفاذ کے لئے بہت سے اسلامی ممالک کوشش کر رہے ہیں ——— تو میں بعض ایسی صورتوں کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نفاذ کے اس مطالبے کے ساتھ ہی سامنے آ رہی ہیں۔

عقلی اور شرعی طور پر یہ حقیقت مسلّمہ ہے کہ جس طرح ہمارے نبی اکرم (صلعم) آخری نبیؐ ہیں، اسی طرح دینِ اسلام بھی آخری دین ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے متعلق کسی چھان پھٹک کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب ہم نفاذِ شریعت کے حالیہ مطالبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض کے نزدیک اس سے مراد صرف شرعی حدود کا نفاذ ہے۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیادی باتیں اور تعلیمات کا اول تو کوئی ذکر ہی نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی ان

کا ذکر کرتا ہے تو وہ بھی بڑی غیر واضح صورت میں۔ حالانکہ طرزِ عمل اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ ہر مسلمان اپنے ملک میں اپنی زندگی کے روزمرہ کے تمام مشاغل پر اسلامی تعلیمات کا نفاذ کرے۔ دوسرا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اسلامی ثقافت کو عام کرنے اور اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ مسلمانوں میں اس شعور کو بھی بیدار کیا جائے کہ ایمان و اعتقاد' قول و عمل دونوں کا نام ہے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کی ابتداء کوڑوں اور ہاتھ کاٹنے سے بمشکل ہو گی۔ ان سے پہلے یہ کرنا ہو گا کہ تمام مسلمانوں پر اس حقیقت کو اُجاگر کیا جائے کہ اسلام قانون الٰہی کا نام ہے جو ان کی سعادت اور بھلائی کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ وہ اسلامی تکریم کا محافظ اور امنِ عالم کا داعی ہے۔ وہ ہر مسلمان پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے مسلمان بھائی کی عزت کی حفاظت کرے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے اس کے مقاصد پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے چوری کے ثبوت کے باوجود چوری کی شرعی حد کو نافذ نہیں کیا تھا کیونکہ اس مقصد کے لئے جس قسم کے اسلامی معاشرے کی ضرورت ہے' اس میں کچھ ناہمواری پیدا ہو گئی تھی جس کی بنا پر آپ نے اس شرعی حد کو معطل کر دیا تھا۔ ناہموار معاشرے میں ایک بھوکا شخص احتیاج کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو موت سے بچانے کے لئے غیر کی روٹی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے۔ اس وقت وہ کسی دوسرے آدمی کی محفوظ جگہ سے مال چرانے کے باوجود چوری کا مرتکب متصوّر نہیں ہو گا۔

ان گذارشات کی روشنی میں ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ شرعی قوانین کے نفاذ میں کامل احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے ابتداء کے طور پر لازم ہے کہ ہر انسان کے سامنے اسلامی نظام کامل شکل میں اجاگر ہو۔ یہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کی اکثریت' اسلام سے اپنے تعلق کے باوجود' اسلامی حقوق و واجبات اور دوسری ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے عملاً" دور ہے۔ یہ صورت حالات علمائے کرام سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اسلامی ثقافت اور نظام کو مختلف طریقوں سے معاشرے میں اجاگر کریں۔ اسلامی نظام کی تفصیلات سے ناواقفیت ایک بہت بڑی مصیبت ہے اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس صورت حالات پر خاموشی اختیار کی جائے۔

(ترجمہ رفیع اللہ)

(مارچ ۱۹۷۹ء)

۴۔ اسلام میں ڈنڈے کا مقام

سوال یہ کیا گیا کہ کیا اسلامی نظام ڈنڈے کے زور پر نافذ کیا جائے گا۔ اس کے جواب میں مودودی مرحوم نے کہا:۔

> اسلامی قانون میں ڈنڈے کا بھی ایک مقام ہے مگر وہ سب سے آخر میں آتا ہے۔
> اسلام میں ترتیب کار یہ ہے کہ پہلے ذہنوں کی اصلاح کا کام تعلیم و تلقین کے ذریعے

سے کیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات تبدیل ہوں۔ پھر لوگوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر کام کیا جائے۔ یہاں تک کہ محلے محلے' بستی بستی اور کوچے کوچے میں ایسے لوگ تیار ہو جائیں جو بدکرداریوں کو عوام کی مدد سے دبائیں اور اپنے اپنے علاقوں کے باشندوں میں دینداری اور دیانتداری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ملک کے اندر ایک ایسی رائے عام پیدا ہو جائے گی جو برائیوں کو سر نہ اٹھانے دے گی۔ کوئی شخص ایسی عام رائے کی موجودگی میں بگڑنا چاہے گا تو اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی اور جو شخص صحیح طرز زندگی اختیار کرے گا اس کو پورا معاشرہ مدد دینے والا ہو گا۔ اس کے ساتھ اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ معاشرہ ایسا ہو جس کے لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار ہوں' ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے والے ہوں۔ ہر شخص انصاف کا حامی اور بے انصافی کا مخالف ہو۔ ہر شخص اپنے اوپر پیٹ بھرنا حرام سمجھے اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا ہمسایہ بھوکا سو رہا ہے۔ پھر اسلام ایک ایسا معاشی نظام بھی قائم کرتا ہے جس میں سود حرام ہو' زکوٰۃ فرض ہو' حرام خوری کے دروازے بند کر دیئے جائیں' رزق حلال کمانے کے تمام مواقع لوگوں کے لئے کھول دیئے جائیں اور کوئی آدمی اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہ ہونے پائے۔ ان تدابیر کے بعد ڈنڈے کا مقام آتا ہے۔ ایمان' اخلاق' تعلیم' انصاف' اصلاح معیشت اور ایک پاکیزہ رائے عام کے دباؤ سے بھی جو آدمی درست نہ ہو' تو وہ ڈنڈے ہی کا مستحق ہے اور ڈنڈا پھر اس پر ایسی بے رحمی کے ساتھ علی الاعلان چلایا جائے کہ ان تمام لوگوں کے دماغ کا اپریشن ہو جائے جو جرائم کے رجحانات رکھتے ہوں۔
(ترجمان القرآن' اپریل ۱۹۷۸ء' ص ۷۹)

اس کے بعد کہا:۔

لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر صرف اس کی سخت سزاؤں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے۔ پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ بناتا ہے۔ پھر تمام تدابیر سے ایک ایسی مضبوط رائے عامہ تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھلیں پھولیں اور برائیاں پنپ نہ سکیں۔ پھر وہ معاشرتی اور معاشی اور سیاسی نظام ایسا قائم کرتا ہے جس میں بدی کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے۔ وہ ان تمام دروازوں کو بند کرتا ہے جن سے فواحش و جرائم نشوونما پاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے ایک پاک معاشرے میں سر

اٹھانے والی ناپاکی کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اب اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لئے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور بیچ کی سب چیزوں کو ایمان کی طرح نگل جاتا ہے۔

(ایضاً" ص۲۲-۲۱)

لیکن انہوں نے اس سے پہلے اپنے کتابچہ "مرتد کی سزا" میں لکھا تھا:۔

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو' وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً" منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں' مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا' اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (کتابچہ' "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں")

(اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن' ص۷۶)

یعنی ان کے "اسلامی انقلاب" میں ڈنڈا ہی نہیں' تلوار کا استدلال سب سے مقدم ہو گا۔

(جون ۱۹۷۸ء)

۵۔ قوانین شریعت کا جائزہ

نظامِ مصطفےٰ جس کا چرچا قریب دو سال سے سنتے چلے آرہے تھے' اس کے قدم اول کے متعلق کہا گیا کہ وہ ۱۲/ ربیع الاول کے مقدس دن کو اٹھایا جائے گا' یعنی اس دن شرعی سزاؤں سے متعلق قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا جائے گا۔ ملک میں اسلامی نظام کے احیاء کی خواہش بڑی مبارک و مسعود ہے۔ لیکن خواہش کیسی ہی مبارک اور نیک کیوں نہ ہو' اس کی صحیح نتیجہ خیزی کے لئے حسن تدبّر لازم اور لاینفک ہے۔ کتنی ہی نیک خواہشیں اور مبارک ارادے ہیں جو عدم تدبّر کی وجہ سے نہ صرف ناکام رہ جاتے ہیں بلکہ تخریبی نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم نے کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی جو منزل من اللہ قرار دیا ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ کتاب کے معنی قانون کے ہیں اور حکمت سے مراد وہ حسن تدبّر ہے جس کی رُو سے اس قانون کو نافذ کیا جاتا ہے اور صحیح نتائج برآمد کرنے کا ضامن بنایا جاتا ہے۔ اس حسن تدبر میں' ترجیحات..... (PRIORITIES) یا تدریج کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اسی عمل تدریج کا نتیجہ تھا کہ' خود

حضورؐ نبی اکرم کے قائم کردہ نظام میں، شراب جیسی ام الخبائث کی ممانعت، آغاز نبوت سے قریب اٹھارہ سال بعد عمل میں آئی۔ اور اس پر بھی قرآن کریم نے اس کی کوئی سزا خود متعین نہ کی۔ عمل تدریج کے نقطہ ء نگاہ سے دیکھا جائے تو معاشرہ کے نظام میں سزاؤں کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ معاشرہ کی اصلاح کا آغاز بچوں کی صحیح تربیت اور پرورش سے ہوتا ہے۔ پھر ان کی تعلیم صحیح خطوط پر کی جاتی ہے۔ معاشرہ میں حالات ایسے پیدا کئے جاتے ہیں جن میں قانون کا احترام اور اتباع، افراد معاشرہ کا اندرونی تقاضا بن جائے۔ قانون کے قیام و استحکام کے لئے ایسی انتظامیہ وجود میں لائی جاتی ہے جو اخلاقی اعتبار سے پاک اور صاف ہو۔ نزاعی امور کے تصفیہ کے لئے ایسا نظام عدل قائم کیا جاتا ہے، جو ہر قسم کی لغزش سے منزہ ہو۔ اس قسم کے اہتمامات اور انتظامات کے بعد، اگر معاشرہ میں ایسے نفسیاتی مریض باقی رہ جائیں جن کے دیوانہ پن سے معاشرہ کو نقصان کا اندیشہ ہو تو معاشرہ کی حفاظت اور خود ان کی اصلاح کے لئے سزائیں تجویز ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ معاشرتی اصلاح میں سزاؤں کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ قرآن کریم میں بھی سزا کے لئے کہیں عقاب کی اصطلاح آئی ہے **(فکیف کان عقاب** (۱۳/۳۲) اور کہیں **عاقبتہ** کی **(فانظر کیف کان عاقبتہ المجرمین** (۷/۸۴)۔ عقاب ہو یا عاقبتہ اور عقوبت، ان کے عام معنی انجام کے ہیں، یعنی معاشرتی پروگرام میں سب سے آخر میں آنے والی کڑی ــــــ اگر معاشرہ کی اولیں کڑیاں درست ہوں، تو اس آخری کڑی کی نوبت شاذو نادر ہی آتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خلافت صدیقیؓ میں حضرت عمرؓ کو مدینہ کا مجسٹریٹ مقرر کیا گیا تو انہوں نے سال بھر کے بعد رپورٹ کی کہ اس اسامی کو کالعدم قرار دیا جائے کیونکہ سال بھر میں ان کے سامنے کوئی مقدمہ ہی پیش نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ کی یہ کیفیت "سخت سزاؤں" کی پیدا کردہ نہیں تھی۔ سزاؤں کی تو وہاں ہنوز نوبت ہی نہیں آئی تھی ــــــ یہ پیدا کردہ تھی اس اصلاحی پروگرام کی جو افراد معاشرہ میں اندرونی (نفسیاتی) تبدیلی کے لئے بتدریج عمل میں لایا گیا تھا۔ اس لئے کہ ان کے سامنے یہ ارشاد خداوندی تھا کہ : **ان اللہ لا یغیر مابقوم حتی یغیروا ما با نفسھم** (۱۳/۱۱) (تم تو ایک طرف) خدا بھی اس معاشرہ میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ معاشرہ اپنے افراد میں اندرونی (قلب و نگاہ کی نفسیاتی) تبدیلی پیدا نہ کرے۔

ہمارے ہاں اٹھتے بیٹھتے کہا جاتا ہے کہ سعودی عرب کو دیکھئے۔ وہاں شرعی سزائیں نافذ ہیں جس کی وجہ سے وہاں جرائم کا سدباب ہو گیا ہے۔ سعودی عرب میں جرائم کی کیا حالت ہے، اس کی بابت تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ لیکن ان سزاؤں کے باوجود، وہاں کے معاشرہ کی حالت کیا ہے، اس کے متعلق محمد ریاض صاحب کا وہ مقالہ ملاحظہ فرمالیجئے جسے اس باب کے شروع میں درج کیا جاچکا ہے۔

اس سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہو گا کہ جس ملک کو اسلامی نقطہ ء نگاہ سے مثالی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، اس میں شرعی سزاؤں کے نفاذ کے باوجود، معاشرہ کی حالت کیا ہے؟

ہماری سوچ کا بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم مرض کے علاج کے لئے علّتِ مرض (مرض کے بنیادی سبب) کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے، علامات مرض کی سطحی مرہم پٹی کو علاج سمجھ لیتے ہیں۔ اس نکتہ کو ذرا غور سے سمجھنے کی

ضرورت ہے۔ جن جرائم کی شرعی سزاؤں کے نفاذ کا پروگرام زیر تجویز ہے (یعنی چوری، زنا، شراب نوشی وغیرہ) مروجہ قوانین کی رو سے بھی وہ جرائم ہیں اور ان کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ اس کے باوجود یہ شکایت عام ہے کہ حقیقی مجرموں کو سزائیں نہیں ملتیں اور بے گناہ پکڑے اور مارے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یہاں رشوت کا چلن عام ہے۔ اس باب میں پہلے تو پولیس ہی بدنام تھی۔ اب عام عدالتوں کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اثبات جرم کے لئے جس طرح شہادات وضع کی جاتی ہیں اس کا بھی کسے علم نہیں۔

آپ سوچئے کہ تفتیشی اور عدالتی مشینری تو ویسے کی ویسی رہے اور سزائیں کر دی جائیں زیادہ سخت، تو کیا اس سے جرائم کی اصلاح ہو جائے گی؟ اصلاح تو ایک طرف، اس سے خرابی اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات واضح ہے۔ اگر کسی جرم کی سزا (مثلاً) تین ماہ قید ہو تو اس میں رشوت کا "ریٹ" ہزار پانسو سے زیادہ نہیں ہو گا۔ لیکن اگر اسی جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینا یا سنگسار کر دینا ہو تو رشوت کا ریٹ آسمان سے باتیں کرنے لگ جائے گا۔ ملزم اپنا گھربار بیچ کر بھی رشوت کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس کی ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفتیشی مشینری اور نظامِ عدل کی اصلاح کے بغیر، سزاؤں کی سختی کیا نتائج پیدا کرے گی؟

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کے تعزیری احکام تجویز ہی "اسلامی معاشرہ" کے لئے کئے گئے تھے۔ اسلامی معاشرہ میں کیفیت کیا ہوتی ہے، اس کا اندازہ بھی ایک مثال سے لگا لیجئے۔ اثبات جرم کا بنیادی مدار شہادت پر ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں شہادت کے متعلق ارشادِ خداوندی (جس کی تعمیل افرادِ معاشرہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں) ہے۔

> **یا ایھا الذین امنوا کونوا قوا مین بالقسط شھداء للہ و لو علی انفسکم اوالو الدین والا قربین ان یکن غنیا اوفقیرا" فاللہ اولی بھما۔ فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا و ان تلوا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا"۔ (۴/۱۳۵)**
>
> اے اہل ایمان! تم ہمیشہ نظامِ عدل کو قائم رکھو۔ اس کی اولیں شرط یہ ہے کہ اگر تمہیں کہیں گواہی دینی ہو تو تم نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر پیش ہو نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ اور سچی سچی شہادت دو، خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں امیر اور غریب میں بھی کوئی فرق نہ کرو (حتیٰ کہ دوست اور دشمن میں بھی نہیں (۵/۸)۔ تم جادۂ حق و صداقت سے ہٹ کر ان کے بہی خواہ مت بنو۔ خدا کو ان کی بہی خواہی کی تم سے زیادہ فکر ہے۔ اس کا بھی خیال رکھو کہ تمہارے جذبات اور میلانات کہیں عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ نہ ہی کوئی پیچدار اور ذومعنی بات کہو، نہ ہی شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافات

تمہارے تمام اعمال' جذبات اور رجحانات سے باخبر ہے۔

جہاں تک عدالت کا تعلق ہے' اور تو اور' خدا نے اپنے ایک جلیل القدر رسول سے فرمایا کہ

یٰداود انا جعلنک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ۔ (۳۸/۲۶)

اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں اقتدار اور اختیار عطا فرمایا ہے تو لوگوں کے معاملات میں الحق (احکام خداوندی) کے مطابق عدل کرو اور اپنے جذبات' رجحانات اور خواہشات کا اتباع نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم خدا کی طرف جانے والے راستے سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

اسلامی سزائیں اس معاشرہ کے لئے ہیں جہاں گواہ اس کردار کے حامل ہوں اور جج اس پاکیزگیء سیرت کے پیکر۔ اس کے ساتھ معاشرہ کی فضا بھی ایسی ہو جس میں نہ جرائم کے محرکات موجود ہوں اور نہ ہی کسی کو ارتکاب جرم پر مجبور کرنے کے اسباب اور مقتضیات۔ اس قسم کی بلندیء کردار اور پاکیزگیء سیرت اس پروگرام سے پیدا ہوتے ہیں جسے قرآنِ کریم نے نفسیاتی تبدیلی سے تعبیر کیا ہے۔ اس تبدیلی کے بغیر' جرائم کا سدباب تو ایک طرف' عادات و اطوار میں بھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی واضح مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ حال ہی میں صدر مملکت نے ملازمین حکومت کو نماز پڑھنے کی تلقین کی۔ نماز' فریضہء خداوندی ہے اس لئے اس کی ادائیگی ہر مسلمان پر لازمی ہے۔ اس فریضہء خداوندی کے ساتھ صدر مملکت کی طرف سے اس کی تلقین بھی ہوئی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا' اسے ذیل کی خبر سے ملاحظہ فرمایئے:۔

> ۴/جنوری ۱۹۷۹ء کے روزنامہ "نوائے وقت" لاہور میں یہ افسوس ناک خبر شائع ہوئی ہے کہ صدر جنرل ضیاء الحق نے سرکاری اداروں میں نماز باجماعت کے اہتمام کے لئے جو تلقین کی تھی اور جس کے لئے آدھے گھنٹے کا وقفہ بھی دے دیا گیا تھا' سرکاری ملازمین نے چند ہفتے تو اس میں دلچسپی سے حصہ لیا اور مساجد میں نمازِ ظہر کے وقت خاصی رونق رہی مگر بتدریج سرکاری ملازموں نے نماز ظہر کے وقت اپنے دفاتر سے نکلنا شروع کر دیا اور اس طرح نماز کی باجماعت ادائیگی کو دفتر سے غیر حاضر رہنے کا بہانہ بنا لیا گیا۔ بعض سرکاری ملازم تو ظہر کی اذان کے بعد اپنے دفاتر میں واپس ہی نہیں آتے۔ یہ صورتِ حال پنجاب کے سول سیکریٹریٹ کی مسجد سمیت دیگر تمام دفاتر کی مساجد میں ہے۔ سول سیکریٹریٹ میں جہاں دسمبر کے اوائل میں پوری مسجد نمازیوں سے بھر جاتی تھی' اب وہاں روزانہ صرف ۴ صفیں ہوتی ہیں جو معمول کے مطابق ہیں۔
>
> (بحوالہ الاعتصام' مورخہ ۱۲/۱/۷۹)

اسلامی نظام کا آغاز سزاؤں سے کرنے کا ایک نقصان تو وہ ہو گا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے' یعنی اس سے

رشوتوں کے دائرے وسیع ہو جائیں گے لیکن اس سے بھی زیادہ نقصان ایک اور ہو گا۔ ہم نے صدیوں کے بعد اسلامی نظام کے احیاء کا دعویٰ' اور اس کے انسانیت ساز نتائج کا فردوس بداماں منظر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں' اس منظر کو دیکھنے کے لئے ہماری طرف لگ رہی ہیں۔ اگر زیر نظر تجربہ ناکام رہا' تو دنیا ہمارے متعلق جو کہے گی سو کہے گی' وہ اسلام کے متعلق اپنے اس خیال میں پختہ ہو جائے گی کہ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے جو زمانے کے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اور ان کے اس پروپیگنڈہ سے خود ہمارے ہاں کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو کر اسلام کی طرف سے بددل ہو جائے گا۔ اور اس کی یہ بددلی خود پاکستان کے مستقبل کو بری طرح مجروح کر دے گی۔ یہ ایسا نقصان ہو گا جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

مجوزہ قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ مرکزی حکومت کے وزیر قانون' محترم بروہی صاحب نے...... اسلامک لاءکانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ موجودہ (مارشل لا) حکومت عبوری ہے۔ اس لئے اس کے صادر کردہ احکام اور نافذ کردہ قوانین عارضی نوعیت کے ہیں۔ یہ اس کے بعد آنے والی منتخبہ مجلس قانون ساز کے لئے ہو گا کہ وہ انہیں قانونی تحفظ دے دے' تبدیلی کر دے یا منسوخ کر دے۔ (پاکستان ٹائمز' مورخہ ۱۴ تا ۱۷/ جنوری ۱۹۷۹ء)۔ ان حالات کے پیش نظر' اور تو اور' خود مودودی (مرحوم) کے ماہنامہ ترجمان القرآن نے محترم صدر ضیاء الحق کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے گذشتہ محرم کے اعلان کو واپس لے لیں جس میں شریعت بنچوں کے قیام اور مروجہ قوانین کو کتاب و سنت کے منافی ہونے کی بنا پر چیلنج کئے جانے کا حق دیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

> اول جب یہ اعلان ہوا تھا کہ بہت جلد ایسا دستوری فیصلہ سامنے آجائے گا کہ جس کے تحت کسی بھی قانون کو اس بنیاد پر چیلنج کیا جا سکے گا کہ وہ شریعت کے خلاف ہے------ تو اسی وقت مجھے پریشانی ہوئی کہ ایسا ہونا کسی قلیل مدت میں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک پورے قانونی نظام' مالیاتی نظام اور عدالتی نظام (بلکہ تعلیمی اور فوجی نظام وغیرہ بھی شامل ہیں) کی تشکیلِ نو شریعت کے مطابق نہیں کر لی جاتی' اس قسم کا حکم یا دستوری فرمان سخت مشکلات پیدا کریگا' بلکہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔
>
> اور اب اس اعلان کی مشکل کو حل کرنے کے لئے اتنے قوانین اور اداروں کو آئینی تحفظ دے دیا گیا ہے کہ اعلان کے مطابق چیلنج کرنے کے حکم کا دائرۂ اثر بے حد محدود بلکہ برائے نام ہے۔ آخر خواہ مخواہ اس اعلان کو نبھانے کی ضرورت کیا تھی۔ جو لے دے اب وسیع دائرہ تحفظ کے خلاف ہو رہی ہے' زیادہ سے زیادہ اتنی ہی ترک اعلان کے بارے میں ہو جاتی۔
>
> ذمہ داری دراصل سی' ایم' ایل' اے' جنرل محمد ضیاء الحق کے ان قانونی مشیروں پر جاتی ہے جنہوں نے ایک قانونی فیصلے کے اثرات کا بروقت اندازہ نہیں کیا۔

> اب بھی کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ اقرار کر لیا جائے کہ متذکرہ اعلان کے تقاضے پورے کرنے کا وقت ابھی دُور ہے۔ فی الحال اسے واپس لیا جاتا ہے۔
> (ترجمان القرآن' بابت جنوری ۱۹۷۹ء' ص۶)

ان حضرات کو کون بتائے کہ اسلامی قوانین کے سلسلہ میں جو الجھنیں پیدا ہو رہی (یا پیدا کی جا رہی) ہیں' ان کی ذمہ داری' جنرل محمد ضیاء الحق کے قانونی مشیروں پر تو جس قدر عائد ہوتی ہے' ہوتی ہے' ان سے کہیں زیادہ ذمہ دار خود آپ حضرات ہیں۔ آپ کی حالت یہ ہے کہ ایک طرف مودودی (مرحوم) بالتصریح ارشاد فرماتے ہیں کہ اس قسم کے معاشرہ میں جو یہاں موجود ہے' اسلامی تعزیرات نافذ کرنے والی حکومت ظالم قرار پائیگی۔ اور ان کے زیرادارت شائع ہونے والا صحیفہ' صدر مملکت کے اعلان کو واپس لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اسی جماعت کی مجلس شوریٰ اپنے اجلاس منعقدہ اوائل جنوری ۷۹ء میں حسب ذیل قرار داد منظور کرتی ہے:۔

> مجلس شوریٰ' جماعت اسلامی کا یہ اجلاس صدر مملکت کے نئے ہجری سال کے آغاز پر اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہے کہ بارہ ربیع الاول کو ملک کے چاروں ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ میں شریعت بنچ قائم کر دیئے جائیں گے جو قرآن و سنت کے منافی قوانین کو کالعدم قرار دے سکیں گے۔ اس کے علاوہ چوری' ڈاکہ' قذف اور زنا کی اسلامی سزاؤں اور تحفظ عقیدہ کا قانون بھی نافذ کر دیا جائے گا۔ مجلس شوریٰ یہ توقع رکھتی ہے کہ اب ان اقدامات کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی تاخیر روا نہ رکھی جائے گی۔
> (ایشیا' لاہور' مورخہ ۷/جنوری ۱۹۷۹ء)

اس جماعت کی اسی قسم کی دورخی پالیسی ہے جو یہاں اسلام کے نام پر اُلجھاؤ پر اُلجھاؤ پیدا کئے چلی آ رہی ہے۔

(فروری ۱۹۷۹ء)

۶۔ شرعی قوانین کا تجزیہ

جن شرعی قوانین کا چرچا ایک عرصہ سے ہو رہا تھا' محترم صدر مملکت پاکستان نے ان کا' ۱۲ ربیع الاول کے مقدس یوم (بابت ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء) کو اعلان بھی کردیا اور ان کے متعلق احکامات بھی جاری کردیئے' جو پاکستان ٹائمز' مورخہ ۱۲ فروری میں شائع ہوئے ہیں۔ ان قوانین کا تعلق ان سزاؤں سے ہے' جنہیں فقہی اصطلاح میں حد (جمع حدود) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ (۱) شراب (منشیات)۔ (۲) سرقہ (چوری اور ڈاکہ) (۳) زنا۔ (۴) قذف (تہمت تراشی) اور لعان (میاں بیوی کی ایک دوسرے کے خلاف تہمت تراشی) سے متعلق ہیں۔ نیز ان میں "کوڑے" کا بھی تعین کیا گیا ہے۔

طلوع اسلام کا اجراء ۱۹۳۸ء میں (قبل از تقسیم ہند) ہوا۔ اس کے بعد یہ پاکستان میں ۱۹۴۸ء سے مسلسل شائع ہو

رہا ہے۔ جن قارئین کی نظروں سے یہ شروع سے گزر رہا ہے وہ اس حقیقت سے واقف اور اس کے شاہد ہیں کہ

۱۔ اس کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ نہ ہی اس نے کوئی اپنا نیا فرقہ بنایا ہے۔

۲۔ اس نے نہ کبھی کوئی ایسی بات کی ہے جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو اور نہ ہی اس نے کبھی عملی سیاسیات میں حصہ لیا ہے۔

۳۔ اس تمیں سال کے عرصہ میں نہ اس کا تعلق کسی حکومت سے رہا ہے او نہ ہی اس نے ملک میں پیدا ہونے والے کسی قسم کے ہنگامے اور انتشار کی تائید و حمایت کی ہے۔ اس نے ان کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔

۴۔ اس نے کبھی نہ خود قانون شکنی کی ہے' نہ کسی کو قانون شکنی کی ترغیب دی ہے۔ قانون شکنی کی یہ مخالفت کرتا ہے اور کسی قسم کی تبدیلی یا اصلاح کے لئے آئینی اور قانونی طریق کار اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی مشن ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ کوئی کہے یا کرے یا ملک میں جو کچھ ہو' قرآن کریم کی روشنی میں اس کا جائزہ لے کر بتائے کہ کتاب اللہ کی رو سے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اس نے ملک کے ہر آئین کو بھی اسی معیار کے مطابق پرکھا اور ہر قانون کا اسی کی روشنی میں جائزہ لیا اور اس کے بعد وہ' اپنی قرآنی بصیرت کی رو سے جس نتیجہ پر پہنچا' اسے بے کم و کاست اور بلا رو رعایت قوم کے سامنے پیش کردیا خواہ وہ کسی کے خلاف جائے یا کسی کے حق میں۔ اس نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری از خود عائد نہیں کر رکھی۔ یہ خدا کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی ایک مسلمان کی حیثیت سے اس پر لازم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینت والھدیٰ من بعد ما بینہ للناس فی الکتب اولئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللعنون (۲/۱۵۹)

جو لوگ ان واضح احکام اور راہ نمائی کی باتوں کو چھپا کر رکھیں جنہیں ہم نے نازل کیا ہے' اس کے بعد کہ ہم نے انہیں تمام لوگوں کے لئے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے بیان کردیا ہے' تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کی بھی لعنت ہے اور ہر لعنت کرنے والے کی لعنت بھی۔

آپ غور فرمایئے کہ احکام و ارشادات خداوندی کو چھپانے کے خلاف کس قدر سخت وعید ہے۔ دوسرے مقام پر اس کا حکم دیا گیا کہ

ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون (۲/۴۲)

جب تم جانتے ہو کہ حق کیا ہے تو پھر نہ تو حق اور باطل کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کرو اور نہ ہی حق کو چھپاؤ۔

یہ (اور اسی قسم کے متعدد دیگر ارشادات خداوندی) کی رو سے' ہم پر یہ اہم فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہم ہر پیش آنے والے معاملہ کے متعلق بتائیں کہ قرآن مجید کا اس باب میں فیصلہ کیا ہے۔ یوں تو اس قسم کی وضاحت ہر معاملہ میں

ضروری ہے' لیکن موجودہ قوانین کے سلسلہ میں اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ انہیں اسلامی قوانین کہہ کر ملک میں نافذ کیا گیا ہے۔ "اسلامی" کی اصطلاح بڑی وسیع اور غیر متعین ہے۔ اس میں بہت کچھ شامل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرقہ کے ..... "اسلامی احکام"...... (جو ان کی فقہ کے احکام ہوتے ہیں) دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ زیر نظر احکام بھی فقہی احکام ہیں۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم بتائیں کہ قرآن مجید کی رو سے ان کی پوزیشن کیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ہی کو حق و باطل کا معیار' بلکہ کفر و ایمان کا خط امتیاز قرار دیا ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔

اور خود رسولؐ اللہ کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ **فاحکم بینھم بما انزل اللہ** (۵/۴۸) "تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو"۔ لہٰذا' کوئی حکم' کوئی قانون' کوئی فیصلہ' جو کتاب اللہ کے خلاف ہو وہ یقیناً" سنت رسولؐ اللہ کے بھی خلاف ہو گا۔

زیر نظر قوانین کے متعلق اتنا اور سمجھ لینا چاہئے کہ

۱۔ ان کا تعلق حدود سے ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں حد (جمع حدود) ان سزاؤں کو کہتے ہیں جو متعین اور مقرر ہیں اور جو سزائیں مقرر نہیں' انہیں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ اپنے جائزہ میں ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ ان میں جو سزائیں بطور حدود تجویز کی گئی ہیں' قرآن کریم کی رو سے ان کی پوزیشن کیا ہے' یعنی وہ قرآن کے مطابق ہیں ...... یا ...... نہیں۔

۲۔ ان قوانین کے متن وغیرہ کے متعلق طلوع اسلام کو اتھارٹی نہ تصور کر لیا جائے۔ اتھارٹی وہی ضابطہ ہو گا جسے حکومت شائع کرے گی۔ غالباً" اس نے اسے شائع کر دیا ہے۔ ہم نے' بہر حال' انہیں پاکستان ٹائمز' بابت ۱۲ فروری ۱۹۷۹ء سے اخذ کیا ہے۔

ان تمہیدات کے بعد آیئے' ان قوانین کی طرف' **وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم**

(ا) منشیات

ان میں شراب' بھنگ' چرس' افیون وغیرہ تمام نشہ آور چیزیں شامل ہیں اور ان کا بنانا' رکھنا' لے جانا' خرید و فروخت کرنا' استعمال کرنا ممنوع اور مستوجب سزا جرم ہے۔ ان کے استعمال کی حد (سزا) اسی (۸۰) کوڑے قرار دی گئی ہے۔ دیگر جرائم کی تعزیری سزائیں مختلف ہیں۔

قرآن کریم میں خمر کی ممانعت کی گئی ہے۔ خمر کے لغوی معنے ڈھانپ دینے کے ہیں اور چونکہ نشہ انسانی عقل پر

پردہ ڈال دیتا ہے' اس لئے عربوں کے ہاں شراب کو خمر کہا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے۔

لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکری (۴/۴۳)

جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ۔

اس سے مستنبط کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ہر نشہ آور چیز ممنوع ہے۔ قرآن کریم میں اس کی ممانعت تو آئی ہے لیکن اس نے اس کی کوئی سزا خود مقرر نہیں کی۔ اس کی ممانعت میں بھی بڑی اہم حکمت عملی سے کام لیا گیا تھا۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال سے رفتہ رفتہ انسان ان کا ایسا عادی ہوجاتا ہے کہ انہیں یک لخت چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں اس کی ممانعت کے احکام بتدریج نازل ہوئے تھے۔ سب سے پہلے انہیں سمجھایا گیا کہ

فیھما اثم کبیر ومنافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما (۲/۲۱۹)

ان میں تھوڑے بہت فائدے بھی ہیں' لیکن ان کے نقصان ان کے فائدے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔

پھر کہا گیا کہ

یاایھاالذین امنوا لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکٰری حتی تعلموا ما تقولون (۴/۴۳)

اے جماعت مومنین! تم نشہ کی حالت میں صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ' تاآنکہ جو کچھ تم کہتے ہو' اسے سمجھ سکو۔

اور پھر آخر میں خمر کو **رجس من عمل الشیطن** ...."شیطانی عمل" ...... قرار دے کر حکم دیا کہ **فاجتنبوہ** "اس سے اجتناب کرو" اور آخر میں کہا کہ

فھل انتھم منتھون (۵/۹۰-۹۱)

اور کیا تم اس پر بھی باز نہیں آؤ گے۔

ان تدریجی احکام کا نتیجہ تھا کہ خمر کی آخر ممانعت مدینہ میں جا کر ہوئی' یعنی آغاز نبوت سے کم از کم چودہ پندرہ سال بعد--- اس دوران میں اس کے متوالوں کو آہستہ آہستہ اس حقیقت کی طرف لایا گیا کہ انہیں اسے چھوڑنا ہوگا۔

حالیہ قانون میں اس تدریج کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اور فوری ممانعت کے احکام نافذ کردیئے گئے ہیں۔ دیگر نشوں کے متعلق تو ہمیں معلوم نہیں۔ افیونیوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ اگر انہیں وقت پر افیون نہیں ملتی تو ان کی کرب انگیز حالت دیکھی نہیں جاسکتی۔ وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات انہیں جان تک کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ زیر نظر قانون کے فی الفور نفاذ سے بہت سی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جائیں گی اور بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اس قسم کی پیچیدگیوں اور مشکلات سے بچنے کے لئے کتاب (قانون) کے ساتھ حکمت کو بھی منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ صدر اول میں اس جرم کی سزا کے سلسلہ میں بھی شروع میں اتنا ہی تھا کہ مجرم کو کسی درخت کی

ٹہنی سے' چادر سے' یا ہاتھوں سے پیٹا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کے شروع میں بھی یہی عمل جاری رہا۔ عہد فاروقیؓ کے اخیر زمانے میں چالیس تازیانوں کی سزا مقرر کی گئی اور عادی مجرم کے لئے اسی (۸۰) تازیانے۔

ان سطور کی تسوید کے وقت یہ خبریں سننے میں آرہی ہیں کہ اس قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں نرمی برتنے کی تجاویز اور تدابیر زیر غور ہیں۔

(۲) سرقہ (چوری)

جرم سرقہ کی سزا کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ پہلی دفعہ کے جرم کی سزا کے طور پر مجرم کا دایاں ہاتھ' اس کی کلائی کے جوڑ سے کاٹ دیا جائے گا۔ دوسری بار کے جرم پر مجرم کا بایاں پاؤں ٹخنے سے کاٹ دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد کے ارتکاب جرم کی سزا عمر قید ہوگی جسے' مجرم کے تائب ہونے کی صورت میں' ہائی کورٹ معاف بھی کر سکے گا۔

قرآن مجید میں سرقہ کے جرم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے:۔

والسارق والسارقہ فاقطعوا ایدیھما جزاء بما کسبا نکالا من اللہ و اللہ عزیز حکیم (۵/۳۸)

سرقہ کے مجرم مرد یا سرقہ کی مجرمہ عورت کی سزا یہ ہے کہ ان کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے جو اللہ کی طرف سے اس جرم کی روک تھام کے لئے مقرر کی گئی ہے' وہ اللہ جو غلبہ بھی رکھتا ہے اور حکمت بھی۔

اللہ تعالیٰ کے صاحب غلبہ (ذی اقتدار) ہونے کا ثبوت تو ارتکاب جرم کی مقرر کردہ سزا ہے۔ لیکن اس کے صاحب حکمت ہونے کی شہادت اس سے اگلی آیت میں دی گئی ہے۔ فرمایا:۔

فمن تاب من بعد ظلمہ واصلح فان اللہ یتوب علیہ ان اللہ غفور رحیم (۵/۳۹)

پھر جو شخص ارتکاب جرم کے بعد اپنے کئے پر شرمسار ہو اور اپنی اصلاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے معاف کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً" اللہ ایسے لوگوں کو سزا سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور انہیں اپنی مرحمت سے نوازتا بھی ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ سزا پہلی بار جرم کے ارتکاب پر نہیں دی جاسکتی۔ ارتکاب جرم پر نادم ہونے والے مجرم کو آئندہ کے لئے اصلاح کی غرض سے معافی بھی دی جاسکتی ہے یا عندالضرورت کوئی تعزیری سزا بھی۔ قطع ید کی سزا عادی مجرموں کے لئے ہے۔ سورۂ آل عمران میں ایک عام اصول بتایا گیا ہے' یعنی:۔

والذین اذا فعلوا فاحشہ اوظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا

لذنوبهم ومن یغفر الذ نوب الا الله ولم یصروا علی ما فعلوا وهم یعلمون (۳/۱۳۵)

جو لوگ کوئی برائی کی بات کر بیٹھیں یا کسی جرم کے ارتکاب سے اپنے آپ پر زیادتی کرلیں' اور اس کے بعد جب قانون خداوندی ان کے سامنے آئے تو وہ اپنے جرم کے لئے معافی کے خواستگار ہوں' تو قانون خداوندی میں معافی کی بھی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ یہ معافی ان مجرموں کے لئے ہے جو جانتے بوجھتے بار بار ارتکاب جرم نہ کریں' یعنی عادی مجرم نہ ہوں۔

غیر مصر مجرموں کے متعلق کہا کہ

اولئک جزاوهم مغفرة من ربهم (۳/۱۳۶)

قانون خداوندی کی رو سے ایسے مجرمین کو معافی دی جائے۔

اس کی تائید میں روایات بھی موجود ہیں۔ ایک روایت میں تو یہاں تک بھی آیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے ایک مجرم کو چار مرتبہ چوری کرنے پر بھی قطع ید کی سزا نہیں دی۔ علاوہ ازیں' اس قسم کی سزاؤں کے نفاذ میں معاشرہ کے حالات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں غلہ کی چوری کو مستوجب سزا قرار نہیں دیا تھا۔ اس سلسلے میں حاطبؓ ابن بلتعہ کے ملازموں کا واقعہ بڑا مشہور ہے۔ انہوں نے کسی کی اونٹنی چرا کر اسے ذبح کر کے کھالیا۔ جرم بھی ثابت ہوگیا لیکن حضرت عمرؓ کے پوچھنے پر کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا' انہوں نے کہا تھا کہ ہمارا مالک ہم سے کام تو پورا لیتا ہے لیکن ہمیں کھانے کو کم دیتا ہے اور ہم نے بھوک سے تنگ آکر ایسا کیا ہے۔ اس پر آپؓ نے ان مجرموں کو تو چھوڑ دیا اور مالک کو بلا کر کہا کہ مجرم یہ نہیں' تم ہو' کہ جس نے انہیں اس جرم کے ارتکاب پر مجبور کردیا۔ اس دفعہ تو تم سے رعایت برتی جاتی ہے۔۔۔ تم اونٹنی کے مالک کو اس کی قیمت ادا کردو۔ اگر آئندہ ایسا کیا تو تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔ غیر اسلامی معاشرہ میں اسلامی سزاؤں کے نفاذ کے متعلق قارئین کی توجہ مودودی صاحب کے اس مقالہ کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جو طلوع اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے[۲]۔ خود قرآن کریم نے معاشرتی حالات کا اس قدر لحاظ رکھا ہے کہ اس نے لونڈیوں کے لئے (جو اس زمانہ کے عربی معاشرہ میں موجود تھیں) جرم زنا کی سزا آزاد عورتوں کے مقابلے میں نصف مقرر کی۔

۲ - زیر نظر قانون میں دوسری مرتبہ کے ارتکاب جرم کے لئے نہ بایاں پاؤں کاٹنے کی سزا رکھی گئی ہے۔ قرآن کریم میں سرقہ کے جرم میں صرف ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر کی گئی ہے' پاؤں کاٹنے کی نہیں۔

۳ - اس قانون میں سرقہ کا نصاب (۴۔۔۔ اعشاریہ۔ ۴۵۷) گرام سونا (یا اس کے برابر قیمت) مقرر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں سرقہ کا نصاب مقرر نہیں کیا گیا۔

۲۔ مودودی صاحب نے اپنی تیسیات کے باوجود حالیہ قوانین کے نفاذ کو مستحق تبریک و تحسین قرار دیا ہے۔ (ہفت روزہ ایشیاء۔ ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء ص۹)

حرابہ

زیر نظر قانون میں حرابہ کو بھی مستوجب حد قرار دیا گیا ہے—— فقہی اصطلاح میں حرابہ کا لفظ عام طور پر ڈکیتی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس جرم کی مختلف سزائیں مقرر کی گئی ہیں جن میں سے ایک سزا مجرم کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دینا ہے۔

حرابہ کے ضمن میں ذیل کی قرآنی آیت کا حوالہ دیا جاتا ہے:۔

انما جزاوا الذین یحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا اویصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف اوینفوا من الارض ذالک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم
(۵/۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں تو ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے یا صلیب دیا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف طرفوں سے کاٹ دیئے جائیں یا قید یا جلا وطن کردیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب۔ (اگلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ قبل اس کے کہ ان پر قابو پالیا جائے توبہ کرلیں تو پھر انہیں معافی دی جاسکتی ہے)۔

اس آیت میں محاربہ کے معنے مملکت کے خلاف بغاوت' اور فساد فی الارض کے معنی (عام طور پر) ہنگامہ آرائیاں کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اصطلاحات بڑی وسیع ہیں اور فقہ میں ان سے مراد' ڈاکہ زنی بھی لی جاتی ہے اور اس کی سزا ہاتھ اور پاؤں کا کاٹ دینا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عام قانون شکنی بھی مملکت کے خلاف بغاوت کے ذیل میں آجاتی ہے۔ اور چونکہ اس آیت میں سزائے موت' صلیب' ہاتھ پاؤں کا کاٹنا اور قید یا جلا وطنی متبادل سزاؤں کے طور پر تجویز کی گئی ہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ حرابہ کے علاوہ دیگر جرائم کی کم از کم سزا قید بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ زیر نظر قانون میں حرابہ کو ڈکیتی کے معنوں میں لیا گیا ہے اور اس کی سزا آیت (۵/۳۳) کی رو سے ہاتھ پاؤں کاٹنا۔

(ضمناً) بعض لوگ قطع ید سے مراد ہاتھ کا سچ مچ کاٹ دینا نہیں لیتے۔ عربی زبان کی رو سے اس کے معنی روک تھام کے بھی ہوتے ہیں' اس لئے وہ اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے مجرم آئندہ کے لئے اس جرم کے ارتکاب سے خود بخود رک جائے۔ توبہ اور اصلاح اس کی بنیادی تدبیر ہے۔

۳۔ زنا

جرم زنا کی سزا کے متعلق قرآن کریم میں ہے

الزانیه والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة .... (۲/۲۴)

زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر اک کو سو کوڑے لگاؤ۔

الزانی اور الزانیہ میں ہر قسم کے مجرم آجاتے ہیں لیکن زیر نظر قانون میں کہا گیا ہے کہ اگر:۔

۱۔ زانی مرد یا زانیہ عورت شادی شدہ (محصن) ہو تو انہیں سنگسار کیا جائے۔ اسے اصطلاح میں رجم کہا جاتا ہے۔ اور

۲۔ اگر وہ شادی شدہ نہ ہوں تو انہیں سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔ قرآن مجید میں رجم کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کے لئے جو سند لائی جاتی ہے وہ بڑی غور طلب ہے۔ روایات میں ہے کہ جب رسول اللہ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد حضرت زیدؓ بن ثابت کی زیر سرکردگی قرآن مجید جمع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا گیا' تو حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کے جمع کردہ قرآن میں آیہ رجم نہیں۔ وہ اس آیت کو لے کر حضرت زیدؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اصول یہ طے کر رکھا ہے کہ جو شخص کسی آیت کو لے کر آئے اسے اس وقت درج قرآن کیا جائے جب وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں ایک گواہ بھی لائے۔ حضرت عمرؓ کوئی گواہ نہ لاسکے اس لئے یہ آیت قرآن میں درج نہیں کی گئی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس پر اصرار تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ ہم رسول اللہ کے زمانے میں اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی تلاش جاری رکھی۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ:

> قرآن کی دو آیتیں کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی میرے صحیفہ میں موجود تھیں۔ ایک آیہ رجم اور دوسری رضاعت (جس میں کہا گیا تھا کہ دودھ کے دس گھونٹ پینے سے رضاعت کی حرمت ہو جاتی ہے)۔ جب رسول اللہ نے وفات پائی تو ہم اس حادثہ میں مشغول ہوگئے۔ میری بکری آئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی (اس لئے اب یہ آیتیں تمہیں کہاں سے مل سکیں گی؟)۔ (ابن ماجہ)

اس طرح یہ دو آیتیں قرآن میں درج نہ ہوسکیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر یہ قرآن میں درج نہیں ہوسکیں' تو کوئی بات نہیں۔ ہم ان پر عمل اسی طرح کرتے رہیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ جب آپ کو اس قدر یقین ہے کہ آیہ رجم قرآن کی آیت ہے تو آپ اسے داخل قرآن کیوں نہیں کردیتے۔ اس پر آپ نے فرمایا:۔

> اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے قرآن میں اضافہ کردیا' تو میں اس آیت کو ضرور داخل قرآن کردیتا۔

چنانچہ یہ آیت قرآن میں تو داخل نہ ہوئی لیکن عمل اس کے مطابق ہوتا رہا۔ واضح رہے کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن کریم میں موجود تو ہیں' لیکن ان کا حکم منسوخ ہوچکا ہے۔ اور بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن میں موجود نہیں لیکن حکم ان کا جاری ہے۔ آیہ رجم کا شمار انہی آیات میں کیا جاتا ہے۔ یہ ہے جرم

زنا کے لئے رجم کی سند۳۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے' قرآن مجید میں رجم کی سزا کا ذکر کہیں نہیں آیا' صرف کوڑوں کی سزا کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لونڈیوں کے جرم زنا کی سزا کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی سزا آزاد عورتوں کی سزا کا نصف ہوگی (۴/۲۵)۔ کوڑوں کی سزا کا نصف تو ہوسکتا ہے' رجم کی سزا کا نصف نہیں ہوسکتا۔

جرم کا ثبوت

جرم زنا کے ارتکاب کے ثبوت کے لئے زیر نظر قانون میں کہا گیا ہے کہ اس کے لئے :۔

۱۔ چار ثقہ اور پاکباز گواہ ہونے چاہئیں اور

۲۔ ان گواہوں نے اس فعل شنیع کے ارتکاب کے سلسلے میں دخول (ACT OF PENETRATION) کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

قرآن کریم نے فعل زنا کے ثبوت کے لئے گواہوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے لئے عام طور پر مندرجہ ذیل آیت سے سند لائی جاتی ہے۔

> **والتی یاتین الفاحشة من نسائکم فاستشهدوا علیهن اربعة منکم فان شهدوا فامسکوهن فی البیوت حتی یتوفهن الموت او یجعل الله لهن سبیلا** (۴/۱۵)
>
> تمہاری عورتوں میں سے جو کوئی کسی امر فاحش (بے حیائی) کا ارتکاب کرے تو اس کے ثبوت میں تم میں سے چار مرد گواہ ہونے چاہئیں۔ اگر وہ گواہی دیں تو ایسی عورتوں کو پابند مسکن کیا جائے تا آنکہ وہ وفات پا جائیں یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راستہ نکال دے۔

اس آیت میں لفظ **الفاحشة** آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ زنا بھی فواحش میں شامل ہے۔ لیکن ہر فحش کام زنا نہیں ہوسکتا۔ اس سے مراد عام بے حیائی کی باتیں ہیں جن کی اگر شروع میں روک تھام نہ کی جائے تو وہ آخر الامر زنا تک لے جاسکتی ہیں۔ انہیں انگریزی زبان میں (OBSCENITY) کہا جائے گا۔ اس مفہوم کی تائید خود اس آیت سے ہوتی ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اس میں صرف عورتوں کا ذکر ہے' اور یہ ظاہر ہے کہ زنا کا ارتکاب تنہا عورت سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے عورت کے ساتھ مرد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے سورۃ النور میں **الزانیة** اور **الزانی**

۳۔ واضح رہے کہ قرآن مجید نبی اکرمؐ کی زندگی میں جمع' مرتب اور مدون ہوچکا تھا اور حضورؐ نے اسے امت کو اسی شکل میں دیا تھا جس شکل میں یہ آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں نہ کوئی آیت درج ہونے سے رہ گئی ہے اور نہ ہی کوئی آیت منسوخ ہے۔ ان امور کی تفصیل' ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقام حدیث" اور پرویز صاحب کی مایہ ناز تصنیف "شاہکار رسالت" میں ملے گی۔

(۲۴/۲) دونوں آئے ہیں۔ زیر نظر آیت میں ایسی بے حیائی کی باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی مرتکب تنہا عورت ہو سکتی ہے۔

اور دوسرے اس لئے کہ اس آیت میں اس جرم کی سزا پابند مسکن بتائی گئی ہے' حالانکہ زنا کی سزا سو کوڑے ہے۔ لہٰذا' اس آیت سے فعل زنا کے لئے چار گواہوں کی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔

سورۂ النور کی آیت نمبر۴ میں چار گواہوں کی شرط کا ذکر ہے' لیکن وہ تہمت تراشی (قذف) کے سلسلے میں ہے۔ اور قذف کے لئے ایک الگ قانون ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے :-

والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعۃ شھداء فاجلدوھم ثمنین جلدۃ ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدا و اولئک ھم الفسقون (۲۴/۴)

جو لوگ پاکباز عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر اس الزام کے ثبوت میں چار گواہ نہ لاسکیں تو ان تہمت تراشوں کو اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے' کیونکہ وہ فاسق ہیں۔

(اگلی آیت میں ان کے تائب ہونے کی صورت میں معافی کا ذکر آیا ہے)۔

تہمت تراشی کے سلسلے میں چار گواہوں کا ذکر سورۂ النور کی آیت نمبر۱۳ میں بھی آیا ہے۔ وہاں اس کے لئے افک کا لفظ آیا ہے۔ ان آیات میں جرم تو تہمت تراشی کا ہے لیکن ان سے زنا کے سلسلے میں یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ اگر ان شہادات کی رو سے تہمت صحیح ثابت ہو جائے تو اس سے گویا جرم زنا ثابت ہو جائے گا۔ یوں جرم زنا کے ثبوت کے لئے بالواسطہ چار گواہوں کی شہادت کی تائید مل سکتی ہے۔

عینی شہادت

جیسے کے پہلے لکھا جاچکا ہے' زیر نظر قانون میں یہ کہا گیا ہے کہ گواہوں کے لئے ضروری ہے کہ انہوں نے اس فعل کے ارتکاب کے سلسلے میں دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ قرآن کریم میں اس قسم کی شرط کا تو تصور تک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس شرط کی رو سے زنا کا جرم ثابت ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا' اس کی سزا بھی نہیں مل سکتی۔ فقہ کی رو سے اس شہادت کی شرائط کس قسم کی ہیں' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ (فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ) اگر تین گواہوں نے عینی گواہی دے دی اور چوتھے گواہ نے بھی ان کی تائید تو کردی لیکن کہا یہ کہ اس نے ملزم مرد اور عورت کو ایک لحاف میں دیکھا تھا' تو اس سے اس ملزم پر حد جاری نہیں ہوگی۔ لیکن پہلے تین گواہوں کو جرم قذف کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور انہیں اسی اسی کوڑے مارے جائیں گے (فتاویٰ عالمگیری' اردو ترجمہ' ص۳۴۲)۔

نوٹ : زیر نظر قوانین میں خلاف وضع فطرت جنسی اختلاط کا (HOMO SEXUALITY) ذکر نہیں۔

۴- قذف

قذف سے مراد ہوتی ہے کسی پاکباز عورت کے خلاف زنا کی تہمت لگانا۔ اس باب میں قرآن کریم میں کہا گیا ہے:

والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعۃ شھدا فاجلدوھم ثمنین جلدۃ ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدا واولئک ھم الفسقون (۲۴/۴)

جو لوگ پاکباز عورتوں کے خلاف تہمت لگائیں اور اس عائد کردہ الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کریں تو انہیں اسی (۸۰) کوڑے لگاؤ اور اس کے بعد ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو' کیونکہ یہ لوگ فاسق ہیں۔

(اس سے اگلی آیت میں ہے کہ جو لوگ اس کے بعد تائب ہو جائیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو انہیں معاف کیا جاسکتا ہے)۔

قرآن کریم نے عورتوں کے خلاف بہتان تراشی کا ذکر کیا ہے لیکن زیر نظر قانون میں "کسی شخص کے خلاف تہمت لگانے" کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس میں عورتوں کی تخصیص نہیں۔ عورت ہو یا مرد' کسی کے خلاف بھی زنا کی ناحق تہمت لگانا جرم قرار پائے گا۔ اس کی سزا تو اسی (۸۰) کوڑے ہی مقرر کی گئی ہے لیکن اس کے ثبوت کے لئے صرف دو گواہوں کی شہادت کافی قرار دی گئی ہے۔

قرآن کریم مین بہتان تراشی کے علاوہ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے اور بڑا سنگین جرم۔ سورۂ احزاب میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ وہ اپنی ازواج مطہرات' بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے اوپر کے پیرہن کو لٹکائے رکھا کریں تاکہ محض لباس ہی سے معلوم ہو جائے کہ وہ شریف زادیاں ہیں اور انہیں کوئی تنگ نہ کرے۔ اس کے بعد ہے کہ اگر اس کے باوجود شریر الطبع اور جھوٹی خبریں اڑانے والے باز نہ آئیں تو **این ما ثقفوا اُخذوا وقتلوا تقتیلا** (۳۳/۶۱) "جہاں بھی یہ پائے جائیں انہیں گرفتار کیا جائے اور قتل کیا جائے"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے متعلق بھی قانون نافذ کرنا ضروری ہے کیونکہ اس قسم کی حرکتیں آج کل عام ہو رہی ہیں۔

۵- لعان

قرآن کریم میں ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائیں اور اس الزام کے ثبوت میں ان کے اپنے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ایسا شخص چار مرتبہ حلفیہ بیان کرے کہ میں بالکل سچ کہتا ہوں اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر یہ الزام جھوٹ ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ اس کے جواب میں اس کی بیوی بھی اسی طرح قسمیں کھائے اور کہے کہ اس کا خاوند جھوٹ کہتا ہے اور یہ بھی اضافہ کرے کہ اگر وہ سچا ہو تو مجھ پر خدا کا غضب ہو (سورۂ النور آیات نمبر۹-۶)۔

زیر نظر قانون میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ عورت اپنے خاوند کے الزام کی اس طرح تردید نہ کرے تو اسے جرم زنا

کی سزا دی جائے۔ اگر وہ اس کی تردید کردے تو پھر عدالت مجاز ان کے نکاح کو فسخ کرنے کا حکم صادر کردے۔ قرآن کریم میں تو اس کی صراحت نہیں لیکن یہ واضح ہے کہ جب میاں اور بیوی کے باہمی تعلقات کی یہ صورت ہو تو ان کے نکاح باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ اس فیصلے کی رو سے طلاق کے ضمن میں بہت سے سوالات ابھریں گے۔ لیکن چونکہ عائلی قوانین کے سلسلے میں ابھی کوئی بات سامنے نہیں آئی' اس لئے سردست اس نکتہ پر بحث نہیں کی جاسکتی۔

۶۔ کوڑے کا تعین

قرآن کریم مین کوڑوں کی سزا تو مقرر کی گئی ہے لیکن کوڑے کا تعین نہیں کیا گیا کہ وہ کس قسم کا ہونا چاہیے۔ ایک بات البتہ واضح ہے او وہ یہ کہ اس نے سزا کے طور پر سو سو اور اسی اسی کوڑے مقرر کئے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کوڑا ایسا ہونا چاہیئے جس کی سو سو اور اسی اسی ضربیں بھی انسانی حد برداشت سے باہر نہ ہوں۔ حالیہ قوانین میں کہا گیا ہے کہ کوڑا' اس کے دستے کو چھوڑ کر' ایک ٹکڑا ہوگا اور بہتر یہ ہو کہ وہ چمڑے کا بنا ہوا ہو یا بید ہو یا کسی درخت کی شاخ جس پر کوئی گانٹھ یا جوڑ نہ ہو۔ اس کی لمبائی ایک اعشاریہ بائیس میٹر اور موٹائی ایک اعشاریہ پچیس سینٹی میٹر سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی کوڑے لگانے کے لئے بھی جزئیات کی وضاحت کردی گئی ہے۔ اس انداز کی تازیانہ زدگی کا نتیجہ کیا ہوگا' یہ تو ان کے عملی استعمال کے بعد ہی معلوم ہوسکے گا۔

---------------○---------------

یہ ہیں حالیہ نافذ کردہ قوانین حدود کے نمایاں خد و خال۔ ہم نے ان قوانین پر کوئی تنقید یا تبصرہ نہیں کیا۔ صرف اتنا بتانے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ ان جرائم کے متعلق قرآن کریم میں کیا آیا ہے۔ یہ درحقیقت فقہی قوانین ہیں اور فقہ کے متعلق ہمارا موقف اور مسلک واضح ہے۔ ہمارے نزدیک فقہی قوانین ابدی اور غیر متبدل نہیں ہوتے۔ ابدی اور غیر متبدل صرف خدا کے احکام' قوانین اور اصول ہوتے ہیں' انسانوں کے وضع کردہ قوانین نہیں۔

ہم نے طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت فروری ۱۹۷۹ء) کے لمعات میں یہ لکھا^۴ تھا کہ سزاؤں سے متعلق قوانین نافذ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جرائم کی تفتیشی ایجنسی' انتظامیہ اور عدلیہ کو ان بدعنوانیوں اور رشوت ستانیوں سے پاک کیا جائے جن کی وجہ سے لوگوں کو عدل اور انصاف نہیں مل رہا۔ ہم نے ججوں اور گواہوں کے متعلق قرآنی معیار کی وضاحت کرنے کے بعد لکھا تھا کہ:

> اسلامی سزائیں اس معاشرہ کے لئے ہیں جہاں گواہ اس کردار کے حامل ہوں اور جج اس پاکیزگی سیرت کے پیکر۔ اس کے ساتھ معاشرہ کی فضا بھی ایسی ہو جس میں نہ جرائم کے محرکات ہوں اور نہ ہی کسی کو ارتکاب جرم پر مجبور کرنے کے اسباب اور مقتضیات۔

۴۔ یہ سابقہ صفحات میں "قوانین شریعت کا جائزہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

اس قسم کی بلندی کردار اور پاکیزگی میرت اس پروگرام سے پیدا ہوتے ہیں جسے قرآن کریم نے نفسیاتی تبدیلی سے تعبیر کیا ہے۔ اس تبدیلی کے بغیر جرائم کا سدباب تو ایک طرف عادات و اطوار میں بھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ محترم صدر مملکت نے بھی اس ضرورت کا اظہار فرمایا ہے۔ اگلے دنوں انہوں نے (C.B.S) کی ٹی وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیا جو پاکستان ٹائمز کی اشاعت بابت ۱۸ فروری میں شائع ہوا ہے۔ اس میں حالیہ قوانین اور ان کی رو سے دی جانے والی سزاؤں کے متعلق بھی ایک سوال پوچھا گیا۔۔۔ وہ سوال اور صدر محترم کی طرف سے اس کا جواب درج ذیل ہے۔

سوال : مغرب میں بعض لوگ مسلمانوں کو وحشی سمجھتے ہیں۔ مثلاً" ان کے لئے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دینا کس طرح عدل انسانی کہلا سکے گا؟

جواب : یہ ٹھیک ہے۔ میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام تعذیب (PUNISHMENT) کے مقابلہ میں تخویف (DETERRENCY) پر زیادہ زور دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس فلسفہ پر نگاہ رکھیں جو ان (نام نہاد) سنگین سزاؤں (مثلاً" ہاتھ کاٹ دینا یا ہاتھ اور پاؤں کاٹ دینا یا سنگسار کردینا) کے پیچھے کار فرما ہے' تو آپ دیکھیں گے کہ اس قانون شہادت کی رو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے' ایک فی ہزار مجرموں کو بھی یہ سزائیں نہیں دی جاسکیں گی۔ اسلام' صرف سزائیں مقرر نہیں کرتا' وہ پہلے یہ بھی متعین کرتا ہے کہ جو شخص ایسے مقدمات کے فیصلے کرے گا وہ کس قسم کا ہے۔ ان ججوں یا قاضیوں کے لئے جو اس قسم کے مقدمات کی سماعت کریں گے' بڑی کڑی شرطیں عائد کی گئی ہیں۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہئے جس کی میرت اور کردار کے خلاف انگشت نمائی نہ کی جاسکے۔ اسے انتہائی دیانتدار ہونا چاہئے۔ اسے اچھا مسلمان ہونا چاہئے۔ اسے کسی کے خلاف تعصب نہیں ہونا چاہئے (یعنی اسے انتہائی غیر جانبدار ہونا چاہئے)۔ یہ تو رہیں اس جج کی خصوصیات جو ایسے مقدمات کی سماعت کرے گا۔ جہاں تک ان شہادات کا تعلق ہے جو اثبات جرم کے لئے پیش کی جائیں' تو ان کے بارے میں بھی ایسی کڑی شرائط عائد کی گئی ہیں جن کی رو سے کسی ایسے شخص کا مجرم قرار پا جانا ناممکن ہوگا جس کے ارتکاب جرم کے بارے میں ذرا سا بھی شک و شبہ ہو۔ مثلاً" گواہ کو عینی شاہد ہونا چاہئے۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہئے جس نے ہمیشہ سچ بولا ہو' جس کا کیریکٹر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو۔ نیز اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ملزم سے یہ جرم پہلی بار صادر ہوا ہے' تو متعلقہ عدالت سزا کے تعین میں

اس کا خاص خیال رکھے گی۔ اکثر احادیث نبویؐ میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب اس قسم کے جرائم کا مقدمہ سامنے آئے جو قطع ید وغیرہ سزاؤں کے مستوجب ہوں' تو کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی ایسا عذر مل جائے جس کی روشنی میں نرم سزا دی جاسکے خواہ اس میں تھوڑا سا شک بھی کیوں نہ ہو (یعنی ذرا سے شک کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہئے)۔

سوال : اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ ان سزاؤں کا بنیادی مقصد تخویف ہے۔

جواب : یہ ٹھیک ہے' بنیادی مقصد تخویف ہی ہے۔ ان سزاؤں کے سلسلہ میں یہ وہ اہم پہلو ہے جس کے نظرانداز کرنے سے اہل مغرب کو غلط فہمی لاحق ہوجاتی ہے۔ وہ اسے بھول جاتے ہیں کہ قانون شہادت' ججوں کی تعیناتی' گواہوں کے متعلق شرائط' (یعنی) وہ پورے کا پورا ضابطہ جس کی رو سے کسی ملزم کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا' ایسا سخت ہے کہ ایک ہزار میں سے بمشکل ایک مقدمہ ایسا ہوگا جس میں یہ انتہائی سزائیں دی جاسکیں گی۔

اس سلسلے میں ہم اتنا گزارش کرنا ہی مناسب سمجھتے ہیں کہ حالیہ قوانین کو ان شرائط کے پورا ہو جانے کے بعد نافذ کیا جانا چاہئے تھا۔ ضمناً" ان قوانین میں مجرم کے انفرادی حالات یا جرم اول کی صورت میں سزا کی تخفیف کا بھی کوئی ذکر نہیں۔

---------------○---------------

ان قوانین کو نافذ کرتے وقت صدر محترم نے فرمایا تھا کہ انہیں مختلف فرقوں نے متفقہ طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ اس سے ہمیں دلی خوشی ہوئی تھی کہ یہ چیز وحدت قانون اور اس کے بعد وحدت امت ..... کے حق میں بڑا نیک شگون ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ہمیں ہزار برس میں بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان کی فرقہ وارانہ مخالفت شروع ہوگئی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل میں شیعہ حضرات کے نمائندہ نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ جب کونسل میں یہ قوانین پیش ہوئے تو انہوں نے ان کی بعض جزئیات سے اختلاف کیا تھا لیکن انہیں اس کے باوجود کثرت رائے سے پاس کردیا گیا۔ اس کے بعد شیعہ حضرات کی مختلف جماعتوں کی طرف سے اس قسم کے بیانات شائع ہو رہے ہیں کہ ان قوانین کی رو سے فقہ جعفریہ پر اکثریت کی فقہ یعنی ---- فقہ حنفی ---- کو مسلط کیا جا رہا ہے جسے برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی طرف سے یہ احتجاج نیا نہیں۔ انہوں نے بہت پہلے ایسا کہہ دیا تھا۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ نہایت مختصر الفاظ میں اس کا پس منظر قارئین کی خدمت میں پیش کردیا جائے۔

تشکیل پاکستان کے بعد پہلا سوال یہ اٹھا' یا اٹھایا گیا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ ہم نے کہا کہ اس کی وضاحت کردی جائے کہ اسلامی قوانین کی بنیاد کیا ہوگی۔ اکتیس علماء کے ایک اجتماع میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شخصی

قوانین تو ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے لیکن پبلک لاز کتاب و سنت کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔ ہم نے کہا کہ کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔ بات بالکل واضح تھی۔ جسے "کتاب و سنت" کہا جاتا ہے' وہ درحقیقت ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ ہوتی ہے جسے بدلنے یا اس میں ترمیم و تنسیخ کرنے کے لئے کوئی فرقہ تیار نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہ ہوا کہ پبلک لاز کا فی الواقع کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جو ان سب کے نزدیک اسلامی کہلاسکے۔ اس سے گریز کی راہ یہ تراشی گئی کہ طلوع اسلام کے متعلق مشہور کردیا گیا کہ یہ منکر سنت ہے تاکہ لوگ اس کی بات نہ سننے پائیں۔ بیس برس تک یہ پراپیگنڈہ بھی جاری رہا اور ملک میں کوئی ضابطہ قوانین بھی نہ بن سکا۔ بالآخر ۱۹۷۰ء میں' مودودی (مرحوم) کو یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رو سے فی الواقع پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس پر سوال اٹھا کہ پھر پبلک لاز مدون کیسے کئے جائیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ چونکہ ملک میں اکثریت حنفیوں کی ہے' اس لئے یہاں حنفی فقہ رائج کردی جائے۔ اس کے خلاف اہل حدیث اور شیعہ حضرات کی طرف سے سخت احتجاج ہوا۔

شیعہ حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ہم پر اکثریت کی فقہ کو مسلط کیا گیا تو "ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی"۔ ان خدشات کے پیش نظر ہم نے اس موضوع پر طلوع اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ایک مبسوط مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "اسلامی مملکت کا خواب جو کثرت تعبیر سے پریشان ہوگیا"۔ اس مقالہ کا پمفلٹ بھی شائع کیا گیا جسے کثیر تعداد میں ملک میں تقسیم کیا گیا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ یہ ملک (خدانکردہ) خانہ جنگی کا شکار نہ ہو جائے۔ واضح رہے کہ ملکوں کی تقدیر کے لئے سیاسی اختلافات اتنے زیادہ خطرناک نہیں ہوتے جتنے خطرناک مذہبی اختلافات ہوتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں' اس حقیقت کا ایک بار پھر اعادہ کردینا ضروری ہے کہ ہمارا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ اس لئے ہم نہ کسی فرقے کی فقہ کے خلاف ہیں نہ کسی کے حق میں۔ ان فقہوں میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہے (وہ کسی فرقہ کی فقہ میں ہو) ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں' جو اس کے خلاف ہو اسے غلط۔ لیکن مودودی (مرحوم) کا اس فقہ حنفی کے متعلق کیا عقیدہ تھا جسے ملک میں نافذ کرنے کی انہوں نے تجویز پیش کی تھی' اسے مختصر الفاظ میں واضح کردینا ضروری ہے۔ انہوں نے اس کے متعلق لکھا تھا:-

> اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے' جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے محض عہد گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن' بابت محرم ۱۳۶۰ھ)

دوسری جگہ لکھا تھا:

امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں-- یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کرلیا گیا ہے- یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ اور کہتے ہیں-

(رسائل و مسائل' حصہ اول' ص۷۵-۲۷۴)

اس سوال کے جواب میں کہ کیا فقہی احکام ہمیشہ کے لئے واجب العمل ہوتے ہیں' انہوں نے کہا تھا:-

یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے- نبی کی بصیرت براہ راست علم الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے' اس لئے اس کے احکام تمام ازمنہ و احوال کے لئے مناسب ہوتے ہیں- مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو' زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا' نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہوسکتی ہے- لہٰذا' اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے-

(تفہیمات' حصہ دوم' ص۳۲۶)

مسلک کا مدار آئمہ فقہ کی تقلید پر ہے- اس کے متعلق مودودی مرحوم نے کہا تھا:-

میرے نزدیک ایک صاحب علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے-

(رسائل و مسائل' حصہ اول' ص۲۴۴)

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جب ۱۹۷۰ء میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ملک میں حنفی فقہ رائج کردی جائے تو اس کے خلاف اہل حدیث اور شیعہ حضرات نے شدت سے احتجاج کیا تھا- اس کے بعد ملک میں اسلامی قوانین کی تدوین یا نفاذ کا سوال سامنے نہ آیا- اب پہلی بار ان قوانین کو اسلامی قوانین کی حیثیت سے نافذ کیا گیا ہے اور ان کے خلاف سردست شیعہ حضرات نے اپنے اسی احتجاج کا اعادہ کیا ہے جسے انہوں نے ۱۹۷۰ء میں بلند کیا تھا- شیعہ مطالبات کمیٹی کے جائنٹ سیکرٹری کی طرف سے شائع کردہ ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ:

اہل تشیع کے نزدیک فقہ جعفریہ ہی نظام مصطفیٰؐ ہے- اس لئے ہم موجودہ اعلانات کو حقیقی معنوں میں نظام مصطفیٰؐ کا نفاذ نہیں سمجھتے اور موجودہ حالات میں اہل تشیع بجا طور پر فکر مند ہیں- انہوں نے شیعہ مطالبات کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کرلیا ہے جو اپریل کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوگا-

(بحوالہ روزنامہ مساوات' مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۷۹ء)

اس طرح ان اختلافات کا آغاز ہو رہا ہے- ابھی چار پانچ قوانین ہی نافذ ہوئے ہیں اور وہ بھی ایسے جن کا تعلق حدود

(سزاؤں) سے ہے۔ ان میں اختلاف کی زیادہ صورت نہیں ہوتی۔ مزید قوانین نافذ ہونے کے بعد نمعلوم کس کس قسم کے اختلافات نمودار ہوں؟

فقہی اختلافات کے علاوہ' ان قوانین کے عملی اطلاق کے وقت بہت سے جزئیاتی اختلافات بھی سامنے آئیں گے۔ حکومت کی طرف سے شریعت بنچوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جن کا منصب یہ ہے کہ جس قانون کے متعلق کوئی پاکستانی شہری یہ سمجھے کہ وہ کتاب و سنت کے خلاف ہے' وہ اس کے لئے شریعت بنچ کی طرف رجوع کرے۔ وہ بنچ فیصلہ کرے گا کہ وہ قانون کتاب و سنت کے خلاف ہے یا نہیں۔ خلاف ہونے کی صورت میں اس قانون کو کالعدم قرار دیا جاسکے گا یا اس میں ضروری ترمیم و تنسیخ کردی جائے گی۔ جن حضرات' افراد یا اداروں کو حالیہ قوانین سے اختلاف ہو' ہم ان سے گزارش کریں گے کہ ایسے اختلافات کو بحث و نزاع کا موضوع بنانے کے بجائے وہ شریعت بنچ کی طرف رجوع کریں تاکہ ملک میں کسی قسم کا انتشار پیدا نہ ہو۔ انہیں اس کا یقیناً" علم و احساس ہوگا کہ ملک میں تشکیل پاکستان کے وقت سے ایسے عناصر چلے آرہے ہیں (خواہ وہ ملک کے اندر ہوں اور خواہ بیرون ملک) جو یہاں مسلسل انتشار پیدا کرتے رہنا چاہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو انتشار مذہب کے نام پر پیدا کیا جائے' اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ہر بہی خواہ پاکستانی کی کوشش ہونی چاہئے کہ وہ مملکت کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا

(فروری ۱۹۷۹ء)

۷۔ فتاویٰ عالمگیری میں شرعی سزائیں

وطن عزیز میں جب بھی اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے تو فتاویٰ عالمگیری کا نام اکثر سننے میں آتا ہے۔ ہمارے علماء کا ایک طبقہ جہاں یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسلامی قانون کو زمانہ جدید کے تقاضوں کے مطابق مدون کیا جائے' وہاں ایک دوسرے طبقے کی طرف سے اس' لبے کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارے پاس فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں اسلامی قانون پہلے ہی سے مدون شکل میں موجود ہے۔ بس ایک سرکاری چٹھی کے ذریعے ملک میں اسے نافذ کردیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا اہم مجموعہ قوانین ہوگا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام قارئین کو اس سے متعارف کرایا جائے۔

مغل بادشاہ سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کہ جن کے نام سے یہ مجموعہ منسوب ہے' خود شریعت کے بہت بڑے عالم تھے۔ اپنی مملکت میں اسلامی قانون نافذ کرنے کے لئے آپ نے حنفی فقہ' کہ جس کے وہ پیرو تھے' کی تمام معتبر کتابوں کا دقت نظر سے مطالعہ کیا۔ لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ ان میں سے کون سی کتاب ہندوستانی مسلم معاشرے کی

ضروریات پوری کرسکے گی۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مقصد کے لئے ایک نیا مجموعہ قوانین مرتب کرایا جائے۔ چنانچہ مملکت کے مختلف حصوں سے آپ نے کوئی پانچ صد جید فقہا کو جمع کیا اور یہ خدمت ان کے سپرد کی۔ ان علماء نے کافی محنت کے بعد یہ مجموعہ تیار کرکے سلطان کی خدمت میں پیش کردیا' جسے ایک حکم کے ذریعے مملکت میں نافذ کردیا گیا۔

اس مجموعے نے' اس دور کی' جس میں اسے مدون کیا گیا تھا' ضروریات کو پورا کردیا ہوگا' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو بھی پورا کرسکے گا۔ اس مقصد کے لئے اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں اسلامی قانون کے نفاذ کی ابتداء کرنے کے سلسلے میں یہ اعلان کیا جاچکا ہے کہ مستقبل قریب میں شرعی حدود کو نافذ کیا جا رہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوگا کہ ہم اس مجموعے کے مطالعے کو صرف اسی موضوع تک محدود رکھیں۔ اسلامی حدود وہ سزائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں مقرر فرما دی ہیں۔ اس لئے ان کی یہ اصطلاحی تعریف بیان کی جاتی ہے کہ کسی انسان حتیٰ کہ اللہ کے رسولؐ کو بھی ان میں رد و بدل کا اختیار نہیں۔ یہ حدود مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ چوری کی سزا۔
۲۔ زنا کی سزا۔
۳۔ زنا کی تہمت (قذف) کی سزا۔ اور
۴۔ شاہراہوں پر ڈاکے ڈالنے یا بغاوت کی مختلف سزائیں۔

سلطان اورنگ زیب عالم گیرؒ نہایت پارسا قسم کا انسان تھا' لیکن چونکہ یہ مجموعہ دور ملوکیت میں تیار کیا گیا تھا اس لئے اپنے ماحول سے اس کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا شرعی حدود کہ جن میں اصطلاحی طور پر اللہ کے رسولؐ کو بھی رد و بدل کرنے کی اجازت نہ تھی' فقہاء نے مسلمان بادشاہوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دے دیا کہ اگر ان سے مذکورہ بالا جرائم سرزد ہو جائیں تو ان پر شرعی حدود نافذ نہ کی جائیں۔ فتاویٰ عالمگیریؒ میں اس مقصد کے لئے یہ قانون بنایا گیا:۔

ایسے امام المسلمین نے جس کے اوپر امام نہیں' اگر ایسی بات کی جس سے حد واجب ہوتی ہے' جیسے زنا و سرقہ و شراب خوری و قذف' تو اس سے مواخذہ نہ کیا جائے (فتاویٰ عالمگیری اردو جلد سوم' صفحہ ۳۴۱ شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)۔ فقہ میں امام سے مراد مسلمان حکمران ہوتا ہے۔ کیا ہمارے علماء آج کل کے مسلمان حکمرانوں کو یہ حقوق دینے کو تیار ہیں؟

اصل فتاویٰ عالمگیری عربی زبان میں ہے لیکن عام قارئین کی سہولت کے لئے راقم نے اردو ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے جو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ایڈیشن چھ ہزار صفحات کی دس جلدوں پر مشتمل

ہے۔

اب ہم مختلف شرعی حدود کو لیتے ہیں کہ ان کے نفاذ کے لئے فتاویٰ عالمگیری میں کیا تفاصیل ملتی ہیں۔

۱۔ ہاتھ کاٹنے کی سزا

اسلام مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ رزق حلال پر قناعت کریں اور کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے حاصل نہ کریں۔ آج کل ان ناجائز طریقوں نے مختلف صورتیں اختیار کرلی ہیں لیکن زمانہ قدیم میں چوری اس کی سب سے بڑی صورت تھی۔ اسلام نے اس برائی کو ختم کرنے کے لئے اس کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سخت سزا مقرر کی۔ لیکن فتاویٰ عالمگیری میں اس جرم کو ثابت کرنے کے لئے جن کڑی شرائط کو ضروری قرار دیا گیا ہے' اس کے بعد ایسی کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ جس میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئے۔ چوری کا جرم دو طریقوں سے ثابت ہوسکتا ہے۔ ایک چور کے اپنے اقرار سے اور دوسرے گواہوں کی گواہی سے۔ اگر چور خود اقرار کرے تو اسے' حد سے بچانے کے لئے مسلمان حکمران پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ اسے تلقین کرے کہ وہ چوری کا اقرار نہ کرے (ص۳۸۹) یعنی اپنے اقرار سے پھر جائے تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ اور اگر چوری کا اقرار کرکے بھاگ جائے تو بھی اس کا پیچھا نہ کیا جائے نہ فی الفور' نہ بعد (ص۳۹۳)۔ پھر گواہوں کی گواہی کے نتیجے میں چوری ثابت ہو جانے کے باوجود' مندرجہ ذیل صورتوں میں ہاتھ کاٹنے کی حد نافذ نہ ہوگی۔

جلانے کی لکڑی' گھاس' نرکل اور مچھلی کی چوری (ص۳۹۸) دودھ' گوشت اور تازہ پھلوں کی چوری' (ص۳۹۹) نمک کی چوری' (ص۴۰۰)۔ آلات موسیقی اور مختلف علوم کی کتابوں کی چوری(ص۴۰۱)۔ سونے چاندی کی صلیب یا بت کی چوری (ص۴۰۲)۔ چاندی کے برتن کی چوری جن میں کھانے پینے کی چیزیں ہوں (ص۴۰۳)۔ سونے کے زیورات پہنے ہوئے بچے کی چوری (ص۴۰۴)۔اگر کسی مرد یا عورت سے دغا بازی کرکے مال لے لیا' یا لوٹ لیا' یا اچک کر لے بھاگا' تو اس پر ہاتھ کاٹنا نہیں آتا اور کفن چور پر بھی ہاتھ کاٹنا نہیں آیا ص(۴۰۴)۔ اسی طرح اگر چور کے پاس سے کسی دوسرے چور نے مال چوری کرلیا تو چور اول اور مالک میں سے کسی کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ دوسرے چور کا ہاتھ کاٹے (ص۴۰۵)۔ بیت المال (سرکاری خزانے) سے چوری میں ہاتھ نہیں کٹے گا (ص۴۰۵)۔ اگر کوئی شخص دارالحرب سے امن حاصل کرکے دارالاسلام میں آگیا تو اس کے مال کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص۴۰۶)۔ اگر کسی کو مکان میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی' پھر اس نے اجازت سے داخل ہو کر کوئی چیز چرائی تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص ۴۰۸)۔اور اگر اونٹ کو راستہ سے مع اس کے بوجھ کے چرالیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اگر جوال یعنی تھیلہ کو چرالیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔اگر اسی تھیلے کو چاک کرکے اس میں سے مال نکال لیا تو پھر ہاتھ کاٹا جائے گا (ص۴۰۸)۔ اگر کسی نے قطار میں سے اونٹ چرالیا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص ۴۰۸)۔ اگر

کسی نے کسی مکان کو نقب لگائی یعنی دیوار توڑی اور اندر والے چور نے مال' اس نقب والی جگہ پر رکھ دیا جسے اس کے باہر والے ساتھی نے اٹھالیا تو دونوں میں سے کسی کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے (ص ۴۰۹)۔ چور ایک گدھے کو لے کر ایک مکان میں داخل ہوا اور کپڑے جمع کرکے گدھے پر لاد کر مکان سے باہر آیا اور اپنے گھر چلا گیا۔ پھر اس کے بعد گدھا وہاں سے نکل کر اس کے گھر آگیا تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا (ص ۴۱۰)۔ اگر چور نے کسی گھر کو نقب لگا کر اس میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز لے لی تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص ۴۱۰)۔ اگر آستین کے باہر لٹکتی ہوئی تھیلی کو کاٹ کر درہم لے لئے تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ ہاں! آستین میں ہاتھ ڈال کر تھیلی کو چاک کرکے درہم لے لئے تو ہاتھ کاٹا جائے گا (ص ۴۱۱)۔ اگر قفل توڑنے والے نے دن میں بند دروازہ کھول لیا اور اس گھر میں کوئی نہیں اور سامان چوری کرلیا تو اس چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا (ص ۴۱۱)۔ اگر چراگاہ سے کوئی بکری یا گائے یا اونٹ چرالیا تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا (ص ۴۱۲)۔ اگر کسی نے ماں باپ اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے گھر سے ان کا یا اگر ان کے پاس کسی دوسرے کا مال پڑا ہو' اس کو چرالیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص ۴۱۲)۔

یہ ہیں چند تفصیلات' سرقہ کے جرم کی سزا کے سلسلہ میں۔ جن تفاصیل کا ذکر غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق تھا' ان کے نقل کرنے سے مجھے کراہت سی محسوس ہوتی تھی' اس لئے انہیں دانستہ قلم زد کردیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ اگر ہماری فقہ کی کتابوں سے غلاموں اور لونڈیوں کے مسائل خارج کردیئے جائیں تو ان کی ضخامت نصف سے بھی کم رہ جائے۔ چوری کے بارے میں ان تفصیلات پر اگر نظر ڈالی جائے تو شاید ہی کوئی صورت ایسی باقی رہ جائے جس میں چور کا ہاتھ کاٹا جاسکے۔

۲۔ زنا کی سزا

زنا ایک سخت قبیح فعل ہے۔ جس معاشرے میں اس کا رواج پڑ جائے وہ جلد ہی تباہی کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے اس برائی کو ختم کرنے کے لئے قرآن حکیم نے اس کے لئے سو کوڑوں کی سزا مقرر کی ہے' لیکن فتاویٰ عالمگیری میں' چوری کی سزا کی طرح' اس بارے میں بھی جرم کے ثبوت کے لئے کچھ ایسی شرائط عائد کی گئی ہیں جن سے شرعی سزا کے نفاذ کی نوبت شاذ و نادر ہی آسکتی ہے۔ یہ جرم بھی دو طرح سے ثابت ہوتا ہے' ایک مجرم کے اپنے اقرار سے' اور دوسرے گواہوں کی گواہی سے۔ اب اگر مجرم خود اقرار کرلے تو اسے تلقین کی جائے گی کہ وہ اپنے اقرار سے پھر جائے تاکہ وہ اس حد سے بچ سکے (ص ۳۲۳)۔ یا اگر مرد نے زنا کا اقرار کیا لیکن عورت نے انکار کردیا' یا عورت نے اقرار کیا اور مرد نے انکار کردیا تو (امام رحمتہ اللہ کے نزدیک) دونوں میں سے کسی پر حد واجب نہ ہوگی (ص ۳۲۲)۔ کسی عورت سے متعہ کا وقتی نکاح کیا اور مرد جانتا تھا کہ اسلام میں یہ نکاح حرام ہے' لیکن اس کے باوجود اس نے یہ وقتی نکاح کرکے اس عورت سے مباشرت کی تو پھر بھی حد واجب نہ ہوگی (ص ۳۳۴)۔ اگر بلا گواہوں کے کسی عورت سے نکاح کیا یا بلا ولی کے عورت سے نکاح کیا تو بالاتفاق اس پر حد واجب نہ ہوگی (ص ۳۳۴)۔ اگر چھوٹی

نابالغ بچی سے زنا کیا تو زانی پر حد نہ ہوگی۔ اس پر اس لڑکی کا مہر واجب ہوگا (ص۳۳۷)۔ اگر عورت کسی سوتے ہوئے مرد کے بستر میں گھس گئی اور مرد کو اپنے نفس پر قابو دے دیا تو دونوں میں سے کسی پر حد شرعی واجب نہ ہوگی (ص۳۳۷)۔ اگر کسی عورت سے لواطت کی یا فرج کے سوا کسی اور جگہ زنا کیا یا کسی لڑکے سے لواطت کی' تو (امام اعظم کے نزدیک) حد لازم نہیں آئے گی' نہ اس کو تعزیر دی جائے گی اور قید میں ڈالا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرے (ص۳۳۹)۔ تعزیر کی حد تین سے ۳۹ کوڑے ہیں جو حاکم کی صوابدید پر منحصر ہیں۔ چار مردوں نے ایک شخص پر زنا کی گواہی دی جن میں سے دو گواہوں نے کہا کہ اس مرد نے اس عورت سے زبردستی زنا کیا ہے جبکہ دوسرے دو گواہوں نے کہا کہ اس عورت نے خود اسے ترغیب دی تھی' تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ حد ان سب سے دور کردی جائے گی (ص۳۴۴)۔

۳۔ حد قذف

قذف یہ ہے کہ کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائی جائے تو اس جھوٹے گواہ پر حد قائم کی جاتی ہے جو اسی کوڑے مقرر ہے۔ چنانچہ گواہوں پر اس قسم کی جرح ہوتی تھی کہ کسی کو گواہی دینے کی جراٴت ہی نہ ہوتی' بلکہ اکثر زانی تو زنا کی حد سے بچ جاتے لیکن گواہ اس سزا سے نہیں بچ سکتے تھے۔ اس کی وضاحت کے لئے صرف ایک مثال کا نقل کرنا کافی ہے۔

زنا کا جرم ثابت کرنے کے لئے چار چشم دید گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر چار گواہوں میں سے تین نے کسی مرد کے خلاف اس کے زنا کے جرم کے بارے میں گواہی دی اور چوتھے گواہ نے بھی ان کی تائید کردی' لیکن الفاظ میں صرف یہ کہا کہ اس نے مجرم مرد اور عورت دونوں کو ایک لحاف میں دیکھا تھا' تو زنا کار مرد پر تو حد جاری نہ ہوگی لیکن پہلے تینوں گواہوں پر حد قذف نافذ کی جائے گی' یعنی انہیں اسی اسی کوڑے مارے جائیں گے (ص۳۴۲)۔
سوچئے کہ اس قسم کے فیصلوں کے بعد کسے گواہی دینے کی جراٴت ہوسکتی تھی؟

۴۔ شراب نوشی کی سزا

شراب نوشی کی سزا قرآن مجید میں تو مذکور نہیں لیکن فقہ میں اسے بھی حدود میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی فتاویٰ عالمگیری میں مذکورہ بالا اسلوب کو اپناتے ہوئے اس جرم کے ثبوت کے لئے ایسی شرائط ضروری قرار دی گئی ہیں کہ پہلے جرائم کی طرح اس میں بھی شرعی حد کے نفاذ کی نوبت نہیں آتی۔ مثلاً حرام شراب کو صرف دو جنسوں یعنی انگور اور کھجور تک محدود کیا گیا ہے۔ باقی ہر قسم کی شراب کو جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ چھوہارے و انگور' تر و خشک وغیرہ سے جو شرابیں بنائی جاتی ہیں' اگر ان کے پینے سے بے ہوش ہی کیوں نہ ہو جائے تو اس کو حد نہ ماری جائے گی (ص۳۶۲)۔ اور جو شراب کہ حبوب و فواکہ مثل گیہوں و جوار اور آلو بخارا وغیرہ سے بنائی جاتی ہے' جب تک وہ شیریں ہوں تو ان کا پینا حلال ہے۔

اس سلسلے میں زیادہ تفصیلات نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتا اور انہی پر بس کرتا ہوں' جو عام قارئین کے غور و فکر کے لئے کافی ہیں۔ ان تفصیلات کی روشنی میں وہ خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ کیا فتاویٰ عالمگیری ہمارے جدید زمانے کی ضروریات پورا کرسکتا ہے یا ہمیں بھی سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کی طرح ایک نیا مجموعہ قوانین مرتب کرنا ہوگا۔

(پروفیسر رفیع اللہ شہاب) (فروری ۱۹۷۹ء)

۸۔ اورنگ زیبؒ عالمگیراور شرعی سزائیں

برصغیر ہند و پاک کے مسلم دور حکومت کے بارے میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ جملہ مسلمان بادشاہوں کی بہ نسبت اورنگ زیب عالمگیرؒ نے شرعی حدود کو سختی سے نافذ کیا تھا۔ اس تصور کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سلطان موصوف نے اپنے وقت کے پانچ صد جید علماء کو جمع کرکے حنفی فقہ کے مطابق اسلامی قانون کی تدوین کرائی تھی۔ یہ کوشش فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی' جس کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سلطان نے ایک فرمان کے ذریعے اسے اسلامی ہند کے طول و عرض میں نافذ کردیا تھا۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے دور حکومت میں جو متعدد فرامین جاری کئے تھے ان کا پورا ریکارڈ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اس لئے راقم کے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ فتاویٰ عالمگیری کو نافذ کرنے والے فرمان کی اصل عبارت کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ فرمان تو مجھے کہیں سے بھی نہ مل سکا' البتہ اس کوشش کے دوران شرعی حدود کے نفاذ کے بارے میں ان کے کچھ دوسرے فرامین نظرے گزرے جن سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آئی کہ سلطان موصوف شرعی احکامات کے نفاذ کے سلسلے میں فقہ کی کتابوں میں متعین کردہ شرعی سزاؤں کے بجائے قرآن مجید پر زیادہ انحصار کرتے تھے۔ یہ بات تو تاریخی طور پر ثابت ہے کہ سلطان موصوف کو مملکت کے انتظام و انصرام کے بعد جو تھوڑا بہت وقت ملتا تھا وہ اسے قرآن کریم کی خدمت میں صرف کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے فرامین پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کتاب مقدس پر غور و فکر بھی کرتے رہتے تھے اور فقہ کے مقابلے میں جن قرآنی احکامات کے بارے میں ان کا اطمینان ہو جاتا تھا' انہیں نافذ بھی کردیتے تھے۔ اس کی وضاحت کے لئے ہم چوری کی سزا نافذ کرنے کے بارے میں ان کا ایک فرمان قارئین تک پہنچانے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

یہ تو معلوم ہے کہ فقہ کی کتابوں میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا بیان کی گئی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ "ہاتھ" کی شرعی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں انگلیوں سے لے کر بازو تک "ید" کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں اکثر فقہا کے نزدیک پہنچے سے ہاتھ کاٹا جانا چاہئے' خوارج پورا بازو کاٹنے کا مشورہ دیتے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے استاد امام نخعیؒ' امام ابن شبرمتہؒ' امام ابن ابی لیلیٰؒ' خواجہ حسن البصریؒ اور حضرت عمرؓ صرف پانچ انگلیوں کے کاٹنے کو کافی سمجھتے تھے (نیل الاوطار' جلد ہفتم' ص ۱۳۳)۔اور فقہ جعفریہ کا یہ مشہور

مسئلہ ہے کہ صرف چار انگلیاں ہی کاٹی جانی چاہئیں۔ لیکن سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنی مملکت میں چوری کی جو سزا نافذ کی وہ ان سب سے مختلف تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو فرمان جاری کیا اس کے اصل الفاظ یہ ہیں :۔

اول شخصے کہ بر او سرقہ نزد قاضی بہ ثبوت شرعی برسد، بہ اقرار یابہ بینہ شرائط اقامت حد نمودہ، محبوس سازد، تا اثر توبہ وزدی ظاہر شود۔

(نقل فرمان عدالت، عنوان مشتمل بر سی وسہ فصل، فرمان اورنگ زیب عالمگیر، بحوالہ مرات احمدی، جزو اول، مصنفہ مرزا محمد محسن، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۸ء، صفحہ ۲۷۸)

(ترجمہ) ایسا شخص جس پر شرعی ثبوت کے ذریعے قاضی کے نزدیک چوری کا جرم ثابت ہو جائے، چاہے اس کے اپنے اقرار سے یا اقامت حد کے لئے جو شرائط ہیں ان کی شہادت کے ذریعے، تو اسے قید کردیا جائے یہاں تک کہ وہ چوری سے توبہ کرلے۔

آج سے چالیس سال پہلے ہمارے علمی رسائل میں اس موضوع پر بحث چلی تھی جس میں کسی نے امام ابو مسلمؒ اصفہانی کے حوالے سے بیان کیا تھا کہ قرآن میں چوری کی سزا قید مقرر کی گئی ہے اور شریعت ابراہیمی کے ایک نبی، حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے درمیان چوری کی سزا کے سلسلے میں اس کا بیان ہوا ہے۔ جب ان کے چھوٹے بھائی کی بوری سے سرکاری پیالہ برآمد ہوا جس کی چوری کے شبہ میں ان کے مال کی تلاشی لی گئی تھی، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے ان کی شریعت میں چوری کی سزا کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا:۔

قالوا جزاوہ من وجد فی رحلہ فھو جزاوہ کذ لک نجزی الظلمین

(سورۃ الیوسف : آیت ۷۵)

انہوں نے کہا کہ جس کی بوری سے یہ (پیانہ) ملے، یعنی اس پر چوری کا جرم ثابت ہو جائے تو وہی اس کی سزا ہے۔ اس طرح ہماری شریعت میں ظالموں کو سزا دی جاتی ہے۔

ابومسلم کی چودہ جلدوں میں قرآنی تفسیر کو تو مخالفین نے ضائع کردیا تھا، لیکن ان کے جو اقوال دوسری تفاسیر میں کہیں نہ کہیں نقل ہوچکے ہیں قرآن فہمی کے سلسلہ میں سرمایہ بصیرت ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے پانچ صد جید علماء سے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرانے کے باوجود اس کتاب میں درج شدہ چوری کی سزا نافذ کرنے کے بجائے، اس جرم کی وہ سزا نافذ کی جو ان کے خیال کے مطابق قرآن سے ثابت ہوتی تھی۔ اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ ان پانچ صد جید علماء میں سے کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ موجودہ دور کے علماء کے لئے اس میں غور و فکر کا کافی سامان ہے۔ (پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

۹- رجم (سنگسار) کی سزا

پاکستان میں حال ہی میں جو چند فقہی قوانین نافذ کئے گئے ہیں' (انہیں شرعی حدود کہہ کر پکارا جاتا ہے) ان کی رو سے جرم زنا کی سزا کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اگر مجرم غیر شادی شدہ ہوں تو انہیں سو سو کوڑے مارے جائیں اور اگر وہ شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے- اسے اصطلاح میں رجم کہا جاتا ہے' یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کردینا- ہم نے طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۷۹ء میں ان قوانین کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قرآن مجید میں جرم زنا کی سزا صرف کوڑے مقرر کی گئی ہے' بلا تخصیص اس امر کے کہ مجرم شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ- اس میں رجم کی سزا کا کوئی ذکر نہیں- لہٰذا' یہ سزا قرآن مجید کے خلاف ہے- ہم نے اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی' اس لئے کہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں بات قرآن مجید کی نص صریح کے خلاف ہے تو اس کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی- لیکن اس کے باوجود ہمارے پاس استفسارات آرہے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے- بالخصوص اس لئے کہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس سزا کا ثبوت روایات سے ملتا ہے- ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ ہمارے نزدیک جو روایت قرآن مجید کے خلاف ہو اس کی نسبت رسولؐ اللہ کی طرف کی ہی نہیں جاسکتی- اس کے متعلق بلا تامل کہہ دینا چاہئے کہ وہ وضعی ہے- رسولؐ اللہ نے ایسا ہرگز نہیں فرمایا ہوگا' کیونکہ حضورؐ کا کوئی قول یا فعل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔

کوئی دو سال ادھر کی بات ہے' جرم زنا کی سزا کے عنوان سے' محترم پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا ایک مقالہ (طلوع اسلام بابت جون ۱۹۷۷ء میں) شائع ہوا تھا- وہ قدرے مفصل تھا' ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ مستفسرین کے تقاضوں کے پیش نظر اسے دوبارہ شائع کردیا جائے- یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان میں اس قانون کے نفاذ کا سوال بھی سامنے نہیں آیا تھا- لہٰذا' اس وقت اس مقالہ کی حیثیت نظری اور تحقیقاتی تھی- لیکن اب اس کی افادیت کم ہونے کی بجائے اور بھی بڑھ گئی ہے- ملاحظہ فرمایئے:-

---

قرآن حکیم کا یہ انداز ہے کہ اس نے چند احکام تو متعین طور پر دیئے ہیں اور زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق اصول اور اقدار عطا کئے ہیں- جس کتاب عظیم کو تمام اقوام عالم اور تمام زمانوں کے لئے ضابطہ رہنمائی بننا تھا' اس کا یہی اسلوب ہونا چاہئے تھا- لیکن احکام ہوں یا اصول' اس نے تکمیل دین کے اعلان کے ساتھ واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :-

وتمت کلمت ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکلمتہ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کی تمام باتیں صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئیں- اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔

اس کے ساتھ' اس کی بھی وضاحت کردی کہ یہ کتاب انسانی رہنمائی کے لئے کافی ہے' اس لئے اس میں کسی اضافہ کی

بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتب یتلی علیھم (۲۹/۵۱)

کیا یہ ان کے لئے کافی نہیں کہ خدا نے تیری طرف یہ کتاب نازل کردی جو ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

۲ - قرآن مجید میں جو احکام متعین طور پر دیئے گئے ہیں ان میں چار جرائم کی سزائیں بھی شامل ہیں۔ فقہ کی اصطلاح میں ان سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے۔ وہ جرائم ہیں' زنا (جس میں ناحق تہمت تراشی بھی شامل ہے) سرقہ' قتل اور بغاوت۔ اس وقت ہمارے پیش نظران میں سے زنا کی سزا ہے۔ اس کے متعلق قرآن مجید میں واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ :-

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائتہ جلدۃ ولا تاخذکم بھما رافتہ فی دین اللہ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ولیشھد عذابھما طائفتہ من المومنین (۲۴/۲)

زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو قانون خداوندی کے نفاذ میں کسی قسم کی نرمی مت برتو۔ اور یہ سزا اس طرح دو کہ مومنین کی ایک جماعت وہاں موجود ہو۔

قرآن مجید میں یہی ایک مقام ہے جہاں زنا کی سزا کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ حکم متعین طور پر دیا گیا ہے اس لئے کسی دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کی ضرورت لاحق نہ ہوئی۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ قرآن تمہارے لئے کافی ہے۔ جب تک صدر اول میں قرآنی نظام نافذ رہا' حسبنا کتاب اللہ' مملکت اسلامی کا دستور رہا' لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہا تو پھر یہ تصور پیدا کیا گیا کہ انسانی رہنمائی کے لئے قرآن کافی نہیں' اس میں حک و اضافہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں زنا کی سزا کے متعلق کہا گیا کہ قرآن میں متعین کردہ سزا غیر شادی شدہ کے لئے ہے۔ شادہ شدہ زانی اور زانیہ کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر امت میں یہ خیال ابھرا ہوگا کہ ایسا اہم حکم خود قرآن کریم میں کیوں نہ دیا گیا۔ یہ تو قرآن پر اضافہ ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اس کا اعتراف کیا جاتا کہ واقعی قرآن پر اضافہ ہے' کہا یہ گیا کہ نہیں' یہ حکم خود قرآن میں موجود تھا لیکن جو قرآن امت کے پاس ہے' اس میں یہ آیت نہیں رہی۔ یہ ایسا "عذر گناہ" تھا جس پر زمین لرز جاتی' آسمان پھٹ پڑتا۔ لیکن اس عقیدہ کے وضع کرنے والوں کے دل میں ذرا سی لرزش بھی پیدا نہ ہوئی اور انہوں نے اس کی تائید میں روایات وضع کرلیں۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعبؓ سے یہ روایت بیان کی گئی۔

عن زر بن جیش' قال قال لی ابی بن کعب کاین تعد سورۃ الاحزاب قلت اثنین و سبعین ایتہ او ثلاثتہ و سبعین ایہ قال ان کانت لتعدی

سورۃ البقرۃ کنا نقراء فیھا ایتہ الرجم قلت وما ایہ الرجم------؟ قال اذا زینا الشیخ والشیخہ فارجموھما البتتہ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم- (الاتقان فی علوم، جلد دوم، ص۲۵)

حضرت زر بن جیش سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعب نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ سورۃ احزاب میں کتنی آیات تھیں؟ میں نے کہا کہ یہی ۷۲-۷۳ (جو سورۃ احزاب میں موجود ہیں)- انہوں نے کہا کہ نہیں، سورۃ احزاب میں سورۃ بقرہ جتنی آیات تھیں (یعنی ۲۸۶ تاقل)- ان میں سے ایک آیہ رجم بھی تھی جس کی ہم تلاوت کیا کرتے تھے- میں نے پوچھا کہ آیہ رجم کیا تھی؟ فرمایا کہ جب بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں سنگسار کرکے ختم کردیا جائے- یہ اس اللہ کی طرف سے سزا مقرر ہے جو غلبہ اور حکمت والا ہے-

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ اس روایت میں الفاظ الشیخ والشیخہ آئے ہیں- عربی زبان کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ ان کے معنی ہیں بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت- لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ان سے مراد ہیں شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت- عربی زبان میں یہ الفاظ ان معانی میں کہیں نہیں آئے- لیکن ان واضعین روایت نے تو زانیوں کو دو قسموں میں منقسم کرنا تھا- اس لئے سورۃ النور کی آیت میں جو الفاظ --**الزانیتہ والزانی** ---- آئے ہیں، ان کے معنے کئے گئے "غیر شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ مرد" اور اس کے بالمقابل **الشیخ والشیخہ** کے معنی کئے گئے "شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت"-

اس روایت میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے- کہا یہ گیا ہے کہ سورۃ احزاب میں سورۃ بقرہ جتنی آیات تھیں، یعنی ۲۸۶ آیات- قرآن مجید میں سورۃ احزاب کی کل آیات ۷۳ ہیں- سوال یہ ہے کہ بقایا ۲۱۳ آیات کا کیا ہوا؟---- وہ کہاں چلی گئیں؟ ان میں سے ایک آیت کے متعلق جو رجم سے متعلق تھی، انہوں نے تحقیق کرلی- غور سے سنئے کہ وہ تحقیق کیا تھی- سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے) کہا گیا ہے کہ جب قرآن کریم مرتب کیا جانے لگا تو صحابہ کرامؓ کو دو آیتیں کہیں نہ مل سکیں- ایک آیت رجم سے متعلق تھی، اور دوسری رضاعت سے متعلق- چنانچہ وہ ان آیات کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے فرمایا کہ :-

آیہ رجم اور آیہ رضاعت کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا- جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہوگئے- اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی-

لہذا، ان دونوں آیات کا دنیا میں وجود ہی باقی نہ رہا- لیکن (روایات کی رو سے) اس کے باوجود صحابہؓ کو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہ کے زمانے میں ہم آیہ رجم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور ایسا کہنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے-

لوگوں نے آپ سے کہا (غالباً" اس زمانہ میں جب وہ برسراقتدار آئے) کہ جب آپ خود کہتے ہیں کہ آپ بھی اس آیت کی، رسول اللہ کے زمانے میں تلاوت کیا کرتے تھے، تو آپ اسے قرآن کریم میں درج کیوں نہیں کردیتے؟ آپ کا جواب ملاحظہ فرمایئے :-

وقال عمرؓ لولا ان یقول الناس زاد عمرؓ فی کتاب اللہ لا ثبتہ فی المصحف

(تفسیر کبیر، امام رازی، نیا ایڈیشن، جلد ۳۲، ص ۱۳۴)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں ضرور درج کر دیتا، لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے خواہ مخواہ قرآن مجید میں اضافہ کردیا۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن میں تو درج نہیں کریں گے، لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے کہ

(۱) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن حکیم میں تو موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہوچکا ہے۔ وہ صرف تلاوت کے لئے رہ گئی ہیں اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن حکیم میں تو موجود نہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے، جیسے آیہ رجم۔

آپ نے غور فرمایا کہ رجم (سنگساری) کا حکم کس طرح قرآن مجید سے ثابت کیا گیا؟ اس پر تو آپ غور کریں یا نہ کریں، لیکن اس پر ضرور غور کیجئے گا کہ اس کے بعد خود خدا کی کتاب کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اہل حدیث ہوں یا اہل فقہ، قرآن حکیم کی اس حیثیت پر سب متفق ہیں۔

---------------O---------------

یہ تو رہا رجم کا حکم۔ اس کے بعد اس کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ ایسا کرنا عین مطابق فطرت ہے۔ ہمارے ہاں احادیث کے چھ مجموعوں کو صحیح قرار دیا جاتا ہے اور ان میں بخاری کا مجموعہ سرفہرست ہے۔--- اس موضوع پر بخاری کی دو ایک روایات ملاحظہ فرمایئے۔

عن عمرو بن میمون قال رایت فی الجاھلیتہ قردۃ اجتمع علیھا قرودقد زنت فرجموھا فرجمت معھم۔

(صحیح بخاری، باب ایام الجاہلیتہ)

حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے (جو ایک صحابی ہیں) کہ زمانہ جاہلیت میں، میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا۵ کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہوگئے

۵۔ حیوانات کے متعلق زنا کا تصور پیش کرنا، ان وضعی روایات ہی کا حصہ ہے۔

اور اسے سنگسار کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔

اس روایت میں تو اس واقعہ کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کے شارح امام ابن حجر عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے۔

عن عمرو بن میمون قال کنت فی الیمن فی غنم لا علی وانا علی شرف۔ فجاء قردمع قردة۔ فتو سدیدھا فجاء قردا اصغر منہ۔ فغمزھا۔ فسلت یدھا من راس القرد سلا رفیقا۔ فتبعتہ فوقع علیہ وانا انظر۔ ثم رجعت و جعلت تدخل یدھا تحت قرد اول برفق۔ فاستقظ فزعا۔ فشمھا۔ فصاح فاجتمعت القرود فجعل یصح ویوحی الیھا یدہ فذھب القرودیمنتہ ویسرة فجاوا بذلک القردا عرفہ فحفوروا لھا حفرة فرجموھما

(فتح الباری، شرح صحیح بخاری از ابن حجر عسقلانی، جلد ہفتم، ص۱۲۱)

حضرت عمر بن مامون فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چرا رہا تھا اور میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لئے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سوگیا۔ اس کے بعد (پہلے بندر کے مقابلے میں) نسبتاً کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔ اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اٹھا۔ اس نے محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ چنانچہ اس نے بندریا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ اس نے دہائی مچانا شروع کردی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہوگئے۔ وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیختا رہا۔ چنانچہ وہ بندر ادھر ادھر دوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لئے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کردیا۔ (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمرو بن میمون نے بھی انہیں کچھ پتھر مارے تھے)۔

یہ ہے اس سزا کی تائید میں فطرت کی گواہی جسے ان روایات کی رو سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ کسی زانی یا زانیہ کو رجم کی سزا دیجئے اور پھر دیکھئے کہ معاشرہ سے زنا جیسا فعل شنیع کس طرح

ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ اس سے اس جرم کا ارتکاب ختم ہو جائے گا یا نہیں۔ قرآن کریم میں جرم قتل کی سزا موت مقرر کی گئی ہے اور یہی سزا ہمارے مروجہ قانون کی رو سے بھی قاتل کو دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود' قتل کی وارداتوں کا ختم ہو جانا تو ایک طرف' ان میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض سزا دینے سے جرم رک نہیں جاتا۔ جرائم کے سدباب کے لئے افراد کے قلب و نگاہ کی تطہیر اور معاشرے کے اجتماعی نظام کی اصلاح ضروری ہوتی ہے۔ بہرحال' یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔
ہم کہہ یہ رہے تھے کہ کہا یہ جاتا ہے کہ زنا کی یہ سزا دی جائے تو اس جرم کا سدباب ہو جائے گا۔ لیکن جرم کی سزا تو اسی صورت میں مل سکے گی جب جرم ثابت ہو جائے۔ ہماری فقہ نے اس جرم کے اثبات کے لئے ایسی شرائط عائد کی ہیں' جن کی رو سے اس جرم کا ثابت ہونا ناممکنات میں سے ہے[۶]۔ مثلاً'' فقہ حنفی کی معتبر ترین کتاب ہدایہ شریف میں ہے:۔

(ا) من زنی فی دار الحرب او فی دار البغی ثم خرج الینا لا یقام علیہ الحد

(ہدایہ مجیدی اولین' صفحہ ۴۹۳)

جس نے دارالحرب یا باغیوں کے علاقے میں جرم زنا کا ارتکاب کیا اور پھر دارالاسلام میں آگیا' تو اس پر کوئی حد نہیں۔

وضاحت کے لئے بطور مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص واہگہ پار کے کھیت میں زناکاری کے بعد پھر پاکستان کی طرف آجائے' تو اسے اس جرم کی کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ اب آگے چلئے۔

(۲) ومن اقرا ربع مرات فی مجالس مختلفۃ انہ زنی بفلانۃ وقالت ھی تزوجنی۔ او اذا اقرت بالزناء وقال الرجل تزوجھا فلاحد علیھا و علیہ المھر۔ (ایضاً'')

اگر کوئی شخص (کسی ایک جگہ نہیں) چار مختلف مجالس میں' (اور ایک ہی بار نہیں) چار دفعہ اقرار کرے کہ اس نے فلاں عورت سے زنا کیا ہے لیکن عورت کہے کہ نہیں' اس نے مجھ سے (پہلے) نکاح کرلیا تھا یا اسی طرح کوئی عورت ارتکاب زنا کا اقرار کرے لیکن مرد کہے کہ نہیں' میں نے اس سے نکاح کرلیا تھا' تو نہ اس مرد کو سزا دی جائے گی اور نہ اس عورت کو۔ البتہ اس مرد کے لئے ضروری ہوگا کہ اس عورت کو مہر کے پیسے ادا کردے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ بات کہاں تک پہنچ رہی ہے؟ ان قوانین کی رو سے نہ صرف یہ کہ زنا جیسے جرم کے ارتکاب

۶۔ ''شرعی حدود'' کے نفاذ کے بعد خود صدر مملکت نے فرمایا تھا کہ جن شرائط سے یہ جرائم مشروط ہیں ان کے پیش نظر شاید ہی کسی کو شرعی سزا مل سکے۔ (طلوع اسلام۔ مارچ ۱۹۷۹ء)

کا نہ کوئی سدباب سوچا گیا ہے بلکہ اس کے لئے پھاٹک کھول دیئے گئے ہیں۔

اور اب ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ اگر یہ زناکار خود اس جرم کے ارتکاب کا اعتراف نہ کریں تو پھر عدالت کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ تحقیق کرے کہ اس جرم کا ارتکاب ہوا تھا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات شہادات (گواہیوں) کی رو سے ہی طے ہوسکے گی۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ اس شہادت کے لئے کیا کیا شرائط عائد کی گئی ہیں۔۔۔۔

امام ابن رشد فرماتے ہیں:

وان من وصفهم ان تكون علو لا وان من شرط هذه الشهادة ان تكون المعانيه فرجها و انها تكون بالتصريح لا بالكنايه

(ہدایہ المجتہد، جلد دوم، مطبوعہ مصر، ص۴۳۰)

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ گواہ عدل کی صفت سے متصف ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہوں، یعنی انہوں نے بچشم خود اس فعل کو صادر ہوتے دیکھا ہو۔ اور اس کے بعد اسے اشاروں کنایوں سے بیان نہ کریں بلکہ پوری صراحت سے بیان کریں۔۷

آپ سوچئے کہ کیا کوئی مرد اور عورت اس فعل کے مرتکب ایسی صورت میں ہوسکتے ہیں کہ ایک نہیں چار چار شخص اس کی ساری جزئیات تک کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ حیوانات کے جنسی اختلاط میں تو یہ چیز ممکن ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ انسانوں کی بے حیا سے بے حیا تک کوئی قوم یا گروہ ایسا نہیں ملے گا جو ناجائز تو ایک طرف، اس جائز عمل کا ارتکاب بھی اس بے حیائی کے ساتھ کرے۔ فرمایئے! کیا اس جرم کے اثبات کے لئے اس قسم کے چار گواہ مل سکیں گے؟

اور اگر بفرض محال ایسے چار گواہ مل بھی جائیں، لیکن ان کی گواہی کی جزئیات میں کسی قسم کا اختلاف پایا جائے، حتیٰ کہ اگر دو گواہ زنا بالجبر کی شہادت دیں اور دو گواہ یہ کہہ دیں کہ نہیں اس عورت نے اس مرد کو اپنی طرف مائل کیا تھا تو اس صورت میں بھی یہ جرم ثابت نہیں ہوسکے گا۔ ہدایہ میں یہ تمام تفاصیل موجود ہیں۔

ہماری فقہ کی کتابوں میں جنسیات کے متعلق اس کثرت اور تفصیل کے ساتھ مسائل درج ہوتے ہیں کہ کوئی سلیم الطبع انسان انہیں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اور یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان طالب علموں کو جو نوجوان بھی ہوتے ہیں اور (بالعموم) غیر شادی شدہ بھی۔ جن مقامات میں لونڈیوں کا ذکر آتا ہے وہاں یہ تفاصیل فحاشی کی ہر حد کو پھاند جاتی ہیں۔ ہم

۷۔ حیا مانع ہے کہ ہم ان الفاظ کا اردو ترجمہ پیش کریں۔ امام ابن رشد نے تو پھر بھی قدرے محتاط انداز میں بات کی ہے۔ دیگر فقہا نے اس کی جزئیات تک کو جس صراحت سے بیان کیا ہے، ان کے ترجمے سے ان صفحات کو مکدر کرنے کی تو ہم جرات نہیں کرسکتے۔

لیکن حالیہ نافذ کردہ قوانین میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ شہادت کے سچے ہونے کی شرط یہ ہے کہ چاروں گواہوں نے "عمل دخول" کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ (طلوع اسلام مارچ ۱۹۷۹ء)

اپنے دل پر جبر کرکے یہاں دو ایک مثالیں پیش کریں گے۔ ہدایہ مجیدی اولین' ص۴۸۹ پر لکھا ہے کہ "اگر کوئی "من چلا" اپنے بیٹے یا پوتے کی لونڈی سے زنا کا ارتکاب کرلے اور یہ بھی کہے کہ اسے اس کا علم تھا کہ ایسا کرنا شرعاً" حرام ہے' اس کے باوجود اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی"۔ دوسری مثال تو خود ہدایہ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے

ومن وطی اجنبیۃ فیما دون الفرج یعزر

(ایضاً" ' صفحہ ۴۹۰)

اگر کوئی شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ' شرمگاہ کے علاوہ کہیں اور اختلاط کرلے تو اسے جرم زنا کی سزا تو نہیں دی جائے گی' البتہ کوئی اور چھوٹی موٹی سزا دی جاسکتی ہے۔

پھر حیا مانع ہے ورنہ ہم بتاتے کہ "کسی دوسری جگہ اختلاط" کی تفاصیل میں ہماری کتب فقہ میں کیا کیا کچھ کہا گیا ہے اور ہمارے بڑے بڑے ائمہ نے ناواقف عورت تو ایک طرف' خود اپنی بیوی کے سلسلے میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ تفصیل کے لئے حافظ ابن حجر عسقلانی کی شرح بخاری (فتح الباری) کے علاوہ علامہ عینی کی شرح (عمدۃ القاری) میں دیکھئے کہ اس باب میں اور تو اور' امام مالکؒ تک کا کیا مسلک بیان کیا گیا ہے۔ (یہ بحث ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقام حدیث" میں دی گئی ہے)۔

یہ ہے رجم کی سزا کے متعلق اس حکم کا اجمالی سا تعارف جسے نافذ کرنے سے' کہا جاتا ہے کہ' مملکت اسلامی بن جائے گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے اس باب میں اپنی طرف سے ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ ہر بات مستند کتب احادیث اور کتب فقہ کے حوالوں سے لکھی گئی ہے۔

یہ ہیں چند ایک مثالیں ان احکام کی جنہیں "احکام شریعت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ (ستمبر۱۹۷۹ء)

۱۰۔ اسلامی قوانین کی تفاصیل میں اختلاف

(فرقہ اہل حدیث کے مطالبات)

فرقہ اہل حدیث کے ترجمان' الاسلام (لاہور) نے اپنی اشاعت بابت (۱۴) اپریل ۱۹۷۸ء میں' حکومت سے کچھ مطالبات پیش کئے ہیں۔ "رضائے مصطفیٰ" (گوجرانوالہ) نے اپنی اشاعت بابت مئی ۷۸ء میں دہرا کر ان کی سخت مخالفت کی ہے۔ "رضائے مصطفیٰ" کے نام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ جریدہ' بریلوی فرقہ کا ترجمان ہے جس کے مشہور نمائندہ (مولانا) نورانی ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں (یعنی فرقہ اہل حدیث اور بریلوی فرقہ کے نمائندگان) جو (منجملہ دیگر علماء) مملکت پاکستان کے لئے ایک متفق علیہ اسلامی قوانین کا ضابطہ مرتب کرنے کے ذمہ دار تصور کئے جاتے ہیں۔ آپ ان مطالبات اور ان کی مخالفت پر ایک نگاہ ڈالئے اور پھر سوچئے کہ ان حضرات سے اسلامی قوانین مرتب کرنے کی توقعات وابستہ کرنے سے' قوم اپنے آپ کو کتنے بڑے فریب میں مبتلا رکھ رہی ہے۔ مطالبات حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ بے نماز کافر ہیں۔ انہیں کوڑوں اور جرمانہ کی سزا دی جاوے۔
۲۔ قبر پرستی' بت پرستی سے بڑا شرک ہے۔ ایسے لوگوں کو سزا ملنی چاہئے۔
۳۔ قبروں پر نذر نیاز' چڑھاوے حرام ہیں۔ انہیں قانوناً" بند کردیا جائے۔
۴۔ عرسوں کو سنگین جرم قرار دیا جائے۔ عرس' قتل اور زنا سے سخت تر گناہ ہے۔
۵۔ پختہ قبریں گرا دی جائیں اور ایسے لوگوں کو قید کی سزا دی جائے۔
۶۔ میلاد' گیارھویں شریف اور صلوٰۃ قبل اذان کو خلاف قانون قرار دے کر کوڑوں کی سزا دی جائے۔
۷۔ تقلید پر عمل پیرا مقلدین آئمہ کو سزائے موت دی جائے۔

(اگست ۱۹۷۸ء)

۱۱۔ ان قوانین کی سند کیا ہے؟

ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ملک میں اسلام کے نام سے جو کچھ کہا اور کیا جاتا ہے اس سے قوم میں وحدت فکر و عمل پیدا ہونے کے بجائے تشتت و انتشار کیوں بڑھ جاتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا متقاضی۔ اسے دو ایک مثالوں سے سمجھئے۔ آپ دس ہزار کے مجمع میں بھی جب "پانی" کا لفظ بولتے ہیں تو ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو نہ سمجھے کہ آپ نے کیا کہا ہے یا باقی لوگوں سے کچھ مختلف سمجھے۔ یا مثلاً" جب آپ "مثلث" کہتے ہیں تو ریاضی کا ہر طالب علم سمجھ جاتا ہے کہ آپ کا مطلب کیا ہے اور کوئی دو طالب علم بھی ایسے نہیں ہوتے جنہیں اس کے مفہوم میں اختلاف ہو۔ یہ اس لئے کہ ان الفاظ کے معانی متعین ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ اسلام' اسلامی نظام یا شریعت کے الفاظ بولتے ہیں تو کیا ان کا بھی کوئی متعین مفہوم آپ کے ذہن میں آتا ہے؟ اور اگر آتا ہے تو کیا تمام افراد امت کے ذہن میں ان کا وہی مفہوم ہوتا ہے؟ ایسا قطعاً" نہیں ہوتا۔ ان الفاظ کا یا تو کوئی متعین مفہوم ذہن میں نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو ہر شخص کا مفہوم الگ الگ ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک فرقہ سے منسلک افراد کے ذہن میں ان کا کم و بیش ایک ہی مفہوم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر' یہ اسلام' اسلامی نظام یا شریعت کا فرقے وارانہ مفہوم ہوتا ہے' ان کا حقیقی مفہوم نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے جو ان الفاظ سے وحدت فکر و عمل پیدا ہونے کے بجائے تشتت اور انتشار میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حالیہ "قوانین حدود" کو لے لیجئے۔ انہیں اسلامی قوانین کہہ کر ملک میں نافذ کیا گیا لیکن قدم اول پر ہی ایک فرقہ (شیعہ) نے کہہ دیا کہ یہ فقہ حنفی پر مبنی قوانین ہیں جنہیں ہم اسلامی تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تو ان قوانین کی قسط اول کی صورت میں ہوا ہے۔ آپ دیکھئے گا کہ ان کی مزید قسطیں نافذ ہونے پر یہ اختلافات کس قدر بڑھ جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے قوانین کو اسلامی کہنا ہی غلط ہے۔ اسلامی قوانین وہ ہوں گے جنہیں تمام امت اسلامی تسلیم کرے اور اس طرح ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں

ہو۔ لیکن کسی ایک فرقہ کی فقہ کو پبلک لاز کا ضابطہ قرار دے کر اسے اسلامی قوانین کی حیثیت سے' تمام فرقوں پر نافذ کرنا' ملک میں مستقل نزاع کا دروازہ کھول دے گا اور اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے' ظاہر ہیں۔ اسی دشواری کے پیش نظر ہم نے ہمیشہ یہ مشورہ دیا ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ یہ کہیں کہ اسلام نے یہ کہا ہے' شریعت کا یہ فیصلہ ہے' آپ متعین طور پر کہئے کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے' فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ اس سے بات متعین اور واضح ہو جائے گی اور اسلام یا شریعت کے متعلق نہ کوئی ابہام پیدا ہوگا' نہ غلط فہمی۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ طلوع اسلام' اسلامی نظام' اسلامی احکام' شرعی قوانین کے بجائے قرآنی نظام' قرآنی احکام اور قرآنی قوانین کیوں کہتا ہے۔ قرآن ایک واحد' متعین' منفرد کتاب ہے۔ "قرآن" کے لفظ سے' کتاب اللہ کے سوا کسی کے ذہن میں کچھ اور آ ہی نہیں سکتا۔ اور جب ہم اس کے ساتھ اس کی سورت اور آیت کا حوالہ بھی دے دیتے ہیں' تو ہر شخص پرکھ سکتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ صدر اول میں "اسلامی" سے مراد تھی وہ بات (فیصلہ۔ حکم۔ قانون) جو قرآن کے مطابق ہو۔ یہی وجہ تھی کہ امت میں اختلاف پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (فروری ۱۹۷۹ء)

۱۲۔ کوڑوں کی سزا

(کوڑا کس قسم کا ہونا چاہئے)

ہمارے ہاں آج کل کوڑوں کی جو سزا دی جاتی ہے' اس میں کوڑوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عام طور پر' کڑیل جوان بھی پانچ سات کوڑوں سے زیادہ کی تاب نہیں لاسکتے اور اکثر و بیشتر بے ہوش ہو جاتے ہیں اور ڈاکٹری مشورہ کے مطابق ان کے باقی ماندہ کوڑوں کو منسوخ کردینا پڑتا ہے اور ان کے زخموں کے مندمل ہونے میں کافی عرصہ لگ جاتا ہے۔ پچھلے ماہ اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ سعودی عرب میں (جہاں جرائم کی "اسلامی سزائیں" دی جاتی ہیں) بعض برطانوی باشندوں کو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

> لندن' ۱۵ جون (رائٹر)۔ شراب کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سعودی عرب میں مزید دو برطانوی باشندوں کو سر عام کوڑے لگائے گئے اور سزائے قید دی گئی ہے۔ ان دو برطانوی باشندوں کو سزائے قید اور کوڑوں کی سزا کا انکشاف برطانوی دفتر خارجہ نے کیا ہے۔ اس سے پہلے جن دو باشندوں کو شراب تقسیم کرنے پر سر عام کوڑے لگائے گئے تھے برطانیہ واپس چلے گئے ہیں۔ میڈمنٹ اور کوپر کو ستر ستر کوڑے لگائے گئے تھے اور چھ چھ ماہ سزائے قید دی گئی تھی۔ میڈمنٹ اور کوپر نے ہیتھ رو کے ہوائی اڈے پر بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تاہم انہوں نے مزید کچھ نہیں بتایا۔ جن دو مزید افراد کو

سزائے قید اور کوڑے لگائے گئے ہیں ان میں ۲۰ سالہ پیرسن اور ۵۰ سالہ پیڈی والش
ہیں اور دونوں امریکی فرم لاک ہیڈ ایئر کرافٹ کارپوریشن کے ملازم ہیں۔ پیرسن کو دو سو
کوڑے اور دو سال قید اور پیڈی کو ڈیڑھ سو کوڑے اور اٹھارہ ماہ قید کی سزا دی گئی۔
(نوائے وقت ۷۸-۶-۱۶)

معلوم نہیں کہ وہاں کوڑے کس قسم کے ہوتے ہیں کہ پچاس پچاس سالہ بوڑھے' ڈیڑھ ڈیڑھ' دو دو سو کوڑے کھا کر بھی ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب اس کی متعینہ تفصیل بتاسکیں تو طلوع اسلام ان کا شکرگزار ہوگا۔
(اگست ۱۹۷۸ء)

۱۳۔ کوڑوں کی وضاحت
(فقہی تحقیق)

قرآن مجید میں کوڑے کے لئے "جلدۃ" کا لفظ آیا ہے جو اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مجرم کو کسی ایسی چیز سے سزا دی جائے جس کا اثر صرف اس کی کھال تک محدود رہے۔ اسلامی فقہ کی تفصیلات کے مطابق اگر کوڑے لگانے سے مجرم کے کسی حصے کا گوشت اڑ گیا' یا کھال پھٹ گئی' یا زخم کھال کے اندر تک پہنچ گیا تو ایسی سزا جائز نہیں ہوتی۔ چنانچہ حفظ ماتقدم کے طور پر ایسے طریقے اختیار کئے جاتے تھے جن سے اس قسم کے زخم وغیرہ کی نوبت نہیں آتی تھی۔

دور نبویؐ میں تو جرائم کی تعداد بڑی محدود تھی اور شاذ و نادر ہی کوڑوں کی سزا تک نوبت پہنچتی تھی۔ اس لئے اس دور میں کوئی مخصوص قسم کا کوڑا تیار نہیں کیا گیا تھا۔ جب کوئی مجرم پکڑا جاتا تو اسے جوتوں یا کھجور کی چھال سے سزا دی جاتی۔ قاضی ابوبکر جصاص دور نبویؐ کی سزا کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

كان من ضرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالجرید والنعال
(احکام القرآن' جلد سوم' ص۲۶۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوڑے مارنے کا کام جوتوں یا کھجور کی چھال سے لیا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ دور نبویؐ میں چمڑے سے بنے ہوئے کوڑے سے سزا دینے کا رواج نہیں تھا۔ یہی صورت حالات حضرت ابوبکرؓ کے دور میں رہی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اس مقصد کے لئے مخصوص کوڑا تیار کرایا تھا جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے :-

اتی عمر بسوط فیہ شدۃ فقال ارید الین من ھذا۔ فاتی بسوط فیہ لین۔

فقال ارید اشد من هذا فاتی بسوط بین السوطین فقال اضرب- ولا یری ابطلک واعط کل عفرحقہ (ایضاً" ص۲۶۱)

حضرت عمرؓ کے پاس ایک کوڑا لایا گیا جو بہت سخت تھا- آپؓ نے فرمایا' اس سے ذرا نرم ہونا چاہئے- اس پر آپ کے پاس دوسرا کوڑا لایا گیا جو پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ نرم تھا- آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے ذرا سخت چاہئے- چنانچہ آپ کے پاس ان دونوں کوڑوں کے درمیانی معیار کا کوڑا لایا گیا تو آپ نے مارنے والے سے فرمایا کہ اس سے اس طرح ضرب لگائی جائے کہ تیری بغل (ARMPIT) نظر نہ آئے- اور پھر یہ کہ یہ کوڑے جسم کے ہر حصے پر لگائے جائیں-

خیال رہے کہ کوڑوں کی سزا وہ اہل علم صحابہؓ دیتے تھے جنہیں شرعی احکامات و اصول کا پورا پورا علم ہوتا تھا- اور پھر یہ کہ یہ سزا کپڑے اتار کر نہیں بلکہ موسم کے مطابق مجرم نے جو کپڑے پہن رکھے ہوتے تھے' ان کو اتارے بغیر دی جاتی تھی' بلکہ اگر کوئی مجرم خود بھی کپڑے اتارنا چاہتا تو اسے کپڑے اتارنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی-

حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح سے روایت ہے :-

ان ابا عبیدة بن الجراح اتی برجل فی حد مذ هب الرجل ینزع قمیصہ وقال ینبقی لجسدی هذا المذهب ان یضرب ولیس علیہ قمیص- فقال ابو عبیدة لا تدعوه تنزع قمیصہ فضربہ علیہ (ایضاً" ص۲۶۲)

حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کے پاس شرعی سزا کا ایک مجرم لایا گیا تو اس نے اپنی قمیض اتارنی شروع کردی اور کہنے لگا کہ اس گنہگار جسم کو اس حالت میں کوڑے پڑنے چاہئیں کہ اس پر قمیض نہ ہو- لیکن حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا کہ اسے قمیض نہ اتارنے دو- پس اسے قمیض کے اوپر کوڑے مارے گئے-

یہی نہیں بلکہ بعض اوقات جلد کو زخمی ہونے سے بچانے کے لئے مجرم کو بھیڑ یا بکری کی کھال پہنا دی جاتی تھی' تاکہ کوڑوں کا اثر جلد کے اندر تک نہ پہنچنے پائے- حضرت سعد بن ابراہیم سے روایت ہے:-

ولقد حدثنی ابی ان ام کلثوم امرت بشاة فسلخت حین جلد ابوبکر فالبسہ مسکها - فهل کان ذالک الا من ضرب شدید (ایضاً" ص۲۶۰)

مجھ سے میرے باپ نے روایت بیان کی کہ ان کی والدہ ام کلثوم نے ایک بھیڑ ذبح کرنے کو کہا- اور جب ابوبکرہ کو کوڑے لگائے گئے تو وہ کھال انہیں پہنا دی' تو کیا یہ ضرب شدید سے بچنے کے لئے نہ تھا (دوسری روایت میں ضرب خفیف آیا ہے)-

(پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

عینی شاہد کی روئداد

گزشتہ سال مجھے چند ماہ سعودی عرب کے ایک شہر "الخرج" میں گزارنے کا موقع ملا جہاں میں نے ایک بار کوڑوں کی سزا کے نفاذ کا منظر بھی دیکھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سو' دو سو کوڑے بیک وقت نہیں لگائے جاتے' بلکہ چالیس چالیس کوڑے ایک وقت میں لگاتے ہیں۔ یہ سزا نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد کے باہر میدان میں دی جاتی ہے۔ ایک سو کوڑے سزا ہو تو چار ہفتوں میں پوری کی جاتی ہے۔

اس روز دو مجرموں کو سزا دی گئی جن میں سے ایک پاکستانی اور ایک سعودی تھا۔ نماز جمعہ کے بعد لوگ میدان میں حلقہ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ پہلے پاکستانی کو زمین پر منہ کے بل لٹا دیا گیا۔ دونوں ہاتھ سر سے اوپر آگے کر رکھے تھے۔ ایک قاضی کا نمائندہ اور ایک اور افسر سرہانے کھڑے ہوگئے اور دو پولیس کے سپاہی ہاتھوں میں بید کی چھڑیاں لئے مجرم کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ بید کی چھڑی تقریباً" چار فٹ لمبی ہوگی۔ مجرم کے کپڑے نہیں اتروائے گئے تھے۔ دونوں سپاہیوں نے کھڑے کھڑے' باری باری' بید مارنے شروع کردیئے۔ بید مارتے وقت نہ تو انہوں نے گھٹنے جھکائے اور نہ کوئی زور لگایا۔ میرا خیال ہے کہ ۳۰ کوڑے لگانے میں انہیں ۳۰ سیکنڈ لگے ہوں گے۔ مجرم کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی طرح سعودی بھی چالیس کوڑے کھا کر اٹھ گیا اور دونوں پولیس کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ ان میں سے نہ کسی کا کپڑا پھٹا اور نہ ہی کسی ضرب پر ان کے منہ سے آہ نکلی۔

تو محترم! یہ ہے سعودی عرب میں کوڑوں کی سزا---- میرا خیال ہے دوسرے شہروں میں بھی یونہی کوڑے لگائے جاتے ہوں گے۔

طلوع اسلام

کوڑوں کے متعلق ہماری الجھن اس لئے تھی کہ قرآن کریم نے زانی اور زانیہ کی سزا سو سو کوڑے (جلد) تجویز کی ہے اور جھوٹی تہمت لگانے والے کی اسی کوڑے۔ ہم سوچتے تھے کہ جب (یہاں کے) پانچ سات کوڑوں سے مجرم کی یہ حالت ہوجاتی ہے تو اسی یا سو کوڑوں سے تو اس کا قیمہ ہو جائے گا۔ قرآن کریم کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا۔ کوڑوں کی زیر نظر وضاحت سے بات صاف ہوگئی کہ کوڑوں سے مقصد مجرم کو مضروب کرنا نہیں بلکہ اس کے اندر احساس ندامت کا بیدار کرنا ہے۔

ویسے' جلدۃ کی جملہ تفاصیل کا تعین' قرآنی مملکت کرے گی۔ کیونکہ خود قرآن نے اس کی تفاصیل متعین نہیں کیں۔ (ستمبر ۱۹۷۸ء)

---------------- ○ ----------------

۱۴- فقہ کی کتاب الحیل

(قوانین سے بچنے کی تدابیر)

ہمارے زمانے میں نظام سرمایہ داری کے خلاف جو نفرت پھیلی تو اس کی سب سے بڑی زد سود پر پڑی- اس سے ہماری مذہبی پیشوائیت بلبلا اٹھی- آپ پوچھیں گے کہ مذہبی پیشوائیت کا سود سے کیا تعلق جو اس پر زد پڑنے سے یہ حضرات بلبلا اٹھے ہیں؟ لیکن بات صاف اور سیدھی ہے- مذہبی پیشوائیت کا سارا دار و مدار سرمایہ داروں کے سہاروں پر ہوتا ہے- ان کی ذاتی ضروریات' ان کی نام نہاد "دینی خدمات"' ان کی مذہب کے لبادوں میں لپٹی ہوئی سیاسی تحریکات' سب سرمایہ داروں کے سہارے چلتی ہیں- اس لئے سرمایہ داروں پر کسی قسم کی زد پڑنے سے ان کا پریشان ہو جانا لازی ہے- یہ وجہ ہے جو یہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ سود کا اقتصادی نظام مٹنے نہ پائے- مثلاً" بلاسود بینکاری کے سلسلے میں مودودی صاحب نے یہ تدبیر بتائی ہے-

> روپیہ جمع کرانے والوں کو سود دینے کے بجائے' بینک ایسے اقتصادی منصوبے تیار کریں گے جنکے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے' برابر کے حق دار ہوں -"

(ایشیاء' ۵ نومبر ۱۹۷۸ء)

یعنی بینک' اس وقت جو کچھ سود کے نام سے دیتے ہیں اسے منافع کہہ دیا جائے تو یہ حلال و طیب ہو جائے گا-

یہ تو رہا کاروباری سلسلے کا سود- جو لوگ انفرادی طور پر' اپنی احتیاج سے مجبور ہو کر' دوسروں سے قرض لیتے ہیں اور وہ سود کی شرط پر قرض دیتے ہیں ان کے لئے اس گناہ سے بچنے کے لئے بھی تدابیر بتائی جا رہی ہیں- آپ کو شاید علم نہیں کہ فقہ کی کتابوں میں پہلے تو شرعی احکام درج ہوتے ہیں اور آخر میں ایک باب میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان احکام سے بچ نکلنے کی کیا تدابیر ہیں- اسے "کتاب الحیل" کہا جاتا ہے یعنی EVASION کی تدابیر-

ہمارے سامنے ایک کتاب آئی ہے جس کا نام ہے "معاشیات نظام مصطفیٰ"- مصنف ہیں' مفتی محمد ابو سعید غلام سرور قادری' ایم اے اسلامک لاء ہمارے پیش نظر اس کتاب پر تبصرہ نہیں- ہم صرف اس کے "باب الحیل" کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں- اس میں پہلے سود کے خلاف اسلامی احکامات کا ذکر ہے اور اس کے بعد سود سے بچنے کی تدابیر درج ہیں- انہیں آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے-

پہلی تدبیر

ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر اس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے- ظاہر ہے کہ یہ دو روپے سود ہوں گے- لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا' قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید لے اور اسے قرض لینے والے کے ہاتھ مدت معینہ کے لئے بارہ روپے میں ادھار بیچ دے- اس مدت کے بعد قرض لینے والا' قرض دینے والے کو بارہ روپے ادا کردے- اس فقہی حیلہ سے یہ زائد دو روپے حلال و طیب قرار

پا جائیں گے۔

دوسری تدبیر

قرض دینے والا اپنی کوئی چیز ایک سو دس روپے میں قرض لینے والے کے ہاتھ ادھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اس چیز کو کسی اور کے ہاتھ ایک سو روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس چیز کو اس شخص سے سو روپے میں خرید لے۔ اس طرح وہ چیز بھی قرض دینے والے کو واپس مل گئی اور قرض لینے والے کے ذمے ایک سو دس روپے واجب الادا ہو گئے۔

تیسری تدبیر

قرض دینے والا قرض لینے والے کے ہاتھ ایک چیز دو سو روپے میں ادھار بیچ دے۔ پھر اسے اس سے ایک سو روپے میں نقد خرید لے۔ قرض لینے والا معینہ مدت کے بعد اس شے کی قیمت کے طور پر اسے دو سو روپیہ ادا کردے گا۔ اس طرح اسے ایک سو روپیہ زائد مل جائے گا جو بالکل حلال اور طیب ہو گا۔

چوتھی تدبیر

قرض دینے والا کوئی چیز ایک مدت معینہ کے لئے بیس روپے میں ادھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اسے کسی اور کے پاس پندرہ روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس سے وہ چیز پندرہ روپے میں خرید لے۔ مدت معینہ کے بعد قرض لینے والا اسے بیس روپے واپس ادا کردے گا۔ قرض دینے والے کو اپنی چیز بھی مل گئی اور پانچ روپے "رزق حلال" کے طور پر زائد بھی ـــــ اس طرح، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی ـــــ اس کتاب میں لکھا ہے کہ امام ابو یوسف علیہ الرحمتہ ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

> اس سے منافع بھی ہو گا اور ثواب بھی ملے گا۔ ثواب اس لئے ملے گا کہ اسے سود جیسے حرام سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ (بحوالہ فتاویٰ قاضی خان مع عالم گیری، جلد دوم، ص ۲۷۹-۲۸۰ مصری)

ان تدابیر کو درج کرنے کے بعد اس کتاب کے مصنف فرماتے ہیں کہ ان تدابیر کی رو سے منافع بھی مل گیا اور سود گناہ بھی نہ ہوا۔

> لیکن افسوس کہ مسلمان دین فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود ایسی لعنت میں مبتلا ہیں۔

> افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو!
> دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارے (ص ۱۷۲)

اس سے آپ کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہوگی کہ یہ لوگ قرآن سے کیوں بھاگتے ہیں اور فقہی قوانین کو نافذ کرنے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ (اکتوبر ۷۹ء)

۱۵۔ قوانین حدود کی ناکامی

جب فروری ۱۹۷۹ء میں، ملک میں شرعی قوانین نافذ ہوئے ہیں تو ہم نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے، منجملہ دیگر امور، لکھا تھا کہ:

> آپ سوچئے کہ تفتیشی اور عدالتی مشینری تو ویسے کی ویسی رہے اور سزائیں کردی جائیں زیادہ سخت، تو کیا اس سے جرائم کی اصلاح ہو جائے گی؟ اصلاح تو ایک طرف، اس سے خرابی اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات واضح ہے۔ اگر کسی جرم کی سزا، (مثلاً) تین ماہ قید ہو تو اس میں رشوت کا "ریٹ" ہزار پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوگا، لیکن اگر اس جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینا یا سنگسار کردینا ہو تو رشوت کا ریٹ آسمان سے باتیں کرنے لگ جائے گا۔ ملزم اپنا گھر بار بیچ کر بھی رشوت کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفتیشی مشینری اور نظام عدل کی اصلاح کے بغیر سزاؤں کی سختی کیا نتائج پیدا کرے گی۸۔ (طلوع اسلام، بابت فروری ۱۹۷۹ء، ص۱۵)

اس پر مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شور مچا دیا گیا کہ یہ لوگ چاہتے ہی نہیں کہ ملک میں شرعی قوانین نافذ ہو جائیں۔ اسی لئے یہ ان کے خلاف اس قسم کے اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ اب سنئے کہ مفتی محمود صاحب کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلہ کے۔ انہوں نے پارٹی ورکرز سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

> اسلامی قوانین کی تنفیذ سے قوم پر خدا کی رحمتوں کی بارش تو کوئی نہ ہوئی البتہ پولیس کی رشوت کا ریٹ بہت اونچا چلا گیا۔ (پاکستان ٹائمز، مورخہ ۲۹ جون ۱۹۷۹ء، ص۷)

مفتی صاحب نے اپنے اسی خطاب میں یہ بھی فرمایا کہ:

> یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ شرعی قوانین کو نافذ ہوئے قریب پانچ ماہ ہوگئے لیکن جرائم کے ارتکاب میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ یہ اس لئے کہ شرعی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ مقدمات کو شرعی قوانین کے بجائے جہاں سے زیادہ سخت سزائیں مل سکتی ہیں، انہیں عام عدالتوں میں دائر کیا جاتا ہے۔ جرائم کا انسداد اس صورت میں ممکن ہے کہ صرف شرعی عدالتیں رکھی جائیں اور دوسری سب عدالتیں بند کردی جائیں۔ (ایضاً)

۸۔ سابقہ صفحات میں مکمل تبصرہ شائع ہوچکا ہے۔

ان حضرات کی مشکل یہ ہے کہ ان پر ہمیشہ جذبات غالب رہتے ہیں جس کی وجہ سے یہ حقائق کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ان کا پہلا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ ہر خرابی کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر عوام کو ان کے خلاف مشتعل کردیا جائے اور خود بری الذمہ ہو جائیں۔ مفتی صاحب محترم اگر حقائق کو اپنے سامنے رکھتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ جس خرابی کی انہوں نے نشاندہی کی ہے' وہ خود ان شرعی قوانین کے اندر موجود ہے جو ملک میں نافذ کئے گئے ہیں۔ حکومت کے اعلامیہ میں جہاں شرعی حدود نافذ کئے گئے ہیں' ان کے ساتھ ہی موجودہ فوجداری قوانین بھی درج ہیں اور کہا گیا ہے کہ اگر کوئی جرم شرعی قوانین کی شرائط کی رو سے ثابت نہ ہوسکے تو اس کا فیصلہ ملک کے رائج الوقت قانون کی رو سے کیا جائے۔ شرعی قوانین میں اثبات جرم کے لئے جو شرائط رکھی گئی ہیں ان کے مطابق شاید ہی کوئی جرم ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کا اعتراف اور اظہار خود صدر مملکت نے اپنے ایک انٹرویو میں فرمایا تھا۔ پولیس کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تفتیش کی رو سے جس قانون کے مطابق جرم کا ثابت ہونا ممکن ہو اسی قانون کے تحت وہ عدالت میں چالان پیش کریں۔ یہ بات ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ جرم زنا کے ثبوت کے لئے قانون شریعت کی رو سے چار ایسے گواہوں کی ضرورت لابنفک ہے جنہوں نے اس فعل کے ارتکاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور تزکیتہ الشہود کی شرط کی رو سے یہ عینی شاہد بھی پاکیزہ سیرت کے حامل ہونے چاہئیں۔ ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا ان شرائط کی رو سے کسی تفتیشی افسر کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے چالان میں اس جرم کا ثبوت پیش کرسکے؟ ان حالات میں اس کے لئے اس کے سوا چارۂ کار کیا رہ سکتا ہے کہ وہ اس مقدمہ کو ملک کی عام عدالت میں پیش کرے جہاں اثبات جرم کا امکان ہوسکتا ہے۔

کیا محترم مفتی صاحب ارشاد فرمائیں گے کہ ان مقدمات کو شرعی عدالتوں کے بجائے عام ملکی عدالتوں میں دائر کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ پولیس اور بیوروکریسی پر یا خود ان شرعی قوانین پر؟ مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ انسداد جرم کے لئے ضروری ہے کہ عام عدالتیں بند کردی جائیں اور مقدمات کے فیصلے صرف شرعی عدالتوں میں ہوں۔ کیا مفتی صاحب فرمائیں گے کہ صدیوں پر مشتمل فقہی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ملتا ہے جس میں کسی شرعی عدالت میں چار عینی شہادتوں کی بناء پر جرم زنا ثابت ہوا ہو؟ یہ تو غنیمت ہے کہ یہاں ملکی عدالتیں موجود ہیں جہاں سے اب بھی ملکی قانون کی رو سے مجرموں کو سزا مل جاتی ہے۔ اگر یہ عدالتیں بند ہو جائیں تو نہ کوئی جرم ثابت ہوسکے نہ کسی مجرم کو سزا مل سکے! (اگست ۱۹۷۹ء)

اہل حدیث کی طرف سے

جب زکوۃ اور عشر کے مجوزہ قوانین کے خلاف شیعہ حضرات نے احتجاج کیا تھا تو ہم نے لکھا تھا کہ ابھی تک تو یہ اختلاف شیعہ حضرات اور سینوں میں ہے۔ آگے چل کر آپ دیکھئے گا کہ خود سینوں میں سے اہل حدیث کی طرف

سے اس سے بھی زیادہ سخت احتجاج ہوگا۔ ان سطور کی تسوید کے وقت تک زکوٰۃ اور عشر سے متعلق ضابطہ قوانین کا اعلان نہیں ہوا لیکن جماعت اہل حدیث کی طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوگئی ہے۔ روزنامہ مساوات' مورخہ ۲۱ جون ۱۹۷۹ء میں شائع شدہ ذیل کی خبر ملاحظہ فرمایئے:۔

> مرکزی جمعیت اہل حدیث نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو تقریباً" ایک کڑور اہل حدیث افراد اہل تشیع کی طرح بنکوں سے رقوم نکلوانے کے سوال پر غور کریں گے۔ تنظیم کے مرکزی امیر مولانا معین الدین لکھوی نے آج یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے استفسار کیا کہ آیا صدر مملکت اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ عشر و زکوٰۃ کی شرائط نصاب اور مصارف کے سلسلہ میں جس طرح اہل تشیع کو اہل سنت سے اختلاف ہے' اسی طرح زکوٰۃ و عشر کے بیسیوں مسائل میں اہل حدیث کو فقہ حنفی سے اختلاف ہے۔ صدر نے مرکز و صوبائی زکوٰۃ و عشر کونسلوں کا جو اعلان کیا ہے اس میں عدالت ہائے عالیہ کے ججوں کے تحت قانونی اور فنی ماہرین کے ساتھ شیعہ' بریلوی اور دیو بندی علماء کو نمائندگی دی گئی ہے لیکن جماعت اہل حدیث کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ان کونسلوں میں مسلک اہل حدیث کی نمائندگی کوئی نہیں کرے گا۔ انہوں نے کہا حنفی علماء' چاہے بریلوی ہوں یا دیو بندی' فقہ حنفی سے ہی رہنمائی حاصل کریں گے اور شیعہ ارکان فقہ جعفریہ سے۔ لیکن اہل ہدیث نہ فقہ حنفیہ کو واجب العمل سمجھتے ہیں اور نہ فقہ جعفریہ کو۔ ان کے نزدیک صرف قرآن اور حدیث واجب التعمیل ہیں۔ ان حالات میں کونسلوں کے طے کردہ قاعدے اور ضابطے اہل حدیث کے نزدیک نہ تو کسی اہمیت کے حامل ہوں گے اور نہ کسی اعتماد کے قابل۔ (اگست ۷۹ء)

---------------○---------------

۱۴۔ اس ناکامی کی بنیادی وجہ

ملک میں' مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شور مچایا جا رہا ہے کہ "حکومت نے بادل نخواستہ شرعی قوانین (یعنی قوانین حدود) نافذ تو کردیئے ہیں لیکن ان کے مطابق مجرموں کو سزائیں نہیں دی جا رہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت بدنیت ہے۔ وہ یہاں اسلام رائج ہی نہیں کرنا چاہتی۔ حکومت کی اس سازش میں پولیس بھی برابر کی شریک ہے اور عدلیہ بھی ملوث"۔ ہم اس موضوع پر مختصر طور پر طلوع اسلام میں پہلے بھی لکھ چکے ہیں لیکن چونکہ ان کی طرف سے پروپیگنڈہ بڑی شد و مد سے جاری ہے اور غالباً" یہ حضرات اپنی انتخابی مہم میں اس نکتے کا سہارا لینا چاہتے

ہیں' اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان قوانین کا تجزیہ کرکے یہ دکھایا جائے کہ اس کے حقیقی ذمے دار کون ہیں۔ واضح رہے کہ ہمیں نہ تو پولیس یا عدلیہ کی صفائی مقصود ہے اور نہ ہی ہمارے پاس حکومت کا وکالت نامہ ہے۔ ہمارا مقصد اصل حقیقت کو بے نقاب کرکے یہ بتانا ہے کہ یہ حضرات دوسروں کے خلاف الزام دھرتے ہیں حالانکہ اس کے ذمہ دار یہ خود ہیں اور اپنے پروپیگنڈے سے عوام کو مغالطہ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ مذہب کے نام پر اس قسم کے کھیل آئے دن کھیلے جاتے ہیں۔

یہ قوانین صرف چار جرائم کو محیط ہیں' یعنی جرم زنا' جرم قذف (کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا)' جرم سرقہ (چوری) اور جرم شراب نوشی۔ ان کے متعلق حکومت کی طرف سے ۹ فروری ۱۹۷۹ء کو آرڈیننس جاری ہوا تھا۔ ہم اس باب میں جو کچھ لکھیں گے وہ اس آرڈیننس پر مبنی ہوگا لیکن ہم شروع ہی میں واضح کردینا چاہتے ہیں کہ قانونی سند بہر حال' اصل آرڈیننس ہوگا نہ کہ ہماری تشریحات۔ اس کے بعد آیئے موضوع زیر بحث کی طرف۔

۱۔ یہ واضح ہے کہ کسی جرم کی سزا اسی صورت میں دی جاسکتی ہے جب وہ جرم ثابت ہو جائے۔

۲۔ اثبات جرم کا بنیادی مدار شہادات (گواہوں) پر ہوتا ہے۔ عدلیہ کے نظام میں شہادت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ضوابط قوانین میں قانون شہادت کو سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ زیر نظر شرعی حدود کے سلسلے میں شہادت کی کیفیت کیا ہے۔ ان تمام جرائم کے متعلق اصولی طور پر کہا گیا ہے کہ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ "تزکیتہ الشہود" کی شرائط پر پورا اترے۔ یہ شرائط یہ ہیں کہ وہ صداقت شعار (سچ بولنے والا اور راست باز) ہو اور اس سے گناہ کبیرہ سرزد نہ ہوئے ہوں۔ اگر کسی مقدمہ میں یہ ظاہر ہو جائے کہ گواہ ان شرائط پر پورا نہیں اترتا تو اس کی گواہی قابل اعتماد نہیں سمجھی جائے گی اور مجرم بری ہو جائے گا۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کتنے فیصد لوگ ایسے نکلیں گے جو ان شرائط پر پورے اتریں؟ اور تو اور' ہم ان پروپیگنڈہ کرنے والے حاملان دین متین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ ان شرائط پر پورے اترتے ہیں؟ ان قوانین کا یہ بنیادی سقم ہے جس کی وجہ سے صدر مملکت نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ ان جرائم کے اثبات کے لئے جو شرطیں رکھی گئی ہیں ان کی رو سے شائد فی ہزار ایک مجرم کو بھی سزا نہ مل سکے"۔ واضح رہے کہ ان قوانین میں نہ تو گواہوں کی تعداد کم ہوسکتی ہے اور نہ ہی قرائنی شہادت یا سائنٹیفک پروف قابل قبول۔

(ا) جرم زنا

جرم زنا کے اثبات کے لئے شرائط یہ ہیں کہ:

۱۔ مجرم خود اقبال جرم کرے۔

۲۔ چار مسلم' بالغ گواہ جو "تزکیتہ الشہود" کی شرط پر پورا اتریں' اس امر کی گواہی دیں کہ انہوں نے زنا کے سلسلہ میں "عمل دخول" کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگر گواہوں کی تعداد چار سے کم ہو یا شہادت کی جزئیات

میں کسی قسم کا اختلاف پایا جائے تو جرم ثابت نہیں ہوسکے گا۔
جہاں تک اقبال جرم کا تعلق ہے، ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارے زمانے میں کوئی بھی ایسا مجرم نکلے جو اقبال جرم کرکے سنگسار ہونے یا سو کوڑے کھانے کے لئے اپنے آپ کو انتظامیہ کے حوالے کردے۔ باقی رہا چار عینی گواہوں کا سوال، سو ہم پوچھتے ہیں ارباب خرد و ہوش سے کہ کیا ایسا ممکن بھی ہے کہ اس عمل اختلاط ہی کو نہیں، عمل دخول کو پوری باریک بینی کے ساتھ ایک بھی نہیں، چار اشخاص نے دیکھا ہو۔ حیوانات میں تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جنسی اختلاط کے عمل میں کسی قسم کا حجاب نہیں رکھتے، لیکن انسانوں کی دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ، ناجائز عمل اختلاط تو ایک طرف، کوئی شخص اسے بھی گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کی اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط کی بھنک تک بھی کسی کے کان میں پڑ جائے۔ ان حالات میں فرمایئے کہ اس جرم کی پاداش میں شرعی سزا کس طرح دی جائے؟ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ عدالت کو چاہئے کہ زنا کے کسی مقدمہ میں، وہ ان پروپیگنڈہ کرنے والے مفتیان عظام سے کہے کہ وہ چار چشم دید گواہ تلاش کرکے عدالت میں پیش کردیں۔ اس طرح انہیں ان کے پروپیگنڈے کا جواب خود بخود مل جائے گا۔

(۲) قذف: یعنی کسی کے خلاف زنا کی تہمت لگانا

زنا کی تہمت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ جس شخص کے خلاف تہمت لگائی جا رہی ہے اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ اور زنا کے جرم کے ثبوت کے لئے جو شرائط اوپر بیان کی گئی ہیں ان کی رو سے یہ جرم ثابت ہی نہیں ہوسکے گا۔ اس سے تہمت لگانے والا جھوٹا ثابت ہوگا اور اسے اسی کوڑوں کی سزا ملے گی۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں کوئی شخص بھی اس کی جرات کرے گا کہ کسی کے خلاف زنا کی تہمت لگائے خواہ اس کے لئے اس کے پاس قرائن کی کتنی شہادات بھی موجود کیوں نہ ہوں۔ اس کی ایک بین مثال پر غور کیجئے۔ کسی شریف عورت کے ساتھ کسی بدمعاش نے زنا بالجبر کا ارتکاب کیا اور اس مظلومہ نے اس ظالم کے خلاف مقدمہ دائر کردیا۔ ظاہر ہے کہ وہ جرم زنا کی شرائط کی رو سے اس ظالم کے خلاف اس جرم کو ثابت نہیں کرسکے گی اور جب وہ اسے ثابت نہیں کرسکے گی تو وہ جرم قذف (جھوٹی تہمت لگانے کے جرم) کی مجرم قرار پا جائے گی جس کی سزا اسی کوڑے ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کوئی عفت مآب خاتون اس ظالم کے خلاف ایک لفظ تک زبان پر لانے کی بھی جرات نہیں کرسکے گی کیونکہ اس کے خلاف ایسا کہنا بھی تو قذف کے زمرے میں جائے گا۔
ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ان حضرات کے اس شرعی قانون کی رو سے نہ صرف زنا بالرضا بلکہ زنا بالجبر کے بھی پھاٹک کھل جاتے ہیں۔

(۳) سرقہ (چوری)

جرم سرقہ کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ:
۱۔ مال حرز کے اندر سے چرایا گیا ہو۔ حرز سے مراد ہے کوئی مکان یا کوئی الماری یا بکس جو کسی شخص کے قبضہ میں

ہو۔ جو مال حرز کے اندر نہ ہو اس کی چوری مستوجب حد نہیں ہوسکتی' مثلاً" تار یا ٹیلیفون کی تاریں' ریلوے کی پٹڑیاں' پلیٹ فارموں پر پڑا ہوا مال یا کھلے میدانوں میں رکھا ہوا ساز و سامان وغیرہ۔ اس قسم کے مال کی چوری "حد" کے اندر نہیں آتی۔

۲ - وہ مال مسروقہ نہ ہو۔

۳ - وہ مال جو (SURREPTITIOUSLY) چرایا گیا ہو۔ اس شرط کا مفہوم کچھ عجیب سا ہے جسے شاید ہم اچھی طرح سمجھ نہیں سکے۔ اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ چور کو اس کا یقین ہو کہ جس کا مال چرایا جارہا ہے اسے اس سرقہ کا علم نہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر یہ واردات دن کے وقت کی جائے جس میں طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے اور غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد تک کا وقت شامل ہے تو واردات کا اس عرصے میں مکمل ہونا ضروری ہے۔

۴ - نصاب ---- مال مسروقہ کی قیمت (۴.۴۵۷) گرام سونے کی قیمت کے برابر ہو۔ اگر ایک چور چوری کی بیس وارداتیں کرتا ہے لیکن ہر واردات میں مال مسروقہ کی قیمت نصاب سے کم ہے تو وہ سرقہ کے جرم کا مرتکب قرار نہیں پائے گا' خواہ مجموعی طور پر اس مال کی قیمت کتنی ہی ہو۔

۵ - اس کے لئے دو مسلمان چشم دید گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ گواہوں میں وہ شخص شامل نہیں ہوگا جس کا مال چرایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ "چوری" کی واردات کے لئے بھی چشم دید گواہی کی شرط رکھی گئی ہے۔

۶ - اگر مجرم اور مستغیث باہمی رشتہ دار ہوں تو بھی حد کی سزا نہ دی جاسکے گی' مثلاً" میاں بیوی (۲) ماں باپ ---- اوپر اور نیچے تک (۳) ماں یا باپ کے بھائی بہن یا ان کے بچوں کے بھائی بہن (۴) مہمان (۵) ملازم یا کارندے۔

۷ - اکراہ یا اضطراری حالات میں چوری۔ اکراہ کے معنے یہ ہیں کہ کسی نے اس سے زبردستی واردات کرادی اور اضطرار کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو بھوک یا پیاس کی وجہ سے موت کا خطرہ لاحق ہو۔

یہ ہیں وہ شرائط جن کے پورا ہونے سے سرقہ کا جرم حد کا مستوجب ہوسکتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ہمارے ہاں کتنی وارداتیں ہوں گی جن میں اثبات جرم کی یہ شرائط پوری ہوسکیں گی؟

(۴) شراب نوشی

اس جرم کے اثبات کے لئے دو مسلمان گواہوں کی ضرورت ہوگی جو تزکیۃ الشہود کی شرائط پوری کریں۔

---------------- ○ ----------------

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ شرائط جن کے پورا ہونے سے یہ وارداتیں ان جرائم کے زمرے میں آسکتی ہیں، جن کی "شرعی حد" ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں ملک کے ارباب علم و بصیرت سے کہ ان شرائط کی رو سے ایک آدھ کو

چھوڑ کر کوئی واردات بھی ایسی ہوسکتی ہے جس میں جرم ثابت ہو جائے؟ لہٰذا' اگر ان قوانین کی رو سے کسی مجرم کو حد کی سزا نہیں دی گئی تو اس میں پولیس کی کون سی سازش ہے اور عدلیہ کا کون سا قصور؟ یہ غنیمت ہے کہ متعلقہ آرڈیننس میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اگر جرم' حد کی سزا کا مستوجب نہ قرار پاسکتا ہو تو پاکستان کے ضابطہ فوجداری کے تحت اس کا فیصلہ کردیا جائے۔ یہ وجہ ہے کہ پولیس اس قسم کی وارداتوں کا چالان بھی ضابطہ فوجداری کے تحت کرتی ہے اور عدالت اس کی سزا بھی اسی ضابطہ کے مطابق دیتی ہے۔ اگر آرڈیننس میں یہ گنجائش نہ رکھی جاتی تو کسی مجرم کو کسی قسم کی سزا نہ مل سکتی۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اسے بھی اپنے پروپیگنڈے کا حصہ بنا رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پولیس جان بوجھ کر (بلکہ رشوت لے کر) وارداتوں کا چالان ضابطہ فوجداری کے تحت کرتی ہے کیونکہ اس سے سزا کم ملتی ہے۔ ان حضرات کا مطالبہ یہ ہے کہ ضابطہ فوجداری کی متعلقہ دفعات کو منسوخ کردینا چاہئے اور جو عدالتیں ان دفعات کے تحت مقدمات کی سماعت کرتی ہیں' ان عدالتوں کو بند کردینا چاہئے۔

تجویز نہایت "معقول" ہے۔ مجرمین کو ضابطہ فوجداری کے تحت سزائیں نہیں مل سکیں گی اور شرعی حدود کی شرائط پوری نہیں ہوسکیں گی تو ملک میں وارداتوں کے پھاٹک کھل جائیں گے اور مجرم "قانون شریعت زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے دندناتے پھریں گے۔

اس ضمن میں ہم دل کے پورے سوز و گداز کے ساتھ ایک سوال سامنے لانا چاہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ قوانین ناممکن العمل بھی ہیں اور بعض جزئیات میں (معاف بفرمائید) اسلام کے لئے باعث تضحیک بھی۔ یہ قوانین فقہ حنفی پر مشتمل ہیں اس لئے اس فقہ کے ماننے والوں کی مجبوری قابل فہم ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ فقہی قوانین میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوچکا ہے۔

لیکن ان قوانین کا مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل میں زیر بحث آیا۔ اس کے تمام کے تمام ارکان تو قدامت پرست نہیں۔ پھر یہ وفاقی حکومت کی وزارت امور مذہبیہ کے بھی زیر غور آیا ہوگا۔ وہ وزارت بھی مولانا حضرات پر مشتمل نہیں۔ اس کے بعد یہ وزارت قانون میں زیر بحث آیا ہوگا۔ وہ وزارت تو بہر حال قانون دان حضرات پر مشتمل ہے۔ پھر یہ کابینہ میں بھی زیر غور آیا ہوگا۔ یہ کہنا تو ہمارے نزدیک ان حضرات کی عقل و بصیرت کی توہین ہے کہ وہ اتنا سا فہم و شعور بھی نہیں رکھتے کہ وہ ان قوانین کے اسقام کو سمجھ نہ سکے ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے ایسے قوانین کو کس طرح نافذ کردیا' اس کا جواب وہی حضرات دے سکتے ہیں۔

ان کا جواب کچھ بھی ہو' اس سے ہمارے علماء کرام کا حربہ ضرور کامیاب ہوگیا۔انہوں نے پہلے اس قسم کے ناممکن العمل قوانین نافذ کرادیئے اور پھر یہ پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ ان پر عمل نہیں کرایا جا رہا۔ اس سے خود تو عوام کی نظروں میں اسلام کے سب سے بڑے مجاہد بن گئے اور انتظامیہ' عدلیہ' بلکہ خود حکومت کے متعلق مشہور کردیا کہ یہ اسلام کو رائج ہی نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے پروپیگنڈے کا سیدھا سا جواب یہ تھا کہ یہ قوانین ایسے ہیں ہی نہیں جن

پر عمل کیا جاسکے لیکن ارباب اقتدار یہ جواب بھی نہیں دے سکتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کہنے سے پبلک کی طرف سے پوچھا جائے گا کہ اگر یہ قوانین ایسے ہی ناممکن العمل تھے' تو آپ نے انہیں نافذ کیوں کیا؟

یہ ادنیٰ سی مثال ہے اس تذبذب اور خلفشار کی جس کا شکار وہ ملک ہوتا ہے جس میں مذہبی پیشوائیت کا اثر غالب ہو- اس کے بعد اب سوچئے کہ اگر (خدانکردہ) کہیں اقتدار بلاواسطہ ان لوگوں کے ہاتھ آجائے تو انسانیت کا حشر کیا ہوگا؟ یہ وجہ تھی جو بانیان پاکستان (علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ) بار بار اعلان کرتے تھے کہ کچھ بھی ہو' پاکستان میں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دی جائے گی-

کار ملا فی سبیل اللہ فساد

تو اس کے پیش نظریہی حقیقت تھی- (اکتوبر ۱۹۷۹ء)

---------------○---------------

۱۷- چور کا کٹا ہوا ہاتھ کس کی ملکیت ہوگا؟

ملک میں شرعی قوانین کے نفاذ کے بعد' ان کے تضمنات کے طور پر' کس قسم کے مسائل پیدا ہوں گے' اس کا اندازہ اس بحث سے لگایئے جو ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن اور مفتی محمد حسین نعیمی صاحب کے مابین شروع ہوئی ہے- واضح رہے کہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب ادارۂ تحقیقات اسلامی کے مشیر قانون ہیں اور مفتی نعیمی صاحب اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن- یعنی دونوں کا تعلق اس ادارے سے ہے جہاں قوانین شریعت مدون ہوتے ہیں- اس بحث کے سلسلے میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب نے اپنے ایک بیان میں فرمایا:

> پچھلے دنوں چور کے ہاتھ کی ملکیت کے مسئلہ پر اسلام آباد کے ایک جلسہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ریٹائرڈ جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب سے ایک شخص نے حد سرقہ میں قطع ید کے بارے میں استفسار کیا کہ آخر وہ قطع شدہ ہاتھ کس کی ملکیت ہوگا اور کیا وہ چور کو واپس مل جائے گا............ اور کیا وہ اس کٹے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ جڑوا سکتا ہے؟ موصوف اس مسئلہ پر کوئی جواب نہ دے سکے اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جب تک کسی دینی مسئلہ میں صحیح اور اطمینان بخش معلومات نہ ہوں' لب کشائی نہ کی جائے- بہر کیف' اسلامی کونسل کے ایک رکن مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب نے چند روز ہوئے نمائندہ جنگ کو بتایا کہ وہ ہاتھ اس چور کی ملکیت ہوگا اور اس کو واپس کیا جائے گا اور وہ اس کو دوبارہ جڑوا سکتا ہے......... اس ناچیز کی رائے میں مفتی صاحب کا یہ ارشاد درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ حد دراصل ایک سزائے محرومی ہے' یعنی چور کو اس ہاتھ سے محروم کردینا ہے جس ہاتھ نے (مروجاً"

اور معروفاً") چوری کی۔ اب وہ ہاتھ اس کی ملکیت نہ رہے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس رائے کی تائید میں فقہ اور احادیث کے حوالے دیئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون روزنامہ جنگ (کراچی) بابت ۱۱ مارچ ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس سے اگلے ہی دن (یعنی ۱۲ مارچ کو) اسی اخبار میں مفتی صاحب نے اپنی رائے کی تائید میں تفصیلی بیان شائع کیا اور کہا کہ:

> جب چور پر حد واجب ہو اور اس کا ہاتھ کاٹ لیا جائے تو اس سے قرآنی حکم مکمل ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن حکیم میں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے اور حکم تکرار نہیں چاہتا۔ بلکہ ایک مرتبہ کے عمل سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے اور منشا پورا ہو جاتا ہے۔ تاہم فقہا نے ہاتھ کاٹنے کے بعد اس کو داغنے کی تجویز بیان کی ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ زیادہ خون بہنے سے اس کی موت واقع نہ ہو۔

اس قسم کے ہیں وہ مسائل جو شرعی قوانین کے عواقب میں پیدا ہوں گے اور اس قسم کی ہوں گی وہ بحثیں جو اس ضمن میں اٹھیں گی۔ (مئی ۱۹۷۹ء)

تیسرا باب

علماء کی باہمی سرپھٹول

۱۔ مقلدین اور غیر مقلدین کے جھگڑے

ماہنامہ "محدث" (لاہور) کی شوال المکرم ۱۳۹۶ھ کی اشاعت میں، پروفیسر محمد سلیمان اظہر، ایم۔ اے، کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کے شروع میں لکھا گیا ہے :-

ان دنوں بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ناخوشگوار بحث چل نکلی ہے کہ وہابی (نجدی) یا اہل حدیث کی اقتداء میں حنفی خصوصاً" بریلوی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں۔ حرمین شریفین کے عالی قدر اماموں کی پاکستان میں آمد اور عوام کی طرف سے ان کی بے پناہ پذیرائی سے بوکھلا کر ہمارے کرم فرماؤں نے یہ بحث شروع کر رکھی ہے اور فتویٰ بازی کا بازار گرم ہے۔

برصغیر کے اہل حدیث حضرات کے لئے یہ بحث کوئی نئی نہیں ہے۔ جب بھی حضرات مقلدین دلائل کی جنگ ہار جاتے ہیں تو پھر اسی قسم کی صورت حال پیدا کر کے اپنے مکتب فکر کی بقا کا سامان کیا جاتا ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا آیا ہے۔ اہل حدیث پر مساجد کے دروازے بند کرنے، ان کے مسجد میں آجانے پر مساجد دھلوانے، رفع الیدین و آمین بالجہر کہنے پر زد و کوب، ان کی لا مذہبیت کے فتوے، ان کے معاشرتی بائیکاٹ کی تحریکیں، ان کے قتل کے سامان اور عدالتوں میں ان کے خلاف مقدمات کا کھیل بہت پرانا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہم (مقلدین) سواد اعظم ہیں (جو سراسر غلط دعویٰ ہے)، اس لئے ان قلیل التعداد اہل حدیثوں کو دبا لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن ہوتا ہمیشہ ان کے برعکس رہا کم من فئة قليلة ۲/۲۴۹ اس نام نہاد سواد اعظم پر کتنی ہی بار فتح یاب ہوا ہے، خواہ وہ تحریر و تقریر کا میدان ہو یا عدالتی کاروائیوں کا سلسلہ ہو۔

برصغیر پاک و ہند میں جب مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے وہ مشہور اشتہار شائع کیا جس میں مقلدین سے دس (۱۰) سوال کئے گئے تھے تو ان کے جواب سے عاجز

آکر حضرات مقلدین نے ہلڑ بازی شروع کردی (یہ ۱۸۷۷ء کے گرد و پیش کی بات ہے)۔ مساجد میں عاملین سنت کا داخلہ بند کیا گیا' ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے کو ناجائز کہا۔ جن مساجد میں اہل حدیث امام و خطیب تھے' انہیں نکالنے کی کوشش کی گئی۔ غرض ملک ایک عجیب ہنگامے کی نذر ہوگیا۔ کہیں مساجد دھلوائی جارہی ہیں' اس لئے کہ عاملین سنت کے قدم اس میں پڑ گئے ہیں۔ کہیں مار پیٹ ہو رہی ہے اس لئے کہ آمین و رفع الیدین کی سنت کیوں ادا کی جا رہی ہے۔ کہیں عدالتوں میں مقدمات دائر ہیں کہ امام طریق سنت کے مطابق نماز کیوں پڑھاتا ہے۔ اسے برطرف کیا جائے۔

ایسا ہی ایک مقدمہ جو پریوی کونسل تک پہنچا' ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ مقدمہ منصف' سب جج' ہائی کورٹ اور پھر پریوی کونسل لندن میں سماعت ہوا۔ مقدمے کی بنا یہ تھی کہ امام مسجد اہل حدیث ہوگیا ہے۔ اب وہ آمین اور رفع الیدین کا عامل ہے۔ مسجد احناف کی چلی آرہی ہے۔ امام کے اس فعل سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے امام کو امامت سے برطرف کیا جائے۔ ہماری اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

اس کے بعد' قریب بارہ صفحات میں اس مقدمہ کی تفاصیل درج کی گئی ہیں' جس کا فیصلہ پریوی کونسل نے اہل حدیث کے حق میں دے دیا تھا۔ اس کے بعد لکھا ہے :۔

قارئین کرام! یہ طویل فیصلہ جو برٹش ایمپائر کی سب سے بڑی عدالت سے بنگال ہائی کورٹ کے انگریز ججوں کے فیصلے کے خلاف صادر ہوا' بغور ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ اہل حدیث کو اہل سنت قرار دیا گیا ہے۔ اہل حدیث کی اقتداء میں مقلدین کے دلائل سننے کے بعد مقلدین کی نماز کو درست قرار دیا گیا ہے۔ ہم اپنے ان کرمِ فرماؤں سے پوچھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ اپنے تازہ موقف میں سچے ہیں تو پریوی کونسل میں پیش ہو کر یہ موقف کیوں نہ پیش کیا۔ وہاں سے بھاگ کیوں گئے تھے۔ آخر وہ نئے دلائل کون سے ہیں جو اس فیصلے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھ آئے ہیں۔ وہ دلائل لے کر یہ کسی عدالت میں کیوں نہیں جاتے اور پریوی کونسل کا یہ فیصلہ کالعدم کیوں نہیں کرواتے۔ عوام کالانعام کو ایسی باتوں سے بے خبر رکھ کر کیوں غلط راستے کی طرف ہانک رہے ہیں۔ حقائق کو پس پشت ڈال کر تعصب اور ہٹ دھری سے کیوں اپنی عاقبت خراب کی جارہی ہے۔ حرمین کے ائمہ اور عاملین سنت کو کیوں مورد طعن بنایا جا رہا ہے۔ ہم آئندہ نشست میں علمائے احناف کے دو فتوے آپ کے سامنے پیش کریں گے اور بتائیں گے کہ جن امور کے باعث آج مقلدین حضرات اہل حدیث کو مطعون کرتے

ہیں' جب آج سے ۹۰ سال قبل انہی امور پر بحث و نظر کا سلسلہ شروع ہوا تھا تو علمائے
احناف نے کس طرح اہل حدیث کے مسلک حق کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔

غور فرمایئے کہ اتباع و خلاف سنت جیسے مسئلہ میں کفار کی عدالت عالیہ کے فیصلہ کو کس فخر و مسرت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے! دوسرے یہ کہ ایک فرعی مسئلہ میں ان حضرات کی شدت کا یہ عالم ہے' اور اس کے باوجود' دعویٰ یہ کہ یہ مکاتب فکر ہیں فرقے نہیں۔

اور سب سے دلچسپ یہ کہ مقالہ ختم ہوجانے کے بعد' (غالباً) ادارہ کی طرف سے جلی حروف میں لکھا ہے:۔

امت ایک غیر منقسم وحدت ہے جسے فرقہ بندی اور انتشار سے محفوظ رکھنا سب کا
اولین فریضہ ہے۔

اور امت کو فرقہ بندی اور انتشار سے محفوظ رکھنے کا طریقہ وہ ہے جسے مقالہ میں بیان کیا گیا ہے! یا للعجب! (جنوری ۱۹۷۷ء)

۲۔ اہل حدیث اور فقہ حنفی

مسلک اہل حدیث کے ترجمان' ہفت روزہ معاصر الاعتصام کی ۲۷ جنوری ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں' مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

مولانا مفتی محمود صاحب کا ایک بیان روزنامہ "جسارت" ۱۰ جنوری ۱۹۷۸ء میں پڑھ کر
میری حیرت کی حد نہ رہی۔

حیراں ہوں' دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں؟

مفتی صاحب فرماتے ہیں' "پاکستان میں حنفی مسلک کو بطور متن نافذ کردیا جائے اور اگر کوئی معاملہ حل نہ ہو تو پھر کسی اور مسلک سے مدد لی جائے۔ اسلام ترقی کا دین ہے"۔
حنفیوں کو حنفی مسلک چاہئے' شافعیوں کو شافعی مسلک' مالکیوں کو مالکی مسلک' حنبلیوں کو حنبلی مسلک' بریلویوں کو بریلوی مسلک مطلوب ہے۔ میں مفتی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ (صلعم) نے تیرہ سال مکہ مکرمہ میں لرزہ خیز مصائب جھیل کر اور دس برس مدینہ منورہ میں ہزاروں جانوں کی قربانی دے کر جو مذہب صحابہؓ اور قیامت تک کے مسلمانوں کو دیا تھا' وہ کیا تھا' اور اس کا نام کیا ہے..... حنفی مذہب کا نام رسول اللہ کے اسلامی نظام سے چار سو سال بعد ظہور پذیر ہوا۔ حنفی مذہب کا نام نہ صحابہؓ نے سنا نہ تابعینؒ نے نہ تبع تابعینؒ نے سنا۔ سلف صالحین کے نیک زمانوں میں

حنفی مذہب کا نام و نشان نہ تھا۔

(اور ہل حدیث کا بھی تو نام نہ تھا۔ اس زمانے میں کسی فرقے کا بھی نام نہیں تھا۔ طلوع اسلام) (مارچ ۱۹۷۸ء)

۴۔ ہم تو حرمین الشریفین کے امام کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے!

بریلوی فرقہ کے راہ نما اور جمعیت العلماء پاکستان کے صدر، مولانا شاہ احمد نورانی کی ایک تقریر کا حسب ذیل اقتباس غور طلب ہے۔ اسے ہم، ہمعصر ایشیا (بابت ۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء) کے حوالہ سے نقل کر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

> ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں اور مولانا عبدالستار نیازی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب یہ ابھی تین چار روز پہلے (۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء جمعرات) کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لئے گئے تاکہ دارالعلوم اور ایک مسجد کا سنگ بنیاد ان سے رکھوایا جائے۔ تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں، انہوں نے یہ فرمایا، میں نے سنا ہے آپ بڑے وسیع القلب ہیں۔ آپ میں بڑی رواداری ہے۔ آپ میں بڑی فراخدلی ہے۔ اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخدلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سالہ میں تھے، قید کے ان لمحات میں رواداری و وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلاں صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ میں سنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہوگئی تو میں نے جواباً" عرض کیا، جنرل صاحب بڑا افسوس ہے۔ آپ کو غلط اطلاعات دی گئیں۔ ہم میں الحمد للہ بڑی وسعت قلبی ہے لیکن گستاخ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہیں۔ ہم میں رواداری ہے لیکن حضورؐ پر نور کی شان میں تنقیص کرنے والے کے لئے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہل سنت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کا لکھا ہوا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتاویٰ موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے۔ ہم الحمد للہ! اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ہو خواہ ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہو، ملتان کا ہو، اچھرہ کا ہو، کسی شاتم رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اور میں نے کہا، جناب والا! یہ چار چار ٹکے کے لوگ ہیں، ہم تو حرمین شریفین کے نجدی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ یہ ملا جو چار چار ٹکے کے ہیں، ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یہ اطلاع غلط ملی ہے۔ آپ مطمئن رہیں، ہمارے
مسلک میں ایسی رواداری، فراخدلی اور وسعت قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاتم
رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہ آج ہے نہ آئندہ ہوگی۔ اور اس کے لئے لوگ بہت سی
باتیں کہتے ہوں گے۔ قومی اسمبلی میں بھی اذان ہوتی تھی۔ علامہ ازہری موجود ہیں۔
ان لوگوں کا رخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رخ ان سے دوسری طرف۔ اس کے
دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں، بے شمار لوگ ہیں۔

نورانی صاحب کو ان کا عقیدہ مبارک! لیکن ہم ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ جن "گستاخان رسولؐ" اور "شاتمان رسولؐ" کے پیچھے نماز پڑھنا آپ حرام سمجھتے ہیں، انہی کے ساتھ مل کر "نظام مصطفیٰؐ" قائم کرنے کی کوششیں آپ کے نزدیک کس طرح جائز قرار پاسکتی ہیں؟ کیا دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ "شاتمان رسولؐ" نے نظام مصطفیٰؐ قائم کیا ہو؟ اور اگر یہ نظام قائم ہوگیا تو اس کی شکل کیا ہوگی؟ اس میں آپ اکیلے ہوں گے اور اکثریت انہی "شاتمان رسولؐ" کی ہوگی! کیا نظام مصطفیٰؐ ایسا ہی ہوتا ہے؟ (فروری ۱۹۷۸ء)

---------------- ○ ----------------

۴۔ تبلیغی جماعت اور حنفیوں میں سر پھٹول

ہم نے اس سے پہلے ایک بار لکھا تھا کہ انگلستان میں بریلویوں اور دیو بندیوں کے جھگڑے اور فسادات کیا شدت اختیار کر رہے ہیں .... (طلوع اسلام جنوری ۱۹۷۶ء).... اب وہاں "جمعیت تبلیغ اسلام" اور حنفیوں میں فسادات شروع ہوگئے ہیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل خبر قابل توجہ ہے جسے ہم، ہمعصر المنبر (لائل پور) کی اشاعت بابت ۱۴ ـــــ ۲۱ جنوری ۱۹۷۷ء کے حوالے سے درج کرتے ہیں:

بریڈ فورڈ (نمائندہ جنگ) : بریڈ فورڈ کے مجسٹریٹ نے آج "جمعیت تبلیغ اسلام" کے
جلسہ میں چاقو زنی کے الزام میں گرفتار...... کو ضمانت پر رہا کرنے کی درخواست مسترد
کردی ہے اور انہیں ہفتہ کے لئے پولیس کی تحویل میں دینے کا حکم دیا ہے۔

..............اور .... کو گزشتہ اتوار کو گرین لین اسکول میں مرکزی جمعیت
تبلیغ الاسلام کے جلسہ میں جمعیت اور مسجد حنفیہ کے حامیوں کے درمیان مسجد کی تعمیر
کے جھگڑے پر گرفتار کیا گیا تھا جس میں چاقو اور کرسیاں چل گئی تھیں جس سے پانچ
افراد زخمی ہوگئے تھے۔

اس جلسہ میں (جو جمعیت تبلیغ الاسلام کی مذہبی خدمات کا جائزہ لینے کے لئے بلایا
گیا تھا) ایک قرارداد پیش کی گئی کہ:

بریڈ فورڈ کونسل نے ایک مسجد تعمیر کرنے کے لئے جو زمین مسجد حنفیہ کو دینے کا وعدہ کیا ہے، اس کی اصل حق دار "جمعیت تبلیغ الاسلام" ہے۔

اس قرارداد میں بریڈ فورڈ کے پاکستانی کونسلیٹ پر چند الزامات عائد کئے گئے تھے جس پر ہنگامہ ہوگیا اور چاقو اور چھریاں چل گئیں (۲۴- نومبر۷۶ء)۔ اور یہ ہے اس خبر پر ہفتہ وار "آزاد" لندن کا تبصرہ:

بریڈ فورڈ (نمائندہ آزاد): یہ بات انتہائی دکھ، کرب اور افسوس کے ساتھ محسوس کی گئی ہے کہ بریڈ فورڈ جو پر امن پاکستانیوں کا گڑھ ہے وہاں گرین لین اسکول میں مسجد حنفیہ اور تبلیغ الاسلام کے حامیوں کے درمیان تشدد اور مار کٹائی تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ بات قابل مذمت ہے جبکہ دونوں تنظیمیں ایک ہی علاقے کے افراد پر مشتمل ہیں جو ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک قرآن پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی جانب سے تشدد کے ایسے گھٹیا مظاہرے سے نہ صرف پاکستان اور پاکستانیوں کے وقار کو نقصان پہنچا ہے بلکہ اسلام کے بارے میں غیر مسلمانوں کے نظریات بھی متزلزل ہوئے ہیں۔

ایک مذہبی تقریب جس کے شرکاء دین مبین اور اسلام کی سربلندی کے نام لیوا ہیں، وہاں کرسیوں اور چاقوؤں سے ایک دوسرے کو گھائل کرنے کا کھیل کھیلا جائے تو اسلام کی عظمت اور تقدس کو پامال کرنے کے مترادف ہے جبکہ اسلام صلح جوئی، امن، رواداری، ہمدردی اور تعاون کا درس دیتا ہے۔

ہنگامے کو فرو کرنے کے لئے پولیس آئی، گرفتاریاں ہوئیں۔ اس سانحہ سے پاکستانیوں کا سر ندامت سے جھک جانا چاہئے۔ بریڈ فورڈ کے پاکستانیوں کو اتحاد و یگانگت کی مثال قائم کر کے اپنی روایات کو زندہ رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن انتہائی دکھ اور کرب کے ساتھ کہنا پڑا ہے کہ

یہ ملت خرافات میں کھو گئی

بریڈ فورڈ کے گرین لین اسکول میں عموماً پاکستانیوں کی تقریبیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس افسوسناک واقعہ کے بعد اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ پاکستانیوں کو اپنی تقریبات کے انعقاد کے لئے یہ جگہ نہیں ملا کرے گی۔ (مارچ ۱۹۷۷ء)

۵- فرقہ اہلِ قرآن

فرقہ اہل قرآن کے ترجمان بلاغ القرآن کی نومبر- دسمبر۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، ایک سوال کے جواب میں کہا گیا

ہے کہ:

فرقہ بندوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے سے الگ مکتب فکر والوں کا نہ جنازہ پڑھتے ہیں اور نہ اپنی لڑکیوں کے رشتے دیتے ہیں (ص ۳۰)۔

بلاغ القرآن نے قصداً" یہ نہیں لکھا کہ "نہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر نماز پڑھتے ہیں"" کیونکہ اس کی زد' اور شدید ترین زد' خود ان پر پڑتی تھی جو حرم کعبہ میں بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے----

انہوں نے باقی مسلمانوں سے الگ ایک نئی نماز وضع کر رکھی ہے اور دعویٰ یہ ہے کہ یہ خدا کی متعین فرمودہ (قرآنی) نماز ہے۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہو سکتا ہے۔ (جنوری ۱۹۷۷ء)

--------------- ○ ---------------

۶- مذہب میں مصلحت بینی

(دیو بندیوں کے خلاف اہل حدیث کا اعتراض)

سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے دینی امور میں لچک روا رکھنے کے سلسلہ میں جماعت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام' (لاہور) کی ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع شدہ حسب ذیل شذرہ' دل چسپی سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کا عنوان ہے "سیاسی علماء سے"۔ شذرہ ملاحظہ فرمایئے:

سیاسی علماء کے متعلق ہم نے پہلے بھی بعض اہم موقعوں پر لکھا ہے کہ سیاسی اغراض کے لئے دینی عقائد و معاملات میں لچک اور مداہنت روا رکھنا سخت نقصان دہ ہے۔ اس سے جہاں علمائے حق کا کردار داغدار ہوتا ہے اور اس تاریخ پر حرف آتا ہے جو علمائے حق نے نازک سے نازک حالات میں بھی حق کا علم بلند کر کے اپنے خون جگر سے رقم کی ہے' وہاں دوسری طرف اہل زیغ کے مسلک ضلال کے لئے "سہارا" مہیا ہو جاتا ہے۔

سیاسی معاملات میں زیادہ سے زیادہ ہمنوائی اور اشتراک فکر و عمل کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں' بلکہ بعض حالات میں یہ ناگزیر ہو جاتا ہے جس طرح کہ جنوری ۷۷ء سے اب تک کے حالات اس کے متقاضی رہے اور ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دینی معاملات میں بھی ہم اس کا مظاہرہ کریں اور ایک شخص جس بات کو یکسر غلط سمجھتا آرہا ہو' سیاسی اشتراک کی وجہ سے' وہ اس غلط بات کو کرنے میں بھی کوئی شرعی قباحت محسوس نہ کرے۔

اس تمہید کی ضرورت مولانا مفتی محمود صاحب صدر' پاکستان قومی اتحاد اور مولانا

عبیداللہ انور کے اس طرز عمل سے محسوس ہوئی ہے کہ ان ہر دو حضرات نے خواجہ علی ہجویریؒ کی قبر پر آستانہ بوسی کا "شرف" حاصل کیا ہے۔ حالانکہ بزرگان دین کی قبروں پر اس طرح کی حاضری ان کے مسلک و عقیدے کی رو سے غلط ہے بلکہ موخر الذکر مولانا کے مرحوم والد مولانا احمد علی صاحب تو حضرت علی ہجویریؒ کی موجودہ قبر کو ہی مصنوعی بتاتے تھے اور اول الذکر نے (اخباری اطلاع کے مطابق) قبر پر "دستار بندی" کا شغل فرمایا اور حلوہ تقسیم کیا جو غالباً چڑھاوا ہونے کی وجہ سے اہل بہ لغیر اللہ کے ضمن میں آتا ہے۔

بہرحال، ہم علمائے دیوبند کے اس طرز عمل کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ اس سے شرک و بدعت کو تقویت پہنچتی ہے اور اس توحید کو نقصان پہنچتا ہے جس کی تبلیغ و تلقین علمائے حق کرتے آئے ہیں اور مذکورہ دیوبندی علماء بھی اپنے آپ کو انہی علماء کے سلسلے کی کڑی سمجھتے ہیں۔ (جنوری ۱۹۷۸ء)

---○---

۷ - غریب مسلمان کی میّت

(مولوی صاحبان کی پیشہ ورانہ ذہنیت)

ذیل کی خبر پڑھیے اور خون کے آنسو روئیے۔

دولت گیٹ (ملتان) میں ایک مسلمان خاکروب کی میت صرف اس وجہ سے ۲۴ گھنٹے تک رکھی رہی کہ میت کو غسل دینے کے لئے جس مولوی کو بھی بلایا گیا، وہ نہ آیا۔ مرحوم کے ورثاء نے مردوں کو غسل دینے والے تمام لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ ہر مولوی نے آنے کا وعدہ کیا مگر رات گئے تک کوئی نہ آیا۔ مرحوم کا صبح آٹھ بجے انتقال ہوا اور بالآخر دس بجے رات کو ضلع مظفر گڑھ کے ایک مزدور کو پچاس روپے دے کر میت کو غسل دینے کے لئے لایا گیا اور تدفین عمل میں آئی۔

(امروز، ملتان، مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۷۶ء)

مذہب جب پیشہ بن جائے تو اس میں اس قسم کے واقعات نہ غیر متوقع ہوتے ہیں، نہ غیر معمولی۔ ہر پیشہ ور یہی دیکھتا ہے کہ مجھے اس کام کی اجرت کیا ملے گی۔ "غسل دینے کی اجرت" کا ایک حالیہ واقعہ خود ہمارا چشم دید ہے۔ میت کے مکان کے قریب ایک جامع مسجد ہے۔ وہاں کے غسال سے رابطہ قائم کیا تو اس نے سو روپیہ طلب فرمایا۔ کہا کہ کچھ کم کر دیجئے تو اس نے نہایت رعونت سے جواب دیا کہ کم پیسوں میں غسل دلانا ہو تو وہ سامنے چھوٹی مسجد ہے وہاں کے

مولوی صاحب کو بلا لیجئے۔ چنانچہ چھوٹی مسجد کے مولوی صاحب پچاس روپے پر رضا مند ہو گئے۔ وہ غسل بھی دیتے جاتے تھے اور بڑی بڑی مساجد والوں کو ملاحیاں بھی سناتے جاتے۔

غسل تو میت کے تجہیز و تکفین کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہوتا ہے۔ اس کے بعد کفن کا مسئلہ آتا ہے' جس کے لئے "از روئے شریعت" اٹھارہ گز نئے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کفن سینے والے کی اجرت' جس کے نزدیک مشین سے کفن سینا مکروہ ہوتا ہے۔ اسے ہاتھ سے سیا جاتا ہے اس لئے اجرت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ازاں بعد گورکن اور ان کے بھائی بند' جنازہ پڑھانے والے مولوی صاحب' پھر قبر کے سرہانے' "اسقاط کرانے والے"' اس کے بعد' قل' جمعراتیں' چالیسواں' اور اگر میت کسی امیر آدمی کی ہے تو چالیس دن تک قبر پر "قرآن خوانی"—— ان تمام مراحل میں مولوی کی ضرورت لاینفک!

یہ سب کچھ "از روئے شریعت" اس لئے ضروری ہے کہ مولوی صاحبان کا ذریعہ معاش کوئی اور نہیں۔

اور اگر ملتان کے مولوی صاحبان اس لئے غسل دینے کے لئے نہیں آئے کہ میت مسلمان "خاکروب" کی تھی' تو اس ذہنیت پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ہماری یہی ذہنیت تھی جس کی وجہ سے پاکستان کے تمام خاکروب' عیسائیت کی آغوش میں چلے گئے۔ ہم انہیں "پنچ" ذات قرار دیتے رہے اور پادریوں نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا لیا۔

(جنوری ۱۹۷۷ء)

———————— ○ ————————

چوتھا باب

تحریک پاکستان اور علماء حضرات

(صرف دو ایک مثالیں)

۱۔ نیشنلسٹ علماء مسلم لیگ سے کیوں الگ ہوئے تھے!

(دین فروشی کی عبرت انگیز مثال)

ابو سعید انور صاحب' تحریک پاکستان کے عینی شاہدوں میں سے ہیں۔ وہ گاہے بگاہے اس تحریک سے متعلق اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ وہ ان کی "دید" ہوتی ہے نہ کہ "شنید" اس لئے ان کے پیش کردہ واقعات اکثر و بیشتر حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کے نوائے وقت (لاہور) میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "تحریک پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے بعض مسلمان جماعتوں کا کردار"۔ اس میں انہوں نے مختصر الفاظ میں نیشنلسٹ علماء' آزاد کانفرنس' احرار' بنگال کی کرشک پرجا پارٹی' پنجاب کی یونینسٹ پارٹی' خدائی خدمت گار اور جماعت اسلامی کے متعلق بتایا ہے کہ انہوں نے کس طرح اس تحریک کی مخالفت کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے جمیعت العلمائے ہند کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> یہ حضرات ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں ایک مرحلہ پر مسلم لیگ سے پورا تعاون کرنے کے لئے تیار ہوگئے' مگر پھر کانگرس کے طرفدار ہوگئے۔ یہ کیوں ہوا' اس کی تفصیل جمیعت علمائے ہند کے لئے تکلیف دہ ہوگی' اس لئے اس کا تذکرہ ضروری نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ محترم ابو سعید انور صاحب کی یہ "رعایت" اصول وقائع نگاری کے مطابق نہیں۔ ایک مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ لکھنے بیٹھے تو واقعات کو بے کم و کاست بیان کردے خواہ وہ کسی کے لئے تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہوں۔ نیشنلسٹ علماء مسلم لیگ سے کیوں الگ ہوئے تھے' اس کا علم کم از کم اہل پاکستان کو ضرور ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں محترم ایم۔ اے۔ ایچ اصفہانی اپنی کتاب (QUAID-E- AZAM M. ALI JINNAH AS I KNEW HIM) میں ۳۷-۱۹۳۶ء کے انتخابات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

> پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ میں ہماری قدیم روایت اور ہوس تقریر بازی کی کمزوری کے مطابق بہت سی تقاریر ہوئیں۔ اجلاس میں پہلے دن مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد

مدنی نے مسٹر جناح کی تائید کی اور ان کے اس اقدام کو خوش آمدید کہا کہ وہ مسلم لیگ کو زندہ تحریک کے میدان میں لے آئے ہیں۔ لیکن اجلاس کے آخری دن' ان بزرگوں میں سے ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ انتخابات لڑنے کے لئے لیگ کو وسیع پیمانے پر پروپیگنڈہ کرنا پڑے گا۔ دیو بند اپنی پروپیگنڈہ مشینری کو لیگ کی تفویض میں دینے کے لئے آمادہ ہے' بشرطیکہ اس کے جملہ اخراجات مسلم لیگ برداشت کرے۔ آغاز کار کے لئے اندازاً" پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا گیا لیکن لیگ کے خزانہ میں تو اس زمانہ میں پچاس پیسے بھی نہیں تھے۔ لیگ کا صدر اور اس کا سیکرٹری اعزازی طور پر خدمات سرانجام دیتے تھے۔ ان مولانا صاحبان کو لیگ کی مالی پوزیشن کا اچھی طرح علم تھا۔ جناح صاحب نے اس کی وضاحت کی تو مولانا حضرات مایوس ہوگئے اور لیگ سے نکل کر سیدھے کانگریس کی طرف چلے گئے اور اس کے حق میں پروپیگنڈہ شروع کردیا کیونکہ کانگریس نے ان کا مطالبہ پورا کردیا تھا۔ (ص ۴۲-۴۳)

اور اس کے بعد ان علماء حضرات نے فتووں پر فتوے شائع کرنے شروع کردیئے کہ تحریک پاکستان' اسلام کے خلاف ہے اور کانگریس کی حمایت خدا اور رسولؐ کے ارشاد کے عین مطابق۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کو تاریخ کے ریکارڈ پر ثبت رہنا چاہئے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ ان حضرات کے نزدیک دین کی قیمت کتنی ہوتی ہے۔

اور یہ تو صرف جمعیت العلماء کی نقاب کشائی ہے۔ کیا معلوم کہ تحریک پاکستان کی دیگر مسلم جماعتوں کے چہرے سے نقاب اٹھنے کے بعد کس کس قسم کے حقائق سامنے آئیں؟ (جنوری ۱۹۷۷ء)

۲۔ مفتی محمود صاحب اور نظریہ پاکستان

(قائداعظمؒ کو کافر اعظم کہا گیا)

قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود بھی اس معاصر (نوائے وقت) سے اپنے خصوصی انٹرویو میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ صوبائی خود مختاری میں مسلمانوں کا مفاد بہتر طور پر محفوظ سمجھتے تھے' اس لئے تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ (نوائے وقت' مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۷ء)

مفتی محمود صاحب نے' خان عبدالقیوم خان کے ایک الزام کے جواب میں کہا کہ:

میں نے نظریہ پاکستان کی مخالفت کی تھی---- لیکن قیام پاکستان کے بعد میں نے گزشتہ تیس سال میں پاکستان کی خدمت کی ہے۔

ملک میں سیاسی جدوجہد نظریات اسلام اور سوشلزم کی جدوجہد ہے........

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا ورنہ پاکستان کے قیام کی ضرورت کیا تھی!
(نوائے وقت' ۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء)

آپ لگے ہاتھوں اس خبر کو بھی نوٹ کر رکھئے جو تقسیم ہند سے پہلے' حیدر آباد (دکن) کے اخبار رہبر' دکن' کی ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔

مولانا حسین احمد صاحب نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیتے اور قائد اعظمؒ کو "کافر اعظم" کا لقب دیتے ہوئے حال ہی میں جو فتویٰ دیا تھا اس کا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیو بندی نے اپنے مکتوب میں جو دہلی کے ایک روزنامہ میں شائع ہوا' حسب ذیل جواب دیا ہے....... (ہم یہ جواب درج نہیں کر رہے)
(بحوالہ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ص ۱۰۱۲)

قارئین کو اتنا تو ضرور معلوم ہوگا کہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اس دارالعلوم' دیو بند کے شیخ الحدیث تھے جس سے مفتی محمود صاحب نے سند فضیلت حاصل کی تھی اور مولانا مدنی اس جمعیت العلماء ہند کے صدر بھی تھے جو نیشنلسٹ علماء کی نمائندہ جماعت تھی اور مفتی صاحب جس کے اہم رکن تھے۔ (جنوری ۱۹۷۸ء)

---------------- ○ ----------------

۳۔ مفتی محمود نے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا

جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے ملتان میں فرمایا:

قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے ابھی تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ اور وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ مملکت مستحکم ہو۔ مفتی صاحب نے تحریک نظام مصطفیٰؐ کو بھی بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ (پاکستان ٹائمز' مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۷۸ء)

(ستمبر ۱۹۷۸ء)

---------------- ○ ----------------

۴۔ پاکستان قائم کرنے کا گناہ

جمعیت علماء پاکستان کے سینئر نائب صدر' سید محمود شاہ گجراتی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ

مولانا مفتی محمود نے خود پی این اے کے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ وہ پاکستان کو قائم کرنے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ (روزنامہ مشرق' مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۷ء)

(فروری ۱۹۷۸ء)

پانچواں باب

اسلامی نظام و نظامِ مصطفیٰؐ

۱- نظامِ مصطفیٰؐ کی اصطلاح

نظامِ مصطفیٰؐ کی اصطلاح کے متعلق جو کچھ طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۷۸ء (ص۱۵) میں لکھا گیا تھا' اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لایئے۔ ہم نے کہا تھا:۔

> اس سلسلہ میں (ضمناً) ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں آج کل "نظامِ مصطفیٰؐ" کی اصطلاح رائج ہو رہی ہے۔ اگر اس سے مراد ہے دینِ خداوندی کا وہ عملی نظام ہے جسے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا' تو پھر اس میں اعتراض کی بات نہیں۔ لیکن اگر اس میں نظام کا لفظ خود دین کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے' تو قرآن کریم کی رو سے' یہ درست نہیں۔ قرآن کریم میں اسلام کو دین اللہ کہا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر' دین خدا کی طرف سے ملتا تھا جسے حضرات انبیاء کرامؑ دنیا میں رائج کرتے تھے۔ دین' خود کسی رسول کا وضع کردہ نہیں ہوتا تھا۔ مستشرقین نے اسلام کے لئے (MUHAMMADANISM) اور مسلمانوں کے لئے (MUHAMMADANS) کی اصطلاحات وضع کیں۔ چونکہ ان سے اسلام کے متعلق بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی تھی اس لئے انہیں کافی تگ و تاز کے بعد بدلوایا گیا۔ چونکہ "نظامِ مصطفیٰؐ" کی اصطلاح سے' اسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان ہے' اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بجائے دینِ خداوندی یا قرآنی نظام کہنا بہتر ہوگا۔

اب یہ دیکھئے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس باب میں کیا کہا جا رہا ہے۔ موقر جریدہ "الاعتصام" کی اشاعت بابت ۱۶ دسمبر ۱۹۷۷ء میں تحریر ہے:

> تفصیلات میں جانا اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ مقصد یہ گزارش کرنا ہے کہ سالہا سال کی اس طویل مدت میں "صحیح اسلامی حکومت کو قرآنی نظام" "اسلامی نظام" "نفاذ شریعت" "حکومت الٰہیہ" "خلافت الٰہیہ" "اللہ کا قانون" سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ پاکستان بنانے کے لئے جو نعرہ عوام کو دیا گیا تھا وہ بھی یہ تھا

"پاکستان کا مطلب کیا! لا الہ الا اللہ"

لیکن معلوم نہیں اس کا پس منظر کیا ہے کہ ان معروف اصطلاحوں کی بجائے اب کچھ عرصہ سے ایک نئی اصطلاح "نظام مصطفیٰ" مخصوص ذہن کے ایک طبقے نے چلا دی ہے جس کے متعلق خود یہ اعتراف اس کے موجد کر رہے ہیں کہ یہ ہماری ایجاد ہے۔ یہ درست ہے کہ ابھی چند ماہ قبل جب بھٹو ازم کے خلاف ملک گیر پیمانے پر تحریک چل رہی تھی تو پروپیگنڈے کے زور پر یہ اصطلاح خوب چلی اور اختلاف و نزاع سے بچنے کے لئے عوام و خواص میں اس کا عام استعمال ہوتا رہا۔ لیکن اب جبکہ حالات کچھ معمول پر آئے ہیں تو بعض وسیع المطالعہ اہل فکر نے اس پر غور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ ملک کے نامور قانون دان مسٹر اے کے بروہی نے کہا ہے کہ چونکہ "نظام مصطفیٰ" کی اصطلاح بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے اس لئے اس کی بجائے "نظام الٰہی" کہا جانا چاہیے۔ اس پر اس اصطلاح کے موجد اور ان کا حلقہ ارادت چیں بہ جبیں ہو رہا ہے اور اس کو غلط مفہوم پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بات یہ درست ہے اور سنجیدگی سے غور و فکر کی مستحق۔ "نظام مصطفیٰ" کی اصطلاح اس معنی میں درست سہی کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپؐ ہی اس کے پیامبرِ اول اور اولین داعی تھے۔ اس وجہ سے آپؐ کے لائے ہوئے نظام اسلام کو "نظام مصطفیٰ" کہا جاسکتا ہے۔ لیکن جب کوئی اصطلاح مبہم، ذو معنی اور غلط فہمی کا موجب بنتی نظر آتی ہو تو اس سے احتراز کا حکم ہے جیسا کہ صحابہؓ کو راعنا کہنے سے روک دیا گیا تھا، کیونکہ اس سے یہود غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ اس اصطلاح میں بھی خرابی کے پہلو ہیں۔ مثلاً غیر مسلم (مغربی اور عیسائی مستشرقین) اسے اپنے مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کریں گے۔ وہ اسلام کے متعلق ہمیشہ یہ تاثر دیتے آئے ہیں کہ یہ قرآن منزل من اللہ نہیں ہے۔ خود محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی (معاذ اللہ) تصنیف ہے اور یوں وہ اسلام کو دین الٰہی کے بجائے دین محمدیؐ اور آسمانی مذہب کے بجائے انسانی مذہب باور کراتے ہیں۔ اسی لئے وہ اسلام کو اسلام نہیں بلکہ محمڈن ازم لکھتے ہیں اور پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معنی میں بانی اسلام کہتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ بروہی صاحب کی رائے درست ہے۔ یہ اصطلاح واقعی دشمنان اسلام کے نقطہ نظر کے فروغ کا باعث بن سکتی ہے جو اس کو اپنے مخصوص اور مکروہ

پروپیگنڈے کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ بنا بریں، اسلام کے لئے اسلامی نظام، شریعت اسلامیہ اور خلافت اسلامیہ ہی موزوں تر نام ہیں۔ اور یہی اصطلاحات تحریر و تقریر میں استعمال ہونی چاہئیں، جیسا کہ مدتوں سے یہی اصطلاحات زبان زد خاص و عام چلی آرہی ہیں۔ (فروری ۱۹۷۸)

---○---

۲۔ اسلامی نظام میں رسولؐ اللہ کا مقام

(قانون سازی کا اہم سوال)

مارچ ۱۹۷۸ء میں، ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کا ایک انٹرویو، ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا۔ اس کا تعارف تو انٹرویو کہہ کر ہی کرایا گیا تھا لیکن وہ ایک مسلسل تقریر تھی۔ اس کا متن مختلف جرائد میں شائع ہوا۔ ہمارے سامنے اس کا وہ متن ہے جو خود مودودی (مرحوم) کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اپریل (۱۹۷۸ء) کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ لہٰذا، اس کے مستند ہونے میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس تقریر کے بعض نکات کے خلاف مختلف گوشوں سے اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔

اس تقریر کے موضوع کا نقطہ ماسکہ یہ تھا کہ اسلامی نظام حکومت میں خود رسولؐ اللہ کی پوزیشن کیا تھی۔ اس ضمن میں مودودی (مرحوم) نے کہا کہ:

> حضورؐ کا قاعدہ یہ تھا کہ جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملتا تھا اس میں تو آپ لوگوں سے بے چوں و چرا اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس میں کسی کے لئے کلام کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن جس معاملہ میں اوپر سے کوئی حکم آیا ہوا نہ ہوتا تھا، اس میں آپؐ صحابہؓ سے خود بھی مشورہ فرماتے تھے، صحابہؓ کو بھی یہ حق دیتے تھے کہ وہ آپؐ کی رائے سے اختلاف کریں۔ اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ آپؐ نے اپنی رائے چھوڑ کر ان کی رائے قبول فرمائی ہے۔ (ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۳)

آگے چل کر کہتے ہیں:

> اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو دو طرح کی تربیت دے رہے تھے۔ ایک اس بات کی تربیت کہ جب خدا کی طرف سے کوئی حکم آئے تو اس کی بے چوں و چرا اطاعت کرو۔ دوسری تربیت اس بات کی کہ جس معاملہ میں خدا کا حکم نہ ہو اس میں اہل الرائے سے مشورہ بھی کیا جائے۔ لوگوں کو بحث کا کھلا حق بھی دیا جائے۔ حضورؐ کی اپنی رائے تک سے اختلاف کرتے ہوئے دوسری رائے پیش کی جاسکے اور مشورہ کے بعد جو بات طے ہو اس پر عمل کیا جائے۔ (ص ۱۴)

اور آخر میں کہا:

اس مثال سے بھی آپ رسولؐ اللہ کے طرز حکومت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جن معاملات میں اللہ کا حکم ہوتا تھا وہاں کوئی جمہوریت نہ تھی۔ جن معاملات میں اوپر کا حکم نہ ہوتا تھا ان میں پوری جمہوریت تھی۔ (ص ۱۴)

بات صاف، واضح اور دوٹوک ہے، یعنی

۱ - جن امور سے متعلق خدا کی طرف سے احکام نازل ہوجاتے تھے، ان میں کسی قسم کی دخل اندازی کی گنجائش نہ تھی۔ اسلامی حکومت کا فریضہ ان احکام کو نافذ کرنا تھا۔ یہ احکام اب قرآن حکیم میں محفوظ ہیں، جو منزل من اللہ کتاب خداوندی ہے---- ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور محفوظ۔

۲ - جن امور میں وحی خداوندی نازل نہیں ہوتی تھی، وہ باہمی مشورہ سے طے پاتے تھے۔ اس مشورہ میں حضورؐ اپنی رائے بھی دیتے تھے اور صحابہ کرامؓ بھی۔ اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ فیصلہ حضورؐ کی رائے کے خلاف ہو۔ اسی کا نام اسلامی جمہوریت تھا۔ ظاہر ہے کہ جو فیصلے اس طرح باہمی مشورے سے ہوتے تھے وہ وحی منزل من اللہ کی طرح ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہیں ہوتے تھے۔ مشورہ سے طے کروہ امور میں، حالات کے بدل جانے سے، مشورہ سے تبدیلی ہوسکتی تھی۔

لیکن جب اسلامی نظام حکومت کا یہی نقشہ (پہلے) علامہ اسلم جیراجپوریؒ اور ازاں بعد پرویز صاحب کی طرف سے پیش کیا گیا تو مودودی مرحوم نے طوفان برپا کردیا کہ یہ انکار حدیث ہے، انکار رسالتؐ ہے، الحاد ہے، بے دینی ہے، ارتداد ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ اس موضوع پر طول طویل بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

لیکن یہ تفریق جو انہوں نے (علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے) محمدؐ بن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمدؐ رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے، قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسولؐ اور نبیؐ ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا، اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسولؐ تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولؐ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے، مربی اور مزکی بھی تھے، قاضی اور حاکم بھی تھے، امام اور امیر بھی تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے...... قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ

> بھی ایسا نہیں........ ملتا جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی اور حیثیت امارات میں کوئی فرق کیا گیا ہو........... رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے (ہوتی تھی)........... آنحضرتؐ جس وقت، جس حالت میں، جو کچھ بھی کرتے تھے رسولؐ کی حیثیت سے کرتے تھے۔
>
> (تفہیمات، حصہ اول، ۱۹۵۹ء ایڈیشن، ص ۳۴۳-۲۴۱)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

> (رسول کی) زندگی کے معاملات، عام اس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے یا معلم اخلاق کی حیثیت سے، شہری اور سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں یا ایک شوہر/باپ، بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے، سب پر اس کی حیثیت رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ کسی حال میں، ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے منفک نہیں ہوتی۔ حتی کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے اس وقت بھی اسی طرح خدا کا رسولؐ ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے وقت ہوتا ہے۔ (ایضاً" ص ۲۶۰)

آپ غور فرمایئے کہ جو کچھ مودودی (مرحوم) نے اب اپنی تقریر میں کہا ہے اور جو کچھ تفہیمات میں لکھا تھا، ان میں کس قدر تضاد ہے۔ اور یہ تضاد بھی کسی فروعی مسئلہ میں نہیں، حضورؐ نبی اکرم کی پوزیشن کے متعلق ہے یعنی اس سوال کے متعلق جس پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے اور جس کے مطابق اسلامی نظام حکومت کو قیامت تک قائم ہونا ہے۔

مودودی مرحوم نے جو کچھ تفہیمات میں لکھا تھا اس کی رو سے حضورؐ کے لئے کسی وقت اور کسی معاملہ میں بھی دوسروں سے مشورہ کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ ایک رسولؐ کا عام لوگوں سے مشورہ کرنے کا کیا مطلب؟ لیکن اس باب میں مودودی مرحوم کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ قرآن کی وہ آیت تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا تھا کہ **وشاورهم فی الامر** (۳/۱۵۸) "اور ان امور میں، ان لوگوں (اپنے ساتھیوں) سے مشورہ کیا کرو"۔ اس ضمن میں انہوں نے لکھا تھا:

> لیکن رسولؐ اللہ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسا کرکے عمل کا اقدام فرمایئے۔ **فاذا عزمت فتوکل علی اللہ** (۳/۱۵۸)۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے بلکہ آپ کو شوریٰ کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرز حکومت کی بنیاد پڑ جائے (ایضاً" ص ۲۴۵)۔

ہم مودودی مرحوم کی اس مضحکہ انگیز تاویل پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی حالیہ تقریر میں فرمایا ہے کہ جن امور میں خدا کی طرف سے حکم نازل نہیں ہوتا تھا' ان میں آپ اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس مشورہ میں آپ کی بھی ایک رائے ہوتی تھی اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ فیصلہ آپ کی رائے کے خلاف ہو۔ آپ اس فیصلہ پر عمل بھی فرماتے تھے۔ اس کا نام اسلامی جمہوریت تھا؟

سوال یہ ہے کہ رسول اللہ کی حقیقی حیثیت وہ تھی جس کا اظہار تفہیمات میں کیا گیا تھا یا وہ جسے حالیہ تقریر میں بیان کیا گیا ہے۔

قانون سازی کا سوال

اگلا اہم ترین سوال' اسلامی نظام حکومت میں قانون سازی کا ہے۔ اس باب میں مودودی مرحوم نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

> اس کے بعد مقننہ کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو دین رسولؐ اللہ لائے تھے اس میں چونکہ بنیادی طور پر قانون اللہ تعالیٰ کا تھا اور وہی قانون بنانے کا حق رکھتا تھا اس لئے رسول اللہ کی حیثیت قانون ساز کی نہ تھی' بلکہ قانون کو نافذ کرنے والے' اس کی تشریح کرنے والے اور لوگوں کو اس کے مطابق عدل و انصاف کا نظام چلانے کی تربیت دینے والے کی تھی...... اس لئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضورؐ خود قانون ساز نہیں تھے بلکہ اصل قانون اللہ تعالیٰ کا تھا اور آپ اس کے مقرر کردہ سرکاری شارح تھے۔ (ترجمان القرآن' بابت اپریل ۱۹۷۸ء' ص ۱۵)

بات بالکل واضح ہے۔ لیکن جب یہی بات پرویز صاحب نے کہی تھی تو مودودی مرحوم نے لکھا تھا:

> حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر یہ مراد ہے کہ' اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے' یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً" قرآن میں ذکر آگیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے...... مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ (ترجمان القرآن' بابت جولائی' اگست' ستمبر ۱۹۵۰ء)

دوسرے مقام پر لکھا:

> حضورؐ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو "غیر از قرآن" کہنا صحیح نہیں ہے۔

(تفہیمات، حصہ اول، ص۳۳۶)

آپ غور فرمایئے کہ اس باب میں مودودی مرحوم نے جو کچھ پہلے لکھا تھا اور جو کچھ اب فرمایا ہے، ان میں کس قدر تضاد ہے۔ اور (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) تضاد بھی کسی فرعی مسئلہ میں نہیں---- ایسے اہم سوال میں ہے جس کا تعلق نظام حکومت اسلامی کی اساس و بنیاد پر ہے۔ (جون ۱۹۷۸ء)

۳۔ مرکز ملت کا مفہوم

(اعتراضات کا جواب)

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک صاحب جماعت اسلامی سے متعلق ہیں جو حسب معمول ہر وقت کوئی نہ کوئی بحث چھیڑے رہتے ہیں اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے ان کا موضوع پرویز صاحب اور طلوع اسلام کی مخالفت ہوتا ہے۔ انداز ان کا یہ ہے کہ وہ یکسر جھوٹے الزامات عائد کرتے ہیں اور لطف یہ کہ جب ان کا جھوٹ ثابت ہو جائے تو انہیں نہ اس پر خفت ہوتی ہے نہ ندامت۔ وہ بلکہ اس جھوٹ پر ایک اور جھوٹ کا اضافہ کردیتے ہیں۔ اس وقت آپ کے لئے باعث زحمت ان کا ایک سنگین سا الزام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پرویز صاحب نے (گورنر جنرل مرحوم) غلام محمد، جیسے فاسق و فاجر کو (یہ ان کے الفاظ ہیں) "مرکز ملت" قرار دے کر، اس کی اطاعت کو بمنزلہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیا تھا۔ چونکہ اس کے متعلق ہمیں حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں اور ہم کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس کا ہمیں یقینی طور پر علم نہ ہو، اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس مبینہ واقعہ پر بھی روشنی ڈالیں اور "مرکز ملت" کی اصطلاح کے مفہوم کی بھی وضاحت فرما دیں تاکہ بات ہمیشہ کے لئے صاف ہو جائے۔

طلوع اسلام

آپ ان حضرات کے جھوٹ پر نہ خفا ہوا کریں نہ متعجب...... انہیں بتایا یہ گیا ہے کہ زندگی کی بعض اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ایسا کرنا واجب ہوجاتا ہے (مودودی مرحوم)۔ اور یہ تو غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ شریعت کی رو سے، واجب کا ترک کرنا گناہ کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بیچارے جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جہاں تک "مرکز ملت" کی اصطلاح اور اس کے مفہوم کا تعلق ہے، انہیں اس کا اچھی طرح سے علم ہے۔ اس لئے یہ حضرات اگر اس قسم کا الزام تراشتے ہیں تو وہ لاعلمی کی بنا پر نہیں ہوتا۔ وہ دیدہ دانستہ ایسا کرتے ہیں۔ ہم اسے یہاں دہرا دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

طلوع اسلام کا پہلا پرچہ مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ آپ اس دور کے پرچوں کے ٹائٹل کی لوح جبیں پر مرکز ملت

اور اس کی اطاعت کے الفاظ نمایاں طور پر منقوش پائیں گے۔ اس کی اکتوبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں علامہ اسلم جیراجپوریؒ کا مقالہ "اسلامی نظام" کے عنوان سے' اور نومبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں پرویز صاحب کا ایک مقالہ "مرکزیت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان میں انہوں نے بتایا کہ اسلامی نظام' خلافت علیٰ منہاج نبوت کا دوسرا نام ہے اور اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی اطاعت امت کا فریضہ۔ اس سنٹرل اتھارٹی کے لئے "مرکز ملت" کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ تشکیل پاکستان کے بعد' جولائی ۱۹۴۸ء اور ستمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعتوں میں پرویز صاحب کے مبسوط مقالات شائع ہوئے جن میں اس اصطلاح کے تمام گوشوں پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ ان تمام مقالات کو اس کتابچہ میں یکجا کرکے شائع کردیا گیا جس کا نام ہے "اسلامی نظام"۔ اس کے بعد بھی وقتاً" فوقتاً" ان الفاظ کا صحیح مفہوم سامنے لایا جاتا رہا ہے۔ جب جماعت اسلامی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ طلوع اسلام' ملک غلام محمدؒ (مرحوم) کو مرکز ملت قرار دے کر اس کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے تو اس کی تردید میں متعدد بار اس کی وضاحت کی گئی۔ ہم اس ضمن میں اس شذرہ کو شائع کرتے ہیں جو جولائی ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔۔۔۔۔ بالخصوص اس لئے کہ اس میں ملک غلام محمدؒ (مرحوم) کا بھی نام آگیا تھا۔ وہ شذرہ حسب ذیل ہے جو ایک استفسار کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

۱۔ نبی اکرمؐ کی ایک حیثیت یہ تھی کہ حضورؐ خدا کی طرف سے وحی پاتے تھے اور اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔ حضورؐ کی یہ حیثیت منفرد تھی جس میں نہ اس وقت کوئی اور شریک ہوسکتا تھا' نہ اس کے بعد۔ اس لئے کہ حضورؐ کے بعد خدا سے وحی پانے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ حضورؐ کی یہ حیثیت قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا' جب تک وہ حضورؐ کی رسالت پر ایمان نہ لائے۔ رسالت کی حیثیت تو ایسی ہے کہ جب تک کوئی شخص تمام انبیاءؑ پر ایمان نہ لائے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔

۲۔ حضورؐ کا دوسرا منصب ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جس میں خدا کے احکام کو عملاً" نافذ کیا جائے۔ اس میں پہلا مرحلہ اس نظام کے لئے تیاری کا تھا۔ اس مرحلہ میں حضورؐ ہی اپنے رفقاء کے سربراہ تھے۔ دوسراہ مرحلہ وہ تھا جس میں وہ نظام قائم ہوگیا تھا۔ اس میں حضورؐ اس نظام کے مرکز (بلند ترین اتھارٹی) تھے۔ دور حاضر کی اصطلاح کے مطابق' اس قسم کے نظام کو مملکت یا ریاست (STATE) اور اس اتھارٹی کو (HEAD OF THE STATE) کہا جاتا ہے۔ ان ہر دو مراحل میں' حضورؐ کی اطاعت جماعت مومنین پر فرض تھی۔

۳۔ حضورؐ کی وفات کے بعد' وحی کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا لیکن دین کا نظام مسلسل آگے چلا۔ اسے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔ اب مرکز ملت' حضورؐ کا جانشین' خلیفۃ الرسولؐ' یا امیر المومنین تھا' اور امت کے لئے اس کی اطاعت فرض تھی۔

۴۔ اگر یہ سلسلہ بدستور آگے چلتا تو ان جانشینان رسالت مابؐ کی اطاعت اسی طرح باقی رہتی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ رک گیا اور خلافت' سلطنت میں تبدیل ہوگئی جس میں احکام خداوندی کے بجائے سلطانی احکام کی فرمانروائی تھی۔ چونکہ دین کا نظام باقی نہیں رہا تھا اس لئے ان سلاطین کی اطاعت اسی قسم کی تھی' جس قسم کی دنیا

کے اور بادشاہوں کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان سلاطین کو "مرکز ملت" کہنا ہی غلط ہے۔ "مرکز ملت" صرف اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو کہا جائے گا (خواہ وہ ایک فرد ہو یا ایک جماعت) جو احکام خداوندی کو نافذ کرے اور امور مملکت امت کے مشورہ سے طے پائیں۔ جو نظام' خدا کی عائد کردہ حلال و حرام کی قیود کو توڑے اور اوامر و نواہی کی پرواہ نہ کرے وہ طاغوتی نظام ہے۔ اسے خدا اور اس کے رسولؐ سے کیا تعلق؟ اس کی اطاعت' طاغوت کی اطاعت ہے۔ یہ طلوع اسلام کے مخالفین کی افترا پردازی ہے جو سب کچھ جانتے بوجھتے محض بدنیتی سے یہ مشہور کرتے ہیں کہ طلوع اسلام ("مثلاً") غلام محمد مرحوم یا اسکندر مرزا کو مرکز ملت اور ان کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے۔ **ھذا افک عظیم**۔ طلوع اسلام نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ اس نے مرکز ملت کی تشریح ہمیشہ "خلافت علیٰ منہاج رسالت" کے الفاظ سے کی ہے' یعنی اس قسم کا نظام جو **محمد رسول اللہ والذین معه** کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا' جس میں مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوتا تھا۔

۵۔ جب صحیح اسلامی نظام (یا خلافت علیٰ منہاج رسالت) باقی نہ رہے تو پھر دین "عملاً" موجود نہیں رہتا' مذہب رہ جاتا ہے' جس میں سیاسی امور کو حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور شخصی امور میں لوگوں کو اجازت دے دیتی ہے کہ وہ جس طرح جی چاہے عمل کریں۔ سابقہ امتوں میں بھی یہ صورت پیدا ہو جاتی تھی اور اب ہمارے ہاں صدیوں سے یہی ثنویت کارفرما ہے۔ شخصی امور میں لوگ اپنی صوابدید کے مطابق' اس طریق پر چلنے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں جو حضورؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں رائج تھا۔ اس میں بھی جس قدر اختلاف پائے جاتے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس طریق کار میں اختلافات ناگزیر ہیں۔ یہی وہ مجبوری تھی جس کی وجہ سے یہ روایت وضع کرلی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے"۔ "مرکز ملت" کی موجودگی میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (واضح رہے کہ اب خود اہل حدیث حضرات نے بھی اس کا اعتراف کرلیا ہے کہ یہ حدیث وضعی ہے)۔

۶۔ ایسا نظام' جس میں امت کو احکام خداوندی کے مطابق چلایا جائے' پھر سے قائم ہوسکتا ہے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو وہ "مرکز ملت" کہا جائے گا جس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائم مقام ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ مرکز سب سے پہلے خود احکام خداوندی کی اطاعت کرے گا۔

جو حکومت کسی اصول پر قائم ہو' جب تک وہ مسلسل آگے چلتی رہے' اس میں اس کے سابقہ ادوار کے فیصلے علیٰ حالہ نافذ العمل رہتے ہیں۔ لیکن جن امور میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو' ان میں اس دور کی حکومت ضروری تبدیلی کرلیتی ہے۔ جب تک اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) قائم رہی' اس میں احکام کی یہی پوزیشن رہی۔ قرآن کریم نے جب امور مملکت کو باہمی مشورہ سے طے کرنے کا حکم دیا تھا تو اس کا یہی منشا تھا۔ اس کی روشنی میں جب ہم اس حدیث کو دیکھتے ہیں جس میں نبی اکرمؐ نے

فرمایا کہ "تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنت واجب ہے" تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ "خلفائے راشدینؓ" کسی خاص زمانہ تک محدود نہ تھے۔ اگر خلافت راشدہ' مسلسل آگے چلتی تو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے لے کر آج تک کے خلفاء' خلفائے راشدینؓ ہوتے۔ اگر وہ سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہوگیا ہے تو اسے پھر جاری کیا جاسکتا ہے۔ جب وہی سلسلہ پھر قائم ہو جائے گا تو ان نئے خلفائے راشدینؓ کی سنت کی اطاعت واجب ہو جائے گی۔ اس سے مراد ہوں گے وہ فیصلے جو یہ نظام قرآن کریم کے احکام کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں باہمی مشاورت سے کرے گا۔

یہ ہے اس باب میں طلوع اسلام کا مسلک' جسے ہم اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم سے سمجھ سکے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ طلوع اسلام کے نزدیک "مرکز ملت" کا مفہوم کیا ہے؟ لیکن جماعت اسلامی والے اس کے بعد بھی یہی رٹ لگاتے جائیں گے کہ پرویز صاحب ملک غلام محمد (مرحوم) جیسے فاسق و فاجر کو مرکز ملت قرار دے کر اس کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتے تھے! سوتے کو تو جگایا جاسکتا ہے' جاگتے کو کون جگا سکتا ہے۔

(جولائی ۱۹۷۸ء)

چھٹا باب

زکوٰۃ کا مفہوم اور نصاب زکوٰۃ میں تبدیلیاں

۱۔ نصاب اور عشر کا قرآنی مفہوم

(نصاب میں تبدیلیاں۔۔۔۔ تفصیلی بحث)

"قوانین حدود" کے بعد حکومت پاکستان' زکوٰۃ کے متعلق قوانین نافذ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی طرف سے رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے ان قوانین کا مسودہ ملک میں شائع کردیا گیا ہے۔ قارئین طلوع اسلام کی طرف سے ہم سے ان قوانین پر تبصرہ یا تنقید کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ یہ قوانین بھی فقہ پر مبنی ہیں' اور فقہی قوانین کے متعلق ہمارا نقطہ نظر طلوع اسلام کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۹ء میں شائع ہوچکا ہے۔ اس کی روشنی میں ان قوانین پر تنقید یا تبصرہ ہمارے دائرۂ فکر و تحقیق سے باہر ہے۔ البتہ ہم یہ بتاسکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور ایسا بتانا ضروری بھی سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کی رو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے۔ لیکن یہ مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک قرآن کریم کے معاشی نظام کا تصور ذہن میں نہ ہو۔ یہ نظام تفصیل طلب ہے اور اس کے متعلق طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ جامع طور پر اس نظام کی تفاصیل پرویز صاحب کی کتاب۔۔۔۔ نظام ربوبیت۔۔۔۔ میں درج ہیں' جسے ادارہ کی طرف سے حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ اس مقام پر ہم اس کے نمایاں خط و خال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں' جن کی روشنی میں زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

--------------- (۱) ---------------

قرآن کے معاشی نظام کا نقطہ ماسکہ' ماحصل یا مقصود ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وما من دابتہ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (۱۱/٦)

روئے زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

انسانوں کو بالخصوص مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

نحن نرزقکم وایاھم (٦/۱۵۲)

تمہارے رزق کی ذمہ داری بھی ہم پر ہے اور تمہاری اولاد کے رزق کی بھی۔

ان آیات (اور اس نوع کی دیگر متعدد آیات) میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام انسانوں کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر

لے رکھی ہے۔ اس مقام پر یہ بنیادی نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ انسانوں کے بارے میں خدا نے جو ذمے داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں وہ اس حکومت کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہیں جو خدا کے نام پر قائم کی جائے۔ اسے نظام خداوندی کہئے یا اسلامی مملکت' مطلب اس سے ایسی مملکت ہے جو خدائی ذمہ واریوں کو پورا کرے۔ اس اجمال کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ یہ کہنے کے ساتھ ہی (کہ تمام افراد معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے) جماعت مومنین سے بار بار تاکید کی گئی ہے کہ وہ افراد معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کا انتظام کریں۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے:

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا (۷۶/۸)

یہ لوگ ان تمام افراد کے رزق کا انتظام کرتے ہیں جو کسی وجہ سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ ہوں۔

وہ اس ذمہ داری کو اپنا فریضہ زندگی سمجھ کر پورا کرتے ہیں' اور جن کی ضروریات پوری کرتے ہیں ان سے کہتے ہیں:-

انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا (۷۶/۹)

ہم تمہارے رزق کا انتظام فریضہ خداوندی سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس کے لئے ہم تم سے معاوضہ تو ایک طرف' شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔

جو لوگ ایمان کا دعوئی تو کریں لیکن اس فریضہ خداوندی کو پورا نہ کریں' ان کے متعلق کہا کہ وہ دین کی تکذیب کرتے ہیں۔

سورۂ الماعون میں ہے:-

ارء یت الذی یکذب بالدین (۱۰۷/۱)

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ یہ شخص وہ ہے

لا یحض علی طعام المسکین (۱۰۷/۳)

جو ضرورت مندوں کی ضروریات نہ خود پوری کرتا ہے' نہ دوسروں کو ان کے پورا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ جب اس قسم کے لوگ ذلیل و خوار ہوتے ہیں (یعنی ایسا نظام تباہ و برباد ہوتا ہے) تو یہ واویلا مچا دیتے ہیں کہ خدا نے ہمیں خواہ مخواہ' بلا جرم و تقصیر' ذلیل اور تباہ کردیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ خدا کسی کو یونہی تباہ اور ذلیل نہیں کیا کرتا۔ تمہاری یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ:

ولا تحضون علی طعام المسکین (۸۹/۱۸)

تم لوگوں کو اس کی ترغیب نہیں دیا کرتے تھے کہ وہ ضرورت مندوں کے رزق کا سامان

فراہم کریں۔

ان (اور اسی قسم کی دیگر متعدد آیات) سے یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رزق فراہم کرنے کی جو ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے وہ اسے براہ راست پورا نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے جو اسے فریضہ خداوندی سمجھ کر پورا کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو سورۂ یٰسین میں مزید وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جب کہا۔

واذا قیل لھم انفقوا مما رزقکم اللہ

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کیا ہے اسے دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا رکھو۔

قال الذین کفروا للذین امنوا

تو جو لوگ نظام خداوندی سے انکار کرتے ہیں وہ ان لوگوں سے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں، کہتے ہیں :-

انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ

کیا تم یہ کہتے ہو کہ جو ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لی ہے، اسے ہم پورا کریں؟ خدا ان لوگوں کو خود رزق کیوں نہیں دیتا؟

اس کے جواب میں کہا کہ:

ان انتم الا فی ضلال مبین (۳۶/۴۷)

تم لوگ کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں ہو جو یہ کہتے ہو کہ خدا کو چاہئے کہ وہ انسانوں تک براہ راست رزق پہنچائے۔ یہ ذہنیت کافرانہ ہے۔ خدا اپنی ذمہ داریاں خود نہیں پوری کیا کرتا۔

اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا:۔

تم میں سے کوئی شخص رزق کی طلب و جستجو سے باز نہ رہے اور یہ نہ کہتا رہے کہ یا اللہ مجھے رزق دے۔ یاد رکھو! آسمان سے ہن نہیں برسا کرتا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔ (شاہکار رسالت)

اسلامی مملکت کی یہ ذمہ داری کس قدر اہم اور بنیادی ہوتی ہے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے لگ سکتا ہے جس نے گویا ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:۔

اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ (شاہکار رسالت)

نیز، نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی کہ:

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہوگیا۔ (نظام ربوبیت)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

تمام افراد معاشرہ کو ضروریات زندگی بہم پہنچانا اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے۔

---------------- (۲) ----------------

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اسلامی مملکت اس ذمہ داری کو پورا کس طریق سے کرے! اس کے لئے پہلا اقدام یہ ہے کہ یہ مملکت تمام افراد معاشرہ کو ان کی استعداد کے مطابق کام مہیا کرے اور یہ افراد اس کام کو فریضہ خداوندی سمجھ کر سرانجام دیں کیونکہ وہ اسی صورت میں رزق خداوندی کے حقدار تصور کئے جاسکیں گے۔ قرآن کے معاشی نظام کا دوسرا نکتہ ماسکہ یہ ہے کہ

وان لیس للانسان الا ما سعی و ان سعیہ سوف یری۔ ثم یجزہ الجزاء الاوفی (۵۳/۳۹-۴۱)

انسان صرف اسی کا حق دار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس نظام میں کسی کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہر ایک کو اس کے کام کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

یعنی اس نظام میں ہر فرد کاسب ہوگا' محنت کش ہوگا' کام کرے گا۔ اس میں استثنا صرف ان کی ہوگی جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہوں یا وہ اتنا کام نہ کرسکیں جن سے ان کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (۷۰/۲۴-۲۵)

ان لوگوں کی کمائی میں ان لوگوں کا حق ہے جو صاحب احتیاج ہیں یا جو بالکلیہ کام کرنے سے معذور ہیں۔ ان کا یہ حق ایسا ہے جس کا ہر ایک کو علم ہونا چاہئے۔

یعنی ان لوگوں کو سامان رزق بطور خیرات نہیں ملے گا۔ وہ اسے اپنے حق کے طور پر (AS OF RIGHT) لے سکیں گے کیونکہ یہ اس مملکت کا فریضہ ہوگا۔ اس نظام میں انتظام یہ ہوگا کہ افراد کاسب اپنی کمائی میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لے لیں گے اور اس سے زیادہ جو کچھ بچے گا اسے بطیب خاطر مملکت کی تحویل میں دے دیں گے۔ اور یہ اس ارشاد خداوندی کی تعمیل میں ہوگا جس میں کہا گیا ہے:۔

ویسئلونک ما ذا ینفقون قل العفو۔ (۲/۲۱۹)

اے رسول! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زیادہ ہے' سب کا سب۔

واضح رہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس نظام کو فریضہ خداوندی سمجھ کر بطیب خاطر قبول کیا ہے۔ اس لئے وہ زائد

از ضرورت اپنے قلب و دماغ کی پوری رضامندی سے مملکت کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کے جبر اور اکراہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عقل و فکر کی رو سے بھی یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ جب ہر فرد کو اس کی ضمانت حاصل ہو کہ اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضروریات زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی رہیں گی' تو وہ فالتو روپیہ (SURPLUS MONEY) اپنے پاس رکھے گا کاہے کے لئے؟ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے دولت جمع کرنے کو سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ اس باب میں اس میں بکثرت آیات آئی ہیں۔ مثلاً" ایک جگہ کہا ہے:

تدعوا من ادبرو تولی وجمع فاوعی (۱۸-۱۷/۷۰)

جہنم آوازیں دے دے کر بلاتی ہے اسے جو نظام خداوندی کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے یا اس میں گریز کی راہیں تراشتا ہے' یعنی وہ جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اس تھیلی کا منہ اس طرح بند کرتا ہے کہ اس میں سے کچھ نکلنے نہ پائے۔

سورۂ الھمزہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

اے رسول! تم اعلان کردو کہ وہ شخص تباہ و برباد ہو کر رہے گا جس کی زندگی کا مقصد یہ ہو کہ وہ دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ وہ کتنی ہوگئی...... اس سے پوچھو کہ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ مصیبتوں سے بچاتا رہے گا۔ اگر وہ ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کا زعم باطل ہے۔ اس کے اس مال کو ناکارہ شے کی طرح اس تباہی کے جہنم میں جھونک دیا جائے گا جو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا اور یوں وہ کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اس جہنم میں خدا کے قانون مکافات کی بھڑکائی ہوئی وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ (۷-۱/۱۰۴)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دولت کا جمع کرنا نظام خداوندی کے خلاف گویا بغاوت ہے اور اس کی سزا جہنم۔ یہ اس لئے کہ قرآن کا معاشی نظام اور نظام سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ قرآن کریم نے اپنے نظام کو ان مختصر الفاظ میں سمٹا کر بیان کردیا ہے:۔

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (۹/۱۱۱)

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین سے ان کی جان اور ان کا مال خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے میں جنت کی زندگی عطا کردیتا ہے' جس میں ہر قسم کے رزق کی فراوانیاں ہوتی ہیں (اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔

لہٰذا' قرآن کے معاشی نظام کی دوسری شق یہ ہے کہ:

اس میں ہر فرد محنت کرتا ہے۔ اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے

کر' باقی سب' بطیب خاطر نظام مملکت کی تحویل میں دے دیتا ہے تاکہ وہ اس سے عالم گیر ربوبیت کا فریضہ سرانجام دے۔

---------------- (۴) ----------------

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی پوری کرے۔ ضروریات زندگی میں صرف روٹی' کپڑا' مکان" شامل نہیں۔ ان میں وہ تمام اسباب و ذرائع شامل ہیں جن سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما (DEVELOPMENT)ہوتی ہے۔ عربی زبان میں نشوونما کو زکوٰۃ کہتے ہیں۔ لہٰذا' ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوں گے سامان نشوونما مہیا کرنا۔ قرآن کریم نے اسے اسلامی مملکت کا فریضہ قرار دیا ہے جہاں فرمایا ہے :۔

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ..... (۲۲/۴۱)

یہ (مومن) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ نظام زکوٰۃ قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

اس آیہ جلیلہ میں **اتوا الزکوۃ** کے الفاظ سارا مفہوم واضح کر دیتے ہیں' یعنی یہاں یہ نہیں کہا کہ جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ لوگوں سے زکوٰۃ لیں گے۔ کہا یہ گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زکوٰۃ کے معنی "سامان نشوونما" ہیں۔ اس سے یہ مفہوم واضح ہے کہ ان کی حکومت قائم ہوگی تو ان کا فریضہ یہ ہوگا کہ افراد معاشرہ کی نشوونما کا سامان فراہم کریں۔

دوسری جگہ ہے:۔

والذین ھم للزکوۃ فاعلون (۲۳/۴)

ان لوگوں کا نظم و نسق سامان نشوونما فراہم کرنے کے لئے ہوگا۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے زکوٰۃ کا مفہوم۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی ان نصوص صریحہ کی موجودگی میں زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم کیسے پیدا ہوگیا' یعنی یہ مفہوم کہ انسان جس قدر جی چاہے مال و دولت جمع کرلے اور سال کے بعد اس میں سے کچھ پیسے خیرات کے طور پر نکال کر دے تو یہ سارا کاروبار اسلام کی رو سے جائز قرار پا جائے گا۔ یہ کیسے ہوگیا' اس کی داستان بڑی غور طلب ہے۔ قرآن کریم میں حسب ذیل آیت بڑی اہم اور قرآن کے معاشی نظام میں اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ فرمایا:۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقو نھا فی سبیل اللہ فبشر ھم بعذاب الیم۔ یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ما کنزتم لا نفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزو۱ن

(۹/۳۴-۳۵)

جو لوگ چاندی سونا (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں نہیں دے

دیتے' اے رسول! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے- جب چاندی سونے
کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں'
پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے
اپنے لئے جمع کر رکھا تھا- سو اب ان جمع شدہ مال کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو!

یہ آیہ جلیلہ اپنے معانی میں بالکل واضح ہے- مال و دولت جمع کرنے کے خلاف اس سے واضح تر الفاظ کون سے لائے جاسکتے تھے؟ لیکن احادیث کے ایک مجموعہ ابوداؤد کی روایت ہے:-

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر
ہوا' یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا- حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں
تمہاری اس فکر کو دور کردوں گا اور اس مشکل کو حل کردوں گا- پس عمرؓ رسولؐ اللہ کی
خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا' یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں
گزری ہے- آپ نے فرمایا' خدائے تعالٰی نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ
تمہارے باقی مال کو پاک کردے- ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے
جوش مسرت سے اللہ اکبر کہا-

(ابوداؤد' بحوالہ مشکوٰۃ' کتاب الزکوٰۃ' اردو ترجمہ
شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' ص ۱۰-۴۰۹)

بادنٰی تدبر یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہ روایت وضعی ہے اور اس زمانہ کی وضع کردہ جب مسلمانوں میں (دور ملوکیت میں) نظام سرمایہ داری رائج ہوچکا تھا- اس میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اللہ تعالٰی کی طرف سے ایک حکم نازل ہوتا ہے اور وہ (معاذ اللہ) صحابہؓ پر گراں گزرتا ہے- خدا کا حکم تو ایک طرف' نبی اکرمؐ کے فیصلوں کے متعلق قرآن مجید میں ہے کہ:

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (۴/۶۵)

اے رسول! تیرا رب اس پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی صاحب ایمان نہیں ہوسکتے جب
تک یہ اپنے ہر متنازع معاملے میں تجھے حکم مقرر نہ کریں- اور اس کے بعد تیرے
فیصلہ کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں' بلکہ اس کے
سامنے بطیب خاطر سر تسلیم خم کردیں-

آپ سوچئے کہ جن مومنین کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے تو کیا ان کی حالت یہ ہوگی کہ ایک حکم نازل ہو اور وہ ان پر گراں گزرے! (معاذ اللہ)-

پھر ان "کبیدہ خاطر" صحابہؓ کی نیابت کے لئے اپنے آپ کو پیش کون کرتا ہے؟ حضرت عمرؓ جن کی حالت یہ تھی کہ ان کی خلافت کے زمانے میں بھی ان کے تہبند پر بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ وہ خدمت نبویؐ میں حاضر ہوتے ہیں تو کیا کہنے کے لئے؟ یہ کہنے کے لئے کہ خدا کے اس حکم سے آپؐ کے صحابہؓ ایک مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ آپ اس مشکل کا کوئی حل تجویز فرمادیجئے' یعنی رسولؐ اللہ کا فریضہ احکام خداوندی کی اطاعت کرانا نہیں تھا' ان کی پیدا کردہ مشکلات کا حل تجویز کرنا تھا (معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ)۔

اور یہ وہ رسولؐ تجویز فرماتے ہیں جنہوں نے ساری عمر زائد از ضرورت ایک پیسہ بھی اپنے ہاں نہیں رکھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ (مروجہ مفہوم کے مطابق) زکوٰۃ بھی نہیں دی!

یہ ہے وہ روایت جس کی رو سے قرآن کریم کا پورا معاشی نظام' نظام سرمایہ داری میں بدل گیا۔ بے حد و نہایت مال جمع کرنا عین مطابق اسلام قرار پاگیا بشرطیکہ اس میں سے کچھ پیسے خیرات کے طور پر الگ کردیئے جائیں۔ ان پیسوں کا نام زکوٰۃ قرار پاگیا۔ فقہ نے اس کے لئے قوانین مرتب کئے۔ زکوٰۃ کا نصاب' اس کی شرح اور مصارف سے متعلق قوانین' فقہ کے مرتب کردہ ہیں۔ جب ہماری اپنی مملکت نہیں تھی تو ان قوانین پر انفرادی طور پر عمل ہوتا تھا' یعنی ہندوستان میں ہم اسی نصاب اور شرح کے مطابق اپنے طور پر زکوٰۃ نکالتے اور خرچ کرتے تھے۔ اب ہماری اپنی مملکت ہے تو یہی قوانین اس کی طرف سے نافذ کردیئے جائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے جسے ہم آخر میں سامنے لائیں گے۔

---------------- (۴) ----------------

زکوٰۃ کے سلسلے میں متفقہ طور پر کہا جاتا ہے کہ اس کے مصارف خود قرآن کریم نے متعین کردیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے مصارف قرآن کریم نے متعین کردیئے ہیں تو پھر اس کا مفہوم وہ نہیں ہوسکتا جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ قرآن کریم نے زکوٰۃ کے مصارف کہیں بیان نہیں کئے۔ اس کے لئے جس آیت کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے اس میں کہا یہ گیا ہے کہ:

انما الصدقات للفقراء والمسٰکین (۹/۶۰)

یعنی یہ مصارف صدقات کے ہیں' زکوٰۃ کے نہیں۔ ان دونوں کے فرق کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ صدقات کے معنی "عطیات" کے ہیں۔ ان عطیات کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں۔

۱۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جب جماعت مومنین کی اپنی مملکت قائم ہو جائے گی تو یہ افراد معاشرہ کو سامان نشوونما فراہم کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لے گی اور اس مقصد کے لئے تمام کاسب افراد زائد از ضرورت کمائی مملکت کی تحویل میں دے دیں گے۔ جب یہ مملکت ہنوز قائم نہیں ہوگی تو افراد معاشرہ اپنی ضروریات آپ پوری کرنے کے ذمے دار ہوں گے۔ لیکن اس زمانے میں بھی معاشرہ میں ایسے افراد ہوں گے جو اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کے محتاج ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے کاسب افراد سے عطیات کی اپیل کی جائے گی۔ انہیں صدقات کہہ کر پکارا

گیا ہے۔
۲۔ اپنی مملکت کے قائم ہونے کے بعد بھی ایسے ہنگامی حالات پیدا ہوسکتے ہیں' جن میں افراد معاشرہ سے اپیل کی جائے گی کہ جو کچھ انہوں نے اپنی ضروریات کے لئے رکھا ہے' اس میں سے بھی کچھ ان ہنگامی ضروریات کے لئے عطیہ کے طور پر دیدیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کہا گیا ہے :

ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ (۵۹/۹)

یہ لوگ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیں گے اور اس مقصد کے لئے خود تنگی ترشی میں گزارہ کرکے زیادہ سے زیادہ بطور عطیہ دوسروں کے لئے دے دیں گے۔

یہ عطیات بھی صدقات کہلائیں گے۔ جیساکہ پہلے کہا گیا ہے' زکوٰۃ کے مصارف قرآن کریم میں متعین نہیں کئے گئے۔ زکوٰۃ کا تو مطلب اسلامی مملکت کی طرف سے اور افراد معاشرہ کے لئے سامان نشوونما مہیا کرنا ہے۔ یہ کسی خاص فنڈ کا نام نہیں جس کے مصارف کے تعین کی ضرورت لاحق ہو۔

--------------- (۵) ---------------

زمین

سامان نشوونما کا بنیادی ذریعہ زمین ہے۔ ظاہر ہے کہ جب افراد معاشرہ کو سامان نشوونما فراہم کرنا اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوگا تو زمین بھی اسی کی تحویل میں رہے گی۔ اس نظام کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں متعدد آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ زمین کا مقصد تمام نوع انسانی کی ضروریات زندگی پورا کرنا ہے۔ **والارض وضعھا للانام** (۵۵/۱۰) "زمین کو ہم نے اپنی مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے"۔ **سواء للسائلین** (۴۱/۱۰) "اس لئے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے"۔ حضور نبی اکرمؐ نے اس اصول کو مختصر لیکن بڑے جامع انداز میں بیان فرمایا جب کہا کہ :

ان الارض ارض اللہ والعباد عباد اللہ

(ابوداؤد)

زمین اللہ کی ملکیت ہے اور انسان اللہ کے بندے ہیں' اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔

لہٰذا' جو اصول دوسری دولت کے سلسلے میں کار فرما ہوگا وہی زمین کی پیداوار پر بھی منطبق ہوگا' یعنی کاشت کرنے والوں کی ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی فصل حکومت کی تحویل میں آجائے گی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے :۔

یاایھا الذین امنوا انفقوا من طیبٰت ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من

الارض

(۲/۲۶۷) ز (۶/۱۴۲)

یعنی جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اور جو کچھ زمین سے حاصل کرو' اسے بطیب خاطر' ربوبیت عالمینی کے لئے کھلا رکھو۔

قل العفو کا اصول دونوں پر یکساں لاگو ہو گا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے' زرعی پیداوار کے محصل سے کہا تھا کہ کاشتکار کی ضروریات سے جس قدر زائد ہو' وہ ہمارا حق ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ اس طرح تو شاید ہمیں کچھ بھی نہ مل سکے تو آپؓ نے فرمایا:۔

وان رجعت کما ذہبت۔ ویحک انا امرنا ان ناخذ العفو۔ یعنی الفضل (الخراج الیحیٰ ص۷۵)

جس طرح تو گیا تھا چاہے اسی طرح خالی واپس آنا پڑے' تجھ پر افسوس ہے۔ (کیا تجھے یاد نہیں کہ) ہمیں صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو ہم وہ وصول کریں۔

لیکن جب دین مذہب میں بدل گیا اور خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو نظام سرمایہ داری کی دوسری شقوں کی طرح زمین کو بھی ذاتی ملکیت میں دے دیا گیا اور روپے پر زکوٰۃ کی طرح فصل کے ایک متعین حصے کو زکوٰۃ قرار دے دیا گیا۔ اصطلاح میں اسے عشر سے تعبیر کیا جاتا ہے' یعنی پیداوار کا دسواں حصہ۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم کے معاشی نظام کی رو سے' نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے نہ زمین پر ذاتی ملکیت تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے دور ملوکیت میں جو معاشی نظام وجود میں لایا گیا اس کی رو سے کہا گیا کہ:

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں' بلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ' پیسہ' جانور' استعمالی اشیاء' مکانات' سواری' غرض کسی چیز کے معاملے میں بھی قانوناً" ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ' اتنے مکان' اتنا تجارتی کاروبار' اتنا صنعتی کاروبار' اتنے مویشی' اتنی موٹریں' اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو' اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔

(مسئلہ ملکیت زمین' از سید ابوالاعلیٰ مودودی' پہلا ایڈیشن' صفحات نمبر ۴۳ ز ۵۲)

اس میں جو کہا گیا ہے "شرعی حقوق و واجبات ادا کرنے کے بعد" تو ان سے مراد مال و دولت پر زکوٰۃ اور زرعی پیداوار میں عشر ہے۔ زکوٰۃ کی شرح عام طور پر اڑھائی فی صد اور عشر کے معنی ہیں دس فی صد۔ یہ ہے مروجہ فقہی قوانین کی رو سے اسلام کا معاشی نظام۔

---------------- (۶) ----------------

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ زکوٰۃ اور عشر کے قوانین کے سلسلے میں ایک بڑا اہم سوال سامنے آجاتا ہے جس سے بہت بڑی دشواری پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں عقیدہ یہ چلا آرہا ہے کہ فقہ نے جو شرح تجویز کر رکھی ہے' (یعنی سونا چاندی میں اڑھائی فی صد اور زرعی پیداوار میں دسواں حصہ) اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی اور حکومت زکوٰۃ اور عشر کے سوا کوئی ٹیکس عائد نہیں کرسکتی۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ زکوٰۃ اور عشر کی آمدنی سے حکومت کا کاروبار کیسے چل سکے گا؟ اس مشکل کے حل کے لئے کہا یہ گیا کہ نظام زکوٰۃ پر نظر ثانی کی جائے اور اس کی شرح وغیرہ میں تبدیلی کی جائے گی۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان' ہفت روزہ' اہل حدیث (لاہور) کی ۱۶ اگست ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا:۔

> خوشحال معاشرہ کا قیام اسلام کا بنیادی نظریہ ہے..... زکوٰۃ کی فرضیت بھی اسی نقطہ نظر سے ہوئی ہے۔ تاہم جس معاشرہ اور ماحول میں اس عمل کو فرض کیا گیا ہے وہ آج کل کے ماحول اور معاشرہ سے قدرے مختلف تھا..... اس سلسلے میں "قانون ضرورت" کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ شرعی قوانین کی رو سے زکوٰۃ چار اشیاء پر فرض ہے۔ (۱) مویشی (۲) غلہ اور پھل (۳) نقدی (سونا چاندی) اور (۴) تجارت۔ پہلی تین مدات تو بحالہ قائم ہیں' مگر جہاں تک مال کی تجارت کا تعلق ہے' اس کا میدان اب بہت وسیع ہوچکا ہے۔ لہذا' اس معاملہ میں اب مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ نصاب زکوٰۃ بھی اسلام میں مقرر ہے لیکن اس معاملہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ کی کم از کم حد ہے۔ زکوٰۃ کا یہ نظام جب رائج کیا گیا تو اس وقت کی طلب اور ضرورت کے مطابق تھا...... زکوٰۃ کا مقصد صرف یہ نہیں کہ مقررہ اموال میں سے معینہ مقدار ادا کردی جائے خواہ وہ معاشرتی ضروریات کا ایک فی صد ہی پورا کرے...... زکوٰۃ کو فقراء اور محتاج لوگوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہونا چاہئے۔ لہذا' آج کل اس امر کی ضرورت ہے کہ ضرورت کا اندازہ لگا کر نظام زکوٰۃ کو از سر نو منظم کیا جائے۔
>
> (طلوع اسلام' بابت اگست ۱۹۷۸ء' ص ۶۳)

آگے بڑھنے سے پہلے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ یہ تجویز اہل حدیث حضرات کی طرف سے پیش کی جارہی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ احادیث نبویؐ قرآن مجید کی طرح ناقابل تغیر و تبدل ہیں اور ان کا بعینہ اتباع اسلام کا تقاضا ہے۔ اب یہ

حضرات بھی اس کے قائل ہو رہے ہیں کہ زمانے کی ضروریات کے پیش نظر سنت نبویؐ میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ طلوع اسلام نے یہی بات کہی تو اسے منکر حدیث' منکر شان رسالت قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کردیا گیا۔ اب وہی بات اہل حدیث حضرات کی طرف سے کہی جارہی ہے!

آگے بڑھیے۔ اتباع حدیث سعودی عرب کا سرکاری مذہب ہے' اور را بطتہ العالم الاسلامی ایک طرح حکومت کا تنظیمی ادارہ ہے۔ اس ادارہ کے ترجمان' را) العالم الاسلامی کے رجب ۱۳۹۸ھ (جون ۱۹۷۸ء) میں اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہ کیا زکوٰۃ کے متعلق رسولؐ اللہ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلی کی جاسکتی ہے یا نہیں....... لکھا تھا:۔

> زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ وہ حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرے۔ اگر موجودہ شرح سے حاجت مندوں کی پریشانیاں دور نہیں ہوتیں تو پھر اس شرح سے زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی.................. زکوٰۃ کا انتظام کرنے والوں اور حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحب نصاب لوگوں سے زیادہ شرح سے زکوٰۃ وصول کریں کیونکہ رسولؐ اللہ نے جو شرح مقرر کی تھی وہ آپؐ کے زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی اور قرآن مجید نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اس کے لئے اس نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔
> (طلوع اسلام' بابت ستمبر ۱۹۷۸ء' ص ۱۲)

لیکن ہمارے ہاں کے اہل فقہ حضرات نے اس سوال پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ زکوٰۃ کے مروجہ نظام میں اس قسم کی کتر بیونت سے بھی اتنی آمدنی نہیں ہوسکتی کہ جس سے حکومت کا کاروبار چل سکے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اور راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور حقوق اللہ میں شامل----- یہ حکومت کے ٹیکسوں سے بالکل الگ رہے گی۔ (مفتی محمود صاحب کا بیان' شائع شدہ نوائے وقت بابت ۱۲ جون ۱۹۷۸ء)

دیو بندی مسلک کے ترجمان ماہنامہ البلاغ (کراچی) کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۷۹ء میں اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

> زکوٰۃ کے سلسلے میں ایک خلش عام طور پر یہ پائی جا رہی ہے کہ زکوٰۃ کے قانون کے نفاذ کے بعد انکم ٹیکس کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے اور اسے کیوں منسوخ نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ زکوٰۃ اور انکم ٹیکس دو بالکل الگ الگ چیزیں ہیں اور زکوٰۃ کو انکم ٹیکس کا بدل بنانا ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف ازروئے قرآن کریم[۱] متعین ہیں اور اس کا اصل منشا غریبوں اور مفلسوں کی حاجت روائی ہے۔ اس کے برعکس' انکم ٹیکس کی رقم حکومت کے دوسرے کاروبار چلانے میں

۱۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ قرآن کریم میں زکوٰۃ کے مصارف کا کوئی ذکر نہیں۔ جنہیں یہ حضرات زکوٰۃ کے مصارف سمجھ رہے ہیں۔ وہ صدقات کے مصارف ہیں۔

صرف ہوتی ہے۔ اگر زکوٰۃ کو انکم ٹیکس کے مصارف میں خرچ کردیا جائے تو نہ صرف یہ شرعاً" جائز نہیں بلکہ اس سے زکوٰۃ کا اصل منشا ہی پورا نہیں ہوتا۔ لٰہذا' نظام زکوٰۃ کو نافذ کرنے کا انکم ٹیکس کے خاتمے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

مودودی صاحب کا بھی یہی نظریہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں جو ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے' سوال اور جواب کی شکل میں کہا ہے :۔

سوال : زکوٰۃ اور عشر کے نفاذ کے بعد دوسرے ٹیکس' مثلاً انکم ٹیکس' پراپرٹی ٹیکس' سیلز ٹیکس اور اکسائز ڈیوٹی وغیرہ کا کوئی جواز رہ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب : اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ زکوٰۃ اور عشر تو صرف معاشرے کے غریب اور پسماندہ لوگوں کی مدد کے لئے ہیں' حکومت کا کام چلانے کے لئے نہیں۔ حکومت کا کام چلانے کے لئے دوسرے ٹیکسز عائد کئے جائیں گے۔ البتہ چونکہ اب زکوٰۃ اور عشر کا حکم نافذ ہو رہا ہے اس لئے سارے ٹیکیشن کے نظام پر نظر ثانی کرنا ہوگی [illegible]کہ اس کے اندر زکوٰۃ اور عشر کی گنجائش نکل سکے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ زکوٰۃ اور [illegible]ر سے ہی [illegible]ومت کا پورے کا پورا نظام چلایا جائے گا' صحیح بات نہیں ہے۔ دو[illegible] [illegible] [illegible]یں گے اور لگانا ناگزیر[2] ہے۔

یہ حضرات اٹھتے بیٹھتے پکارتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہیں۔ اسلامی نظام میں یہ دونوں چیزیں یکجا ہوجاتی ہیں۔ لیکن ان کی ذہنی کیفیت یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کو مذہبی فریضہ قرار دے رہے ہیں اور ٹیکسز کو حکومت کی آمدنی کا ذریعہ۔ زکوٰۃ سے مقصد غریبوں اور مفلسوں کی مدد کرنا ہے اور ٹیکسز کا مقصد حکومت کا کاروبار چلانا۔ یعنی ان کے نزدیک غریبوں اور مفلسوں کی مدد کرنا حکومت کے کاروبار میں داخل نہیں۔ سوچئے کہ کیا یہ ذہنیت مذہب اور سیاست میں اسی ثنویت کی غماز نہیں جو ہمارے دور ملوکیت میں پیدا ہوئی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات بر بنائے مصلحت زبان سے کچھ ہی کہیں' ان کے ذہنوں میں اسی اسلام کا نقشہ منقوش ہے جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس اسلام کی حیثیت پرائیویٹ عقیدے کی سی تھی لیکن اب اس کا احیاء حکومت کے قوانین کی حیثیت سے کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اس سے ایسی الجھنیں پیدا ہوجائیں گی جن سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جو قوانین ہزار سال پہلے کے زمانے کی ضروریات کے پیش نظر مرتب کئے گئے تھے وہ آج کے زمانے کی ضروریات اور تقاضوں کو کسی صورت میں بھی پوا نہیں کرسکتے۔ اگر اس پر اصرار کیا گیا

۲۔ اس کے برعکس مولانا نورانی صاحب کا ارشاد ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے زکوٰۃ کے سوا کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جاسکتا۔ اور شیعہ حضرات کا ارشاد ہے کہ فقہ جعفری کی رُو سے زکوٰۃ کی پوزیشن سُنّی نظام زکوٰۃ سے مختلف ہے۔

تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے ہاں کی نئی نسل سرے سے اسلام ہی سے برگشتہ ہو جائے گی اور اقوام عالم اس نتیجے پر پہنچ جائیں گی کہ اسلام زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔

جہاں تک اسلام کے احیاء کا تعلق ہے اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید کے غیر متبدل احکام' اصول اور اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اسلامی مملکت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین و ضوابط خود وضع کرے۔ اس مملکت کی جس سنٹرل اتھارٹی کی طرف سے یہ قوانین و ضوابط نافذ ہوں گے اسے ہم مرکز ملت کہہ کر پکارتے ہیں۔ خلافت راشدہ میں اسلامی نظام کی یہی شکل تھی۔ ان کے نزدیک' حکومت کا فریضہ زکوٰۃ دینا تھا' زکوٰۃ لینا نہیں۔ اور وہ افراد معاشرہ سے اس وقت تک کچھ نہیں لیتے تھے۳۔ جب تک مملکت انہیں کچھ دے نہ۔

ایک آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان ہے کہ میں اپنی آزادی حاصل کرنے کے بعد' حکومت کے واجبات کی رقم جمع کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا' پھر اپنی رقم واپس لے جا۔ جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لے کر آنا۔

(شاہکار رسالت' ص ۳۶۸ ایڈیشن چہارم (بلا ترمیم) ۱۹۸۷ء)

---------------------- ○ ----------------

آخر میں ہم اس کی وضاحت کردیں کہ جو کچھ ہم نے گزشتہ صفحات میں لکھا ہے وہ قرآنی نظام مملکت سے متعلق ہے۔ حکومت پاکستان جن قوانین کو نافذ کرے گی ان کی فرماں پذیری اسی طرح لازم ہوگی جس طرح حکومت کے دیگر قوانین کی۔

---------------------- ○ ----------------

یہاں تک لکھا جاچکا تھا کہ ہمارے سامنے دو ایسی شہادات آئیں جن سے ہمارے ان خدشات کی مزید تصدیق ہوگئی جن کی طرف ہم شروع سے اشارہ کرتے چلے آرہے ہیں' یعنی یہ کہ اگر کسی ایک فرقہ کے فقہی قوانین کو مملکت کے پبلک لاز کی حیثیت سے نافذ کردیا گیا تو اس سے ایسے فرقہ وارانہ اختلافات رونما ہو جائیں گے جن کا ازالہ ناممکن ہوگا۔ لاہور سے شائع ہونے والا ماہنامہ "محدث" فرقہ اہل حدیث کا ترجمان ہے۔ اس کی ربیع الاول و الاخر ۱۳۹۹ھ کی اشاعت میں سید بدیع الدین شاہ صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے' جس کا عنوان ہے "اسلام کا دستور صرف قرآن و سنت ہے' فقہی اور وضعی روایات نہیں"۔ اس میں انہوں نے مسلک اہل حدیث کی روشنی میں حالیہ نافذ شدہ "قوانین حدود" اور

۳۔ مملکت جو کچھ افراد معاشرہ سے لیتی تھی (یا بالفاظ صحیح' جو کچھ افرادِ معاشرہ مملکت کو دیتے تھے) اس کا مقصد' افراد کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا تھا۔ اس مقصد کی روشنی میں دیکھا جائے' تو حکومت کے تمام محاصل (آمدنی) کو زکوٰۃ کہا جائے گا۔ یعنی سامانِ نشوونما پہنچانے کا ذریعہ۔

زیر تجویز زکوٰۃ اور عشر سے متعلق قوانین کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ زنا اور سرقہ کے متعلق جو قوانین نافذ ہوئے ہیں وہ ناقص اور نظر ثانی کے مستحق ہیں۔ جہاں تک زکوٰۃ اور عشر کا تعلق ہے' انہوں نے لکھا ہے کہ:

> مغرب کے تصور تدوین قانون یا فقہی جمود و تقلید کو اپنانے سے الجھنیں بڑھ جائیں گی۔ ٹیکسوں کا مسئلہ "مکس ٹیکس" کے جواز پر مبنی ہے۔ اسلامی نظام معیشت میں اس کی حرمت اور وعید زنا سے بھی شدید تر ہے۔ نیز جب زکوٰۃ و عشر کو اسلامی معیشت و کفالت میں رکھ کر دیکھا جائے تو ٹیکس کی ضرورت ہی ختم ہوجاتی ہے۔ موجودہ ٹیکس کی بنیاد دین و دولت (مذہب و سیاست) کی تقسیم پر ہے۔ لہٰذا' علماء دین کو مرعوبیت کی بجائے اصل اسلام کی تفصیلات کو سامنے رکھنا چاہئے۔ (فٹ نوٹ ص۳)

یہ تو رہے اہل حدیث حضرات۔ جیسا کہ معلوم ہے' تیرہ۔ چودہ اپریل کو بھکر میں "آل پاکستان شیعہ کنونشن" کا انعقاد ہوا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ:

> شیعان علیؑ کے لئے فقہ جعفریہ کے مطابق قوانین نافذ کئے جائیں۔ زکوٰۃ کا نظام علحدہ کیا جائے۔ اوقاف بورڈ علحدہ کئے جائیں۔ شریعت بنچوں میں نمائندگی دی جائے۔
>
> (مساوات و پاکستان ٹائمز' مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء)

یہ واضح ہے کہ شخصی قوانین (پرسنل لاز) میں تو یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہر فرقہ کے معاملات اس فرقہ کی فقہ کے مطابق طے پائیں۔ لیکن پبلک لاز میں یہ ممکن ہی نہیں ہوتا۔ پبلک لاز تو کہتے ہی ان قوانین کو ہیں جن کا اطلاق' تمام افراد مملکت پر یکساں ہو۔ آپ سوچئے کہ کسی ایک فرقہ کے فقہی قوانین کو پبلک لاز کی حیثیت سے' اسلامی قوانین کے طور پر نافذ کردینے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ دوسرے فرقے انہیں اسلامی تسلیم کرنے سے انکار کردیں گے اور اپنی فقہ کے قوانین کے نفاذ پر اصرار کریں گے۔ حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ان کے مطالبہ کو تسلیم کرلے۔ کیونکہ مملکت میں' مختلف فرقوں کے لئے مختلف پبلک لاز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے جو صورت حالات پیدا ہوسکتی ہے' ظاہر ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں' اہل حدیث اور شیعہ حضرات کی طرف سے حنفی فقہ کے نفاذ کے خلاف یہ احتجاج نیا نہیں۔ جب ۱۹۷۰ء میں مودودی مرحوم نے یہ کہا تھا کہ کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جسے اہل حدیث اور شیعہ حضرات اسلامی تسلیم کرلیں' اس لئے مناسب ہوگا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کردی جائے۔ تو ان حضرات کی طرف سے اس تجویز کے خلاف شدید احتجاج ہوا تھا۔ اسی کا اعادہ اب ہو رہا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں ہم ارباب حکومت کی خدمت میں پوری دل سوزی کے ساتھ عرض کریں گے کہ وہ اس فیصلہ پر نظر ثانی فرمائیں اور اسلامی نظام کا آغاز اختلافی قوانین کے بجائے ان قرآنی اقدار سے کریں جو تمام افراد کے لئے منفعت بخش ہیں اور جن میں کسی کو اختلاف نہیں۔ مثلاً" یہ کہ ملک میں کوئی شخص بھوکا نہ رہے۔ ہر ایک کی

ضروریات زندگی پوری ہوتی جائیں۔ کوئی شخص بلا علاج نہ مرجائے اور مرنے کے بعد اس کے پس ماندگان بلا سہارا نہ رہ جائیں۔ کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہ جائے اور ہر ایک کو اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ ہر ایک کو بلا قیمت عدل مل سکے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ لاکھوں مقدمات عدالتوں کے ریکارڈ کے نیچے دبے ہوئے' فیصلوں کے منتظر ہیں۔ ہزار ہا ملزم جیلوں میں سڑ رہے ہیں کہ ان کے مقدمات کی سماعت کی باری نہیں آتی۔ وہ جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں اور ان کے لواحقین بھوکوں مر رہے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے بھی ہیں جو بالآخر بے گناہ ثابت ہوں گے۔ وہ جیلوں میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اور مسائل ہیں جن کے حل کے لئے اسلامی نظام کا آغاز کیا جانا چاہئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ملک باہمی اختلافات کے خطرات سے محفوظ رہ جائے گا' بلکہ اقوام عالم' اسلام عطا کرنے والے خدا کی رب العالمینی اور اس کے رسولؐ کی رحمتہ اللعالمینی کے انسانیت ساز اور زندگی بخش نتائج کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کرسکیں گی۔ اسے کہا جائے گا------ اسلامی نظام----- خدا کرے کہ ہماری اس استدعا کو شرف باریابی حاصل ہو اور اسے درخور اعتنا سمجھا جائے۔ والسلام (المرقوم ۱۶ اپریل ۱۹۷۹ء)

(مئی ۱۹۷۹ء)

۲۔ اس پر اہل حدیث کی طرف سے اعتراض

چونکہ ہمارا مروجہ معاشی نظام جسے بدقسمتی سے اسلامی نظام کہہ کر پکارا جاتا ہے' ہمارے دور ملوکیت کا وضع کردہ ہے' فلہذا انتہائی سرمایہ دارانہ ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں کسی نے "روٹی" کا نام لیا انہیں خطرہ لاحق ہوگیا کہ یہ کمیونزم کے سیلاب کی علامت ہے جو اسلام کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ چنانچہ ایسا کہنے والے کے خلاف یہ دہائی مچا دیں گے کہ وہ کمیونسٹ ہے' ملحد ہے' بے دین ہے۔ اور اگر کہیں اس نے یہ کہہ دیا کہ قرآن مجید میں روٹی کے مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے تو یہ شور مچا دیں گے کہ یہ اسلام کی تحریف ہے۔ یہ قرآن کی تعلیم کو مسخ کرنا ہے وغیرہ **ذالک**۔

اس کی تازہ ترین مثال ہمارے سامنے ہے۔ طلوع اسلام کی اشاعت بابت مئی میں زکوۃ کے قرآنی مفہوم کو واضح کرتے ہوئے اس کے معاشی نظام کے نمایاں خط و خال کو بھی سامنے لایا گیا تھا۔ اس میں کہا یہ گیا تھا کہ قرآنی نظام کی رو سے تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اسلامی مملکت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس نظام میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا اور یہ حقیقت حضور نبی اکرمؐ کی اس حدیث کے عین مطابق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

> جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' اس بستی سے خدا کی حفاظت اور نگرانی کا ذمہ ختم ہوگیا۔

جماعت اہل حدیث کے ترجمان' ہفت روزہ "الاعتصام" کو اس قرآنی نظام میں کمیونزم کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آیا اور اس نے اپنی ۲۵ مئی اور یکم جون کی اشاعتوں کے اداریہ میں انتہائی غیظ و غضب کا اظہار فرمایا ہے۔ اداریہ کا عنوان ہے:۔

"طلوع اسلام" کا اشتراکی نظریہ

(حدیث سے انحراف اور قرآن میں تحریف)

اس میں قرآن کے معاشی نظام کے خلاف کس قسم کے دلائل دیئے گئے ہیں' اس کی صرف ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔ کہا گیا ہے کہ "طلوع اسلام" نیں قرآن کی متعدد آیات میں تحریف کی گئی ہے۔ مثلاً "**وان لیس للانسان الا ما سعی وان سعیہ سوف یری ثم یجزہ الجزاء الاولی** (۴۱-۳۹/۵۳) انسان کو وہی ملے گا جو اس کی سعی ہے اور اس کی سعی ضرور دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو بدلہ ملنا ہے اس کا پورا بدلہ"۔

اس کے بعد لکھا ہے:۔

> یہ آیت آخرت کے متعلق ہے کہ وہاں انسان کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے کمایا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کسی کا بوجھ دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ نیز ہر ایک کی سعی و کوشش اس کے سامنے رکھ دی جائے گی اور اس کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (الاعتصام ۲۵ مئی ۱۹۷۹ء' ص ۴)

یعنی ان حضرات کے نزدیک قرآن کریم میں بیان کردہ عدل و انصاف کے تمام اصولوں کا تعلق آخرت سے ہے' اس دنیا سے نہیں۔ بالفاظ دیگر:۔

۱۔ آخرت میں تو ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ ملے گا' لیکن اس دنیا میں ہر ایک کو چھٹی ہوگی کہ وہ دوسروں کی محنت کا جس قدر استحصال کر سکتا ہے کرے۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

۲۔ آخرت میں تو یہ اصول کار فرما ہوگا کہ کسی کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں لادا جائے گا لیکن اس دنیا میں ہر صاحب قوت کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ جس قدر جی چاہے اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ دوسروں پر لادتا چلا جائے۔

اس ایک مثال سے آپ قرآن کریم میں بیان کردہ دیگر اصول اور قوانین کا اندازہ لگا لیجئے یعنی قانون کی حکمرانی' ہر ایک سے عدل و انصاف کی تاکید' مظلوم کی داد رسی' کمزور کی حفاظت' طبقاتی ناہمواریوں کا استیصال' احترام انسانیت وغیرہ تمام اصولوں کا اطلاق اخروی زندگی میں ہوگا' اس دنیا کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ ہے ان حضرات کے پیش کردہ اسلام کا تصور۔

ہم نے لکھا تھا:۔

> قرآن کے معاشی نظام میں ہر فرد محنت کرتا ہے۔ اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب بطیب خاطر نظام مملکت کی تحویل میں دے دیتا ہے'

تاکہ وہ اس سے عالمگیر ربوبیت کا فریضہ سرانجام دے۔

یہ تو ان حضرات کے نزدیک خلاف اسلام ہے اور مطابق اسلام یہ ہے کہ ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ بے حد و نہایت دولت جمع کرے' بلا تحدید جائدادیں کھڑی کرے' کارخانے تعمیر کرے' ہزاروں ایکڑ زمین کے رقبوں کا مالک بن جائے اور سال کے بعد اس میں سے چند ٹکے خدا کے نام پر الگ کردے۔

ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ بتائیں کہ خود نبیؐ اکرم کی حیات طیبہ کون سے اسلام کی حامل تھی؟

۱۔ کیا حضورؐ بے حد و نہایت دولت کے مالک تھے یا ضرورت سے زیادہ ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے؟

۲۔ کیا حضورؐ نے اپنی زندگی میں کبھی وہ زکوٰۃ ادا کی تھی جو ہمارے ہاں مروجہ چلی آرہی ہے؟

۳۔ کیا حضورؐ نے اپنے لئے جائدادیں کھڑی کر رکھی تھیں اور آپ لا محدود زمین کے رقبوں کے مالک تھے' یا سکنی حجروں کے سوا' حضورؐ کا کوئی مکان نہیں تھا۔ اور ایک مرلہ زمین بھی حضورؐ کی ملکیت میں نہیں تھی؟

۴۔ کیا حضورؐ نے اپنے ترکہ میں مال و دولت' زمینیں اور جائدادیں اپنے ورثاء کے لئے چھوڑی تھیں یا اس ترکہ میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا؟

ان سوالات کا جو جواب آپ کی طرف سے ملے گا' ظاہر ہے کہ وہی صحیح اسلام ہوگا اور اسی کا اتباع' اتباع سنت نبویؐ۔ دنیا دیکھے گی کہ یہی وہ اسلام ہے جسے طلوع اسلام پیش کرتا ہے اور آپ اسے محرف قرآن اور منکر سنت رسولؐ اللہ قرار دیتے ہیں۔

ضمناً" "الاعتصام" نے یہ بھی لکھا ہے:۔

> حدیث شریف کی رو سے تو صلوٰۃ کا مفہوم بھی متعین ہے اور زکوٰۃ کی صورت بھی مقرر جس کی پشت پر امت مسلمہ کا چودہ سو سالہ عملی تواتر بھی موجود ہے۔ ان کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ اس کے بعد اسلام کو مسخ کرنے کا راستہ کھل گیا ہے۔ اب پرویزی "قرآنی مفہوم" کی رو سے نہ نماز کا مطلب وہ ہے جس پر چودہ سو سال سے مسلمان عمل کرتے آرہے ہیں اور نہ زکوٰۃ کا وہ مطلب جو مسلمان انفاق مال کی ایک متعین صورت سمجھتے آئے ہیں۔

زکوٰۃ کے متعلق آگے چل کر بات ہوگی۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے کیا آپ پرویز صاحب کی ہزارہا صفحات پر مشتمل تحریروں میں کسی ایک مقام پر بھی یہ دکھا سکتے ہیں کہ انہوں نے نماز کے اس طریق سے الگ کوئی طریقہ تجویز کیا ہو' جو امت میں مسلسل چلا آرہا ہے (یا چلے آرہے ہیں) یا کوئی نیا طریقہ وضع کیا ہو۔ اس کے برعکس' ہم بکثرت ایسے مقامات دکھا سکتے ہیں جس میں انہوں نے ان طریقوں میں کسی قسم کے رد و بدل یا کسی نئے طریقے کے وضع کرنے کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں سوچئے کہ آپ نے پرویز صاحب کے خلاف کس قدر سنگین بہتان کا افترا کیا ہے۔ خدا اور اس کے رسولؐ کی بارگاہ سے اس قسم کے بہتان کی جو وعید ملتی ہے اس سے یقیناً" آپ واقف ہوں گے۔

خدا کے لئے جوش مخالفت میں اپنی عاقبت تو خراب نہ کیجئے۔

جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے' الاعتصام نے کہا یہ ہے کہ اس کے نصاب وغیرہ کی جو متعین شکل چلی آ رہی ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی' خلاف سنت رسول اللہ اور اسلام میں تحریف ہے۔ الاعتصام نے طلوع اسلام کی جس اشاعت کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے (یعنی مئی ۱۹۷۹ء) اس کے ص۱۱ پر' خود جماعت اہل حدیث کے دوسرے ترجمان اہلحدیث کا ایک اقتباس دیا گیا ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ زکوٰۃ کا نصاب وغیرہ جس زمانہ میں مقرر کیا گیا تھا' موجودہ زمانے کے حالات اس زمانے کے حالات سے مختلف ہیں' اس لئے ان میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اسی صفحہ پر رابطہ عالم اسلامی (جو ایک اہل حدیث حکومت کا تنظیمی ادارہ ہے) کے ایک مقالہ کا اقتباس شائع ہوا ہے جس میں زکوٰۃ کی مروجہ تفصیلات میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

جریدہ الاعتصام کو نہ تو اہلحدیث کی تجویز میں تحریف دین یا اختلاف سنت رسول اللہ کی کوئی جھلک دکھائی دی ہے اور نہ ہی رابطہ عالم اسلامی کے نظریہ میں کمیونزم کی کوئی رمق۔ اسے تحریف دین' اختلاف سنت نبوی اور کمیونزم کی شعلہ فشانیاں دکھائی دی ہیں تو صرف طلوع اسلام میں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اہل حدیث اور رابطہ عالم اسلامی کا تعلق الاعتصام کی اپنی برادری سے ہے اور طلوع اسلام' قرآن مجید کی روشنی میں' فرقہ ورانہ عصبیت کو شرک سمجھتا ہے۔

الاعتصام نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس مفہوم کی پشت پر امت مسلمہ کا چودہ سو سالہ عملی تواتر بھی موجود ہے اس کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے۔

ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر امت کا عملی تواتر دین میں سند کی حیثیت رکھتا ہے تو آپ مسلک اہل فقہ سے اختلاف کیوں رکھتے ہیں جسے امت کی اکثریت کا عملی تواتر حاصل ہے؟ (جولائی ۱۹۷۹ء)

(اس کا کوئی جواب ان کی طرف سے شائع نہیں ہوا)

۳۔ زکوٰۃ کے مروجہ نظام کے خلاف اعتراضات

(خود مذہب پرست طبقہ کی طرف سے)

زکوٰۃ اور عشر کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں' مذہبی جماعتوں کی طرف سے ان کا بڑا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ قرآن کریم کی روشنی میں زکوٰۃ کے صحیح مفہوم کے متعلق طلوع اسلام کی اشاعت بابت مئی' میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔ اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے مروجہ زکوٰۃ کے متعلق جماعت اسلامی کا کیا خیال تھا۔ ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شیخ یوسف القرضاوی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "اسلامی معیشت کی کامیابی کے لئے چند ناگزیر شرائط"۔ اس کا ترجمہ عبدالحمید صدیقی

(مرحوم) نے کیا تھا۔ اس میں زکوٰۃ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا وہ غور طلب ہیں:۔

"فرض کیجئے آج کوئی معاشرہ جو اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرتا ہے' نظام زکوٰۃ کو نافذ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ میری رائے میں اس کا نتیجہ مندرجہ ذیل ہوگا:۔

۱۔ اتنی کم مقدار میں زکوٰۃ جمع ہوگی کہ وہ افلاس کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہوگی۔ اس کی کے کئی اسباب ہیں جن میں مندرجہ ذیل دو بڑے اہم ہیں:۔

اولاً : لوگ حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے کترائیں گے۔ کیونکہ حکومت نے پہلے ہی بہت سے ناقابل برداشت قسم کے ٹیکس لگا رکھے ہیں۔ اور حکومتیں جو زکوٰۃ جمع کریں گی اور کتاب و سنت کی عملداری کا اہتمام نہیں کریں گی' ان پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ چکا ہوگا۔ نیز انہیں یہ خیال ہوگا کہ زکوٰۃ کی رقم شریعت کی رو سے جائز کاموں پر خرچ ہونے کے بجائے' محض سیاسی مقاصد کے حصول پر صرف کی جائے گی جیسا کہ اکثر ٹیکسوں کی رقم کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم معاشرے کے افراد کی کثیر تعداد دینی احکام کی پابندی قبول کرنے کے جذبے اور شعور اسلامی سے غیر اسلامی فکری یلغار کے باعث محروم ہو چکی ہے۔

ثانیاً : قوم مسلم کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ اس کے پاس اتنی دولت یا آمدنی نہیں کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو سکے۔ اور یہ اثر ہے اس طرز حیات کا جسے دور حاضر کے مسلمان اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ طرز حیات ہے ان غیر ملکی کفار کا جن کی مسلمان اندھی تقلید کر رہے ہیں' یہاں تک کہ اگر وہ سانپ کے بل میں انگلی ڈالیں گے تو یہ بھی ڈالیں گے۔ اور وہ طرز زندگی معیشات' ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ناجائز اور حرام لہو و لعب میں فضول خرچی اور اسراف پر قائم ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کی اس تھوڑی سی مقدار کا ایک حصہ انتظامی پیچیدگیوں اور ظاہری نمود و نمائش پر توجہ دینے کے باعث دفاتر زکوٰۃ' سامان نوشت و خواند اور زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کے لئے رکھے گئے ملازموں پر خرچ ہو جائے گا۔ یوں زکوٰۃ فقراء و مساکین تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔

۳۔ چونکہ حکام اور عوام کو اسلامی طرز زندگی کی کوئی تربیت نہیں دی گئی اور ان کے قلب و ضمیر کو مسلمان نہیں کیا گیا' لہذا تقسیم زکوٰۃ کے وقت گڑ بڑ اور دھاندلی ہوگی' جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثر مستحقین زکوٰۃ تو زکوٰۃ سے محروم رہ جائیں گے اور غیر مستحق لوگ زکوٰۃ لے جائیں گے۔

۴۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف زکوٰۃ سے معاشرے کے جملہ فقراء و مساکین کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہو سکیں گی بلکہ ان میں سے صرف وہ تھوڑے سے لوگ ہی زکوٰۃ سے فائدہ اٹھا سکیں گے جنہیں تقسیم زکوٰۃ کے وقت کچھ رقم مل جائے گی۔ اس کے بعد نظام زکوٰۃ کے بارے میں عام لوگ شکوہ و شکایت کرتے ہوئے اس کی عدم افادیت کے قائل ہو جائیں گے۔ اور یوں اسلام کے پورے نظام زندگی کے بارے میں شکوک و شبہات کی راہیں کھل جائیں گی"۔ (جولائی ۱۹۷۹ء)

ساتواں باب

ارکان اسلام کے مقاصد

۱۔ حج کا مقصد

(جب حج کا زمانہ قریب آتا ہے تو تقاضے موصول ہونے لگ جاتے ہیں کہ حج کے مقصد کے متعلق لکھا جائے۔ ہم اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن احباب کے مطالبہ کے پیش نظر ہم ذیل میں پرویز صاحب کی وہ تقریر درج کرتے ہیں جو انہوں نے نومبر ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان سے نشر فرمائی تھی)
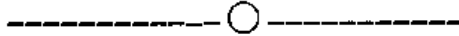
اس سرزمین پر جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ایک اہم سوال کے حل میں غلطاں و پیچاں نظر آرہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنا ہے اور جب وہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس تصادم اور ٹکراؤ سے فساد کی چنگاریاں اٹھتی ہیں جو ان کے خرمن امن و سلامتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں۔ وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ مضطرب و بے قرار رکھا ہے یہ ہے کہ کون سی شکل پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکیں۔ انسانیت کی تاریخ اسی سوال کے حل کی مسلسل داستان ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا سوچا اور تجربہ نے اسے کس طرح غلط ثابت کردیا۔ قرآن نے انسان کی اس کوشش اور کوشش کے مال کو ایک چھوٹی سی مثال میں اس طرح واضح کردیا ہے کہ نگہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے وجد و کیف سے جھوم اٹھتی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

ولا تکونوا کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انکاثا (۱۶/۹۲)

تمہاری مثال اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور (پھر خود اپنے ہی ہاتھوں سے) اسے بکھیر ڈالا۔ قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کرکے دیکھئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جدوجہد پر غور کیجئے۔ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظام تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس عمارت کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں محو رہتا

ہے لیکن ابھی وہ عمارت' تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اس عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین مرقع خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا جس کی ٹھیکریاں اپنے مٹے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیث الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا' مصر اور یونان' چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھئے اور سوچئے کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہی ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

ادوار سابقہ کی طرح عصر حاضر کے انسان نے بھی اس سوال کے حل میں دماغ سوزی کی اور اس کی فکر و کاوش کا نتیجہ نیشنلزم (قومیت پرستی) کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا جس پر اقوام مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوام عالم کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ یورپ نے اس نسخہ کیمیا کو اس قدر کامیاب قرار دیا کہ ان کے آئینہ فکر میں قومی محبت (PATRIOTISM) کو شرف انسانیت کی انتہا تصور کرلیا گیا ہے۔ لیکن جنگ اول نے بالعموم اور اس کے بعد جنگ دوم کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب نے بالخصوص اس حقیقت کو بے نقاب کردیا کہ جسے تریاق سمجھا جاتا تھا وہ انسانیت کے لئے زہر قاتل ہے۔ چنانچہ دانایان مغرب اپنی اس سوت کی انٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے بکھیرنے کی فکر میں ہیں۔ ڈاکٹر ککلے نے ۱۹۴۷ء میں کہا تھا:۔

> قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بہ حیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے' انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے' باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے۔

اب اس مسئلہ کا حل یہ سوچا جا رہا ہے کہ مختلف اقوام کے گروہوں کو ملا کر متحدہ حکومتیں قائم کی جائیں۔ حتی کہ تمام اقوام عالم کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اقوام یورپ کو ایک گروپ بنا لینے کی تجویز یا مجلس اقوام متحدہ اور ان کی حفاظتی کونسل کا قیام یا ونڈل وکی کا ONE WORLD کا تصور اسی انتہا کا نقطہ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال' اقوام مغرب کے موجودہ تصور حیات کے ماتحت عملی طور پر اس کا امکان ہو یا نہ ہو' نظری طور پر اب یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ تمام دنیا کو ایک برادری تصور کرکے ان کے تمدنی مسائل کی پیچیدگیوں کا حل سوچا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر (GAULD) اپنی کتاب (MAN, NATURE AND TIME) میں لکھتا ہے:۔

> اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوع انسانی کی منظم برادری قائم کی جائے۔

یہ ہے وہ حل جس تک ذہن انسانی بیسویں صدی تک پہنچ سکا ہے۔ لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر جبکہ دنیا کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے رہنے والے دوسرے گاؤں کے باشندوں سے بھی بمشکل واقف ہوسکتے تھے' قرآن نے یہ

بتایا کہ:

کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین ص(۲/۲۱۳)

چونکہ تمام نوع انسانی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے--- اس لئے اس مقصد کے پیش نظر کہ ان کے مفاد کے باہمی تصادم سے فساد کی چنگاریاں نہ ابھریں' خدا نے ایسی تعلیم بھیجی جس پر عمل پیرا ہونے سے فساد کا امکان نہ رہے۔ چنانچہ اس نے حضرات انبیاءؑ کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اس تعلیم کے حامل تھے' فرمایا کہ:

ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون (۲۱/۹۲)

تمہاری یہ امت' ایک امت واحدہ ہے اور اس کی وجہ جامعیت اس حقیقت پر ایمان کہ ان سب کا پروردگار ایک ہے۔

اس وحدت انسانی کی عملی شکل اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو۔ سب انسان خدا کے قانون کے محکوم رہیں۔ یہ تعلیم اپنی آخری شکل میں قرآن کریم کی رو سے انسانوں تک پہنچی جس کا مقصود تمام نوع انسانی کو ایک برادری تصور کرکے جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت آدم کی عملی شکل میں تشکیل کرنا ہے۔ اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی نقطہ کی طرف قدم اٹھاتے ہیں لیکن اس کی تکمیل حج کے اجتماع میں ہوتی ہے جو اسلامی نظام کا اہم رکن ہے۔

حج سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز زبان' جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں' محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے' اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت' مرکز وحدت انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرائے ملت اپنے میں سے ایک امیر الامرا کا انتخاب کرلیں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کرلیں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے اور جو امن و سلامتی' انسانیت کا ضامن اور فلاح و سعادت آدمیت کا کفیل ہو۔ ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبہ حج میں اس پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان' مقام منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا عملی اثر اور رد عمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی' جس کے لئے "قربانی" تجویز کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں کو واپس آجائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام نوع انسانی کو ایک امت واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایاہے۔ قرآن کریم نے حج کے اس مقصد اور غایت کو دو مقامات پر دو دو الفاظ میں بیان کردیا ہے۔ آپ ان مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند' اور کوئی انداز

بیان اس سے بلیغ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ...... **لیشھدوا منافع لھم** (۲۲/۲۸) تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں۔ اور اس کی غایت؟ **قیاما للناس** (۵/۹۷) یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

غور کیجئے! کیا دنیا میں کسی کانفرنس' کسی اسمبلی' کسی پارلیمنٹ' کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند ہو سکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرف انسانیت کے قیام کا باعث ہو۔ کسی خاص قوم' خاص جماعت' خاص ملک' خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کے قیام کا باعث! یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد یعنی **قیاما للناس**۔

کہا جاسکتا ہے کہ آج اقوام متحدہ کی مجلس (U. N. O) کے اجتماعات میں تمام دنیا کی قوموں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں اور ان کے سامنے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی رہے۔ پھر یہ اجتماعات اپنے مقصد پیش نظر میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے اور حج کے اجتماع میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر وہ اجتماع ایسے بلند اور درخشندہ مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ حج کے اجتماع میں فی الواقع ایک خصوصیت ہے اور وہ خصوصیت ہے ایک بندۂ مومن کے اس عہد و پیاں کی جو وہ اپنے خدا سے باندھتا ہے اور جس کی تجدید حج کا نقطہ آغاز ہے۔ ایک عبد مسلم اپنے خدا سے اقرار کرتا ہے کہ **ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین** (۶/۱۶۳) میری صلوٰۃ اور میرے مناسک' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ فقط اللہ کے لئے ہے' کسی اور غرض کے لئے نہیں' یعنی اس مقصد کے حصول کے لئے جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ یہ ہے وہ اقرار جس کی تجدید اس اجتماع عظیم سے پہلے تمام نمائندگان فداکارانہ انداز سے خدا کے گھر' یعنی ملت حنیفہ کے مرکز محسوس' کے گرد گھوم کر کرتے ہیں اور طرح زمین و آسمان کو اپنے اس عہد پر گواہ ٹھہراتے ہیں۔ ان نصب العین کو دل میں لئے ہوئے' یہ نمائندگان نوع انسانی' انسانیت کی فلاح و سعادت کا پروگرام مرتب کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد باندھتے ہیں۔ یہ ہے وہ خصوصیت جو دنیا میں کسی اور اجتماع کو حاصل نہیں۔ فلہذا' وہ اجتماعات' بلند آہنگ دعووں کے باوجود' انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے نہ آج تک کچھ کرسکے ہیں نہ آئندہ کرسکیں گے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد' اقوام مغرب نے جمعیۃ الاقوام (LEAGUE OF NATIONS) کی طرح ڈالی۔ لیکن علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "کفن چوروں" کی یہ جماعت جس بری طرح ناکام ہوئی' واقعات اس پر شاہد ہیں۔ اس کے متعلق (MR. REEVES) اپنی کتاب (ANATOMY OF PEACE) میں لکھتا ہے کہ "لیگ آف نیشنز" کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ "دنیا کے مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کرکے باہمی بحث و تمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جاسکتا ہے"۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوام مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربے کو دہرایا اور سمجھ لیا کہ لیگ آف نیشنز کا نام (UNITED NATIONS ORGANIZATION) رکھ دینے سے کامیابی ہو جائے گی۔ یہ جمعیت اقوام متحدہ کس بری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ابھی دو ہفتے ہوئے لندن کے اخبار "ڈیلی میل" نے کہا ہے کہ "جمعیت اقوام متحدہ اپنی موجودہ ہیئت میں امن عالم کے لئے سخت خطرے کا موجب ہے' اس لئے اسے فوراً

ختم کردینا چاہیئے"۔ اور اس کی وجہ (MR. REEVES) کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعہ دور نہیں ہوسکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوع انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت۔

یعنی وہی چیز جسے علامہ اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ: ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود!
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟

ر سے مقصود اسی "جمعیت آدم" کی تشکیل تھا۔ اس حج پر نگاہ رکھئے اور پھر اس حج پر جو آج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس آئین کہن میں آج بھی وہی روح پیدا کی جاسکتی ہے جو انسانیت کے شرف کی کفیل ہے۔ آج عالم اسلامی چاروں طرف سے مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشے پر کہیں ان کا نام نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ باہمی میل ملاپ کے سلیقے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن، کسی کی نگاہ اس طریق ربط و اخوت کی طرف نہیں اٹھتی جسے ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا، جس سے ہمارے دلوں میں ائتلاف اور نگاہوں میں یک رنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم اسے ایک بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجویز نہیں سوچتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر اقوام عالم کی تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے ہماری کامیابیاں انہی کے پیمانوں سے ناپی جائیں گی۔ لیکن جس وقت ہم نے اپنے اللہ سے بھلایا ہوا عہد استوار کرلیا اور پھر اس مرکز کو زندہ کردیا جس کی زندگی سے تمام نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے، اقوام عالم کی امامت ہمارے حصہ میں آجائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشت حیات سرسبز و شاداب ہوگی۔ آج مسلمانان عالم کو حج کا فریضہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ: ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

(نومبر ۱۹۷۸ء)

۲- حج بدل کی شرعی حیثیت

حج اسلامی عبادات کا پانچواں رکن ہے اور وہ ہر ایسے بالغ عاقل مسلمان پر' جو اس کے لئے سفر کے اخراجات برداشت کرسکتا ہو' پوری عمر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے- خود رسول اللہ نے ملک عرب میں رہنے کے باوجود' زندگی میں صرف ایک بار حج ادا کیا تھا- لیکن آج کل مختلف اسباب کی بنا پر ہمارے معاشرے کے ایک طبقہ میں دولت کی فراوانی ہوگئی ہے- اور اگرچہ حج کا اصل مقصد ہماری نظروں سے اوجھل ہوچکا ہے' لیکن دولت مند لوگ زیادہ حجوں کی تعداد پر فخر کرنے کے لئے ہر سال حج کرنے پر مصر ہوتے ہیں (انہیں نفلی حج کہا جاتا ہے)- چونکہ ہر سال حج کے موقع پر حجاج کرام کا اژدھام بڑھتا جاتا ہے جس سے فریضہ حج ادا کرنے (اور اس کا انتظام کرنے) والوں کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے' اس لئے سعودی عرب کے مشہور دینی ادارہ را بطتہ العالم الاسلامی نے یہ اپیل کی' کہ نفلی حج کرنے کے بجائے متعلقہ رقم کسی دوسرے دینی مقصد کے لئے خرچ کی جائے تو زیادہ ثواب ہوگا- اس اپیل کی روشنی میں بہت سے اسلامی ممالک نے نفلی حج پر پابندی لگادی ہے- لیکن دولت مند حضرات نے اس پابندی کو غیر موثر بنانے کے لئے ایک اصطلاح یعنی حج بدل کا سہارا لے لیا ہے جس کے ذریعے ہزاروں لوگ حج پر جانے کا ذریعہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں-

فقہ میں حج بدل کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ کوئی دولت مند مسلمان کسی خاص وجہ سے ( )" سخت بیماری یا حادثے کی وجہ سے) فریضہ حج ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو وہ کسی دوسرے مسلمان کو اس مقصد کے لئے بھیج کر اپنا فریضہ پورا کرسکتا ہے- یا کوئی ایسا مالدار آدمی جو اپنی زندگی یں فریضہ حج ادا نہ کرسکا ہو' اور وفات کے وقت یہ وصیت کر جائے کہ اس کے مال سے حج بدل کرایا جائے- لیکن آج کل جس حج بدل کا رواج پڑگیا ہے وہ اس سے مختلف ہے- اس کے لئے ایسے فوت شدہ رشتہ داروں کے نام پر حج بدل کیا جاتا ہے جن کی نہ تو حج کرنے کی استطاعت تھی اور نہ ہی انہوں نے حج بدل کے بارے میں کوئی وصیت کی تھی- واضح ر ہے کہ خود حج بدل کی شرعی حیثیت کے بارے میں سخت اختلاف ہے اور علمائے امت کا ایک گروہ اسے قرآن حکیم کے واضح ارشادات کے خلاف قرار دیتا ہے- وہ اسے عیسائیوں کے مشہور کفارہ کے عقیدے کا عکس قرار دیتے ہیں جو قرآن مجید کے اس ارشاد کے خلاف ہے کہ:

الا تزر وازرۃ وزر اخری و ان لیس للانسان الا ما سعی (۳۹-۳۸/۵۳)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور انسان کے لئے اس کی اپنی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے-

جو علماء حج بدل کا جواز ثابت کرنے پر مصر تھے' انہوں نے مذکورہ علماء پر معتزلہ ہونے کا فتویٰ جڑ دیا- خیال رہے کہ

معتزلہ ان علماء کو کہا جاتا ہے جو ہر دینی معاملہ میں قرآن کو سند قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ قرآن حکیم میں کوئی بات خلاف عقل نہیں۔ یہ لوگ احادیث رسول اللہ سے بھی استدلال کرتے تھے لیکن جو حدیث قرآن حکیم کے ارشادات سے ٹکراتی وہ اسے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ایسی حدیث رسول اللہ صلعم کا ارشاد نہیں ہو سکتا۔
چنانچہ علامہ آلوسی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

ان استدلال المعتزلہ بالایہ علی ان العبد اذا جعل ثواب عملہ۔ ای عمل کان بغیرہ لا یجعل ویلغوا جعلہ

(تفسیر روح المعانی، جلد ۲۷، صفحہ ۶۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ لاہور)

اس آیت سے معتزلہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی عبادت کا ثواب کسی دوسرے کو منتقل کردے تو وہ ثواب منتقل نہیں ہوتا، بلکہ ضائع ہو جاتا ہے۔

خود علامہ آلوسی معتزلہ کے استدلال کے مخالف ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ صرف معتزلہ کا مسلک نہیں، بلکہ امت مسلمہ کے کئی دوسرے ائمہ بھی حج بدل کے عدم جواز کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

بل قال الامام ابن الھمام ان مالک و الشافعی لا یقولون بوصول العبادات البدنیتہ المحفتہ کالصلوۃ والتلاوۃ بل غیرھا کا الصدقتہ والحج (ایضاً)

بلکہ امام ابن ہمام (مصنف شرح فتح القدیر) نے فرمایا ہے کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نہ صرف یہ کہ بدنی عبادات کے ثواب کی منتقلی کے قائل نہیں بلکہ صدقات اور حج کے بارے میں بھی ان کا یہ مسلک ہے کہ اس کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا۔

صدر اسلام میں کوئی ستر کے قریب فقہی مذاہب وجود میں آگئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں سے بیشتر نسیاً منسیاً ہوگئے اور صرف چار فقہی مذاہب باقی رہ گئے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ انہی (چار) میں سے دو فقہی مذاہب کے بانی تھے۔ ان کا شمار ائمہ حدیث میں بھی ہوتا ہے۔ اس لئے ان پر کسی مخالف تک نے بھی معتزلہ ہونے کا امکان نہیں لگایا۔
لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ امام مالکؒ کے استدلال کا بھی وہی طریقہ تھا جسے عام طور پر معتزلہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یعنی یہ کہ وہ ہر دینی معاملے میں قرآن مجید کو سند قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حج بدل کے جواز کے ثبوت کے لئے ان کے سامنے خشعمی عورت کے متعلق یہ حدیث پیش کی گئی۔

عن ابن عباس ان امراۃ من خثعم قالت یا رسول اللہ ان ابی ادرکتہ فریضہ اللہ فی الحج شیخا کبیرا الا یستطیع ان یستو فی علی ظھر بعیرہ قال فحجی عنہ

(نیل الاوطار' جلد چہارم' ص۳۰۰' مطبوعہ مصر ۱۹٦۱ء ایڈیشن)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ خشعم کی ایک عورت نے حضور صلعم سے دریافت کیا کہ جس وقت اس کے باپ پر حج فرض ہوا تو وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اس میں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس کی طرف سے حج کرلو۔

امام مالکؒ نے اس حدیث کو اپنے مجموعہ حدیث (موطا) میں شامل کیا ہے۔ لیکن اس کے خلاف جس طرح فیصلہ دیا ہے اسے امام قرطبی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:۔

وقال القرطبی رانی مالک ان ظاهر حدیث الخثعمیه مخالف للقران فیر حج ظاهر القران

(ایضاً" صفحہ ۳۰۲)

امام قرطبی نے کہا کہ قبیلہ خشعم کی عورت والی حدیث' قرآن مجید کے واضح ارشادات کے خلاف ہے' اس لئے حدیث کے مقابلے میں قرآن کو ترجیح دی جائے گی۔

اس طرح امام مالکؒ علمائے اسلام کے اس گروہ کے استدلال کو صحیح قرار دیتے ہیں جن پر معتزلہ کی پھبتی کس کر ان کے استدلال کی وقعت کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خیال رہے کہ امام مالکؒ اس وقت تک کوئی فتویٰ صادر نہیں فرماتے تھے جب تک کہ وہ اس کا اطمینان نہ کرلیتے تھے کہ مدینہ منورہ کے کم از کم ستر علماء ویسی ہی رائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں علمائے مدینہ کی اکثریت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کردہ مندرجہ ذیل حدیث بھی پیش کرتے تھے:۔

وروی سعید بن منصور وغیرہ عن ابن عمر باسناد صحیح انہ لا عن احد

(ایضاً")

سعید بن منصور اور کچھ دوسرے راوی صحیح اسناد کے ذریعے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جانب سے حج نہ کرے۔

سلف صالحین نے متفقہ طور پر حضرت عبداللہ بن عمر کو امت مسلمہ بھی سب سے بڑا متبع سنت قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ چھوٹی سے چھوٹی سنت پر عمل کا اہتمام اس طرح کرتے تھے جس طرح فرائض کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ کے تمام علماء حج بدل کو خلاف اسلام قرار دیتے تھے۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کی فقہ میں حج بدل کے خلاف جو تفصیلی احکامات ہیں ان کا متعلقہ حصہ بھی مختصراً" قارئین کی خدمت میں پیش کردیا جائے۔

قالوا الحج و ان کان عبادة مرکبه من بدنیه و مالیته ولکن غلب فیه

جانب البدنیتہ فلا یقبل النیابتہ فمن کان علیہ حجتہ الاسلام وھی حجتہ الفریضتہ فلا یجوزلہ ان ینیب من یحج عنہ

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱۹۵۰ء ایڈیشن' جلد اول' ص ۵۶۵)

مالکیہ کے نزدیک اگرچہ حج بدنی اور مالی عبادات کا مرکب ہے' لیکن اس میں بدنی عبادات کا حصہ غالب ہے' اس لئے اس میں کسی کو قائم مقام نہیں بنایا جاسکتا۔ پس جس پر حج فرض ہے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ اپنی طرف سے کسی کو حج بدل کے لئے مقرر کرے۔

یہی نہیں بلکہ مالکی مذہب میں ایسے شخص کے لئے سرے سے حج بدل کی نوبت ہی نہیں آتی۔ کیونکہ ان کے نزدیک جو شخص حج کرنے سے معذور ہوجائے' اس سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ومن عجز عن الحج بنفسہ ولم یقدر علیہ فی الی عام من حیاتہ فقد سقط عنہ الحج بتا تا۔ (ایضاً" صفحہ ۵۶۶)

جو خود حج کرنے سے عاجز ہوگیا اور زندگی کے کسی سال میں بھی اسے اس کی قدرت حاصل نہ ہوئی تو (استطاعت کے باوجود) حج اس سے ساقط ہوگیا۔

قبیلہ خشعم کی عورت والی روایت

قبیلہ خشعم کی عورت والی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ امام مالک نے اس روایت کو صحیح قرار دینے کے باوجود خلاف قرآن ہونے کی وجہ سے اسے مسترد کردیا۔ لیکن احناف کا استدلال عجیب ہے۔ ان کا ایک گروہ حج بدل کا قائل ہے' لیکن اس کے باوجود وہ اس حدیث کے ایک حصے پر عمل کرنے کو مکروہ قرار دیتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس بارے یں یہ فتویٰ سامنے آتا ہے:۔

اگر کسی کی طرف سے عورت نے حج کیا تو جائز ہے اور مکروہ ہے۔ یہ محیط سرخسی میں ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری اردو' مطبوعہ لاہور' جلد دوم' ص ۱۱۷)

معاف بفرمائیے۔ یہ سنت نبویؐ کا عجیب انداز کا احترام ہے کہ اس کے مطابق عمل جائز بھی ہے اور مکروہ بھی! اس کے علاوہ اس حدیث میں کافی اضطراب ہے۔ کسی روایت میں سائل عورت ہے اور کسی میں مرد۔ اسی طرح جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ بھی کہیں باپ ہے........ اور کہیں بہن۔ اور بعض کے نزدیک حضور صلعم کا یہ ارشاد خاص اس عورت کے لئے تھا اور اس کی تائید میں وہ اس حدیث کا یہ آخری ٹکڑا پیش کرتے ہیں:۔

حجی عنہ ولیس للحد بعدہ

(نیل الاوطار' جلد چہارم' ص۳۰۱)

اس کی جانب سے حج کرلو' لیکن اس کے بعد کسی کے لئے جائز نہیں۔

حدیث میں اس اضطراب کی وجہ سے علمائے احناف نے ایک دوسری غیر متعلقہ حدیث سے استدلال کیا ہے۔ لیکن اگر اس استدلال کو تسلیم کیا جائے' تو پھر دوسرے بہت سے مسائل میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے نتیجے میں ایسے تضادات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں' جن سے حج بدل کا جواز مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے پہلے انہوں نے یہ اصول قائم کیا:۔

الاصل فی ھذا الباب ان الانسان لہ ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ صلوۃ و صوما او صدقتہ اوغیرھا۔ عند اھل السنتہ والجماعتہ لعاوری عن النبی علیہ سلام انہ ضحی بکسبش املحین احدھما عن نفسہ والاخرعن امتہ

(شرح فتح القدیر مع ہدایہ' مطبوعہ مصر' جلد دوم' صفحہ ۳۰۸)

اس بارے میں اصل یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایک انسان اپنی عبادات مثلاً" نماز' روزہ' یا صدقہ وغیرہ کا ثواب دوسرے شخص کو منتقل کرسکتا ہے۔ اس کی سند وہ حدیث نبویؐ ہے کہ جس میں حضور صلعم نے دو ڈبڈے مینڈھے عید قربان کے دن ذبح کئے' ایک اپنی طرف سے اور دوسرا ساری امت کی جانب سے۔

اس اصول کی تائید میں قربانی والی جو حدیث پیش کی گئی ہے' اس پر گفتگو تو بعد میں ہوگی' لیکن یہاں ایک اور نکتہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان علماء سے جب یہ استدلال کیا گیا کہ جب اس اہم مسئلہ میں خود قرآن حکیم اور حضور صلعم کے واضح ارشادات موجود ہیں' اور فقہاء کی ایک کثیر تعداد بھی اس قرآنی حکم کو تسلیم کرتی ہے اور اس کے خلاف جو احادیث پیش کی جاتی ہیں ان کو مسترد کرتی ہے' تو آپ حضرات قرآن و سنت کے واضح احکامات کو ترک کرکے ایک غیر متعلق حدیث سے حج بدل کا جواز ثابت کرنے پر کیوں مصر ہیں۔ تو انہوں نے سرے سے قرآن حکیم کی اس آیت پر ہی ہاتھ صاف کردیا اور اس کے ثبوت میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب یہ قول پیش کیا۔

وعن ابن عباس ان الایتہ منسوختہ

(تفسیر روح المعانی' جلد ۲۷' ص ۶۶)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت (**لا تزر وازرۃ......** الخ) منسوخ ہے۔

جب علمی دلائل سے یہ واضح کیا گیا کہ یہ آیت منسوخ نہیں' تو پھر ایک نئی تاویل کا سہارا لیا گیا کہ قرآن مجید کا یہ

حکم بے شک واضح ہے لیکن اس کا تعلق امت مسلمہ سے نہیں بلکہ پہلی امتوں سے ہے۔ اور اس کی تائید میں عکرمہ کا یہ قول نقل کیا

وقال عکرمۃ کان ھذا الحکم فی قوم ابراھیم وموسی علیھما السلام

(ایضاً")

عکرمہ نے کہا ہے کہ قرآن کا یہ حکم (کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا) حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی امتوں کے بارے میں ہے۔

یہ تو تھا ایک خلاف قرآن عقیدہ اور عمل کا جواز ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم کے واضح ارشادات کے ساتھ سلوک۔ اب صحیح احادیث کے ساتھ ان کا طرز عمل ملاحظہ فرمائیں۔ ان حضرات سے جب یہ کہا گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کردہ صحیح حدیث کے مطابق حج بدل کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں رہتی' تو انہوں نے اس بنیاد پر اس صحیح حدیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اس کے مقابلے میں دوسری بہت سی احادیث ہیں۔ ان احادیث میں سرفہرست خثعمی عورت والی حدیث ہے۔ اس حدیث کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ اس میں جہاں دوسرے علماء کے نزدیک اضطراب ہے وہاں خود احناف اس کے آخری حصے پر عمل کرنے کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری غیر متعلقہ قربانی والی حدیث ہے۔ لیکن اس کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے ہم حنفی فقہ کے ایک بنیادی اصول' یعنی قیاس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اہل حدیث علماء کا حنفی فقہ اور فقہاء پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اکثر مسائل میں احادیث کو ترک کر کے قیاس یا رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ائمہ اہل حدیث کی کتابوں میں احناف کو اہل الرائے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ یہ حضرات قیاس کے بادشاہ تھے۔ اور بعض اوقات اس سلسلے میں ایسی ایسی نکات آفرینیاں کرتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بایں ہمہ' حج بدل کے معاملہ میں انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ:-

کان مقتضی القیاس ان لا تجری النیابۃ فی الحج لتضمنہ المشقین البدنیۃ والمالیۃ۔ (شرح فتح القدیر' جلد ۲' ص ۱۰)

قیاس کا اقتضاء یہ ہے کہ بدنی اور مالی عبادتوں کے اجتماع کی وجہ سے حج بدل جائز قرار نہیں پاتا۔

لیکن یہ قیاس چونکہ ان کے خود ساختہ مسلک کے خلاف پڑتا تھا' اس لئے انہوں نے اپنی ہی فقہ کی اس اہم بنیاد کو ترک کر کے ایسی احادیث کا سہارا لیا کہ جو ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف قرار پاتی ہیں۔ خثعمی عورت والی حدیث کی تفصیلات پیش کی جا چکی ہیں۔ اب دوسری غیر متعلقہ حدیث (بابت قربانی) کو لیجئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علمائے حدیث مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر اسے ضعیف قرار دیتے ہیں:-

ھذا حدیث غریب من ھذا الوجہ و قال المطلب بن عبداللہ بن حنطب۔

يقال انه لم يسمع من جابر

(نیل الاوطار' جلد پنجم' ص ۱۱۷)

یہ حدیث اس وجہ سے غریب ہے کہ (حدیث کے ایک راوی) مطلب نے حدیث کے آخری راوی حضرت جابرؓ سے اسے نہیں سنا تھا۔

اور جب علمائے حدیث کی صحیح قرار دادہ احادیث موجود ہوں' تو پھر اصولاً ضعیف حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر بالفرض اس حدیث کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے ایک عجیب و غریب چونکا دینے والا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ حدیث یہ (بیان کی جاتی) ہے کہ حضورؐ نے دو مینڈھوں کی قربانی دی' ایک اپنی طرف سے اور دوسری ساری امت کی طرف سے۔ سو جب حضورؐ ساری امت کی طرف سے قربانی دے چکے ہیں تو پھر امت کے کسی فرد کے لئے بھی قربانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی! سوچئے کہ یہ گہرا سوچنے کا مقام ہے۔

اپنے استدلال کی ان کمزوریوں کی وجہ سے حنفی فقہاء نے کچھ اس قسم کا فتویٰ دیا کہ حج بدل کا جواز بے معنی ہو کر رہ گیا۔ امام محمد حنفی فقہ کے بانی ثانی سمجھے جاتے ہیں کیونکہ فقہ حنفی انہی کے توسط سے آگے پہنچی ہے۔ انہوں نے اس بارے میں یہ فتویٰ صادر فرمایا:

وعن محمد رحمته الله ان الحج يقع عن الحاج والامر ثواب النفقته للانه عبادة بلنيته وعند الفجر اقيم الانفاق مقامه كالفديته في باب الصوم (ہدایہ مع شرح فتح القدیر' جلد دوم' ص ۳۱۸)

امام محمد سے روایت ہے کہ حج بدل میں حج تو حج کرنے والے کا ہوتا ہے البتہ جس کی طرف سے حج کیا جاتا ہے اسے ان اخراجات کا ثواب ملتا ہے جو اس نے اس حج کے لئے مہیا کئے تھے۔ اس کی معذوری کی وجہ سے حج کے یہ اخراجات اصل حج کے قائمقام ہو جاتے ہیں جس طرح روزے کا فدیہ۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب حج بدل کرانے والے کا فریضہ حج ادا ہی نہیں ہوتا تو پھر ایسے حج بدل کا فائدہ کیا؟ اور متاخرین علمائے احناف کا بھی اسی فتویٰ کے مطابق عمل رہا ہے۔ علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں:-

وعليه جمع من المتاخرين' صدر اسلام' الاستيجاني وقاضي خاف حتى نسب شيخ الاسلام هذا الاصحابنا لقال على قول اصحابنا اصلى الحج عن المامور-

(ایضاً"- ص ۳۲۱)

اور متاخرین علمائے حنفیہ کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے جن میں امام صدر اسلام الاستیجانی اور قاضی خاف شامل ہیں۔ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے کہ حنفی فقہ کے تمام ائمہ

کا یہی مسلک ہے اور ان کے اس مسلک کے مطابق حج بدل میں صرف اسی کا حج ادا
ہوتا ہے جو دوسرے کے اخراجات پر حج ادا کرتا ہے (یعنی حج بدل کرانے والے کا حج ادا
نہیں ہوتا)۔

حنفی فقہ کے ایک دوسرے استدلال کی روشنی میں بھی حج بدل کا جواز مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ یوں کہ ان کے
نزدیک کسی قسم کی عبادت اجرت پر کرانی جائز نہیں۔ امام کاسانی فرماتے ہیں۔

الا ستجار علی الصوم والصلوٰۃ والحج انہ لا یصح لا نہا من فروض الاعیان۔

(البدائع والصنائع، جلد چہارم، کتاب الاجارۃ، ص ۱۹۱ مطبوعہ مصر)

اجرت پر نماز، روزہ یا حج کی عبادات صحیح نہیں کیونکہ یہ عبادات فرض عین ہیں۔

حرف آخر مختصراً یہ کہ قرآن مجید، حدیث نبویؐ اور فقہا کے اقوال کے مطابق شریعت اسلامی میں حج بدل کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور دوسرے علمائے اسلام کی اکثریت کا فیصلہ واضح اور دو ٹوک ہے۔ اس کے برخلاف بعض علمائے احناف نے جو اس کا جواز ثابت کرنے کی کوششیں کی ہے تو اس سے قرآن حکیم کی ایک واضح آیت کو منسوخ قرار دینے کی نوبت آگئی۔ پھر انہیں اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لئے کئی تضادات کا سامنا کرنا پڑا۔ حتی کہ انہیں اس قسم کا فتویٰ دینا پڑا جس سے حج بدل کا جواز بے اثر ہو کر رہ گیا اور اس طرح حقیقت پر پردے ڈالنے کے باوجود قرآن حکیم کی یہ سچائی ابھر کر سامنے آگئی کہ کوئی انسان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہر ایک کے لئے اس کے اپنے عمل کے سوا کچھ نہیں۔ (پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

طلوع اسلام

دین (یعنی قرآنی نظام) کی رو سے "حج" امت کے نمائندگان اور مبصرین کے اجتماع کا نام ہے جس میں امت کے اجتماعی امور کے متعلق غور و فکر اور مشاورت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے تین الفاظ میں جامع طور پر اس اجتماع کا مقصد واضح کر دیا ہے جب کہا کہ: **لیشهدوا منافع لهم** (۲۲/۲۸) اس اجتماع سے مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی

آنکھوں سے دیکھ لیں (مشاہدہ کرلیں) کہ ان کا نظام اس کی منفعت (مفاد) کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ حج کے اس مفہوم و مقصود کے پیش نظر "کسی کا کسی کی طرف سے حج کرنے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن جب اسلام' دین کی جگہ مذہب بن گیا تو پھر اسلامی نظام (کے پروگرام) کے ان اجزاء کا مقصد "ثواب حاصل کرنا" رہ گیا اور پھر ثواب کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اسے دوسروں کی طرف منتقل بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسے "ایصال ثواب" کہا جاتا ہے۔ "حج بدل" بھی اسی اصل کی ایک شاخ ہے۔ اس میں حج کرنے والا' حج کے ثواب کو' اس شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے جس نے اسے حج کرایا تھا۔ یعنی حج کا ثواب تو وہ لے جاتا ہے اور حاجی کہلاتا یہ ہے۔ یہ درحقیقت سرمایہ داروں کے چونچلے ہیں۔ سرمایہ دار' محنت کئے بغیر محض سرمایہ پر منافع حاصل کرتا ہے۔ جو کچھ وہ دنیاوی معاملات میں کرتا ہے' وہ کچھ "اخروی معاملات" میں بھی کرنا چاہتا ہے۔ وہ حج کرنے کی محنت اور مشقت سے بچتا ہے اور کسی دوسرے کو روپیہ دیکر' اس کے بدلے میں حج کا ثواب حاصل کر لیتا ہے۔ وہ "جنت خریدنے" کے بیشتر معاملات میں ایسا ہی کرتا ہے۔ یہاں مسجد بنوادی اور بلا محنت و مشقت' محض سرمایہ کے بدلے جنت میں گھر حاصل کر لیا **وقس علی ذالک**۔ ایصال ثواب کا عقیدہ اسی ذہنیت کا وضع کردہ ہے۔ روپیہ لگا کر دیگیں پکوائیں' اجرتوں پر حافظوں سے قرآن پڑھوایا اور مولوی صاحبان سے ختم دلوایا اور اس سرمایہ پر منافع (یعنی ثواب) یا تو جیتے جی وصول کر لیا اور یا مرنے کے بعد' اگلی دنیا میں منگوا لیا۔

ایصال ثواب کا عقیدہ تو اپنی اصل کے اعتبار سے قرآن کریم کے قانون مکافات عمل کے یکسر خلاف ہے۔ قانون مکافات کا ملخص یہ ہے کہ:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلھا - (۱۷/۷)

اگر تم کوئی اچھا (نیک) کام کرو گے تو اس کا فائدہ تمہارے اپنے لئے ہوگا اور اگر کوئی برا کام کرو گے تو اس کا نقصان بھی تمہیں ہی اٹھانا پڑے گا۔

بات بالکل واضح ہے۔ آپ صبح کے وقت چار میل کی سیر کرتے ہیں۔ اس سے آپ کی صحت پر نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی سیر کا یہ اثر اپنے بھائی کی طرف منتقل کر دیں جو اس دوران میں پڑا سوئے رہتا ہے۔ آپ اپنی سیر (عمل) کا نتیجہ (خوشگواری صحت) کسی دوسرے کی طرف منتقل کر ہی نہیں سکتے۔ **لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت** (۲/۲۸۶) جو اچھا کام کرتا ہے اس کا فائدہ اسی کے لئے ہے۔ جو غلط کام کرتا ہے اس کا نتیجہ بھی اسی کو

بھگتنا پڑتا ہے۔ **ولا تزر وازرۃ وزر اخری** (۶/۱۶۵) کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ہے قانون مکافات عمل۔ اپنی محنت کی (زاید از ضرورت) کمائی کو دین کے اجتماعی نظام (فی سبیل اللہ) کے لئے دے دینا ایک ایسا عمل ہے جس کا اجر (معاوضہ) خود اس عمل کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ آپ کسی دوسرے کو روپیہ دے دیتے ہیں۔ وہ کچھ کام کرتا ہے اور اس کام کا اجر (ثواب) آپ کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اجر (کام کا نتیجہ) کام کرنے والے ہی کو ملتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے قانون مکافات عمل جو دین کی اصل اور اساس ہے (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کی کتاب "جہان فردا" میں ملے گی)۔

پروفیسر شہاب صاحب' مروجہ مذہب (اسلام) کے عقائد اور رسوم کا جائزہ' خود انہی حضرات کی مستند کتب کی روشنی میں لیتے ہیں اور اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ یہ کس طرح قرآن کے خلاف ہیں۔ ان کی اس قسم کی تحقیق و تدقیق اور سعی و کاوش کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قارئین کو معلوم ہو جاتا ہے کہ (وضعی) روایات اور فقہ کی رو سے کس طرح غلط عقائد و اعمال کو مستند بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ حتی کہ جب کوئی اور چارہ کار نہ رہے تو قرآن کی آیات کو منسوخ قرار دینے میں باک نہیں سمجھا جاتا۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا !
کہ افتاد است از بام بلندے

(جون ۱۹۷۸ء)

۳۔ روزوں کا مقصد

(خدا کی کبریائی کا قیام)

(پرویز صاحب کا خصوصی درس قرآن)

عزیزان گرامی قدر! درس قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورہ النمل کی اگلی آیت سے یہ سلسلہ کلام شروع ہونا چاہیے تھا۔ لیکن احباب کے تقاضا کے پیش نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورہ بقرہ کی تین چار آیات (۱۸۳-۱۸۷/۲) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں' اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآن کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے' اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا

ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً" اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی- **وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ** '(۴/۱۱۳) "اے رسول' اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے"- کتاب کے معنی احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد 'ان احکام و قوانین کی غرض و غایت- یہ دونوں منزل من اللہ ہیں- احکام کے سلسلے میں یہ انداز' عظیم حکمت بالغہ پر مبنی ہے- اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے' یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے' تو وہ اس کی تعمیل طوعاً" و کرہاً" کرے گا' بطیب خاطر نہیں کرے گا- مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں- لوگ ان پر بامرمجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں- اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا' اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں' تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے- کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے-

دوسرے یہ کہ آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں- اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے میکنکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں- اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے- مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں- ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا- آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر بھی لیتے ہیں- اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے- لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سر نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کے استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے- یہ نہیں ہوگا کہ ...... ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور دوائی دیتے چلے جائیں- اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے- اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا- اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے- اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے-

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا .... **کتب علیکم الصیام** (۲/۱۸۳) "اے جماعت مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں"- یہ "کتاب" یعنی حکم ہے- اس کی غایات کے متعلق کہا **لعلکم تتقون** (۲/۱۸۳)' **لعلکم تشکرون** (۲/۱۸۵) اور **ولتکبروا اللہ علی ما ھدکم** (۲/۱۸۵)- تتقون سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانین خداوندی

کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ رہو۔ تشکرون سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دوغایات کے متعلق سردست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا۔ اور وہ غایت الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہی، یعنی خدا کی کبرائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا **لتکبروا اللہ علی ما ھدکم**۔

سب سے پہلے لفظ "کبریائی" کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہل فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں، یعنی یہ کہ **تکون لکما الکبریاء فی الارض** (۱۰/۷۸) "یعنی تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے، اقتدار تمہارے ہاتھ میں آجائے"۔ اس سے لفظ "کبریائی" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

-----------O----------

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے، اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہ راست قائم ہے۔ تمام کارگہ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجال انحراف نہیں، یارائے سرکشی نہیں۔ **ولہ الکبریاء فی السموت والارض وھو العزیز الحکیم** (۴۵/۳۷) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔ دوسری جگہ ہے **وھو الذی فی السماء الہ وفی الارض الہ** (۴۳/۸۴) "وہی آسمانوں میں بھی صاحب اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحب اقتدار" (الہ کے معنی صاحب اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ **یا یھا المدثر** (۷۴/۱) "اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشن کائنات بہار نور کا مظہر بن جائے گا (المدثر کے یہی معنی ہیں)" **قم فانذر** (۷۴/۲) "اٹھ اور نوع انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے"۔ **وربک فکبر** (۷۴/۳) "اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو"۔ یہ تھا منصب رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے، لیکن میں ان سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ **ولم یکن لہ شریک فی الملک** "حکومت صرف اس کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا"۔ اور اس کے آگے ہے **وکبرہ تکبیرا** (۱۷/۱۱۱) لہذا، تم اس کی

کبریائی قائم کرو"۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ "**المتکبر**" (۵۹/۲۳) کہا ہے' کہیں **الکبیر المتعال** (۱۳/۹) اور کہیں **العلی الکبیر** (۲۲/۶۲)۔ ہماری دنیا میں وہ **العلی الکبیر** کیسے قرار پاتا ہے' اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ **فالحکم للہ العلی الکبیر** (۴۰/۱۲) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہیے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے نہ وہ تخت حکومت پر بیٹھتا ہے' نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطہ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہو گی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان کو ہی کافر کہا جاتا ہے۔

------------○------------
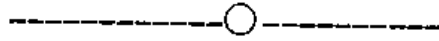
لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے' وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظام خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جماعت مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے **وجعل کلمتہ الذین کفروا السفلی وکلمتہ اللہ ھی العلیا** (۹/۴۰) "اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے' عملاً" مسلط ہو جائے"۔ اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:-

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و د ین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطہ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے' خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومت خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظام خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعت مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہو گی' یعنی یہ فریضہ **محمد رسول اللہ والذین معہ** (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا۔ لیکن جس جماعت مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے اس نے انہیں الاعلون کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا **وانتم الا علون ان کنتم مومنین** (۳/۱۳۸) اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآن کریم نے **ان کنتم مومنین** کی شرط عائد کر دی ہے' "یعنی اگر تم مومن ہوئے تو"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ لہٰذا' مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ **ولن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا** (۴/۱۴۱) خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعت مومنین پر غالب آنے دے۔ لہٰذا' یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ **انتم الا علون**' لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبہ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سرزمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ **الاعلی** میں نہیں' **سبحن ربی الا علی**--------- **الا علی** کے شایان شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں جو ہمیں **الاعلون** کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں' تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہرمانیت ہے' مومن کی علو شان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:۔

سا صرف عن ایتی الذین یتکبرون فی الا رض بغیر الحق (۷/۱۴۶)
جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں' ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہوگی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہی کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعت مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں **لتکبروا اللہ علی ما ھدکم** (۲/۱۸۵) صدر اول کی جماعت مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گزارنے کے بعد مدینہ میں آئی تاکہ یہاں کی "نسبتاً" مساعد فضا میں نظام خداوندی کی بنیادی رکھ دی جائے ' لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (۲ ھ میں) روزے فرض ہوئے۔ اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے

گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا۔ اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟ **لتکبروا اللہ علی ما ھدکم** (۲/۱۸۵) خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (STANDING ARMY) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآن مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آجکل مستقل فوج سے الگ (RESERVISTS) ہوتے ہیں' وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقت ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضورؐ نبی اکرم سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے' تو آپؐ نے فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہی دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ **شھر رمضان الذی انزل فیہ القران** (۲/۱۸۵) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظمیٰ قرار دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔

> **قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذالک فلیفرحوا - ھو خیر مما یجمعون** (۱۰/۵۸)
> اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاع گراں بہا بلامزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشن نزول قرآن ہے۔ قرآن خدا کی کبریائی کا ضابطہ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد **لتکبروا اللہ علی ما ھدکم** تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا باترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں' اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا "تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو۔" یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا' مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس بڑائی بیان کرنے کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان'

نماز اور عیدین کی تکبیریں' اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں' یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر' اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے بصد آہ و فغاں کہا تھا کہ :۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور ' مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ:

اللہ اکبر!

کبریائی صرف خدا کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ:

اشهد ان لا الہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا ہے کہ میں اس حقیقت کی "شہادت دیتا ہوں"۔ شہادت اسی کی قابل قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو' جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور تو علم نہیں' میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت قابل قبول ہونا تو درکنار' اسے درخور سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا' اشہد ان لا الہ اسی کا قابل قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا عینی شاہد ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں' یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا عینی شاہد نہیں' اسے اشہد ان لا الہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ : **شهد اللہ انہ لا الہ الا هو** "خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں ہے"۔ **والملئکۃ** "اور ملا ئکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اس کی شہادت دیں' کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے **واولوا العلم قائما بالقسط** "ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزان عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ **لا الہ الا هو العزیز الحکیم** (۳/۱۷) "خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں' بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے"

آپ نے غور فرمایا کہ ---- قرآن کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعت مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزان من! میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہی۔ والسلام

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

(اکتوبر ۱۹۷۸ء)

صلوٰۃ اور دیگر ارکان کے مقاصد پر نگہ بازگشت

طلوع اسلام بابت جون ۱۹۷۹ء میں جو میرا مقالہ بعنوان ---- دین اور مذہب میں کش مکش ---- شائع ہوا تو اس سلسلے میں مجھے بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب ملک میں ایسی فضا عام ہو رہی ہے جس میں دین سے متعلق بنیادی مسائل سے اس قدر دلچسپی لی جا رہی ہے۔ ان استفسارات میں بعض نکات ایسے ہیں جن کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ وضاحت بعض مثالوں کی رو سے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آئے گی۔

قرآن کریم کی یہ آیت بڑی مشہور ہے اور اسے اکثر وبیشتر دہرایا جاتا ہے' یعنی :-

ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (۲۹/۴۵)

عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "بے شک نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روک دیتی ہے "۔ لغت کی رو سے فحشا کے معنی بخل اور خودغرضی کے بھی ہیں اور منکر کے معنی عقل خودبیں کی فریب کاریوں کے۔ لہٰذا' اس آیت کا مفہوم یہ بھی ہوگا کہ یہ یقینی بات ہے کہ "**الصلوۃ**" خود غرضیوں اور فریب کاریوں سے روک دیتی ہے۔ مفہوم یہ ہو یا وہ' اس آیت میں حتمی اور یقینی طور پر کہا گیا ہے کہ "**الصلوۃ**" کا لازمی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ اول تو پورے کا پورا معاشرہ ورنہ کم از کم مصلی (نمازی) ہر قسم کی برائیوں' بے حیائیوں' خود غرضیوں اور فریب کاریوں سے رک جاتا ہے۔ اس سے ایسی حرکات سرزد ہی نہیں ہو سکتیں۔

یہ تو **الصلوۃ** کا منفی پہلو ہے۔ مثبت پہلو کے لئے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ جب نماز کے لئے بلایا جاتا ہے (یعنی اذان دی جاتی ہے) تو باواز بلند کہا جاتا ہے---- **حی علی الصلوۃ**------ "آؤ صلوٰۃ کی طرف" اور اگلے ہی سانس میں اس کی تشریح یہ کہہ کر دی جاتی ہے کہ **حی علی الفلاح** ------- "آؤ کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف"۔ یہ اعلان درحقیقت قرآن مجید کی ان آیات کا مخفف یا ملخص ہے جن میں کہا گیا ہے : **قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون** اور **ھم علی صلوٰتھم یحافظون** (۲۳/۲'۹) یعنی یہ حقیقت ہے کہ مومنین جو صلوٰۃ

کی پابندی کرتے ہیں وہ بڑی کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں ہر قسم کی فلاح و بہبود حاصل ہوتی ہے۔ ان کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں (فلاح کے یہی معنے ہیں)۔

ان آیات---- اور انہی جیسی متعدد دیگر آیات---- سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ الصلوۃ کا یقینی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ ہر قسم کی برائیوں' بے حیائیوں' فریب کاریوں سے پاک اور صاف ہو جائے گا اور اسے فلاح و بہبود حاصل ہوگی۔ اجتماعی معاشرہ سے قطع نظر' کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ نمازیوں کی سیرت اس قسم کی تمام برائیوں سے پاک اور صاف ہوگی اور انہیں ہر قسم کی فلاح و بہبود حاصل ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہماری نمازیں یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہیں یعنی جو لوگ نماز پڑھتے ہیں کیا ان کی زندگی واقعی ایسی ہوتی ہے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں ' خود اس امام یا خطیب سے مانگئے جو نماز کے ہر اجتماع میں نمازیوں سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ "ہم میں برائیاں اور بے حیائیاں عام ہو رہی ہیں۔ ہم میں سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی نہیں رہی۔ اگر ہم ان فحشاء و منکرات سے باز نہ آئے تو ہم پر خدا کا غضب نازل ہو جائے گا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان نمازیوں کی نماز انہیں فحشاء و منکر سے نہیں روکتی۔ اس کے لئے انہیں الگ وعظ اور نصیحت کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ وعظ و نصیحت بھی اکثر و بیشتر بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے سامنے ہے' یعنی:۔

۱۔ خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے **الصلوۃ فحشاء** اور منکر سے روکتی ہے اور فلاح و بہبود کی ضامن ہوتی ہے۔

۲۔ جو نمازیں ہم پڑھتے ہیں وہ یہ نتائج پیدا نہیں کرتیں۔ اس سے انسان لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ

i)۔ یا تو (معاذ اللہ) خدا کا یہ وعدہ (بلکہ دعویٰ) غلط ہے کہ صلوٰۃ فحشاء و منکر سے روکتی ہے۔ اور یا

ii)۔ جو کچھ ہم صلوٰۃ کے نام سے کرتے ہیں وہ 'وہ صلوٰۃ نہیں جسے خدا نے متعین فرمایا ہے۔

اسلام کے متعلق ہم ساری دنیا میں اعلان کرتے ہیں کہ یہ سائنٹیفک نظام زندگی (دین) ہے۔ سائنٹیفک کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "اگر یوں کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا"------ اگر ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ایک خاص تناسب کے ساتھ ملایا جائے تو اس سے پانی بن جائے گا۔ اگر پانی کو آگ پر رکھو گے تو وہ ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر کھولنے لگ جائے گا اور پھر بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔ اگر تندرست بیج کو مناسب زمین (SOIL) میں بو کر قاعدے کے مطابق پانی' روشنی اور حرارت کا انتظام کرو گے تو اس سے یقیناً" کھیتی اگے گی۔

اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر حکم کے سلسلے میں کہا ہے کہ اس پر عمل کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ سائنس کی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ خدا کا ہر حکم ایک "فارمولا" ہوتا ہے جسے عمل میں لانے سے متعین نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ اگر الصلوۃ کے "فارمولے" پر عمل کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ فحشاء و منکر کا انسداد اور فلاح و بہبود کا ضامن ہوتا ہے۔

اب اس مثال کو آگے بڑھائیں۔ بخار کے ایک مریض کے متعلق ڈاکٹر کی تشخیص یہ ہے کہ اسے ٹائیفائیڈ ہے۔

اس کے لئے وہ دوائی کے کیپ شولز تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ چھ چھ گھنٹے کے بعد ایک کیپ شول دیتے چلے جاؤ۔ اول تو چوبیس گھنٹے کے بعد' ورنہ زیادہ سے زیادہ چھتیس گھنٹے کے بعد' بخار نارمل ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کیا جاتا ہے لیکن بخار ہے کہ نارمل تو ایک طرف' کم ہونے کا بھی نام نہیں لیتا۔ اس سے آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟ اس نتیجے پر کہ:

(۱) یا تو ڈاکٹر کی تشخیص غلط ہے۔

(۲) یا جو علاج تجویز کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ اور

(۳) یا کیپ شولز میں صحیح دوائی نہیں۔

آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ بخار بدستور رہے اور آپ وہی کیپ شولز دیتے چلے جائیں۔ آپ مرض کی دوبارہ تشخیص کراتے ہیں۔ مرض وہی تشخیص ہوتا ہے لیکن پتہ چلتا ہے کہ کیپ شولز کی شکل و صورت تو اصل جیسی تھی لیکن ان میں دوائی جعلی تھی اور بعض بالکل خالی تھے۔ آپ کبھی ایسا نہیں کرتے کہ انہی سابقہ کیپ شولز کو دہراتے چلے جائیں۔ آپ صحیح کیپ شولز حاصل کرتے ہیں اور ان کے صحیح ہونے کا معیار یہ قرار دیتے ہیں کہ ان سے مقررہ مدت کے اندر بخار اتر جائے۔

لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مرض کا سبب فحشاء اور منکر بتایا۔ اس کا علاج الصلوۃ تجویز کیا اور حتمی طور پر کہا کہ اس سے فحشاء و منکر کا سدباب ہو جائے گا اور تمہیں فلاح و بہبود حاصل ہو جائے گی۔ لیکن ہم جس عمل کو صلوٰۃ (نماز) کہہ کر اس پر اس شدومد سے کاربند ہوتے ہیں' اس سے یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا' اس سے فحشاء و منکر نہیں رک رہے۔ بایں ہمہ' ہم ہیں کہ بجائے اس کے کہ کھڑے ہو کر سوچیں کہ غلطی کہاں ہے' اسی عمل کو دہرائے چلے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں' جب کہا جائے کہ معاشرہ میں فحشاء و منکر عام ہو رہے ہیں تو جواب دیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نماز پڑھیں۔ یعنی کمی تعداد کی ہے کیپ شولز میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن جس خدا نے یہ کہا تھا کہ: **ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر** اسی نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ **واللہ یعلم ما تصنعون** (۲۹/۴۵) "جو کچھ تم مصنوعی طور پر کرتے ہو' رسمی طور پر کرتے ہو' میکانکی طور پر کرتے ہو اور مطمئن ہو جاتے ہو کہ ہم نے فریضہ صلوٰۃ ادا کر دیا ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے"۔ وہ جانتا ہے کہ مصنوعی کیپ ر سے مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اس سے تو بلکہ موت واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ **فویل للمصلین** ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے۔ **الذین ھم عن صلاتھم ساھون۔ الذین ھم یراءون** (۱۰۷/۴-۶) جو صلوٰۃ کے مقصد کو تو فراموش کر دیتے ہیں اور اس کی مرئی اور محسوس حرکات کو صلوٰۃ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے منشاء خداوندی کو پورا کر دیا۔

میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ الصلوۃ کی شکل و صورت کس قسم کی ہونی چاہیے' اس کی تفاصیل و جزئیات کیا ہونی چاہئیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس صلوٰۃ کا عملی نتیجہ **تنھی عن الفحشاء والمنکر** ہو گا وہ صلوٰۃ منشاء

خداوندی کے مطابق ہوگی۔ جس سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا وہ **"ماتصنعون"** کے زمرے میں آتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک جدید فرقہ (اہل قرآن) نے نماز کے اوقات اور دیگر جزئیات میں تبدیلیاں کیں۔ لیکن ان سے کونسا قرآنی مقصد حاصل ہو گیا؟ یاد رکھئے! جن کیپ شولز سے شفا نہ ہوتی ہو' انہیں تین بار دیجئے یا چھ بار' اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو دوائی کیپ شولز کے اندر ہے وہ اصلی ہے یا نہیں۔ اور اس کے پرکھنے کا پیمانہ یہ ہے کہ اس سے وہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے یا نہیں جسے خدا نے خود متعین فرمایا ہے۔ آپ کو شکایت ہے کہ لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ لیکن آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ جس نماز کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں اس سے فحشاء و منکر کا سدباب نہیں ہوتا۔ نمازیوں کی سیرت اور ان کا کردار اس کا بین ثبوت ہوتا ہے۔ آپ ایسی صلوٰۃ کا نظام قائم کیجئے جس سے فحشاء و منکر کا سدباب ہو اور فلاح و بہبود کی فراوانیاں میسر۔ پھر دیکھئے کہ لوگ کس طرح فوج در فوج اس کی طرف آتے ہیں (۲/۱۱۰)۔ جس دوائی سے مریض کو آرام آتا ہو وہ اس کے استعمال سے کبھی کوتاہی نہیں کرے گا۔ وہ تو اس کے وقت پر آوازیں دے دے کر دوائی مانگے گا۔

اس کے جواب میں مذہبی پیشوائیت کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ یہ تو خدا کے احکام ہیں جن کی بلاچون و چرا تعمیل ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ ان کے متعلق اس قسم کے سوالات اٹھانے ہی نہیں چاہئیں۔ ایسا کرنا ایمان کی کمزوری ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ خدا کے احکام ہیں جن کی تعمیل ضروری ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مذہب کے خدا کے تصور اور دین کے خدا کے تصور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مذہب میں خدا کا تصور ایک ڈکٹیٹر کا سا ہوتا ہے۔ وہ' جو جی میں آئے حکم دیتا ہے۔ نہ اس کی کوئی علت بتاتا ہے نہ غایت۔ بس اتنا کہتا ہے کہ تمہیں یہ حکم ماننا ہوگا۔ جو نہیں مانے گا اس کی کھال ادھیڑ دی جائے گی۔

اس کے برعکس' دین (قرآن) کا خدا ہے جو ایک ناصح مشفق کی طرح نوع انسان سے کہتا ہے کہ تمہارے ہاں اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کے ازالہ کی یہ تدبیر ہے۔ اس کے مطابق عمل کرو گے تو اس سے تمہارا بھلا ہوگا' یعنی یہ خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہارا نقصان ہوگا۔ اب دیکھئے قرآن کریم میں احکام خداوندی کے ساتھ کہا جاتا ہے **لعلکم**" تم ایسا کرو تاکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے **ذلکم خیر لکم ان کنتم مومنین** (۷/۸۵) اس میں تمہارا اپنا ہی بھلا ہے۔ جامع طور پر ان الفاظ میں کہ:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم - وان اساتھم فلھا (۱۷/۷)

اگر تم اچھے کام کرو گے تو اس کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کو پہنچے گا۔ اور اگر برے کام کرو گے تو اس کا خمیازہ بھی تم ہی بھگتو گے۔

اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ حتیٰ کہ:

ان تکفروا انتم ومن فی الارض جمیعا - فان اللہ لغنی حمید (۱۴/۸)

اگر تم' اور تمہارے ساتھ تمام ساکنان ارض کفر اختیار کرلیں' تو اس سے خدا کا کوئی

نقصان نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے کفر و ایمان سے مستغنی ہے۔
خدا کے احکام کی تعمیل ایسے ہی ہے جیسے (بلاتمثیل) ڈاکٹر کی ہدایات کی پابندی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے احکام و ارشادات کو ہدایت سے تعبیر کیا ہے۔

لہٰذا' جب حکم دینے والے خدا نے کہہ دیا ہے کہ اگر تم اس کی تعمیل کرو گے تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے منفعت بخش ہوگا۔ تو جب اس کے احکام کی تعمیل کے منفعت بخش نتائج سامنے آئیں گے تو دنیا لپک کر ان کی طرف آئے گی۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:**اذا جاء نصر الله والفتح۔ و رایت الناس یدخلون فی دین الله افواجا** (۲-۱/۱۱۰) "جب (تمہارے ایمان اور اعمال کے نتیجہ میں) خدا کی نصرت تمہارے شامل حال ہوگی اور فتح اور کامرانی تمہارے قدم چومے گی تو تم دیکھو گے کہ اقوام عالم کس طرح جوق در جوق دین خداوندی میں داخل ہوتی ہیں"۔ اور اگر تمہارے رسمی اور مصنوعی اعمال یہ نتیجہ پیدا نہیں کریں گے تو پھر نہ تمہارے وعظ و تلقین سے لوگ احکام خداوندی کی پابندی کریں گے' نہ دنیا فوج در فوج حلقہ بگوش اسلام ہوگی۔

یہاں تک ہم نے صلوٰۃ کی بات کی تھی۔ اس کے بعد' حج کی طرف آیئے جو ہمارا سب سے بڑا اور عالمگیر اجتماع ہے۔ اس اجتماع کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دو۔

لیشهدوا منافع لهم (۲۲/۲۸)

تاکہ وہاں جا کر یہ اپنی منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ بتائی گئی ہے حج کی غایت------ اس اجتماع عظیم کا مقصد------ بلکہ اگر غور سے دیکھیں تو بات اس سے بھی زیادہ اہم سامنے آتی ہے۔ آیت کے شروع میں کہا گیا ہے:۔

واذن فی الناس بالحج (۲۲/۲۷)

تو لوگوں کو حج کے اجتماع میں شرکت کی دعوت دے۔

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی یہ تھا کہ اس اجتماع کا انصرام و اہتمام تو امت مسلمہ کی طرف سے ہو لیکن اس میں دیگر اقوام عالم کے نمائندوں کو بھی مبصرین کی حیثیت سے دعوت شرکت دی جائے' تاکہ وہ اس امر کا مشاہدہ کریں کہ نظام خداوندی عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ بہرحال' اگر اسے اس طرح پھیلا کر نہیں بلکہ سمٹا کر بھی دیکھا جائے تو اتنا تو بالکل واضح ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا حج کے اجتماع میں یہ نظر آتا ہے کہ عالم انسانیت نہیں تو کم از کم امت مسلمہ کی منفعت کے لئے کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اس کا جواب ہر حاجی دے سکتا ہے۔ وہ محض اپنی عقیدت مندی سے اس فریضہ کو رسمی طور پر ادا کر کے چلا آتا ہے۔ اسے وہاں **منافع لهم** کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ قرآن کریم نے **لیشهدوا منافع لهم** کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ کوئی نظری یا محض اقتصادی شے نہیں ہوتا۔ ایسا تو منفعتوں کے مرئی اور محسوس طور پر سامنے

آنے کے لئے کہا جائے گا۔

اس سے واضح ہے کہ ہمارے موجودہ حج سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا جسے اللہ تعالٰی نے اس کی غایت بتایا ہے۔ ہم ہر سال بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ امسال اتنے لاکھ حاجیوں نے اس فریضہ کو ادا کیا۔ لیکن اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ اس کا جو مقصد اللہ تعالٰی نے بتایا تھا کیا وہ بھی حاصل ہوا؟ اگر نہیں ہوا تو یہ بھی صلوٰۃ کی طرح محض ایک رسمی عمل بن کر رہ گیا ہے۔ یہ دس لاکھ کے بجائے پچاس لاکھ پر بھی مشتمل ہو جائے تو بھی ایک رسم کی ادائیگی ہو گا۔ منشاء خداوندی کے مطابق تو وہ صحیح ہو گا جس میں عالمگیر انسانیت' یا بر سبیل تنزل' امت مسلمہ کی منفعت مشہود طور پر سامنے آجائے۔

---------------○---------------

اسلام کا تیسرا رکن صوم ہے جسے روزہ کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالٰی نے اس فریضہ کی ادائیگی کا نتیجہ یہ بتایا:۔

لتکبروا اللہ علی ما ھدکم (۲/۱۸۵)

تاکہ تم اس راہ نمائی کی رو سے جسے اللہ نے عطا کیا ہے' اس کی کبریائی کو دنیا میں ثبت کر سکو۔

کبریائی کے معنی ہیں غلبہ' حکومت' اقتدار مطلق وغیرہ۔ قرآن کریم میں ہے:۔

ولہ الکبریاء فی السموت والارض وھو العزیز الحکیم (۴۵/۳۷)

خارجی کائنات اور انسانی دنیا میں کبریائی اسی کو حاصل ہے۔ وہی صاحب غلبہ ہے اور اس کا غلبہ حکمت پر مبنی ہے' دھاندلی پر نہیں۔

خارجی کائنات میں اس کی کبریائی از خود قائم ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں یہ کبریائی انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہو گی۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا کہ **وربک فکبر** (۷۴/۳) اٹھو (قم) اور دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کرو۔ خدا کی کبریائی قائم ہونے کا عملی مفہوم کیا ہے' اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ **فالحکم للہ العلی الکبیر** (۴۰/۱۲) "ہر قسم کا غلبہ اور کبریائی کا مستحق خدا ہے' اس لئے حکومت صرف اسی کی قائم ہونی چاہیے۔ اور خدا کی حکومت کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی کہ **فاحکم بینھم بما انزل اللہ** (۵/۴۸) "ان کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو"۔ بالفاظ دیگر' خدا کی کبریائی کا عملی مفہوم یہ ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کی حکمرانی ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی اسی کے قوانین کی حکمرانی ہو۔ اسی کو **الدین** یا نظام خداوندی کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس نظام کے متعلق کہا گیا ہے **لیظھرہ علی الدین کلہ** (۹/۳۳) "یہ نظام انسانوں کے وضع کردہ تمام نظاموں پر غالب آکر رہے گا"۔

یہ تھی غایت صیام کی' یعنی کتاب اللہ کی حکمرانی کو اس طرح قائم کرنا کہ کوئی اور نظام اس پر غالب نہ آسکے۔ صیام ۲ھ میں فرض ہوئے اور جماعت مومنین نے ہنوز سترہ روزے رکھے تھے کہ انہیں بدر کی رزم گاہ میں اترنا پڑا۔ مقصد

اس سے کیا تھا ــــــ جعل کلمۃ الذین کفروا السفلی وکلمۃ اللہ ھی العلیا (۹/۴۰) "تاکہ مخالفین کا نظام مغلوب ہو جائے اور اللہ کا نظام غالب آجائے۔ یہ باطل کے نظام کے خلاف پہلا تصادم تھا اور اس پر غلبہ۔ اس کے بعد صیام پر عمل کرنے والی اس امت نے اس دور کے ہر نظام پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اور اس طرح: **ولتکبروا اللہ علی ما ھدکم** (۲/۱۸۵) کا عملی ثبوت بہم پہنچا دیا۔ "اللہ اکبر" اس نظام کا ماٹو یا منشور تھا اور ساری دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا عملی مفہوم کیا ہے۔

ذرا سوچئے کہ کیا ہمارے روزوں سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ دنیا میں کتاب اللہ کی حکمرانی غالب ہو اور جب ہمارا موذن مینارہ پر کھڑا ہو کر دن میں لاکھوں' کروڑوں مساجد سے کم از کم تیس مرتبہ اعلان کرے کہ اللہ اکبر' تو وہ ایک واقعہ کا اعلان ہو نہ کہ محض چند الفاظ کا دہرا دینا۔ ان ملکوں کو تو چھوڑیئے جہاں غیر مسلموں کی حکومت قائم ہے۔ کیا مسلم ممالک میں کوئی ایک ملک بھی ایسا ہے جہاں اللہ اکبر ایک حقیقت کا اعلان ہو' جہاں کبریائی واقعی خدا کی ہو' جہاں حکمرانی اس کتاب کی ہو۔ کیا یہ اللہ اکبر کی محض لفظی تکرار اور اس کی عملاً" نفی نہیں؟

---------------O---------------

یہاں تک تو دین خداوندی کے دو تین ارکان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہ ہیئت مجموعی اس دین کے پیروؤں کے متعلق فرمایا ہے۔

۱۔ **حقا علینا ننج المومنین** (۱۰/۱۰۳) "انہیں ہر قسم کی مصیبت اور پریشانی سے محفوظ رکھنا خدا پر واجب ہے"۔ خدا نے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ (نمبراً") "**حقا علینا**" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ہم ہمیشہ حقوق اللہ کا ذکر کرتے ہیں' یعنی اللہ کے حقوق جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں خدا نے مومنین کے ایک حق کا ذکر کیا ہے جسے خود خدا نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں' بڑی اہم بات ہے۔

۲۔ **وکان حق علینا نصر المومنین** (۳۰/۴۷) یعنی مومنین کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے اس فریضہ کو ادا کرے گا تو اس کا نتیجہ کیا برآمد ہو گا۔ فرمایا:۔

۳۔ **ولن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا** (۴/۱۴۱) "یہ ناممکن ہو گا کہ غیر مسلم مسلمانوں پر غالب آسکیں"۔ مومنین کی تو کیفیت یہ ہو گی کہ:

۴۔ **ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین** (۳/۱۳۸) "تم کیوں گھبراتے ہو' کیوں افسردہ خاطر ہوتے ہو۔ تم تو مومن ہو اس لئے تمہیں تمام اقوام عالم پر غلبہ حاصل ہو گا۔ **فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** (۲/۳۸) تمہیں نہ کسی سے خوف کھانے کی کوئی وجہ ہے نہ ہی ملول خاطر ہونے کی۔

یہ ہیں معیار اس بات کے پرکھنے کے کہ ہم اسلام کے پیرو (مومن) ہیں یا نہیں۔ قرآن کریم نے یہ دعاوی محض نظری طور پر پیش نہیں کئے تھے' ان کی صداقت کا ثبوت عملاً" سامنے آگیا تھا ــــ صدر اول کے مسلمانوں کے اجزاء ایمان

وہی تھے جو ہمارے ہیں' یعنی اللہ پر ایمان' کتابوں پر ایمان' ملائکہ پر ایمان اور حیات آخرت پر ایمان۔ ان کا پروگرام بھی انہی ارکان پر مشتمل تھا جو ہمارے ہاں رائج ہیں۔۔۔۔ یعنی صلوٰۃ' صیام' حج' زکوٰۃ وغیرہ۔ اس ایمان اور ان ارکان پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا تھا' اسے ایک ایرانی گورنر نے ایسے جامع اور مانع الفاظ میں بیان کیا تھا جس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جب ایران فتح ہوا تو تستر کا گورنر' ہرمزان' قیدی کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ ہرمزان! قید و بند کی بات تو بعد میں ہوگی۔ تم پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو جو بڑا اہم اور بنیادی ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ:

> اس سے پہلے تم ایرانی' ہم عربوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ تم ہمیں اس قدر ذلیل اور حقیر سمجھا کرتے تھے کہ دوستی تو ایک طرف' تم ہمارے ساتھ جنگ کرنے کو بھی اپنے لئے باعث ننگ سمجھا کرتے تھے۔ اب وہی تم ہو اور وہی ہم۔ تو پھر یہ کیا ہوا' جو تم نے ہمارے ہاتھوں اس قدر ذلت آمیز شکست کھائی ہے۔ ملک تمہارا ختم ہو گیا۔ مملکت تمہاری تباہ ہوگئی۔ تمہاری تہذیب اور تمدن جس پر تمہیں اس قدر ناز تھا خاک میں مل گئے۔ تم (گورنر) میرے سامنے پابجولاں کھڑے ہو اور تمہارا شہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے مارے مارے پھر رہا ہے۔ یہ انقلاب کیسے ہو گیا؟ اس کی وجہ کیا ہوئی؟

سوال آپ نے سن لیا۔ اب ہرمزان کا جواب سنئے۔ اس نے کہا:۔

> عمرؓ! بات یہ ہے کہ اس سے پہلے تم اور ہم اکیلے ایک دوسرے سے نمٹتے تھے۔ اس لئے ہم ہمیشہ تم پر غالب آجاتے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت ہم تو بدستور اکیلے ہوتے ہیں لیکن تمہارے ساتھ تمہارا خدا بھی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے کیا' دنیا کی کسی طاقت کے لئے بھی ممکن نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کر سکے۔

(شاہکار رسالت' ص ۱۳۳' ایڈیشن چہارم (بلا ترمیم) ۱۹۸۷ء)

یہ تھا عملی ثبوت خدا کے ان دعووں کی صداقت کا جن کی رو سے اس نے کہا تھا کہ اگر تم ہماری ہدایات کے مطابق عمل کرو گے تو تمہاری نصرت ہم پر واجب ہو جائے گی اور دنیا کی کوئی قوم تم پر غالب نہیں آسکے گی۔ آج ہمارے اجزاء ایمان بھی وہی ہیں اور اسلام کے ارکان و شعائر بھی وہی۔ اگر تمام کے تمام مسلمان نہیں تو بھی اس کا ایک معتدبہ حصہ ان کی پابندی کرتا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ابتدائی دور کے تمام مسلمانوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود' ہماری جو حالت ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اقوام عالم پر غلبہ تو ایک طرف' ہم بعض قوموں کے دست نگر لہٰذا' ان کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہیں اور بعض سے اس قدر خائف کہ قرآن کریم کے الفاظ میں **یحسبون کل صیحۃ علیھم**(۶۳/۴) کہیں کوئی پتا بھی کھٹکے تو ہماری ان پر بن جاتی ہے۔ اس وقت دنیا کی کوئی قوم

اس قدر خوف اور حزن' پریشانی اور مایوسی کا شکار نہیں جتنی مسلم قوم ہے۔ (معاف فرمائیے) مسلم کے ساتھ اقوام کا لفظ واقعہ کے طور پر لکھنا پڑتا ہے' ورنہ مسلم قوم تو امت واحدہ ہوتے ہیں' اقوام میں بٹے ہوئے نہیں ہوتے۔

ایسا کیوں ہے ؟ اس لئے ہم نے اجزاء ایمان (یعنی بنیادی نظریات زندگی) کے صرف الفاظ دہرانے اور ارکان دین کی صرف رسمی شکلیں (RITUALS) قائم رکھنے کا نام اسلام رکھ چھوڑا ہے۔ ہم نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ یہ دیکھیں کہ اس ایمان اور ان اعمال کا جو حتمی اور یقینی نتیجہ خود خدا نے بتایا تھا وہ برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ وہ برآمد نہیں ہو رہا' لیکن ہم انہیں برابر دہرائے چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے بہت پہلے ہمارا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا۔ **قل ھل ننبئکم بالا خسرین اعمالا** (۱۸/۱۰۳) "اے رسولؐ ! ان سے کہو کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ سب سے زیادہ نقصان میں کون لوگ رہتے ہیں۔" یہ وہ لوگ نہیں جو کچھ کرتے نہیں۔ کرنے کو تو یہ بہت کچھ کرتے ہیں۔ لیکن **الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا** (۱۸/۱۰۴) ان کی ساری کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ وہ یہ سب کچھ محض رسمی طور پر کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہمارے ان کاموں کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ **فحبطت اعمالھم** "ان کا تمام کیا کرایا رائیگاں چلا جاتا ہے۔ وہ عبث اور بے کار ہوتا ہے' اس قدر عبث اور بے کار کہ **فلا نقیم لھم یوم القیمۃ وزنا** (۱۸/۱۰۵) اس جنس کاسد کے تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

لہذا' قرآن کریم نے ہماری تباہی کا بنیادی سبب خود ہی واضح کر دیا' یعنی اسلامی احکام کو محض رسمی طور پر بجا لاتے چلے جانا اور کبھی اس پر غور نہ کرنا کہ ان سے وہ نتائج بھی مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں جنہیں ان کا لازمی حصہ قرار دیا گیا تھا۔ دین میں یہی اعمال اپنا متعینہ نتیجہ مرتب کرتے چلے جاتے ہیں اور مذہب میں محض یہ رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایک مذہب پرست قوم میں دین کے نظریات از سر نو زندگی اور توانائی حاصل کر سکتے ہیں ؟ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس موضوع پر بڑی عمیق' فکر انگیز اور عبرت آموز بحث کی ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ اس قسم کی قوم کے مذہبی پیشوا' اس دور کی درخشندہ داستانیں جس میں دین کے اعمال نتیجہ خیز ہوتے تھے' دہرا دہرا کر قوم کو سہانے خوابوں میں سلائے رکھتے ہیں لیکن یاد رکھئے:-

> قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔ (آکسفورڈ ایڈیشن' ص ۱۴۳)

اس کے بعد انہوں نے ایک ایسی بات کہی ہے جو ہر صاحب فکر و احساس کیلئے نہایت گہرے غور و تدبر کی متقاضی ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر میں اسے ان کے اصل الفاظ میں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔

> THE VERDICT OF HISTORY, AS A MODERN WRITER HAS HAPPILY PUT IT, IS THAT WORN OUT IDEAS

HAVE NEVER RISEN TO POWER AMONG A PEOPLE WHO HAVE WORN THEM OUT.

(P. 144)

یعنی عصر حاضر کے ایک مصنف نے کیسی سچے کی بات کہی ہے کہ:

تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن نظریات اور تصورات کو کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو---- وہ اس قوم میں پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے--- (ص ۱۴۴)

یہ کونسی قومیں ہیں جن کی طرف اس دیدہ ور مصنف نے اشارہ کیا ہے؟ یہ وہی قومیں ہیں جو دین کو مذہب میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ دین کے بنیادی نظریات اور تصورات بے پناہ قوتوں کے حامل ہوتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے والی قوم میں ان قوتوں کا اس طرح مظاہرہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا اس کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اس لئے اس قوم کے اخلاف ان نظریات کے الفاظ کو دہراتے رہتے اور دین کے ارکان پر محض رسمی طور پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اس سے یہ نظریات اپنی توانائی کھو دیتے اور چلے ہوئے کارتوس بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ دیدہ ور' بالفاظ دیگر' کہتا یہ ہے کہ:

تاریخ کا فیصلہ ہے کہ مذہب پرست اقوام میں دین کا احیاء نہیں ہو سکتا۔

اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کی طرف اپنے رسول بھیجے۔ ہوتا یہ کہ ایک رسول آتا اور اپنی قوم کو زندگی بخش نظریات دیتا اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق بتاتا۔ وہ ان کے مطابق عمل کرتے تو زندگی کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں ان کے قدم چومتیں۔ اسے دین یا نظام خداوندی کہا جاتا۔ اس نظام میں نہ انسانوں کی حکمرانی کے لئے کوئی گنجائش ہوتی نہ سرمایہ داری کے لئے اور نہ ہی اس میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل ہوتا۔ اس میں اطاعت صرف احکام و قوانین خداوندی کی ہوتی۔ وہ رسول چلا جاتا تو طاغوتی قوتیں پھر سر اٹھاتیں اور مذہبی پیشوائیت ان کی سرخیل ہوتی۔ اس کی ٹیکنیک یہ ہوتی کہ وہ دین کے نظریات کے الفاظ اور اس کے ارکان کی شکل و صورت (FORM) بدستور قائم رکھتی لیکن ان کے معانی اور مفہوم یکسربدل دیتی۔ مفہوم کے بدلنے میں بنیادی حربہ یہ استعمال کیا جاتا کہ ان نظریات اور اعمال کو ان کے نتائج سے پرکھنے کاتصور ختم کر دیا جاتا اور انہیں رسمی طور پر ادا کئے جانے کو مقصد قرار دے دیا جاتا۔ اکثر و بیشتر رسولؑ کی عطا کردہ وحی کے الفاظ میں بھی تحریف کر دی جاتی یا آمیزش۔ اس طرح دین' مذہب میں بدل جاتا۔

اس کے بعد ایک اور رسول آتا اور دین کے حقیقی نظریات اور ان کے عوامل ان کے سامنے پیش کرتا۔ مذہبی پیشوائیت اچھی طرح جانتی کہ یہ مذہب کو دین میں تبدیل کر دینے کی کوشش ہے۔ لہٰذا' اس کی طرف سے اس دعوت کی سخت مخالفت ہوتی۔ وہ اس (رسول) سے کہتے کہ آپ کونسی ایسی بات لے کر آئے ہیں جو ہمارے پاس پہلے سے موجود نہیں؟ ہم خدا کو مانتے ہیں' اس کے رسولوں کو مانتے ہیں' وحی کو مانتے ہیں' آخرت کو مانتے ہیں۔ تم بھی انہی پر ایمان لانے کے لئے کہتے ہو۔ ہم خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ یہی تعلیم تم دیتے ہو۔ پھر ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم اپنی اس

روش کو چھوڑ کر جو ہمارے اسلاف سے مسلسل چلی آ رہی ہے' تمہارے پیچھے لگ جائیں؟ اس رسول اور اس کی قوم میں یہ کش مکش جاری رہتی- ان میں سے بعض سعادت مند افراد جو دین اور مذہب کے فرق کو پہچان لیتے' اس رسول کی دعوت کو قبول کر لیتے- اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ یہ رسول اپنی اس مختصر سی جماعت کو اپنے ساتھ لے کر کسی ایسے مقام کی طرف ہجرت کر جاتا جو نظام خداوندی کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہوتی- اس طرح وہاں دین متشکل ہو جاتا-

اور جب وہ رسول چلا جاتا تو اس قوم کی بھی وہی حالت ہو جاتی' یعنی ان پر بھی مذہب مسلط ہو جاتا- اس تبدل و تحول کی بین مثال حضور نبی اکرمؐ کی دعوت ہے- حضورؐ کے مخاطب قریش بھی تھے جو کسی مذہب کے پیرو نہیں تھے' اور یہودی' نصرانی اور (کسی حد تک) مجوس بھی جن کے ہاں دین کی جگہ مذہب رائج تھا- انہیں قرآن' اہل کتاب کہہ کر پکارتا ہے- حضورؐ کی دعوت کی مخالفت تو ان سب کی طرف سے ہوئی لیکن اس مخالفت کے اسباب و وجوہ مختلف تھے- قریش کی مخالفت بر بنائے مذہب نہیں تھی- (لیکن اہل کتاب کی مخالفت مذہب کی بنا پر تھی) نتیجہ یہ کہ (شدید مخالفت کے بعد ہی سہی) قریش تو اس ...... دعوت کے پیرو ہو گئے' لیکن اہل کتاب میں سے (باستثناء چند) کسی نے اسے قبول نہ کیا اور اپنے اپنے مذہب کے پابند رہے- دین کا قیام اسی طبقہ میں ہوا جو مذہب پرست نہیں تھا- یوں دین کے نظریات اس قوم میں توانائی حاصل نہ کر سکے جس نے انہیں فرسودہ کر دیا تھا-

نبی اکرمؐ اس جماعت مومنین کو' دین پر کاربند ہونے کی بنا پر' دولت کونین کے وارث بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے- لیکن کچھ عرصہ کے بعد' مفاد پرست قوتوں (ملوکیت' سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت) نے سر ابھارا اور آہستہ آہستہ دین کو مذہب میں تبدیل کرنا شروع کر دیا- اس طرح دین کے آثار مدھم پڑتے چلے گئے اور مذہب کی گرفت محکم سے محکم تر ہوتی گئی' کیونکہ اس کی پشت پر ملوکیت اور سرمایہ داری کی تائید اور قوت تھی- صدر اول کے چند لمحات کو چھوڑ کر ہماری ساری تاریخ مذہب کی تاریخ ہے اور جس جدوجہد کو اسلامی کہہ کر پکارا جاتا ہے' وہ درحقیقت مذہب کی گرفت کو محکم کرنے کی کوششیں ہیں- یہ کیفیت آج تک چلی آ رہی ہے-

رسول اللہؐ کے بعد کسی رسول نے آنا نہیں کیونکہ حضورؐ پر سلسلہ نبوت ختم ہو چکا ہے- سلسلہ نبوت کو جاری رکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی- دین کا ضابطہ اپنی مکمل اور غیر متبدل شکل میں خدا کی کتاب کے اندر محفوظ ہے اور تمام اقوام عالم کے لئے یکساں آئین حیات- جو قوم چاہے' اسے اختیار کر کے اس کے زندگی بخش نتائج سے متمتع ہو سکتی ہے- یعنی جو قوم چاہے اس کے ہاں دین کا احیاء ہو سکتا ہے- اس لئے اجرائے نبوت کی ضرورت نہیں رہی تھی-

ہم نے اوپر کہا ہے کہ کسی مذہب پرست قوم میں دین کا احیاء نہیں ہو سکتا- تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے- ہندو مت کے متعلق تو کہا نہیں جا سکتا کہ اس کی عمر کتنی ہے- اس کے پیرو اسے ازلی قرار دیتے ہیں- اس کی عمر کتنی ہی ہو' ان کے ہاں دین کا احیاء نہیں ہو سکا- چین اور جاپان کے مذاہب کی بھی یہی کیفیت ہے- بدھ مت اور جین مت ان سے کم عمر ہیں لیکن ہیں یہ بھی قدیم مذاہب- ان میں بھی کہیں زندگی کی نمود نظر نہیں آتی- سامی مذاہب میں یہودیت قدیم اور عیسائیت اس سے عمر میں کم ہے لیکن ان کے ہاں بھی دین کا احیاء نہیں ہوا- قدیم مذاہب میں سے

اکثر' زمانے کے تقاضوں کی تاب نہ لا کر مٹ چکے ہیں- باقی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر قبروں کی جانب گھسٹتے چلے جا رہے ہیں- انہیں پھر سے زندگی اور توانائی نصیب نہیں ہو سکی- یوں تاریخ کا یہ فیصلہ ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ:

جن نظریات اور تصورات کو کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو وہ اس قوم میں پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے-

مذاہب عالم میں اسلام کی عمر سب سے کم ہے لیکن تاریخ کے مذکورہ بالا فیصلہ کا اس پر بھی یکساں اطلاق ہو رہا ہے- اس مذہب کے پیروؤں (یعنی ہم مسلمانوں) کو زندگی کی وہ سرفرازیاں نصیب ہی نہیں ہوئیں جن کا مظاہرہ دین کے اتباع کے زمانے میں ہوا تھا- جیسا کہ کہا جا چکا ہے 'ہماری طرف کسی نبی نے آنا نہیں تھا- دین کی طرف دعوت کا فریضہ (جسے دعوت الی القرآن کہئے) غیر نبی انسانوں کی طرف سے ادا ہونا تھا- لیکن جیسا کہ دیگر مذاہب کے سلسلہ میں ہوا' جس نے بھی انہیں قرآن کی دعوت دی' مفاد پرست قوتوں نے اسے کچل کر رکھ دیا- یہ ہماری تاریخ کا بڑا درد انگیز اور الم ناک باب ہے' لیکن اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں- علامہ اقبالؒ نے احیاء دین کی ایک اسکیم سوچی یعنی انہوں نے سوچا کہ ایک ایسا خطہ زمین حاصل کیا جائے جہاں مذہب کی حکمرانی نہ ہو- اس خطہ زمین میں قرآنی نظام نافذ کر دیا جائے اور اس طرح دین کا احیاء عمل میں آجائے- غور سے دیکھئے تو یہ اسکیم' زمانہ حاضرہ کے احوال و ظروف کی روشنی میں' ہندی مسلمانوں کے لئے "ہجرت" کے مترادف تھی- قائداعظم کی کوششوں نے اس خطہ زمین کے حصول کو ممکن بنا دیا- آپ علامہ اقبالؒ اور قائداعظم کے ارشادات پر غور کیجئے- وہ بار بار کہتے تھے کہ پاکستان میں قرآنی نظام قائم کیا جائے گا- اس میں تھیوکریسی کو کسی صورت میں بھی روبہ عمل نہیں ہونے دیا جائے گا- لیکن ہماری بدقسمتی کہ ان کی عمروں نے ایفا نہ کیا اور پاکستان میں نتیجہ اس کے بالکل برعکس برآمد ہو گیا یا ہو رہا ہے- غیر منقسم ہندوستان میں اسلام ایک انفرادی مذہب کی حیثیت میں رائج تھا- یہاں وہی مذہب تھیاکریسی کی شکل اختیار کئے جا رہا ہے-

خواستم پیکاں برارم' در جگر نشتر شکست!

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے بعد' دین اور مذہب کے فرق کو نمایاں طور پر پیش کرنے کا فریضہ میں نے اپنے ذمے لیا' لیکن جس انداز سے اور جس ملک گیر پیمانے پر مذہبی پیشوائیت کی طرف سے میری مخالفت ہوئی اور ہو رہی ہے' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں- میں نہ کوئی "مامور من اللہ" نہ میرا کسی قسم کا دعویٰ ہے- میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قوم سے صرف اتنا کہتا ہوں کہ:

جو کچھ آپ اسلام کے نام سے کہتے اور کرتے ہیں' اس کے متعلق یہ دیکھ لیجئے کہ اس کے جو نتائج اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بتائے ہیں' وہ برآمد ہو رہے ہیں یا نہیں! اگر نہیں ہو رہے (اور ہم سب اس کا رونا روتے رہتے ہیں) تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ منشاء خداوندی کے مطابق نہیں- لہٰذا' اسے منشاء

خداوندی کے مطابق بنائیے۔

یہ ہے جو کچھ میں کہتا ہوں۔ لیکن چونکہ مروجہ اسلام کو اس معیار کے مطابق پرکھنے سے مذہب کی شکست ہی نہیں، اس کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ یعنی اس کی جگہ دین لے لیتا ہے۔۔۔۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی مخالفت تاریخ کا فطری عمل ہے۔ لیکن میری اس مخالفت سے حقائق تو نہیں بدل سکتے۔ مذہب نے جو کچھ دوسری قوموں کے ساتھ کیا ہے وہی کچھ ہمارے ساتھ ہوگا (اور ہو رہا ہے)۔

جب مذہب کے پیدا کردہ اسباب کی رو سے قوم کی حالت ابتر ہو جاتی ہے، تو مذہبی پیشوائیت شور مچا دیتی ہے کہ:

(۱) مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے، اس لئے ان کی یہ حالت ہو گئی ہے اور

(۲) الحاد اور بے دینی کی قوتیں زور پکڑ رہی ہیں جس سے اسلام خطرے میں ہے۔

جہاں تک الحاد اور بے دینی کی قوتوں کے زور پکڑنے کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا تھا: **ولن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا** (۴/۱۴۱) "یہ ناممکن ہے کہ اللہ غیر مسلموں کو مومنین پر غالب آجانے دے۔" اگر آپ مومن ہیں تو پھر الحاد و بے دینی کی قوتوں سے اس قدر خائف کیوں ہیں؟ اور اگر آپ خائف ہیں تو، بجائے اس کے کہ یہ دہائی مچائیں کہ الحاد اور بے دینی کی قوتیں زور پکڑ رہی ہیں، دیانتداری سے اعلان کیجئے کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ لیکن مذہبی پیشوائیت دوسروں کو کافر قرار دے دے گی، اپنے متعلق اس اعتراف اور اعلان کی جرات کبھی نہیں کرے گی۔ اقبالؒ کے نشترانہ الفاظ ۔

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت!
حدیثے خوشتر ازوئے کافرے گفت
"نداند آں غلام احوال خودرا!
کہ دوزخ را مقام دیگرے گفت"

(ارمغان حجاز)

اب رہا ان کا یہ کہنا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ مذہب پرست بن جائیں، یعنی جو کچھ مذہب کے نام سے اس وقت ہو رہا ہے، اس پر اور کثرت اور شدت سے عمل کیا جائے۔ بالفاظ دیگر، ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر میدان کارزار میں ایک سو چلے ہوئے کارتوسوں سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو ان کی تعداد بڑھا کر ہزار تک پہنچا دی جائے۔ انہیں کون بتائے کہ عرصہ کارزار میں ایک بھرا ہوا کارتوس دس ہزار خالی کارتوسوں پر بھاری ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے جب کہا تھا تمہارا ایک سو مجاہد فریق مخالف کے ایک ہزار پر غالب آجائے گا (۸/۶۵) تو اس سے یہی بتانا مقصود تھا۔ یاد رکھیئے! مذہب کی نشرواشاعت سے دین کے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس، مذہب جتنا زیادہ پھیلے گا قوم اتنی ہی زوال پذیر ہوگی۔ علامہ اقبالؒ کی ساری عمر مذہب اور دین کے فرق کو نمایاں کرنے میں بسر ہو گئی۔ انہوں نے جو کچھ ملا کے خلاف لکھا ہے، وہ درحقیقت اس کے رسمی اسلام (یعنی مذہب) کے خلاف تنقید ہے۔ کبھی وہ

کہتے ہیں کہ:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

اور کبھی یہ کہ:

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل!
یاخاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدامست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

اور کبھی یوں نکھار اور ابھار کر کہ:

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے

اس احساس سے ان کے قلب درد آگیں میں ایسی ٹیس اٹھتی ہے کہ وہ بصد نالہ و فغاں پکارتے ہیں کہ:

حرم کے دل میں سوز آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تیری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی

یہ "حجاب آمیزی" دین کے حقائق پر پڑے ہوئے مذہب کے دبیز پردوں کا دوسرا نام ہے۔

ظاہر ہے کہ اقبالؒ کی اس قسم کی پردہ دری مذہبی پیشوائیت کو کبھی گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ان کے خلاف کفر کے فتوے لگانے تک سے بھی احتراز نہ کیا۔ لیکن انہوں نے اس پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو بس اتنا کہ:

گر قتم حضرت ملا ترش روست
نگاہش مغز رانشاسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ وارم !!
مرا از کعبہ می راند حق اوست

(ارمغان حجاز)

چونکہ تاریخ کا وہ فیصلہ جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں بیان کردہ مذہب پرست اقوام کا عبرت ناک انجام ان کے سامنے تھا' اس لئے وہ علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ اسلام' الدین کی شکل میں موجودہ

مسلمانوں میں جن پر مذہبی پیشوائیت اس بری طرح مسلط ہے، زندہ نہیں ہو سکتا' اس لئے انہوں نے، بصد حسرت و یاس، لیکن اس کے ساتھ ہی دین کے مستقبل کے متعلق بہ ہزار امید اور یقین کہا کہ:

محفل ما بے مے و بے ساقی است
ساز قرآں را نواہا باقی است !
زخمہ ما بے اثر افتد اگر !
آسماں دارد ہزاراں زخمہ در
حق اگر از پیش ما بردارش
پیش قومے دیگرے بگذاروش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن
ہر زماں جانم بلرزد دربدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتش خود بر دل دیگر زنند!

(جاوید نامہ)

اور یہ خود قرآن کی اس آیت کی ترجمانی ہے جس میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ:

وان تتولوا یستبدل قوما غیر کم ثم لا یکونوا امثالکم(۴۷/۳۸)

اگر تم نے قرآن سے روگردانی کی تو وہ تمہاری جگہ ایک اور قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

یہ وہ قوم ہوگی جس میں قرآنی نظریات کے الفاظ دہرانے کا نام ایمان نہیں ہوگا۔ اس کے نزدیک ان نظریات کے نتائج کی صداقت پر یقین محکم کا نام ایمان ہوگا۔ اس کے ہاں اسلام کے ارکان اور شعائر کی رسمی پابندی فریضہ خداوندی کی ادائیگی نہیں ہوگی۔ وہ قدم قدم پر رک کر دیکھے گی' سوچے گی اور اس امر کا جائزہ لے گی کہ ان سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں جن کا وعدہ خدا نے کر رکھا ہے۔ وہ اسلام کی اشاعت' لفظی مناظروں اور نظری کانفرنسوں کے ذریعے نہیں کرے گی بلکہ اقوام عالم کو چیلنج دے گی کہ:

اعملوا علی مکانتکم انی عامل ج فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبۃ الدار ط انہ لا یفلح الظلمون(۶/۱۳۶)

تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو' ہمیں اپنے نظام کو روبہ عمل لانے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ اور اس بات کو تو ابھی سے سن رکھو کہ جس نظام کی بنیاد ظلم و استبداد پر ہوگی اسے کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکے

گی۔

اس عملی پروگرام کی رو سے یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ نظاموں پر غالب آجائے گا' خواہ وہ مذہب پرست طبقہ کے مسالک ہوں اور خواہ لامذہب اقوام کے نظام۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے' میری زندگی کا مشن بھی دین کا احیاء ہے۔ میری سوچ کا رخ کچھ اس طرف جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ وہ' دین سے روگردانی کرنے والی قوم کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا' تو اس سے بالضرور ایسی قوم مقصود نہیں جو کسی دوسرے ملک سے اٹھے یا کسی دوسری نسل سے متعلق ہو۔ اصل سوال ملک اور نسب کا نہیں' ذہنیت کا ہے۔ اگر کسی مذہب پرست قوم کی اگلی نسل زمانے کے تقاضوں سے مذہب سے برگشتہ ہو جائے اور اس کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر کر دی جائے تو یہ بھی وہ قوم ہو سکتی ہے جو مذہب کی جگہ دین کا نظام قائم کرے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اپنی توجہات کو "شاہین بچوں" پر مرکوز کر رکھا تھا اور میں نے بھی اپنے پیغام کا اولین مخاطب اپنی قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرار دے رکھا ہے۔ اس میں مجھے بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے اور میں اس پروگرام کے مستقبل کے متعلق پرامید بھی ہوں۔ اس وقت تک میں تنہا اس آواز کو بلند کرتا چلا آرہا ہوں۔ اگر اس نہج پر سوچنے والے ارباب ہمت اجتماعی طور پر اس پروگرام پر عمل پیرا ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں کامیابی نہ ہو۔ مذہب تو زمانے کے تقاضوں کی تاب نہ لا کر مٹتا چلا جا رہا ہے۔ اس لئے دین کے لئے فضا خود بخود ہموار ہو رہی ہے۔ اگر ذرا ہمت کر کے اسے صحیح رنگ میں پیش کر دیا جائے' تو مادی دنیا سے مایوس اور متجسس انسان لپک کر اس کی طرف آجائے گا۔

(اگست ۱۹۷۸ء)

آٹھواں باب

جنسیات

۱۔ غلام اور لونڈیاں

سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا ارشاد ہے کہ جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ وہ انہیں بلا نکاح اور بلا حد تعداد اپنے استعمال میں لائیں گے۔ اس کے بعد جب جی چاہے انہیں دوسروں کی طرف منتقل کر دیں گے۔ حتیٰ کہ انہیں فروخت بھی کر سکیں گے۔ اس کی پوری تفصیل ان کی کتاب۔ تفہیمات، حصہ دوم، اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن، صفحات ۲۹۔۳۲۴ میں "غلامی کا مسئلہ" کے عنوان کے تحت درج ہے۔ نیز انہوں نے اسے اپنی تفسیر، تفہیم القرآن کی پہلی جلد میں بھی دہرایا ہے۔ (۱۹۵۱ء ایڈیشن ص ۳۴۰)۔

(جون ۱۹۷۸ء)

------------○------------

۲۔ کم از کم ایک لونڈی

جمعیت العلماء اسلام کے رکن اسمبلی، مولانا نعمت اللہ صاحب نے اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران فرمایا:۔

> غلامی کو منسوخ کرنا خلاف اسلام ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی استطاعت نہ رکھتا ہو، ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک لونڈی رکھ سکے۔

(پاکستان ٹائمز، یکم مارچ ۱۹۷۳ء)

(جون ۱۹۷۸ء)

------------○------------

۳۔ غلام سربراہ مملکت کا نیلام

لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ محدث کے شمارہ، بابت محرم۔ صفر ۱۳۹۵ھ میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا۔۔۔ علماء حق کے لئے لمحہ فکریہ۔۔۔ اس کی ابتدا ان سطور سے ہوئی تھی۔

> علمائے کرام، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث، دین نبی کے ترجمان، صداقت اسلام کے شاہد، طائفہ منصورہ کی جان اور ملت اسلامیہ کے اصلی نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ وہ

اعزاز ہے جو بیک وقت کسی ایک طبقہ کو ایک ساتھ مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ سے انہیں ناقابل تسخیر محاذ اور قابل صد رشک اعزاز تصور کیا جاتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گروہ سعید اس احترام، اکرام، اعتماد اور عزت کا اہل بھی ہے۔

کثر ھم اللہ سواد ھم

اس کے بعد علماء سے کہا گیا کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں اور اس کی بازیابی کے لئے متحد ہو جائیں۔ اگر انہوں نے اس مقام کو حاصل کر لیا تو مملکت میں ان کے اقتدار کا کیا عالم ہوگا، اس کی وضاحت کے لئے ایک واقعہ درج کیا گیا۔ اسے غور سے سنئے لکھتے ہیں:

مصری حکومت کا ایک نائب السلطنت اصل میں غلام تھا جو کسی طرح برسراقتدار آگیا تھا۔ غلام اصل میں، اسلامی بیت المال کی ملکیت ہوتے ہیں اس لئے حضرت امام عزالدین بن عبدالسلام نے اعلان کیا کہ یہ شخص بیت المال کی جائیداد ہے اور شرعی طریقے پر آزاد نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس فتوے سے بڑی کھلبلی مچ گئی۔ حکام نے بلا کر پوچھا کہ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا:

ہم ایک مجلس طلب کریں گے اور بیت المال کی طرف سے آپ کو نیلام کریں گے اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا۔ انہوں نے جاکر بادشاہ سے کہا کہ یہ شیخ ہمیں ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے بڑی کوشش کی مگر شیخ نے اپنے الفاظ واپس لینے سے انکار کر دیا جس سے برہم ہو کر شاہ سے شیخ کی شان کے خلاف کوئی غیر محتاط جملہ نکل گیا۔ آپ نے سن کر وہاں سے کوچ کر دیا۔ پھر کیا تھا، سارے شہر میں کہرام مچ گیا، اور بادشاہ کو خود جاکر منتوں سے واپس لانا پڑا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ وہ امراء سلطنت کو خود نیلام کریں۔

نائب السلطنت نے جلال میں آکر کہا کہ میں اس کی گردن اڑا دوں گا ..... تلوار لے کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا، دستک دی۔ شیخ کا بیٹا آیا۔ دیکھا کہ نائب السلطنت تلوار سونتے کھڑا ہے۔ جاکر بتایا تو شیخ نے کہا کہ:

بیٹا! آپ کا باپ اس قدر خوش نصیب کہاں کہ اس کو شہادت ملے۔ پھر باہر نکلے تو دیکھتے ہی نائب السلطنت کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور بدن پر رعشہ طاری ہو گیا اور پاؤں میں گر گیا اور کہا، آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا آپ کا نیلام! پھر فرمایا رقم کس مد میں ڈالیں گے؟ فرمایا مسلمانوں کے کاموں میں۔ پوچھا، قیمت کون وصول کرے گا؟ فرمایا، میں خود۔ اس نے کہا، بہت اچھا! چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک ایک امیر کو نیلام کیا گیا اور ہر

ایک کی بولی بولی گئی اور قیمت وصول کر کے وہ خیر کے کاموں میں صرف کی گئی۔
طبقات الشافعیہ ' ماخوذ از تاریخ دعوت و عزیمت)
(جون ۱۹۷۸ء)

---○---

۴۔ تمام فتنوں کی جڑ ــــ عورت

جنسیات ان حضرات کا خاص موضوع ہوتا ہے اور اس کے متعلق وہ بڑی تفصیل سے تصریحات بیان کرتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ عورت کی ان حضرات کے نزدیک حیثیت کیا ہے۔ جماعت اہل حدیث کے ایک ترجمان' ہفتہ وار منہاج کی ۱۷/۲۱ ستمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں حضرت داتا گنج بخشؒ سے متعلق ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ عورت کے متعلق داتاؒ صاحب فرماتے ہیں:۔

> بہشت میں سب سے پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا اس کا اصل سبب یہی عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا یعنی ہابیل اور قابیل کی لڑائی' اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا گیا۔ اور آج دینی اور دنیاوی فتنوں کے تمام اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں۔ (جون ۱۹۷۸ء)

---○---

۵۔ نابالغ لڑکی سے خلوت

مودودی مرحوم نے اپنی تفسیر' تفہیم القرآن' جلد پنجم' ص ۵۷۱ (طبع اول) پر لکھا ہے کہ نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ شوہر کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

---○---

۶۔ جنت کی حوریں

(کفار کی کم سن لڑکیاں)

مودودی مرحوم سے دریافت کیا گیا کہ جنت کی حوریں کون ہوں گی تو آپ نے جواب دیا:۔

> کفار کی لڑکیاں جو کم سنی میں وفات پا گئی ہوں گی' انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا۔
> (ایشیاء ۱۴ جون ۱۹۶۹ء)

انہوں نے اپنی تفسیر' تفہیم القران' جلد پنجم' طبع اول' ص ۲۷۱ میں اس پر اضافہ فرمایا ہے:۔

اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔

(جون ۱۹۷۸ء)

---------------○---------------

۷۔ جنت میں جنسیات

(قوت ' رجولیت اور عورتوں کی بارش)

جنت کی عورتوں کے متعلق کتب روایات و تفاسیر میں اس سے بھی زیادہ "دلچسپ" کوائف درج ہوتے ہیں۔ مشکوۃ المصابیح حدیث کا مشہور اور بڑا مستند مجموعہ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ' مولوی نور محمد ' کارخانہ تجارت کتب ' کراچی نے چھاپا تھا۔ اس کی دوسری جلد میں جنت کی تفاصیل بڑی وضاحت سے دی گئی ہیں۔ اس میں ایک حدیث شریف میں ہے:۔

(حضرت) انسؓ کہتے ہیں نبی صلعم نے فرمایا ہے' جنت میں مومن کو جماع کی اتنی قوت عطا کی جائے گی (یعنی مثلاً" دس عورتوں سے جماع کرنے کے وقت)۔ پوچھا گیا' یارسول اللہ (صلعم) کیا مرد کو اتنی عورتوں سے جماع کرنے کی قوت ہوگی؟..... فرمایا جب مرد کو سو مردوں کے برابر قوت عطا کی جائے گی تو پھر وہ کیوں اتنی عورتوں سے جماع کی قوت نہ رکھ سکے گا۔ (ترمذی)

(مشکوۃ' جلد دوم ' ص ۳۲۹)

ابن کثیرؒ تفسیر کی ایک نہایت مستند کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

حضرت ابو طیبہؒ فرماتے ہیں کہ جنتیوں کے سروں پر ابر آئے گا اور انہیں ندا ہوگی کہ بتلاؤ کس چیز کا برسنا چاہتے ہو؟ پس جو لوگ جس چیز کا برسنا چاہیں گے وہی چیز ان پر اس بادل سے برسے گی۔ یہاں تک کہ کہیں گے کہ ہم پر ابھرے ہوئے سینے والی ہم عمر عورتیں برسائی جائیں۔ چنانچہ وہی برسیں گی' اس لئے فرمایا کہ فضل کبیر یعنی زبردست کامیابی کامل نعمت یہی ہے۔

(اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر از مولانا محمد جوناگڑھی -- پارہ پچیسواں ص ۱۱)

(جون ۱۹۷۸ء)

---------------○---------------

متفرق سوالات و جوابات

۱۔ انسان سے افضل مخلوق

(کیا انسان خدا کا خلیفہ ہے)

لاہور سے ایک طالب علم نے ایک سوال پوچھا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہے کہ **وفضلنهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا** (۱۷/۷۰) "ہم نے انسان کو اپنی مخلوق میں سے اکثر پر فضیلت دی ہے"۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ایسی مخلوق بھی ہے جس سے انسان افضل نہیں۔ لیکن زمین پر تو ایسی مخلوق کوئی نہیں ہوتی۔ کیا کسی اور جگہ بھی مخلوق ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ مخلوق ارتقائی طور پر انسان سے آگے ہو۔ لیکن انسان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اسے اس نے اپنا خلیفہ (نائب) بنایا ہے' تو خدا کے خلیفہ سے زیادہ افضل کون ہو سکتا ہے۔

جواب :- قرآن کریم اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ ارض کے علاوہ سموت (اجرام فلکی) میں بھی ذی حیات مخلوق ہے۔ **ومن ایتہ خلق السموت والارض وما بث فیھما من دابۃ** (۴۲/۲۹) اس کی تائید (۱۶/۴۹) سے بھی ہوتی ہے' یعنی زمین اور آسمانوں میں ذی حیات پھیلے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور کرے میں ایسے ذی حیات ہوں جو ارتقائی سلسلہ میں انسان سے بھی آگے ہوں۔ وہ مخلوق انسان سے افضل ہوگی۔ ضمناً" آیت (۴۲/۲۹) کا آخری حصہ یہ ہے **وھو علی جمعھم اذا یشاء قدیر** خدا کے قانون مشیت کی رو سے یہ بھی ممکن ہے کہ زمین اور آسمانی کروں کی یہ مخلوق کبھی آپس میں مل جائے۔ اس وقت جو کوششیں دوسرے کروں تک پہنچنے کی ہو ..... رہی ہیں' ہو سکتا ہے کہ انہیں سے یہاں اور وہاں کی مخلوق کے یک جا ہو جانے کا امکان عملی شکل اختیار کر لے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مخلوق ہم سے آگے ہو۔

باقی رہا انسان کا خلیفتہ اللہ ہونا' تو یہ تصور ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ خدا نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ہم نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا ہے کہ آدم کو خلیفہ فی الارض بنایا گیا ہے۔ خلیفہ کے معنی کسی کا جانشیں ہوتے ہیں۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسان سے پہلے دنیا میں کوئی مخلوق تھی جس میں گرمی برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ تھی۔ وہ مخلوق ناپید ہو گئی اور اس کا جانشین انسان کو بنایا (۱۵/۲۷)۔ انسان خدا کا خلیفہ (جانشین) نہیں ہو سکتا۔ تفصیل ان امور کی---- مطالب الفرقان---- جلد دوم میں دیکھئے یا ابلیس و آدم میں---- (مارچ ۱۹۶۵ء)

۲۔ کفن کے لئے نیا کپڑا

(قل' جمعراتیں' چالیسواں' ختم وغیرہ رسومات)

سوال :- آج کل چیزوں کی گرانی ہوش ربا حد تک پہنچ چکی ہے۔ بیشتر آبادی ایسی ہے جسے دو وقت کی روٹی بھی نصیب

نہیں ہوتی اور غریب آدمی کے پاس علاج کے لئے پیشہ تک نہیں ہوتا۔ وہ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے لاعلاج مرجاتا ہے۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کے کفن دفن اور بعد کی رسومات کے لئے اس قدر خرچ کی ضرورت ہوتی ہے کہ مرنے والے کے پس ماندگان اس بوجھ کے تلے دب کر مرجاتے ہیں۔ کفن کے لئے اٹھارہ گز لٹھے کی قیمت کا ہی اندازہ لگائیے۔ مرنے والے کو برسوں سے نیا کرتہ نصیب نہیں تھا۔ لیکن مرنے کے بعد اٹھارہ گز کپڑا اسے دفن کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ پھر قل' جمعراتیں' چالیسواں اور ان پر "ختم" غریب لوگ کیا' متوسط طبقے کے لوگ بھی ان اخراجات کی استطاعت نہیں رکھتے' لیکن بایں ہمہ' انہیں یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ سب کچھ واقعی ضروری ہے ؟ کیا اس خرچ میں تخفیف نہیں ہو سکتی؟ لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ازروئے شریعت ضروری ہے۔ اور وہ اس ڈر سے یہ تمام اخراجات برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں خواہ اس کے لئے انہیں گھر کے برتن بھی کیوں نہ بیچنے پڑیں؟

جواب :۔ ضروری صرف اس قدر ہے کہ مردے کو سپرد خاک کیا جائے اور اس کے لئے نیک آرزوؤں کا اظہار کیا جائے اور انسانی جذبات کا تقاضا ہے کہ یہ کچھ احترام اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے۔

جہاں تک کفن کے لئے اٹھارہ گز نئے لٹھے کی ضرورت کا سوال ہے' ہمارے اس بھائی کی نگاہ صرف غریبوں کی ناداری تک پہنچی ہے' لیکن ذرا گہرائی تک جانے سے نظر آئے گا کہ اس سوال کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک شہر لاہور میں' ایک دن میں کتنی میتیں ہوتی ہیں۔ پھر اس تعداد کو پورے پاکستان پر پھیلایئے اور پھر تمام ممالک اسلامیہ میں مرنے والوں کی تعداد سامنے لایئے اور اسے اٹھارہ سے ضرب دیجئے۔ آپ کی قوم---- نہایت غریب اور پسماندہ قوم-------- اتنے گز نیا کپڑا ہر روز زمین کے نیچے دباتی رہتی ہے------ ہر روز---- سال کے تین سو پینسٹھ دن--- لاکھوں گز نیا کپڑا جسے تیار کرنے کے لئے کتنے ہی کارخانے درکار ہیں---- زمین کے نیچے چلا جاتا ہے۔ آپ نے کبھی اس کا بھی اندازہ لگایا ہے کہ اگر یہی کپڑا زندہ انسانوں کو میسر آجائے تو کتنوں کا تن ڈھنپ جائے؟

اس باب میں صحیح مسلک کیا ہونا چاہیے' اس کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ارشاد گرامی سنئے۔ روایت میں ہے کہ آپ نے اپنی تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں وصیت فرمائی کہ:

> انہیں ان دو کپڑوں میں کفن دیا جائے جو وہ بالعموم پہنا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ ابا جان! ہم میں اتنی استطاعت ہے کہ ہم نئے کپڑوں میں آپ کو کفن دے سکیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اے میری بیٹی! زندہ شخص نئے کپڑے کا زیادہ حقدار ہے۔ کفن تو اس لئے ہوتا ہے کہ پیپ وغیرہ اس میں جذب ہو جاے۔
>
> (طبقات ابن سعد' بحوالہ ابوبکر از محمد حسنین ہیکل)

چنانچہ طبقات میں ہے کہ آپ کی انہی دو چادروں کو دھو کر اور ان کے ساتھ ایک اور چادر ملا کر آپ کو دفنایا گیا۔

باقی رہا قل' جمعراتیں' چالیسواں اور ان کے ختم' تو یہ سب رسومات غیر قرآنی ہیں۔ جو کچھ ان پر صرف کیا جاتا ہے

اس میں سے حبہ بھر بھی مردے تک نہیں پہنچتا۔ وہ سب ختم پڑھنے والے مولوی صاحبان کے ہاں چلا جاتا ہے۔
(مارچ ۱۹۶۵ء)

۴۳۔ رشوت کس طرح ختم کی جا سکتی ہے؟

سوال :۔ ہمارے معاشرے میں رشوت اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اس کے متعلق کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ خرابی کسی طرح ختم بھی ہو سکتی ہے؟ اس وقت تک اسے روکنے کے لئے جس قدر اقدامات کئے گئے ہیں وہ تو کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔ ان سے تو مرض بلکہ اور بڑھ گیا ہے۔

جواب:۔ رشوت ختم کرنے کے لئے جس قدر اقدامات کئے گئے ہیں وہ نہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں نہ کامیاب ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ اقدامات اس کے سوا کیا ہیں کہ انسداد رشوت ستانی کا ایک نیا محکمہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ یہ اقدامات کیوں ناکام رہتے ہیں' اس کی وجہ ظاہر ہے ـــــ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک' کسی مجسٹریٹ کا اہل مد ہو جاتا ہے اور وہ رشوت لیتا ہے۔ دوسرا بھائی محکمہ انسداد رشوت ستانی میں سپاہی بھرتی ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو محرکات اس اہلمد کو رشوت لینے پر آمادہ کرتے ہیں وہی محرکات اس دوسرے بھائی کو رشوت لینے پر آمادہ کیوں نہیں کریں گے؟ قانونی ممانعت دونوں کے لئے یکساں ہے۔ اگر وہ ایک کے لئے موثر ثابت نہیں ہوتی تو دوسرے کے لئے کس طرح موثر ہو جائے گی۔ باقی رہا گرفتاری کا خطرہ' سو وہ دوسرے بھائی (سپاہی) کے لئے اور بھی کم ہے۔ لہٰذا' اس قسم کے اقدامات ایسے جرائم کے انسداد کے لئے موثر نہیں ثابت ہو سکتے ...... تاوقتیکہ ہم محکمہ انسداد رشوت کے لئے کہیں سے ایسے افراد نہ لے آئیں جن کا خمیر کسی اور ہی مٹی سے اٹھا ہو۔ اور یہ بات ہمارے معاشرہ میں مشکل ہی سے میسر آ سکتی ہے۔

اس خرابی (اور اس قسم کی دوسری خرابیوں) کے انسداد کے لئے دو تدبیریں ہیں: ایک خارجی اور دوسری داخلی۔ خارجی پر عملدر آمد فوری طور پر کیا جا سکتا ہے اور اسی کو ہم پہلے لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انسان رشوت کیوں لیتا ہے؟ ان افراد کو چھوڑ کر' جو روپیہ اکٹھا کرنے کی نفسیاتی بیماری کے مریض ہیں (اور جن کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی)' ناجائز طریق سے روپیہ حاصل کرنے کا جذبہ محرکہ مستقبل کے متعلق عدم حفاظت (INSECURITY) کا احساس ہوتا ہے ـــــ شروع میں شعوری طور پر اور بعد میں غیر شعوری طور پر ـــــ غلط معاشرہ میں ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ آج تو کسی نہ کسی طرح وقت گزر رہا ہے' اگر کل کو خدا نہ کردہ کوئی افتاد پڑ گئی تو میں کیا کروں گا۔ میری اولاد کیا کرے گی۔ ہمارا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا۔ ہم فاقوں مر جائیں گے۔ میری اولاد تباہ ہو جائے گی۔ یہ احساس اسے چھلاوے کی طرح ڈراتا ہے۔ یہ ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ جائز' ناجائز ہر طریقے سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ برے

وقت کے لئے کچھ بنا لے۔ عدم حفاظت کا یہ وہ جذبہ ہے جو اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ جب تک آپ اس کے دل میں مستقبل کی حفاظت کا یقین نہ پیدا کر دیں' وہ روپیہ حاصل کرنے کے جذبہ کو روک ہی نہیں سکتا۔ یہ تھا وہ شافی علاج جسے قرآن نے تجویز کیا تھا اور نظام معاشرہ سے کہا تھا کہ تم انہیں یقین دلا دو کہ **نحن نرزقکم و ایاھم** (۱۵۲/۶) ہم تمہارے سامان زیست کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ یہ گارنٹی اس قدر محکم' متقین' قابل اعتماد اور قابل تغیر ہونی چاہیے کہ انسان اس پر دل کے پورے اطمینان سے بھروسا کر سکے۔ حکومت کے ملازمین کو یہ ضمانت آئینی طور پر ملنی چاہیے' ایسی آئینی طور پر کہ حکومتیں آئیں اور حکومتیں جائیں لیکن ان کی اس ضمانت پر کوئی اثر نہ پڑے۔ تازیست ان کی تمام ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری بھی حکومت کے سر پر ہو' اور جب تک ان کی اولاد خود کفیل نہ ہو جائے ان کی ذمہ داری بھی حکومت کے سر پر۔ حکومت انہیں یہ ضمانت دے اور اس کے بعد انہیں کسی نوع کی ذاتی جائداد بنانے کی اجازت نہ ہو۔ اگر اتنا کچھ کر دینے کے بعد بھی کوئی شخص ناجائز طور پر کچھ حاصل کرے تو اس کی سزا سنگین ترین دی جائے۔ یاد رکھیے! قرآن کریم نے بعض جرائم کی سزائیں جو اس قدر سنگین بتائی ہیں تو وہ اس بات سے مشروط ہیں کہ پہلے ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن میں انسان کو اس قسم کے جرم کے ارتکاب کی ضرورت پیش نہ آئے اور جو اس کے بعد ایسا کرے' اسے سخت سزا دی جائے (بشرطیکہ وہ اپنی اصلاح پر آمادہ نہ ہو)۔

اس وقت حکومت کے ملازمین کی کیفیت اس قسم کی ضمانت کے بالکل برعکس ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ان کی تنخواہ' ان کی ضروریات زندگی کے پیش نظر مقرر نہیں کی جاتی۔ ایک اسکیل مقرر کر دیا جاتا ہے جس کا اطلاق ہر فرد پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری کسی کی بھی نہیں ہوتی کہ وہ دیکھے کہ اس تنخواہ میں اس ملازم حکومت کی بنیادی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اگر سروس کے دوران' اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کے پسماندگان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ جب اس کی عمر پچاس ساٹھ سال کی ہوتی ہے (جبکہ اس کی اولاد کی ذمہ داریاں پورے شباب پر ہوتی ہیں) تو اسے ریٹائر کر کے اس کی آمدنی ایک ہی دن میں آدھی کر دی جاتی ہے۔ پھر اسے سرکاری مکان سے بھی نکال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ جس عسرت اور بدحالی کی زندگی بسر کرتا ہے اسے دیکھ کر ہر شخص کے دل میں یہ احساس بیدار ہو جاتا ہے کہ اگر میں نے ایسے وقت کے لئے کچھ جمع نہ کر لیا تو میری بھی یہی حالت ہو جائے گی۔ مستقبل کا یہ بھیانک نقشہ ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے اور اسے' جائز اور ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کر لینے پر آمادہ کرتا رہتا ہے (**الا ماشاء اللہ**)۔ انہیں اس کا یقین دلائیے کہ ان کی ایسی حالت نہیں ہوگی۔ اور اس کے بعد اگر کوئی ایسی ناجائز حرکت کرے تو اس کی کھال کھنچوا دیجئے۔

یہ ہے خارجی طریق عمل رشوت بند کرنے کا ـــــــ صرف رشوت بند کرنے ہی کا نہیں' بلکہ معاشرہ کی بہت سی خرابیاں دور کرنے کا ـــــــ لیکن چونکہ اس وقت سوال صرف رشوت کا زیر نظر ہے اس لئے ہم دوسری خرابیوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے ہیں۔ قرآن کا معاشی نظام' جس میں ہر فرد کو اپنی بنیادی ضروریات زندگی کی طرف سے پورا پورا اطمینان حاصل ہوتا ہے' معاشرہ کی بیشتر خرابیوں کا علاج ہے۔

اب رہا داخلی طریق' سو اس کا ذریعہ تعلیم ہے۔۔۔ جیسا کہ طلوع اسلام کے صفحات پر اس سے پہلے متعدد بار یہ مثال پیش کی جاچکی ہے' ہم انتہائی بھوک کے عالم میں بھی وہ کھانا کیوں نہیں کھاتے جس میں زہر ملا ہوا ہو؟ اس لئے کہ ہمیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ اس سے ہماری ہلاکت ہو جائے گی' اس سے ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اگر ہم اپنے بچوں کے دل میں شروع ہی سے یہ یقین پیدا کر دیں۔۔۔۔ اور اس یقین کی بنیاد رسمی عقیدہ پر نہ ہو بلکہ عقل و بصیرت پر ہو' کہ جس طرح زہر آلود کھانے سے ہمارے طبیعی جسم کی ہلاکت ہوتی ہے' اسی طرح ناجائز کمائی سے ہماری وہ متاع گراں بہا ضائع ہو جاتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے' تو وہ ناجائز کمائی سے اسی طرح اجتناب کریں گے جس طرح زہر آلود کھانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر' اگر ہم اپنی آنے والی نسلوں کے دل میں قرآن کی دی ہوئی مستقل اقدار کی قدر و قیمت اور اہمیت جاگزیں کر دیں' تو وہ کسی شجر ممنوعہ کے پاس تک بھی نہیں پھٹکیں گے۔ یوں رشوت (اور اس قسم کے دیگر جرائم) کے خلاف' جذبہ نفرت ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے گا۔ پھر یہی طبقہ قرآن کا معاشی نظام از خود قائم کر دے گا اور اسے مستحکم رکھنا ان کا اندرونی تقاضا ہوگا۔

یہ ہے رشوت بند کرنے کا وہ موثر طریقہ جس کی طرف ہماری قرآنی بصیرت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے "توکل علی اللہ" پر جو اس قدر زور دیا ہے اور اسے تمام اخلاق حسنہ کا سرچشمہ بتایا ہے' تو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے نظام خداوندی (یعنی قرآنی نظام معاشرہ) کی طرف سے کئے گئے وعدوں (یعنی ان کی طرف سے دی گئی ضمانت) پر غیر متزلزل یقین رکھنا' ان پر پورا اعتماد کرنا۔ قرآن کی رو سے تو مملکت کی ضرورت ہی افراد کے دل میں اس قسم کا اعتماد اور یقین پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ جس قدر یہ اعتماد بڑھتا جائے گا خرابیاں کم ہوتی جائیں گی۔ اور کامل اعتماد حاصل ہوگا دلوں میں مستقل اقدار کے احترام اور قرآن کے معاشی نظام کے قیام سے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ غلط نظام معاشرہ میں بھی مستقل اقدار کا احترام کرتے ہیں اور ان پر پابند رہتے ہیں' وہ بڑی عزیمت کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن ان کا شمار مستثنیات میں ہوتا ہے۔ اور اس وقت زیر غور سوال یہ ہے کہ وہ کونسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے معاشرہ کی عام روش صحیح ہو جائے۔ یہ تدبیر وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

(اپریل ۱۹۶۵ء)

۴۔ حاجیوں کا کردار

روزنامہ "مشرق" (لاہور) کے عید نمبر میں خانہ کعبہ کی ایک تصویر شائع ہوئی تھی جس کے نیچے لکھا تھا:۔

یوم عرفہ کو خانہ کعبہ کا غلاف بدل کر اونچا کر دیا گیا ہے تاکہ کوئی اسے کاٹ نہ سکے۔

یعنی مسجدوں میں نمازی جوتے چور اور کعبہ میں حاجی غلاف تراش! جب دین کے ارکان رسم بن کر رہ جائیں تو ان سے اسی قسم کا کردار وجود میں آتا ہے۔

اس کے نیچے ایک اور تصویر ہے جس پر لکھا ہے:-

ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو شیطان کو کنکریاں مارنے والوں کا ہجوم۔

اگر انہیں، شیطان کو کنکریاں مارنے کے بجائے، خود اپنے آپ کو کنکریاں مارنے کی تعلیم دی جائے تو پھر جوتی چوروں اور غلاف تراشوں کا وجود باقی نہ رہے۔

(جون ۱۹۶۶ء)

۵- زر، زمین اور زن سے متعلق مسائل

(اور ان کا قرآنی حل)

سوال :- ہمارے ہاں مشہور ہے کہ دنیا میں فساد کی جڑ تین ہی چیزیں ہیں------ یعنی زر- زمین- اور زن---- قرآن مجید نوع انسانی کی مشکلات کا حل پیش کرتا ہے- اس نے ان معاملات کا حل کیا تجویز کیا ہے جن کا تعلق زر------ زمین اور زن سے ہے-

جواب:- اس بحث میں الجھے بغیر کہ دنیا میں فساد کا سرچشمہ یہی تین چیزیں ہیں یا کچھ اور بھی، مختصر الفاظ میں یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ انہیں فساد کا سرچشمہ کس طرح بنا لیا گیا ہے اور قرآن کریم کی رو سے ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے- پہلے زر کو لیجئے (زر سے مفہوم ہے دولت، جو عام طور پر سکوں کی شکل میں سامنے آتی ہے)-

انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں سکہ ایجاد نہیں ہوا تھا- زندگی کی ضروریات کے لئے اشیاء کا تبادلہ ہوتا تھا (جسے (BARTER SYSTEM) کہا جاتا ہے)- زید کے پاس گندم ہے، بکر کے پاس تیل- زید نے بکر کو کچھ گندم دے دیا اور اس سے تیل لے لیا- آج سے کچھ عرصہ پہلے (اور اب بھی اکثر مقامات پر) دیہات میں یہی رواج ہے- وہاں سکہ کے مقابلہ میں اشیاء ہی کا تبادلہ ہوتا ہے- عربی زبان میں اب تو بیع کا لفظ بیچنے اور شری کا لفظ خریدنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے- لیکن بنیادی طور پر یہ دونوں لفظ خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے معنی میں استعمال ہوتے تھے- یعنی بیع کے معنی صرف فروخت کرنا نہیں تھے- اس کے معنی "بیچنا اور خریدنا" تھے، اسی طرح شریٰ کے معنی- جب جنس کا تبادلہ جنس سے ہو، تو اس میں بیچنا اور خریدنا بیک وقت ہوتا ہے- زید جب گیہوں دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تیل لیتا بھی ہے- اور بکر جب تیل دیتا ہے تو گندم لیتا بھی ہے- اس نہج زندگی میں کسی شے کے ذخیرہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا- جب تمدنی ضروریات ذرا آگے بڑھیں اور آبادی کی وسعتیں پھیلیں، تو بغرض سہولت سکہ ایجاد کیا گیا- اب زید، عمر کے ہاتھ کچھ گیہوں بیچ کر کچھ سکے لیتا تھا اور ان سکوں کے عوض بکر سے تیل خریدتا تھا اور فاضلہ سکے اپنے پاس رکھ لیتا تھا- یہ "فاضلہ سکے" (جسے SURPLUS MONEY کہا جاتا ہے) بنیاد ہے اس فساد کی جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اور جس کا رونا ساری دنیا روتی ہے- اس فاضلہ دولت سے سامان معیشت اور ذرائع پیداوار پر قبضہ کیا جاتا ہے، تاکہ دوسروں کی محنت کو غصب کیا جائے- حتیٰ کہ یہی فاضلہ دولت دوسروں کو بطور قرض دے کر، ہاتھ

پاؤں ہلائے بغیر' ان کی کمائی میں شرکت کر لی جاتی ہے۔ اس سے ان غریبوں کی کمائی ہی دوسروں کے ہاں نہیں چلی جاتی' ان کی آزادی بھی سلب ہو جاتی ہے' ان کی حمیت و غیرت تک بک جاتی ہے' ان کی عزت و آبرو تک کے سودے ہونے لگتے ہیں۔ ادھر سے افراط زر سے وہ تمام خرابیاں ابھرتی چلی جاتی ہیں جو سرمایہ دار طبقہ میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں یعنی وہ غریبوں کی اس تمام متاع کا خریدار بن جاتا ہے۔ ان ناہمواریوں سے وہ فساد رونما ہوتا ہے جو دنیا کو جہنم بنا دیتا ہے۔

قرآن کریم ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہنے پاتی۔ لفظ "دولت" کے معنی گردش کرنے کے ہیں۔ فاضلہ دولت گردش نہیں کرتی' بلکہ ایک جگہ جمع ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم' دولت کے ایک جگہ جمع ہو جانے کا نتیجہ "جہنم قرار دیتا ہے اور ایسا کرنے والوں کو انسانیت کا بدترین مجرم ٹھہراتا ہے۔ **والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقو نھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم** (۹/۳۴) جو لوگ چاندی سونے کے سکے دبا کر بیٹھ جاتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ (نوع انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے) کھلا نہیں رکھتے' ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس عذاب کے متعلق اگلی آیت میں ہے کہ ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان دولت جمع کرنے والوں کی پیشانی' پہلو اور پشت کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا' یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے دبا کر رکھ دیا تھا۔ اب اپنے اس طرز عمل کا نتیجہ دیکھو۔ "وہ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ "جہنم آوازیں دے دے کر بلاتی ہے"۔ وہ کسے بلاتی ہے؟ اسے کہ۔۔۔۔۔ **جمع فاوعی** (۷۰/۱۸) جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اپنی میانی کا منہ کس کر باندھ رکھتا ہے۔ سورہ الھمزۃ میں ہے' تباہی اور بربادی ہے اس کے لئے جس کی روش یہ ہو کہ **جمع مالا وعددہ** (۱۰۴/۲) جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر حساب کرتا رہتا ہے کہ یہ کتنی ہو گئی ہے اور کتنی کسر رہ گئی۔ اس کے بعد' اس "آتش سوزاں" کا ذکر ہے جو اس ذہنیت کا فطری نتیجہ ہے اور "جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں"۔

یہ تو رہا دولت کے جمع کرنے کے متعلق۔ اس کے گردش کرنے کے سلسلہ میں بھی کہا کہ اس کا انداز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ دولت مندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ **کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم** (۵۹/۷) اس کی گردش' خون زندگی کی طرح معاشرہ کی رگ رگ میں ہونی چاہیے' تاکہ ہر ایک کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔

ان اصولی ہدایات کے بعد' اس نے اس کی عملی تدبیر یہ بتائی کہ **یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو** (۲/۲۱۹) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت کھلی رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے' سب کی سب۔ اس سے قرآن کریم نے فاضلہ دولت کے تصور کو عملاً" ختم کر دیا۔ یہ قرآن کریم کے عطا کردہ نظام کا نقطہ ماسکہ ہے اور اس سے ان تمام خرابیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو "زر" کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے نظام میں نہ کسی کی ضرورت رکی رہتی ہے (کہ ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری خود نظام معاشرہ پر ہوتی ہے۔ اسی کو نظام ربوبیت کہا جاتا ہے) اور نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے۔ اس سے ان خرابیوں کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے جو

مفلسی اور ناداری (ضروریات زندگی پوری نہ ہو سکنے) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور ان خرابیوں کا بھی جو افراط زر (فاضلہ دولت) کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔

زمین

اب آیئے زمین کی طرف۔

خدا نے انسان (بلکہ ہر ذی حیات) کو پیدا کیا' تو جن چیزوں پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا انہیں بھی ساتھ ہی (بلکہ ان سے بھی پہلے) مہیا کر دیا۔ ہوا' پانی' روشنی' حرارت' اور زمین۔۔۔ جس میں غذا کا "ذخیرہ" جمع رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں (ذرائع زیست) تمام ذی حیات کے لئے سامان زندگی کے طور پر دی گئی تھیں نہ کہ کسی فرد یا افراد کے مجموعہ کے لئے جاگیریں کھڑی کرنے کے لئے۔۔۔ انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں' ان اشیاء میں سے کسی شے پر "ملکیت" کا تصور ہی نہیں تھا۔۔۔ ان کی زبان میں "ملکیت" کا لفظ ہی نہیں ملتا' "متاع" (فائدہ حاصل کرنے) کا لفظ ملتا ہے۔۔۔ ضمناً" یہی لفظ۔۔۔ "متاع" قرآن کریم نے استعمال کیا ہے جب کہا ہے کہ۔۔۔ **ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین** (۲/۳۶) تمہارے لئے زمین میں ایک مدت کے لئے رہنا اور اس سے فائدہ اٹھانا (یعنی سامان زیست حاصل کرنا) ہے۔

انسانوں کو زمین سے سامان زیست حاصل کرنے کے لئے کچھ محنت کرنی پڑتی ہے۔ ابتدائی تمدنی زندگی میں ہر شخص اپنے لئے آپ ہی محنت کرتا تھا۔ اس سے اگلے دور میں' طاقتور انسانوں نے' کمزور انسانوں کو اپنا غلام بنا کر ان سے محنت کرانے کا کام شروع کر دیا۔ وہ ان سے محنت کراتے تھے اور انہیں روٹی دیتے تھے۔ وہ دن نوع انسانی کی زندگی میں انتہائی بدبختی کا دن تھا جب ان غلاموں نے زمین سے اتنا پیدا کر کے اپنے آقا کو دیا جو ان کی روٹی کے خرچ سے زیادہ تھا۔ اس سے زمین' سامان زیست حاصل کرنے کا ذریعہ ہونے کے بجائے' دولت کمانے کا ذریعہ بن گئی اور اسی سے اس پر ملکیت کا تصور پیدا ہوا۔ بس' پھر کیا تھا؟ ہر طاقتور نے زمین کے رقبوں پر لکیریں کھینچ کر انہیں اپنی ملکیت بنا لیا۔ اور پھر یہی ملکیت' اس کی اولاد میں وراثتاً" منتقل ہونے لگی۔ یوں زمین' سامان زیست کی برکات کا سرچشمہ بننے کی بجائے' مرگ آور فسادات کا موجب بن گئی۔

قرآن کریم نے زمین کو ملکیت کی شے قرار دینے کے بجائے' متاع۔۔۔ یعنی سامان زیست حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے جس پر تمام نوع انسان کا' اسی طرح یکساں حق ہے جس طرح ہر سانس لینے والے کا ہوا پر یکساں حق ہوتا ہے۔ **والارض وضعھا للانام** (۵۵/۱۰) زمین کو ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔۔۔ **سواء للسائلین** (۴۱/۱۰) اسے ہر ضرورت مند کی ضرورت پورا کرنے کے لئے یکساں طور رکھلا رہنا چاہئے۔ **متاعا لکم ولانعامکم** (۷۹/۱۰) تمہارے اور تمہارے مال مویشیوں کے لئے سامان زیست کا ذریعہ۔

چونکہ انسانوں کی اجتماعی زندگی میں تقسیم کار کا اصول کارفرما ہوتا ہے جس کی رو سے یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد اپنے اپنے طور پر زمین سے رزق حاصل کرے' اس لئے قرآن کریم نے انسانی معاشرہ کا فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ذرائع پیداوار کا اس قسم کا انتظام کرے جس سے یہ چند افراد کی ملکیت بننے کے بجائے' تمام افراد انسانیہ (بلکہ ہر متنفس) کو سامان زیست بہم پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔ چنانچہ جب اس نے کہا ہے کہ **وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا** (۶/۱۱) زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر نہ لی ہو' تو اس سے مطلب یہی ہے کہ ذرائع رزق خدا نے پیدا کر دیئے ہیں۔ انسانی معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ ان کا نظم و نسق اس طرح کرے کہ ان سے ہر ذی حیات کو سامان زندگی ملتا رہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب آپ ذرائع رزق کو انفرادی ملکیت میں دے دیں گے تو یہ مقصد فوت ہو جائے گا۔ ان کا مالک' انہیں تمام افراد انسانیہ کی ضروریات پورا کرنے کا ذریعہ بننے کے بجائے' اپنے مفاد حاصل کرنے کا وسیلہ بنا کر بیٹھ جائے گا۔

چنانچہ قرآن کریم نے (کافروں' ملحدوں' بے دینوں کے لئے ہی نہیں بلکہ) ان نمازیوں (مصلین) کے لئے تباہی اور بربادی بتائی ہے جو **یمنعون الماعون** (۱۰۷/۷) کرتے ہیں' یعنی رزق کے ان ذرائع کو جنہیں چشموں کے بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے لئے کھلا رہنا چاہیے' بند لگا کر روک لیتے ہیں۔ اور ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ دین کی تکذیب کرتے ہیں' یعنی دین سے انکار کر کے' غیر مسلموں کی صف میں نہیں چلے جاتے۔ زبان سے تو اس کا اقرار کرتے ہیں لیکن رزق کے سرچشموں پر بند لگا کر عملاً" اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہاں "تکذیب" کا لفظ غور طلب ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو جھوٹا ثابت کرنا۔ دین کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں ہر فرد معاشرہ کو سامان زیست بہم پہنچتا رہتا ہے۔ دین سچا اسی صورت میں ثابت ہو سکتا ہے کہ جو معاشرہ دین کا مدعی ہو اس میں سامان زیست ہر ایک تک پہنچتا رہے۔ لیکن اگر ایک معاشرہ دین کا مدعی بھی ہو اور اس کی کیفیت یہ ہو کہ رزق بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات پورا کرنے کا موجب نہ رہے' تو اس سے دنیا لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچے گی کہ اس دین کا یہ دعویٰ کہ اس میں کوئی فرد رزق سے محروم نہیں رہ سکتا' جھوٹا ہے۔ یوں یہ دین کے مدعی (مصلین) اپنے طرز عمل سے' دین کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں۔

یوں قرآن کریم نے "زمین" کو موجب فساد بننے کے بجائے باعث رحمت بنا دیا۔

زن

اب "زن" کے سوال کو لیجئے۔

"زن" سے مراد ہے جنسی مسئلہ (SEX PROBLEM)۔ انسان نے اپنی زندگی میں جس قدر بدنہادیاں (PERVERSIONS) پیدا کی ہیں' ان میں سب سے زیادہ شدید' سنگین' فساد انگیز اور تباہ کن بدنہادی' جنسیات (SEX) سے متعلق ہے۔

سیدھے سادے، کھلے کھلے، واضح، غیر مبہم الفاظ میں، نر اور مادہ کا جنسی اختلاط، افزائش نسل کا ذریعہ ہے۔ اس سے فطرت کا مقصود ہی یہ تھا۔ افزائش نسل کے سلسلہ میں بہت سی مشقتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ اس سے فطرت کو خدشہ لاحق ہوا کہ ان کی وجہ سے افزائش نسل کا سلسلہ ہی نہ رک جائے۔ اس اندیشہ کے پیش نظر اس نے اس اختلاط میں ایک خاص حظ و کیف پیدا کر دیا، ایک لذت رکھ دی---------- یعنی اس نے اس کڑوی گولی کو (SUGAR COATED) بنا دیا۔

حیوانات کو چونکہ اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا، اس لئے ان کی صورت میں جنسی اختلاط پر فطرت نے اپنا کنٹرول رکھا۔ وہ انہیں اس اختلاط کی اجازت اس وقت دیتی ہے جب افزائش نسل کے عمل کا وقت آتا ہے۔ وہ اس وقت اس کی اجازت ہی نہیں دیتی بلکہ انہیں اس پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایک سانڈ صبح شام گایوں کے گلے میں چرتا پھرتا رہتا ہے۔ نہ کوئی گائے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہے نہ وہ اس کے پیچھے مارے مارے پھرتا ہے۔ لیکن جب (MATING SEASON) آتا ہے تو فطرت کی طرف سے "چاک ا۔ دامان" کے ادنیٰ سے اشارے پر وہ دونوں مضطرب و بیتاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو ان میں پھر وہی بے رغبتی اور بے گانگی پیدا ہو جاتی ہے، یعنی ان کے ہاں اس "آتش" کی کیفیت (غالب کے الفاظ میں) یہی ہوتی ہے۔

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

لیکن انسان کو خدا نے صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ یہی اس کے مقام بلند کا تقاضا تھا۔ اسی میں اس کے شرف و مجد کا راز تھا۔

لیکن اسی اختیار و ارادہ کے غلط استعمال سے، یہ حیوانات سے بھی پست سطح پر پہنچ جاتا ہے------ **کالانعام بل ھم اضل** ۷/۱۷۹------ یعنی اس نے جنسی اختلاط کے مقصد------ افزائش نسل---- کو تو پس پشت ڈال دیا اور اس کے حظ و لذات کو مقصود بالذات سمجھ لیا۔ اور اس کے بعد، اپنے اس اختیار و ارادہ سے اس جذبہ کو جب چاہے بیدار کر لیا۔ ۲۔ اب سوچئے کہ اگر جنسی اختلاط کی لذت کو (جو شدت اور ارتکاز میں اپنی مثال نہیں رکھتی) مقصود بالذات قرار دے لیا جائے اور یہ چیز انسان کے اپنے اختیار میں ہو کہ وہ جب جی چاہے جنسی جذبہ کو بیدار کر کے، یہ لذت

ا۔ چاک مت کر جیب بے ایام گل!
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہئے (غالب)

۲۔ جنسی جذبہ کی کیفیت بھوک یا پیاس کے تقاضوں کی طرح نہیں جو جسم کی ضرورت کے لئے از خود بیدار ہوتے اور شدت اختیار کئے چلے جاتے ہیں۔ جنسی جذبہ انسان کے اپنے خیال کے ماتحت بیدار ہوتا ہے۔ بھوک اور پیاس حیاتیاتی تقاضے (BIOLOGICAL NECESSITIES) ہیں۔ لیکن جنسی جذبہ نفسیاتی تحرک (PSYCHOLOGICAL URGE) ہے۔ اس لئے اس کا بیدار کرنا یا خوابیدہ رہنے دینا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے خوابیدہ رکھنے سے کسی قسم کا نقصان نہیں ہوتا۔ (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کے مقالات "جنسیات کا اثر تمدن پر" اور "ضبطِ ولادت" میں دیکھئے جو "سلیم کے نام خطوط" جلد سوم میں شائع ہو چکے ہیں۔

حاصل کر لے' تو اس دوہری غیر فطری روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہوگا۔

اس بدنہادی کا پہلا نتیجہ تو یہ ہوا کہ مرد نے' عورت کو اپنے جیسا انسان سمجھنے کے بجائے' اسے اپنی لذت یابی کا ذریعہ قرار دے لیا۔ وہ انسان (HUMAN BEING) ہونے کے بجائے' ایک جنس (COMMODITY) یا استعمال کی شے متصور ہونے لگی' جسے خریدا جا سکتا ہے' بیچا جا سکتا ہے' کرائے پر لیا جا سکتا ہے۔ (بصد معذرت) "استعمال کے قابل" نہ رہنے کی صورت میں اٹھا کر پھینک دیا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ اور "جنس" لائی جا سکتی ہے۔ عورت کو جنسی لذت کے حصول کا آلہ (INSTRUMENT) سمجھنے کا تصور اس قدر عالم گیر اور انسان کے تحت الشعور میں جاگزین ہو چکا ہے کہ (وقتی طور پر اختلاط تو ایک طرف رہا) دنیا کی ہر قوم میں (کم از کم ہر "مہذب" قوم میں) نکاح' شادی یا (MARRIAGE) اور شب عروسی' شب زفاف (HONEY MOON) لازم و ملزوم قرار پا چکے ہیں۔ اگر کہیں شادی کی تاریخ ایسی مقرر ہو جاتی ہے جبکہ لڑکی (دلہن) ایام سے ہو (اور ایام میں اختلاط کو جائز نہ سمجھا جاتا ہو) تو اسے انتہائی بدتہذیبی اور بے تمیزی سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر شب اول اختلاط کا عمل سرزد نہ ہو تو قسم قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگ جاتی ہیں۔ کیا انسانیت کی اس سے بڑی تذلیل تصور میں بھی آسکتی ہے؟

یہ ہے "زن" کا وہ مسئلہ' جس نے عالم انسانیت میں فساد ہی فساد برپا کر رکھا ہے۔ ہر شخص اس "ذریعہ حصول "لذت" کو اپنے تصرف میں رکھنا اور اس سے زیادہ سے زیادہ لذت گیر ہونا چاہتا ہے۔

قرآن آیا اور اس نے یہ اعلان عظیم کیا کہ:

۱۔ مرد اور عورت دونوں' نوع انسان (HUMANITY) کے اجزاء ہیں اور مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کے مجموعہ کا نام عالم انسانیت ہے۔ انسانیت (HUMANITY) صرف (MANKIND) نہیں' وہ (MAN AND WOMAN KIND) ہے۔

۲۔ عورت اور مرد مصاف زندگی میں دوش بدوش چلنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ (سورہ احزاب نمبر ۳۳ کی آیت نمبر ۳۵ میں دیکھئے۔ وہ کس طرح شانہ بشانہ چلتے نظر آتے ہیں)۔

۳۔ مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی الگ انفرادیت ...... (INDIVIDUALITY) رکھتے ہیں۔ اس لئے ان میں سے کوئی ایک' دوسرے کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

۴۔ افزائش نسل کے سلسلہ میں مرد اور عورت کی طبیعی ساخت اور وظائف میں فرق ہے۔ لیکن اس سے ان کی انسانیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۵۔ حیوانات میں صرف بچہ پیدا کرنا یا اس کی طبیعی پرورش مقصود ہوتی ہے لیکن انسان کی صورت میں بچے کی ولادت اور طبیعی پرورش کے علاوہ اس کی تربیت بھی نہایت ضروری ہوتی ہے جس کی ذمہ داری ماں اور باپ دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے اس جوڑے کا باہمی تعلق جنسی اختلاط کا نہیں بلکہ رفاقت (COMPANION SHIP) کا ہوتا ہے۔ اس رفاقت کے لئے وہ باہمی معاہدہ کرتے ہیں جسے نکاح کہا جاتا ہے۔

اس سے مقصد محض جنسی اختلاط کا جائز قرار پا جانا نہیں ہوتا' بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مساوی رفاقت کا اقرار ہوتا ہے۔

۶۔ جنسی اختلاط کا مقصد حصول لذت نہیں بلکہ افزائش نسل ہے۔

۷۔ افزائش نسل کے لئے جنسی اختلاط بھی صرف اس جوڑے میں جائز قرار پا سکتا ہے جس نے زندگی کی رفاقت کا معاہدہ کیا ہو۔

۸۔ اور جب صورت یہ ہو تو پھر (اس جوڑے سے باہر) کسی مرد یا عورت کے ساتھ جنسی اختلاط تو ایک طرف' اس کے تصور تک کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تحفظ عصمت (CHASTITY) کا تقاضا' مرد اور عورت دونوں سے یکساں کیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کی سزا دونوں کے لئے ایک جیسی مقرر کی ہے۔ یہ نہیں کہ (جیسا کہ دنیا میں عام طور پر ہو رہا ہے) مردوں کے لئے فحش کاری معاشرہ کا عام معمول سمجھ لیا جائے اور عورت سے اس کا تقاضا سخت ترین ہو۔ فحش کاری تو ایک طرف' قرآن تو نگاہ کی خیانت بھی مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں جرم قرار دیتا ہے۔

۹۔ لڑکے اور لڑکی ----- مرد اور عورت کے متعلق گفتگو اسی انداز سے ہوگی جس انداز سے دو انسانوں کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ ان میں جنس (SEX) کی تفریق اس وقت سامنے آئے گی جب ان کے حیاتیاتی خصائص (BIOLOGICAL CHARACTERISTICS) کے ذکر کرنے کی ضرورت ہو۔

یہ ہے وہ انداز نگاہ' جسے پیدا کرنے سے قرآن کریم "زن" کے مسئلہ کو حل کرتا ہے۔ جب تک یہ انداز نظر پیدا نہیں ہوتا' یہ دنیا بدستور جہنم بنی رہے گی۔

------------ ○ ------------

یہ ہیں "زر' زمین اور زن" کے پیدا کردہ مسائل حیات کے متعلق قرآن کریم کے پیش کردہ حل۔ آپ ان پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا ان سے وہ تمام مفسدات مٹ نہیں جاتے جو ان کے متعلق انسانوں کے خود ساختہ انداز نگاہ اور طرز زندگی کے پیدا کردہ ہیں اور جن کی وجہ سے پورے کا پورا عالم انسانیت جہنم کی آگ میں جھلس رہا ہے اور ہزاروں کوششوں کے باوجود اس سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے نہیں ملتا۔ یہ راستہ قرآن کریم کی تجویز کردہ "صراط مستقیم" کے سوا اور کوئی نہیں۔

واللہ علی ما نقول شھید !

(اکتوبر ۱۹۶۶ء)

------------ ○ ------------

۶۔ لِمَ تقولون مالا تفعلون کا صحیح مفہوم

فکر طلوع اسلام سے متعلق ایک صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہم قرآن مجید کے نظام ربوبیت کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے

ہیں کہ اس میں کوئی شخص اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہے گا' کیونکہ اس وقت دولت کی تقسیم ناہموار نہیں ہوگی' تو اس کے خلاف اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ پہلے تم لوگ اپنے مکانات' کاروبار' روپیہ پیسہ' دوسروں کو دے دو پھر اس قسم کی باتیں کرو اور اس کے لئے قرآن شریف کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں کہ--- **لِمَ تقولون ما لا تفعلون** ۶۱/۲ ---- تم جو کچھ خود نہیں کرتے اسے دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ اس کے متعلق طلوع اسلام میں لکھنے کی ضرورت ہے' کیونکہ یہ اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے۔

طلوع اسلام

یہ اعتراض اگر نیک نیتی سے کیا جاتا ہے تو معترض کی کم فہمی کی دلیل ہے' اور اگر بدنیتی سے کیا جاتا ہے تو منافقت کی نشانی ہے اور---- **یصدون عن سبیل اللہ** (خدا کی راہ سے روکنے) کی سعی مذموم۔

ہم کہتے یہ ہیں کہ جب ملک میں غلط معاشی نظام رائج ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت چند مراکز میں جمع ہونی شروع ہو جاتی ہے اور عام آبادی اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ اس تباہی سے بچنے کی صورت' ملک میں صحیح معاشی نظام کی ترویج ہے' جسے قرآنی نظام ربوبیت کہتے ہیں۔ اس نظام کی رو سے' وسائل پیداوار انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے' امت کی تحویل میں رہتے ہیں' تاکہ نظام مملکت اس پیداوار کی تقسیم ہر ایک کی ضروریات کے مطابق کرے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ غلط نظام کی جگہ' صحیح قرآنی نظام رائج کرنا' کسی ایک فرد کا کام نہیں۔ یہ تو مملکت کے کرنے کا کام ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ملک کے ارباب دانش و بینش تک قرآن کا یہ پیغام پہنچاتے جائیں تاکہ آئینی طور پر اس نظام کے قائم ہونے کے لئے فضا سازگار ہو جائے۔ ایسا کہنے والے سے یہ کہنا کہ---- **لِمَ تقولون ما لا تفعلون** یا جہالت ہے یا شرارت۔ اس آیت سے اگر یہی مفہوم لیا جائے جس کے لئے یہ حضرات اسے پیش کر دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص کسی نظام کو غلط کہے تو اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جائے کہ میاں! پہلے خود صحیح نظام قائم کرو اس کے بعد اس نظام کو غلط کہو۔ جب تم صحیح نظام قائم نہیں کرتے تو موجودہ نظام کو غلط کیوں کہتے ہو۔ اس منطق کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے تدبر و فراست کی بنا پر کہے کہ مجھے خدشہ نظر آتا ہے کہ فلاں سمت سے دشمن ہمارے ملک پر حملہ کر دے گا اس لئے ہمیں چاہئے کہ سرحد پر ایک لشکر جرار بھیج دیں۔ تو اس کے جواب میں اس سے کہا جائے کہ آپ پہلے خود رائفل لے کر اس سرحد پر جا کر کھڑے ہو جایئے اور پھر قوم سے کہیئے کہ وہاں فوج بھیج دے۔ تمہیں خدا کا یہ ارشاد یاد نہیں کہ **لِمَ تقولون ما لا تفعلون**۔

غلط معاشی نظام میں' آپ حسب استطاعت' کسی غریب کی کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ملک کی کثیر آبادی کے افلاس اور محتاجی کا علاج نہیں۔ اول تو یہ دیکھئے کہ اس سے آپ کتنے لوگوں کی ضروریات پوری کر سکیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے ان کی کوئی ہنگامی ضرورت پوری ہو جائے تو ہو جائے' ان کی احتیاج کا مستقل علاج نہیں ہو سکے

گا۔ غلط معاشی نظام کا علاج، خیرات نہیں، (خواہ اس کا نام زکوٰۃ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) اس کا علاج صحیح قرآنی نظام کا قیام ہے۔ اگر غلط نظام میں آپ اپنا سب کچھ دوسروں کو دے دیں گے تو ملک کا افلاس تو دور نہیں ہو سکے البتہ اس سے محتاجوں کی صف میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا (یعنی آپ کا شمار بھی ملک کے محتاجوں میں ہو جائے گا)۔ قرآن کا یہ حکم کہ **یسئلونک ماذا ینفقون**---- **قل العفو** ۲/۲۱۹ (یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب) صحیح معاشی نظام کا حکم ہے جس میں کسی کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ کل کو مجھ پر اگر کوئی مصیبت آپڑی تو میرا کیا بنے گا؟ غلط معاشی نظام میں آپ اس حکم پر عمل کیجئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کل کو آپ کو (خدا نکردہ) کوئی حادثہ پیش آجائے تو آپ بھیک مانگتے پھریں گے۔ غلط نظام میں قرآن کی ہدایت یہی ہے کہ تم نہ تو اس قدر بخل کرو کہ بالکل ہاتھ سکیڑ لو اور نہ ہی اس قدر ہاتھ کشادہ کر دو کہ کل کو تمہیں خود دوسروں کا دست نگر ہونا پڑے (۱۷:۲۹)۔ ہاں، اگر صحیح نظام قائم ہو رہا ہو تو پھر اس کے لئے جان اور مال دونوں پیش کر دینے چاہئیں۔ یہ وجہ ہے کہ، اس وقت ہم نہ تو ذی استطاعت حضرات سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنا سب کچھ غریبوں کو دے دیں اور نہ ہی غریبوں اور محتاجوں سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اٹھ کر، امیروں کا سب کچھ لوٹ لیں۔ یہ دنوں انداز غلط ہیں۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ آئینی طور پر صحیح قرآنی نظام کے قیام کے لئے ذہنی فضا کو سازگار بنانا چاہیے اور اس دوران میں جس قدر کسی سے ہو سکے، غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنی چاہئے تاکہ ان کی وقتی مشکلات کسی حد تک دور ہو جائیں۔

یاد رکھئے! غلط کار اور غلط اندیش لوگ، جو خدا کی راہ میں روک بن کر کھڑے رہنا چاہتے ہیں، اس قسم کی آیات (مثل **لِمَ تقولون ما لا تفعلون**) سے بڑا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس اپنی غلط روش کے جواز کے لئے کوئی سند اور دلیل نہیں ہوتی تو وہ ان حربوں پر اتر آتے ہیں اور اس قسم کی باتوں سے لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک شخص جس بات کی دعوت دوسروں کو دیتا ہے، اس سلسلے میں جو کچھ اسکے اپنے اختیار اور استطاعت میں ہے، اگر وہ اس پر عمل نہیں کرتا، تو وہ اس حد تک واقعی مورد الزام ہے۔ (مثلاً) اگر کسی ملک کا ذی اقتدار حاکم یہ کہتا ہے کہ ملک میں نظام عدل قائم کرنا چاہئے اور وہ (باوصف اختیار) ایسا نظام قائم نہیں کرتا تو اسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ **لِمَ تقولون ما لا تفعلون**۔ لیکن اگر اس ملک کی رعایا کا کوئی مظلوم یہ کہتا ہے کہ یہاں نظام عدل قائم ہونا چاہئے، تو اس سے یہ کہنا کہ "تم جو کچھ کہتے ہو وہ کر کے کیوں نہیں دکھاتے"، حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

اور پھر اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص اپنی استطاعت کے باوجود وہ کچھ نہیں کرتا جس کی تلقین وہ دوسروں کو کرتا ہے، تو اسے اس جرم کا خمیازہ خود بھگتنا پڑے گا۔ آپ اسے یہ کہہ کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے کہ "جب تم خود ایسا نہیں کرتے تو تمہیں مجھے تلقین کرنے کا کیا حق ہے"۔ آپ یہ دیکھئے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے، وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر وہ صحیح ہے تو آپ اسے اختیار کر لیجئے۔ اس کا غلط عمل آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا---- **لِمَ تقولون ما لا تفعلون**------ اس کے لئے خدا کا حکم ہے اور آپ کے لئے خدا کا ارشاد یہ ہے کہ:

علیکم انفسکم؟ لا یضر کم من ضل اذا اھتد یتم (۵/۱۰۵)

تم یہ دیکھو کہ تمہاری ذات کی اصلاح کس طرح ہوتی ہے۔ اگر تم صحیح راستہ اختیار کر لو گے' تو کسی دوسرے کا غلط راستے پر چلنا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

اپنی اصلاح کرو اور دوسروں کو صحیح راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص تمہاری راہنمائی صحیح راستے کی طرف کرتا ہے' لیکن خود غلط راستے پر چلتا ہے' تو تم یہ کہہ کر غلط راستے پر نہ چلتے جاؤ کہ جب تم خود صحیح راستے پر نہیں چلتے تو تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ تم مجھ سے کہو کہ میرا راستہ غلط ہے۔ اگر تم اس کے کہنے پر صحیح راستہ اختیار کر لو گے تو اس شخص کا غلط راستے پر چلنا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ تم صحیح منزل تک پہنچ جاؤ گے۔

یاد رکھیے! یہ انسانی نفس کی بڑی مکاری ہے کہ وہ غلط راستہ چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرنے والے کو یہ کہہ کر کہ جب تم خود اس پر عمل نہیں کرتے' تو مجھے غلط راستہ چھوڑنے کو کیوں کہتے ہو' اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے کہ میں نے بڑا تیر مارا ہے جو دوسرے کو لاجواب کر دیا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو دوسروں کو صحیح راستے کی طرف آنے سے یہ کہہ کر روکتے ہیں کہ جو شخص صحیح راستے کی نشاندہی کر رہا ہے' اس کا اپنا عمل تو دیکھو' ان کا خبث باطن انہیں اس پر اکساتا ہے۔ نیک نیت لوگوں کا شیوہ یہی ہونا چاہئے کہ وہ دوسروں سے کہیں کہ:

علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتد یتم (۵/۱۰۵)

صحیح بات کی طرف دعوت دینے والا لیکن استطاعت کے باوجود اس پر عمل نہ کرنے والا' غلط عمل کا خمیازہ بھگتے گا اور صحیح بات سن کر اس پر عمل نہ کرنے والا' اپنی غلط روش کا نقصان خود اٹھائے گا۔

لہٰذا' اس سلسلہ میں صحیح روش یہ ہے کہ:

۱۔ صحیح راستے کی طرف دعوت دینے والے کو چاہئے کہ جس حد تک اس کے لئے ممکن ہو' اپنی دعوت پر خود بھی عمل کرے۔

۲۔ اگر وہ دعوت کسی ایسے پروگرام کی ہے' جسے بروئے کار لانا اس کے بس کی بات نہیں' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اس کی طرف دعوت ہی نہ دے۔

۳۔ اگر اس کی دعوت صحیح ہے اور وہ خود اس پر عمل نہیں کرتا تو آپ یہ کہہ کر غلط راستے پر نہ چلتے جائیے کہ جب وہ اپنی دعوت پر خود عمل نہیں کرتا' تو اسے دوسروں کو ایسا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ نہ ہی کسی صحیح دعوت کی اس لئے مخالفت کرو کہ اس کا داعی اس پر خود عمل پیرا نہیں۔ بات کو پرکھو۔ کہنے والے کے عمل کو اپنے لئے دلیل مت بناؤ۔ صحیح بات' صحیح ہوتی ہے خواہ اس پر دنیا کا کوئی انسان بھی عمل نہ کر رہا ہو۔ (نومبر۱۹۶۶ء)

۷- زنا کی سزا ——— رجم یعنی سنگساری

(آیہ رجم کہاں گئی؟)

ایک صاحب گجرات سے لکھتے ہیں کہ "اخبار مشرق (لاہور) میں حال ہی میں یہ خبر چھپی تھی کہ اسلامی مشاورتی کونسل نے اسلامی قوانین کے نفاذ کی نسبت جو سفارشات حکومت کو بھیجی ہیں ان میں ایک سفارش یہ ہے کہ زنا کی سزا موت بذریعہ سنگساری یعنی رجم ہونی چاہئے۔ میرا خیال تھا کہ اکتوبر کے طلوع اسلام میں اس سوال کو اٹھایا جائے گا کہ رجم کی سزا کا قرآن مجید میں مطلقاً" ذکر نہیں ہے۔ اور چونکہ مروجہ آئین کتاب و سنت کے مطابق احکام نافذ کرنے کا پابند ہے' اس لئے یہ سفارش حکومت کو قابل قبول نہیں ہونی چاہئے۔ امید ہے کہ آئندہ ماہ کے پرچہ میں یہ سوال ضرور زیر بحث آئے گا۔"

طلوع اسلام

ہم نے اس سوال کو اس لئے نہیں اٹھایا تھا کہ (اول تو) ہم اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں' اس لئے ہم نے اسے دہرانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اور دوسرے اس لئے کہ ملک میں قانون سازی کا کام جس انداز سے سرانجام پا رہا ہے وہ ہمارے نزدیک کسی سنجیدہ توجہ کا سزاوار ہی نہیں۔ قانون سازی کے سلسلہ میں' سب سے پہلا اور بنیادی کام یہ ہوتا ہے کہ ان اصولوں کو متعین کیا جائے جن کے مطابق قوانین مرتب کئے جائیں گے۔ اس کے لئے آئین پاکستان میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ملک کے قوانین کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوں گے۔ کتاب (قرآن کریم) تو بہرحال ایک متعین کتاب ہے۔ اس لئے اس کا طے کرنا مشکل نہیں کہ کوئی قانون' قرآن کے خلاف ہے یا نہیں ——— لیکن "سنت" کی اصطلاح ایسی ہے جس کا آج تک کوئی متفق علیہ مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا اور نہ ہی یہ طے پا سکا ہے کہ متفق علیہ سنت' کس کتاب میں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر فرقہ اپنے ہر عمل کو عین مطابق سنت قرار دیتا ہے اور دوسرا فرقہ اسی عمل کو خلاف اسلام۔ جب تک بات فرقوں تک محدود تھی' اس کا نتیجہ باہمی بحث و جدل اور سر پھٹول تھا۔ لیکن جب بات کسی مملکت کی قانون سازی تک پہنچ جائے تو اس وقت اس بنیادی معیار کو جس کے مطابق قوانین مرتب کرنے چاہئیں' اس طرح غیر متعین رہنے دینے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے' ظاہر ہے۔ اس سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو ملک کے تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر "کتاب و سنت" کے مطابق ہو۔ ۳۔ اور اس حقیقت کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ اتنا عرصہ گزر گیا' ملک کے لئے اس معیار کے مطابق کوئی ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکا——— نہ ہی ایسا ضابطہ اس وقت تک مرتب ہو سکتا ہے جب تک آپ سنت کا ایک متفق علیہ مفہوم متعین نہ کریں اور یہ نہ طے کر لیں کہ یہ سنت آپ کو ملے گی کہاں سے۔ اوروں کو تو چھوڑیئے' آپ اسلامی مشاورتی کونسل کے ارکان سے کہیے کہ وہ کسی ایسی کتاب کی نشاندہی کر دیں جو اس کے نزدیک متفق علیہ

۳۔ مودودی (مرحوم) نے اس کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ (ایشیا۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

سنت کا مجموعہ ہو۔ کونسل کے ارکان کو بھی چھوڑیئے۔ اس کے چیئرمین سے کہئے کہ وہی کسی ایسی کتاب کی نشاندہی کرویں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ قیامت تک ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اب آپ سوچئے کہ جس کونسل کی اپنی یہ حالت ہو کہ اس نے اس بات کا ذمہ لے رکھا ہو کہ وہ بتائے گی کہ کونسا قانون' کتاب و سنت کے خلاف ہے' لیکن ان کے ہاں یہ بھی طے نہ ہو کہ متفق علیہ سنت کا مجموعہ کہاں سے ملے گا' وہ سفارشات کیا کرے گی اور اس کی سفارشات درخور اعتنا کس حد تک ہوں گی؟ دوسری طرف حکومت ہے جس نے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کونسل کی کونسی سفارش قابل قبول ہے اور کونسی مسترد کر دینے کے قابل----- یہ فریضہ مرکزی حکومت کی وزارت قانون (منسٹری اوف لا) سے متعلق ہے۔ آپ مرکزی وزیر قانون سے کہیے کہ وہی بتا دیں کہ آئین میں جو لکھا ہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا تو اس میں سنت کا متعینہ مفہوم کیا ہے اور اس سنت کا مجموعہ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو' کہاں سے ملے گا۔ اور اگر وہ یہ نہ بتا سکیں (اور وہ کبھی نہیں بتا سکیں گے) تو ان سے باادب دریافت کیجئے کہ جب آپ کے پاس کونسل کی کوئی سفارش آئے گی تو آپ کس معیار کے مطابق یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ "کتاب و سنت" کے مطابق ہے یا نہیں' جب آپ کے پاس "سنت" کا کوئی متفق علیہ مجموعہ ہی نہیں۔

۲۔ اب آیئے جرم زنا کی سزا کی طرف۔ یہ واضح ہے کہ صرف چند جرائم ایسے ہیں جن کی سزا بھی قرآن نے خود متعین کر دی ہے۔ ان میں ایک زنا ہے۔ اس کی سزا کے متعلق سورہ نور میں ہے۔

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ (۲۴/۲)

"زانیہ عورت اور زانی مرد' ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو"

اور سورہ نساء میں ہے' کہ لونڈی کے جرم زنا کی سزا' آزاد عورت سے نصف ہے (۴/۲۵) یعنی پچاس کوڑے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں اس جرم کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سزا بن بیاہی عورت اور کنوارے مرد کی ہے۔ شادی شدہ عورت اور مرد کی سزا رجم ۴۔ یا سنگسار کرنا ہے۔ اس کی سند بڑی دلچسپ ہے۔ غور سے سنئے :-

موطا امام مالکؒ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جسے ہم نے تلاوت کیا' یاد بھی کیا' اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا۔ اور ہم نے بھی آپؐ کے بعد رجم ۵۔ کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ "حدیث کی ایک دوسری کتاب (مسند امام احمد) میں اس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ:

۴۔ رجم کی سزا یہودیوں کے ہاں تھی۔

۵۔ معلوم نہیں کہ لونڈیوں کے سلسلہ میں رجم کی نصف سزا کس طرح دی جاتی تھی؟

اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا' عمرؓ نے لکھ دیا' تو
میں آیہ رجم کو اسی طرح لکھ دیتا جس طرح نازل ہوئی تھی۔

اب آپ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ وہ آیہ رجم' جو قرآن میں موجود تھی' جس کی صحابہؓ تلاوت کیا کرتے تھے' حفاظ نے جسے حفظ کیا تھا' جس کے مطابق رسول اللہؐ اور بعد کے زمانے میں عمل ہوتا رہا' وہ اس قرآن میں نہیں تھی جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھا (اور جو اس قرآن میں بھی نہیں جو اس وقت ہمارے پاس ہے) تو وہ آیت گئی کہاں؟ اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔ سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک کتاب ہے) حضرت عائشہؓ کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:

آیت رجم اور رضاعت کبیر (جس میں یہ کہا گیا تھا کہ دس گھونٹ دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ہو جاتی ہے) ایک صحیفے میں میرے تخت کے نیچے تھی۔ جب رسول اللہؐ کا انتقال ہوا تو ہم لوگ اس حادثے میں مشغول ہو گئے اور گھر کی پالتو بکری آئی اور اس صحیفے کو کھا گئی۔

یوں آیہ رجم قرآن کریم میں نہ رہی۔ اور نہ ہی پھر بعد میں حضرت عمرؓ نے اسے قرآن میں درج کرنا مناسب سمجھا۔ البتہ اس کا حکم بدستور باقی رہا۔

یہ ہے وہ سند جس کی رو سے اسلام میں زنا کی سزا رجم بتائی جاتی ہے اور جس کی سفارش اب اسلامی مشاورتی کونسل نے کی ہے۔ آپ فرمایئے کہ یہ مقام کچھ لکھنے کا تھا یا سر پیٹ کر بیٹھ جانے کا؟ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ حکومت اس سفارش کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے؟ وہ اسے منظور کرتی ہے یا مسترد۔ اور اگر مسترد کرتی ہے تو کس دلیل اور سند کی بنا پر؟

(نومبر ۱۹۶۶ء)

۸۔ کیا مشینوں کے ذریعے ذبیحہ حلال ہو گا؟

(اہل کتاب کے ہاں کا کھانا!)

آجکل اخبارات میں یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ انگلستان میں مشینوں کے ذریعے جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں' ان کا گوشت حلال ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس بھی بہت سے استفسارات آئے ہیں۔ ہم اس تفصیل سے درگزر کرتے ہوئے کہ اس بحث میں فلاں صاحب نے کیا کہا اور فلاں نے کیا فرمایا' اتنا بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا حکم ہے۔

۱۔ حلال جانوروں کا گوشت کھانے کے متعلق پہلا حکم یہ ہے کہ **فکلو مما ذکر اسم اللہ علیہ ان کنتم بآیتہ**

مومنین (۶/۱۱۹) "سو تم کھاؤ (اس جانور کے گوشت) میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے' اگر تم احکام خداوندی پر ایمان رکھتے ہو"۔

۲۔ اسی کی تائید میں منفی طور پر فرمایا **ولا تاکلوا مما لم یذکر سم اللہ علیہ** (۶/۱۲۲) اور اس میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

لہٰذا' ذبیحہ کے حلال ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

۳۔ سورہ مائدہ میں ہے۔

حرمت علیکم المیتہ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقہ والموقوذۃ والمتردیہ والنطیحتہ وما اکل السبع الا ما ذکیتم...... (۵/۳)

حرام ہوا تم پر مردہ جانور اور (بہتا ہوا) لہو اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جس کا گلا گھٹ جائے یا چوٹ لگ جائے یا اوپر سے گر جائے یا سینگ لگنے سے زخمی ہو جائے' یا جسے درندوں نے کھایا ہو۔ ہاں اگر تم ایسے جانور کو مرنے سے پہلے ذبح کر لو (تو وہ حرام نہیں ہوگا)۔

اس آیت میں مردار اور ذبیحہ کا فرق بتا دیا گیا ہے اور وہ فرق ہے **ما ذکیتم**۔ تزکیتہ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں حرارت غریزی کا خارج کر دینا (امام راغب) اور مطلب ہوتا ہے جانور کا خون بہا کر اس کی حرارت غریزی کا ختم کر دینا۔ جب کسی جانور کا اس طرح خون بہا دیا جائے تو اس کے بعد وہ بھی مردہ ہو جائے گا لیکن یہ حلال ہوگا اور وہ جانور جو خون بہائے بغیر مر جائے' حرام ہوگا۔

لہٰذا' کسی جانور کے حلال ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا خون بہا دیا جائے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ مشین سے ذبح کرنے میں جانور کا خون بہتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کا خون نکل جاتا ہے تو پھر (قرآن کریم کی عائد کردہ) دوسری شرط پوری ہو جائے گی۔

لہٰذا' اگر حلال جانور کو ذبح کرتے وقت' اللہ کا نام لیا جائے اور جانور کا خون خارج ہو' تو اس کا گوشت حلال ہوگا' خواہ اسے قصاب کی چھری سے ذبح کیا جائے یا مشین سے۔ اور اگر ان دونوں میں سے ایک شرط بھی ساقط ہو جائے تو اس کا گوشت حرام ہوگا (سدھائے ہوئے جانوروں کے شکار کا ذکر سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۴ میں ہے)۔

۴۔ سورہ المائدہ کی آیت نمبر ۵ میں ہے:

الیوم احل لکم الطیبت۔ وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم (۵)

آج تمہارے لئے تمام طیب چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اہل کتاب کے ہاں کا کھانا بھی بشرطیکہ وہ تمہارے ہاں کا کھانا اپنے لئے حلال سمجھیں۔

اہل کتاب کے طعام کے حلال ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ان کے ہاں کی ہر چیز ہمارے لئے حلال ہے۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہوگا۔ یعنی ایک حرام شے مسلمانوں کے ہاں سے لی جائے تو حرام ہوگی' لیکن وہی شے اہل کتاب کے ہاں

سے لے لی جائے' تو حلال ہو جائے گی (یا للعجب)- اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیزیں تمہارے ہاں حلال ہیں' ان کا اہل کتاب کے ہاں سے لے کر کھالینا بھی حلال ہے- نزول قرآن کے زمانے میں عام متعارف اہل کتاب یہودی اور نصرانی تھے- عیسائیوں کے متعلق تو معلوم نہیں لیکن یہودی اب تک ذبیحہ پر خدا کا نام لیتے ہیں- معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نزول قرآن میں نصرانی بھی ذبیحہ پر خدا کا نام لیتے ہوں گے- اسی لئے ان کے ذبیحہ کو مشرکین کے ذبیحہ سے متمیز کر دیا گیا- لیکن اگر اب عیسائی ذبیحہ پر خدا کا نام نہیں لیتے تو ان کا ذبیحہ بھی ہمارے لئے حلال نہیں ہوگا-

انگلستان (اور دیگر غیر مسلم بیرونی ممالک) میں مسلمانوں کے لئے گوشت کا مسئلہ آج سے نہیں' شروع ہی سے بڑا پریشان کن چلا آرہا ہے- پاکستان سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ولایت جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی طرف سے یہ شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں کہ وہاں گوشت کا مسئلہ بڑی مشکلات پیدا کرتا ہے- ہمارا خیال ہے کہ صرف ایک انگلستان میں اب مسلمانوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہوگی- لیکن حیرت ہے کہ نہ تو وہ خود ہی اس کا کوئی تسلی بخش انتظام کر سکے ہیں اور نہ ہی ہمارے ہائی کمشنر کی طرف سے اس ہر روز کی مشکل کا کوئی حل تجویز کیا گیا ہے- ہم نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی ایسا ہی عقدہ لاینحل ہے- سوال صرف اس کی اہمیت کے احساس کا ہے- ہم حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ جہاں' ملک سے باہر جانے والے اہل پاکستان کی دیگر مشکلات کا خیال رکھتی ہے' اس سوال کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنائے-

باقی رہا خود پاکستان میں مشین کے ذریعے ذبیحہ کا سوال' سو اگر مشین کے ذریعہ ذبیحہ سے جانور کے خون کا اخراج ہو جاتا ہے' تو ان مشینوں سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے- یہاں' ان مشینوں کے ذریعے ذبح کرنے والے تو بہرحال مسلمان ہی ہوں گے اور وہ جانور پر اللہ کا نام بھی لیں گے-

(نومبر ۱۹۶۷ء)

------------ ○ ------------

۹- کیا انسان کی کوئی فطرت ہے

ایک درس میں' مودودی صاحب سے یہ سوال پوچھا گیا کہ:

جب انسان کی فطرت میں چھچھورا پن ہے تو وہ سلیم الطبع کیسے ہو سکتا ہے-

اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ:

> انسان کے اندر چھچھوراپن تو کم و بیش موجود ہوتا ہے- یہ منجملہ انہی اوصاف کے ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں- انسان سے انہی عادات و خصائل کا اظہار ہوتا ہے جو اس کی فطرت میں پوشیدہ ہیں- اب انسان کی آزمائش دراصل اس بات میں ہے کہ وہ فطری اوصاف میں سے کن اوصاف کو ابھارے اور کن اوصاف کی حوصلہ

شکنی کرے۔ اپنے اندر بھلائیاں پرورش کرنے کا جو طریقہ اللہ کی شریعت نے بتایا ہے
اگر اس کے مطابق انسان چلتا رہے تو اس کے نفس کی خرابیاں کم ہوتی جائیں گی اور
اس کے اندر اعلیٰ صفات تقویت پکڑلیں گے۔

اس جواب کی رو سے یہ ثابت ہوا کہ انسان کی فطرت میں کچھ خراب باتیں بھی ہیں اور ان خرابیوں کی اصلاح دین کی پابندی سے ہو سکتی ہے۔

یہ حضرات ہمیں یہ بھی بتاتے رہتے ہیں کہ:

(۱) اسلام' دین فطرت ہے اور

(۲) خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ (معاذ اللہ) خود خدا میں بھی وہ خرابیاں موجود ہیں جو انسانی فطرت میں پائی جاتی ہیں۔ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ خرابیاں انسان کی فطرت میں ہیں' تو "ان کی اصلاح کرنا خلاف فطرت" ہوگا۔ اور اگر اسلام' دین فطرت ہے تو اس کا فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان خرابیوں کی حفاظت کرے اور انہیں اور جلا دے نہ کہ ان کا استیصال کرے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے تصور کی رو سے اسلام کا کیا نقشہ سامنے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں نہ یہ معلوم ہے کہ فطرت کسے کہتے ہیں اور نہ یہ کہ اسلام کیا ہے اور اپنی جہالت کی بنا پر خدا کے دین حقہ کو بدنام کرتے رہتے ہیں۔

فطرت' اشیائے کائنات کی ان بنیادی خصوصیات کو کہتے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے وہ مجبور ہیں اور جنہیں وہ بدل نہیں سکتیں۔ مثلاً" آگ کی فطرت ہے کہ وہ جلائے۔ مچھلی کی فطرت ہے کہ وہ پانی میں رہے۔

انسان' اشیائے کائنات کی طرح مجبور نہیں' صاحب اختیار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو صاحب اختیار ہو' اس کی کوئی فطرت نہیں ہو سکتی۔

انسان کی طبیعی زندگی کے کچھ تقاضے ہیں (مثلاً" کھانا' پینا' سانس لینا وغیرہ) اور یہ تقاضے وہی ہیں جو دیگر حیوانات کے ہیں۔

لیکن حیوانی زندگی سے اوپر' انسان کی "انسانی زندگی" بھی ہے اور اسی زندگی کی راہنمائی کے لئے خدا کی طرف سے اقدار اور قوانین عطا ہوئے ہیں۔ انہیں دین کہا جاتا ہے۔ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی طبیعی زندگی کے تقاضوں کو ان قوانین و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے پورا کرے' یا ان حدود و قیود سے بے باک ہو کر' حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے۔

قرآن نے جہاں کہا ہے کہ انسان کو ایسا پیدا کیا گیا ہے اور ویسا' تو اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اگر وحی کی راہنمائی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کے پیچھے لگا رہے تو اس کا نتیجہ اس قسم کا ہوتا ہے۔ لیکن دین چاہتا ہے کہ وہ اپنے تقاضوں کو

اس کی معین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے پورا کرے اور اس طرح وہ حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرے۔

اس سے واضح ہے کہ انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں (کہ فطرت' مجبور اشیاء کی ہوتی ہے)۔ اس کے اندر کچھ طبیعی زندگی کے تقاضے ہیں اور کچھ صلاحیتیں جنہیں یہ جس طرح جی چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ ان کے صحیح استعمال کے لئے وحی کی رو سے راہنمائی ملی ہے۔

اور جب انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اسلام' دین فطرت ہے یا خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے (ان امور کی مزید وضاحت کے لئے"سلیم کے نام خطوط" (جلد سوم) یا لغات القرآن میں عنوان "فطر" دیکھئے)۔

(جون ۱۹۶۸ء)

۱۰۔ کیا نیکی اور بدی کی تمیز انسان کی فطرت میں موجود ہے

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنے درس قرآن مجید میں (جس کی رپورٹ' ایشیا' بابت ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی ہے) فرمایا۔

> دوسرے معنی اسکے یہ ہیں کہ انسان کے اندر اخلاقی حس رکھ دی گئی ہے۔ اس کی فطرت میں یہ بات اتار دی گئی ہے کہ برا کیا ہے اور بھلا کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے' ہدایت نہ بھی آئے تو بھی وہ برے بھلے کی تمیز کر سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر برے اور بھلے کی تمیز انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور اگر خدا کی طرف سے ہدایت نہ بھی آئے تو بھی وہ ان میں تمیز کر سکتا ہے' تو پھر خدا کی طرف سے ہدایت بھیجنے کا فائدہ کیا ہے ؟ جو لوگ وحی کے وجود سے انکار کرتے ہیں وہ دلیل ہی یہ دیتے ہیں کہ برے بھلے کی تمیز انسانی فطرت میں موجود ہے' اس لئے اسے کسی خارجی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ یہ چیز بکری کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ گھاس اس کے لئے "حلال" ہے اور گوشت "حرام"۔ وہ مرتی مرجائے گی لیکن گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ جنگل کا بادشاہ' شیر' اتنی مہیب قوت کا مالک ہوتے ہوئے بھوکا مرجائے گا لیکن گھاس پات کی طرف رخ نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ یہ بات اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ وہ گوشت خور ہے۔ مرغی کے چوزے کو لاکھ گھیر کر لاؤ' وہ پانی کے حوض میں کبھی نہیں اترے گا' کیونکہ یہ بات اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ پانی اس کے لئے ہلاکت آفریں ہے۔ بط کا بچہ' لپک کر پانی کی طرف جائے گا۔ انہیں' ان کی فطرت کے تقاضوں کو بتانے کے لئے' نہ کوئی رسول آتا ہے نہ کتاب۔ وہ پیدائش کے ساتھ ہی فطرت کی مقرر کردہ راہ پر چل نکلتے ہیں اور ساری عمر اسی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ اس لئے کہ جو بات کسی کی

فطرت میں داخل ہو' وہ نہ بدلی جا سکتی ہے نہ بھلائی' نہ کسی کو اس کی یاددہانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر کسی جانور سے اس کی فطرت کے خلاف کوئی کام کرانا ہو تو ہزار جتن کر کے' اسے اس کے لئے مجبور کیا جاتا ہے اور جونہی یہ جبر کی زنجیر ٹوٹتی ہے تو وہ بھاگ کر فطرت کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔

یہ ہے اشیائے کائنات اور جانوروں کی کیفیت جن کی فطرت کے اندر' ان کے برے اور بھلے کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔ لیکن انسانوں کی تو یہ کیفیت نہیں۔ ان کی طرف آسمانی راہنمائی آتی تھی (جواب قرآن میں محفوظ ہے) جو برے اور بھلے کی تمیز بتاتی تھی۔ رسول آکر ان سے کہتا یہ تھا کہ **واعلم من اللہ مالا تعلمون** (۷/۶۲) میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اگر یہ تمیز ان (انسانوں) کے اندر موجود ہوتی تو ان سے یہ کس طرح کہا جا سکتا تھا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جس کا تمہیں علم نہیں۔ وہ رسول کی آمد سے پہلے **فی ضلل مبین** ہوتے تھے (۳/۱۶۳) یعنی بالکل کھلی ہوئی گمراہی میں۔ کیا کوئی حیوان بھی (جس کے اندر برے اور بھلے کی تمیز موجود ہوتی ہے) ضلال مبین۔۔۔۔۔ گمراہی۔۔۔۔ میں ہوتا ہے؟ وہ تو کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔

آپ نے غور فرمایا کہ "انسانی فطرت" کے غلط تصور نے کس قدر گمراہیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اگر انسانی فطرت کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر انسان اپنے کسی عمل کے لئے ذمہ دار قرار نہیں پاتا۔۔۔۔ ہم کبھی شیر کو پھانسی پر نہیں لٹکاتے کہ اس نے فلاں انسان کو مار کیوں ڈالا تھا۔۔۔۔ نہ ہی اس کی طرف خدا کی طرف سے وحی۔۔۔۔ نبی اور رسول۔۔۔۔۔ آنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فطرت انسانی کا عقیدہ' وحی کے منکرین نے وضع کیا۔ لیکن اس کی تبلیغ ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو وحی پر ایمان رکھنے کے دعویٰ سے مسلمان کہلاتے ہیں۔ حرام' جو یہ لوگ کبھی کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور ایسا کہنے کے نتائج اور اثرات کیا ہیں۔ بس بھیڑوں کی ایک قطار ہے جو صدیوں سے اس راستے پر چلی جا رہی ہے جس پر کبھی کوئی پہلی بھیڑ چلی تھی۔۔۔۔ **کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاء و نداء صم بکم عمی فھم لا یعقلون** (۲/۱۷۱)

(جولائی ۱۹۶۹ء)

۱۱۔ کیا ٹیکسوں کی چوری جائز ہے؟

ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے:۔

"پاکستان میں بڑے بڑے پرہیزگار' پارسا اور شرع کے پابند لوگ بھی سرکاری محاصل وغیرہ مثلاً" کسٹم ڈیوٹی' انکم ٹیکس' پراپرٹی ٹیکس اور چونگی وغیرہ کی چوری کو چوری نہیں سمجھتے اور ان محاصل کی تشخیص کے وقت ہر قسم کی غلط بیانی اور ہیرا پھیری کو جائز سمجھتے ہیں۔ جب کبھی ان کے اس طرز عمل پر نکتہ چینی کی جائے تو یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جب تک ہمارا ملکی نظام کتاب و سنت کے وضع کردہ اصولوں پر استوار نہیں کیا جاتا' ٹیکسوں کی چوری شرعاً" قابل احتساب

نہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بلیک مارکیٹ اور سمگلنگ کو بھی شرعاً اور اخلاقاً ناجائز نہیں سمجھتے ہیں۔
براہ مہربانی قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں ان کے طرز عمل کا تجزیہ فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔"

طلوع اسلام

ہم "ارباب شریعت" کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے جواز کے لئے کوئی راستہ نکال دیں۔ کیونکہ فقہ کی کتابوں کے ساتھ ایک "کتاب الحیل" بھی ہوتی ہے جس میں وہ طریقے بتائے جاتے ہیں' جن سے جرائم کا ارتکاب بھی کیا جائے اور اس پر مواخذہ بھی نہ ہو سکے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے اس قسم کی چوری کیسے جائز قرار پا سکتی ہے؟ اور اس کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں ---- بات صاف ہے ---- غلط بیانی' فریب دہی' خیانت وغیرہ موجودہ حکومت کے قوانین کی رو سے بھی جرائم ہیں اور یہ چیزیں کتاب و سنت کی رو سے بھی ناجائز ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کے ان قوانین کی خلاف ورزی خود کتاب و سنت کی خلاف ورزی قرار پائے گی یا نہیں؟

اگر دلیل یہ لائی جائے کہ جن امور کو کتاب و سنت نے ناجائز قرار دیا ہے ان کا ارتکاب اسی صورت میں ناجائز ہوگا جب ملک میں کتاب و سنت کا نظام قائم ہو' تو بات بہت دور تک جا پہنچے گی۔ (مثلاً) زنا کتاب و سنت کی رو سے حرام ہے۔ کیا ہمارے یہ "بڑے بڑے پرہیز گار' پارسا اور شرع کے پابند" حضرات آج اس بنا پر زنا کو جائز قرار دے دیں گے کہ یہاں کتاب و سنت کا نظام قائم نہیں۔ یہاں تو ایک طرف' یہ ہندوستان کی حکومت میں بھی (جہاں کتاب و سنت کے مطابق نظام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) حرام ہی ہوگا۔

اگر ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو (مذکورہ صدر دلیل کی بنا پر) فی الواقع ان امور کو جائز سمجھتے ہیں تو ان کی ذہنیت ان لوگوں کی سی ہو چکی ہے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ **زین له سوء عمله فراه حسنا** (۳۵/۸) "ان کی نگاہوں میں' ان کے برے کام بھی نہایت مزین ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں حسن عمل بن کر دکھائی دیتے ہیں"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ **واتبعوا اهواء هم** (۴۷/۱۴) وہ اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور اس طرح انہیں برا کام' برا کام دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اس قسم کی خود فریبی انسان کی تباہی کی آخری منزل ہوتی ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ جو برائی کرے لیکن اسے برائی سمجھے' اس کی اصلاح کا تو امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن جسے برائی' اچھائی بن کر دکھائی دینے لگ جائے' اس کی اصلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ آپ ان حضرات سے کہئے کہ اگر آپ کی مفاد پرستیاں آپ کو اس قسم کے جرائم پر آمادہ کرتی ہیں اور آپ ان سے رک نہیں سکتے' تو ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں! لیکن آپ اس قسم کی جھک مارنے کے بعد' کتاب و سنت کو تو بدنام نہ کیجئے۔

(جولائی ۱۹۶۸ء)

۱۲۔ کیا انشورنس جائز ہے؟

جوں جوں معاشی تقاضے بڑھتے جاتے ہیں' اس قسم کے استفسارات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے کہ بینک کا سود جائز ہے یا ناجائز' زمین بٹائی پر دی جا سکتی ہے یا نہیں' روپیہ لگا کر منافع میں حصہ دار بنا کیسا ہے' پراویڈنٹ فنڈ کا منافع لیا جا سکتا ہے یا نہیں' انشورنس جائز ہے یا نہیں---- ہم وقتاً" فوقتاً" ان استفسارات کا جواب ان صفحات میں دیتے رہتے ہیں- اور قرآن کے معاشی نظام کے متعلق اپنی کتاب ---- خدا اور سرمایہ دار (ایڈیشن اول' اکتوبر ۱۹۶۷ء) میں تفصیلی بحث بھی کر چکے ہیں- لیکن پچھلے ماہ انشورنس کے متعلق دو تین استفسارات موصول ہوئے ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ اس پر متعین طور پر لکھا جائے۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل متعدد بار لکھ چکے ہیں' بات بینک کے سود' مضاربت' مزارعت' انشورنس وغیرہ کی نہیں- اصل بات یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام ہی غیر قرآنی ہے اور ہم چاہتے یہ ہیں کہ کسی طرح اس غیر اسلامی نظام میں "اسلام" کا پیوند لگا کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیں- یہ اطمینان فریب نفس سے زیادہ کچھ نہیں- کوئی غیر اسلامی نظام' پیوند سازی سے اسلامی نہیں بن سکتا- لہٰذا' غیر اسلامی نظام معیشت کو علیٰ حالہ رکھتے ہوئے' اس قسم کی بحثیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں- اگر قرآن کا معاشی نظام قائم ہو جائے تو اس میں' ان میں سے کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہو گا- آج ان سوالات کی نوعیت اسی قسم کی سمجھئے جیسے (مثلاً") ایک کمیونسٹ' نظام سرمایہ داری کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے پوچھے کہ میں ذاتی جائداد بنا سکتا ہوں یا نہیں؟

آپ انشورنس ہی کو لیجئے- اس کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ ایک شخص سوچتا ہے کہ اگر کل کو اس پر کوئی حادثہ گزر جائے تو اس کا (یا اس کی موت کے بعد' اس کے بچوں کا) کیا بنے گا؟ قرآن کے معاشی نظام میں کسی شخص کو اس قسم کا خطرہ لاحق ہو ہی نہیں سکتا- اس نظام میں ہر ذی حیات کے سامان زیست (بنیادی ضروریات زندگی) بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے' اس لئے اگر کوئی شخص کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو جائے تو اسے اس کی فکر ہی نہیں ہوگی کہ وہ کھائے گا کہاں سے یا اگر وہ وفات پا جائے تو اس کے بچوں کا کیا بنے گا- لہٰذا' اس نظام میں انشورنس کی نہ ضرورت لاحق ہوتی ہے' نہ ہی اس کے جائز یا ناجائز ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے- اس میں ہر فرد اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے مستقبل کے متعلق ہر طرح سے (ASSURED) ہوتا ہے۔

لیکن آج (غیر اسلامی نظام معیشت میں) صورت یہ ہے کہ اگر کوئی فرد کا سب' کسی وجہ سے کام کاج کرنے سے معذور ہو جاتا ہے' یا اس کی موت ایسے حالات میں ہو جاتی ہے کہ اس کے پاس اثاثہ کوئی نہیں ہوتا' تو وہ خود اور اس کے بیوی بچے نان شبینہ تک کے محتاج ہو جاتے ہیں اور ان بیچاروں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا- غیر قرآنی نظام معیشت (یعنی نظام سرمایہ داری) میں اس صورت حال سے بچنے کے لئے انشورنس کی اسکیم رائج کی گئی- اس سے' بہرحال' اس قسم کے واقعات میں' زندگی کے دن بسر کرنے کے لئے ایک سہارا مل جاتا ہے- اندریں حالات' موجودہ نظام

میں، اس اسکیم کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ لیکن

شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

یعنی یہ حضرات (ہمارے مذہبی پیشوا) بجائے اس کے کہ موجودہ نظام کو حرام قرار دیں، اس کے اندر اس قسم کی سہولتوں کو حرام قرار دے دیتے ہیں۔ اور جب پوچھا جائے کہ صاحب! اگر یہ شخص انشورنس نہ کرائے اور کل کو اس پر اس قسم کا حادثہ گزر جائے تو اس کا اور اس کے بال بچوں کا کیا بنے گا، تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بتانا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام تو فتویٰ دینا ہے------ یہی سوال قرآن کریم نے بھی اٹھایا تھا جب کہا تھا کہ:

ایود احدکم ان تکون لہ جنۃ من نخیل واعناب تجری من تحتھا الانھار لہ فیھا من کل الثمرات و اصابہ الکبر ولہ ذریۃ ضعفاء فاصابھا اعصار فیہ نار فاحترقت کذالک یبین اللہ لکم الایات لعلکم تتفکرون (۲/۲۶۶)

کیا تم میں سے کوئی شخص بھی یہ چاہے گا کہ:

(۱) اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا سرسبز و شاداب باغ ہو جس میں پھل بکثرت آئیں۔

(۲) وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔

(۳) کہ ایسے میں ایسی بادسموم چلے کہ اس باغ کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے (اور اس طرح وہ پورے کا پورا کنبہ سامان زیست سے محروم رہ جائے)۔

(۴) کیا تم میں سے کوئی بھی چاہے گا کہ اس کی ایسی حالت ہو جائے؟ اگر ایسا نہیں چاہتے تو پھر فکر و تدبر کی رو سے دیکھو کہ وہ کونسا قدم اٹھایا جائے جس میں ایسی صورت پیدا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں چاہے گا۔ قرآن نے اس کا اعتراف کرانے کے بعد (کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں چاہے گا) کہا کہ پھر تم ایسی آفت سے بچنے کا انتظام کیوں نہیں کرتے! اور وہ انتظام یہ ہے کہ تم قرآن کا تجویز کردہ معاشی نظام اپنے ہاں رائج کر لو۔ اس نظام میں کبھی ایسی شکل پیدا ین ہوگی۔

قرآن کریم نے اس کا یہ حل بتایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نظام قائم کر کے دکھا دیا کہ یہی ان مشکلات کا قرار واقعی حل ہے۔

وہ نظام باقی نہ رہا اور دنیا میں نظام سرمایہ داری کا چلن عام ہو گیا۔ اس نظام میں بھی وہی سوال سامنے آیا جسے قرآن سامنے لایا تھا۔ اس نظام کے حاملین نے اس کا حل انشورنس کی صورت میں تجویز کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حل ویسا نہیں جیسا قرآن کریم نے تجویز کیا تھا، لیکن موجودہ غلط نظام میں یہ حل، جب تک قرآنی حل ممکن نہ ہو بہرحال غنیمت

ہے اور دنیا اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں قرآنی حل رائج نہیں کرتے اور دنیا نے جو حل تجویز کیا ہے' اسے اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

قرآن نے (مندرہ بالا آیت میں) کہا تھا کہ تم سوچو کہ تمہیں کیا انتظام کرنا چاہیے' جس سے ایسی صورت پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن مولوی صاحبان کا ارشاد ہے کہ شریعت کے معاملہ میں سوچنا حرام ہے۔

انشورنس کو ناجائز قرار دینے کے لئے' ان حضرات کی طرف سے دو دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ چیز "توکل علی اللہ" کے خلاف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں سود شامل ہوتا ہے۔

جہاں تک "توکل علی اللہ" کا تعلق ہے' ان حضرات نے توکل کا ایسا غلط مفہوم پیش کر رکھا ہے جس سے یہ قوم اپاہجوں اور مفلوجوں کا گروہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان کے پیش کردہ توکل علی اللہ کے مفہوم کی تردید تو روزمرہ کے واقعات کر رہے ہیں۔ اگر توکل علے اللہ سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے لئے کوئی حفاظتی تدبیر نہ کرد' کیونکہ رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے' تو ان سے پوچھئے کہ یہ جو اس وقت دنیا کی آدھی آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے اور ایک ایک قحط میں لاکھوں انسان بھوک سے مرجاتے ہیں یا فرد کا سب کی موت کے بعد ' اس کے بیوی بچوں پر فاقے آنے شروع ہو جاتے ہیں' تو اس وقت خدا کی یہ ذمہ داری کہاں چلی جاتی ہے؟

یاد رکھئے! توکل علے اللہ کے یہ معنی نہیں۔ اس کے معنی ہیں خدا کے تجویز کردہ نظام کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد۔ یہ بھروسا کہ اس نظام میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی ذی حیات بھوکا رہ جائے۔ یہ اسی نظام کی محکمیت تھی جس کے پیش نظر حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ:

> اگر کسی بستی میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو جائے تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

یا جس "ذمہ داری" کی حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں تشریح کی تھی کہ:

> اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرجائے تو بخدا! عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

یہ تھا وہ نظام جس پر کامل بھروسا کو "توکل علے اللہ" کہا گیا تھا۔

باقی رہا سود کا معاملہ۔۔۔ سو ان حضرات سے پوچھئے کہ آپ' لوگوں سے "کار خیر" کے لئے جس قدر عطیات لیتے ہیں (حتیٰ کہ جس وظیفہ یا تنخواہ پر آپ کی بسر اوقات ہوتی ہے) کبھی سوچا بھی ہے کہ اس میں کس قدر حصہ سود کا ہوتا ہے؟ سود' موجودہ نظام سرمایہ داری کا خون رگ حیات ہے۔ اس سے (اس نظام میں زندگی بسر کرنے والوں میں سے) کس کو مفر ہو سکتا ہے؟

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ موجودہ نظام معیشت سراسر غیر اسلامی ہے اور سود' انشورنس وغیرہ قسم کی اسکیمیں اس نظام کا لازمی جزو ہیں۔ لہٰذا' جب تک آپ اس نظام کو گوارا کئے ہوئے ہیں' آپ کو اس شجرۃ

الزقوم کے برگ و بار کو بھی گوارا کرنا ہوگا۔

اور اگر آپ انہیں گوارا نہیں کر سکتے اور رزق حلال کے متمنی ہیں تو اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ، قرآنی نظام معیشت رائج کریں۔ لیکن اگر ہماری روش یہی رہی کہ موجودہ نظام سرمایہ داری کو تو عین مطابق اسلام قرار دیتے رہے اور اس کے برگ و بار کو حرام، (اور قرآنی نظام کی طرف دعوت دینے والوں کو مرتد قرار دے کر مطعون کرتے رہے) تو یہ فریب نفس ہے جس سے عملی مشکلات کا حل نہیں مل سکتا۔

اگست ۱۹۶۸ء

۱۳۔ مرتد کی سزا

(ہائی کورٹ کا قرآن کے مطابق فیصلہ)

ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ بھی چلا آرہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان، اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لے، تو اسے قتل کر دینا چاہیے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک، "اسلام چھوڑ دینے" سے مراد یہی نہیں کہ وہ مسلمان کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جس مسلمان کے متعلق یہ حضرات کہہ دیں کہ اس کے عقائد صحیح نہیں رہے اور اس طرح اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیں، تو اسے بھی مرتد سمجھا جائے گا اور وہ واجب القتل ہوگا۔ مودودی صاحب اس باب میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے (اپنے کتابچہ ---- مرتد کی سزا ---- میں) لکھ دیا کہ جب پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے تو موجودہ مسلمانوں کو نوٹس دے دیا جائے گا کہ وہ ایک سال کے اندر اندر صحیح اسلامی عقائد اختیار کر لیں (یعنی وہ عقائد جنہیں مودودی صاحب "اسلامی" قرار دے دیں) ورنہ انہیں (سب کو) قتل کر دیا جائے گا۔

طلوع اسلام نے اس عقیدہ (یعنی مرتد کی سزا قتل) کے خلاف شروع سے صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ یہ مسلک قرآن کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہے---- قرآن کے نزدیک، ایمان نام ہے حق و صداقت پر دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ یقین رکھنے کا۔ اس لئے اس میں مذہب کی پوری آزادی ہے۔ اگر کوئی مسلمان (بدقسمتی سے) اسلام چھوڑ کو کوئی اور مذہب اختیار کر لے گا تو وہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت سے رہے گا۔ یہ چیز قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے کہ ایک غیر مسلم کو تو اجازت ہو کہ وہ جی چاہے تو غیر مسلم رہے اور جی چاہے تو اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کر لے، لیکن ایک مسلمان کو اس کی اجازت نہ ہو کہ وہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ یعنی جو مذہبی آزادی کافر کو حاصل ہے، مسلمان پر اس کے دروازے بند ہو جائیں---- ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے طلوع اسلام کے خلاف جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ یہ مرتد کو واجب القتل قرار نہیں دیتا۔

مغربی پاکستان کی ہائی کورٹ نے چٹان پریس سے متعلق رٹ درخواست ۶؎ کے فیصلہ (مورخہ ۲۲ جولائی ۶۸ء) میں' ضمناً' اس سوال کو بھی لیا ہے (کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں) اور اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے غور سے پڑھا جائے۔ فیصلہ کا متعلقہ حصہ حسب ذیل ہے (واضح رہے کہ ہم اس وقت احمدیوں کے عقائد اور ان کے کفرو اسلام کے متعلق بحث نہیں کر رہے۔ ہم صرف فیصلہ کے اس حصہ کو سامنے لا رہے ہیں جس میں "مرتد کی سزا" کے سوال سے بحث کی گئی ہے)۔

> جہاں تک ان واقعات کا تعلق ہے جس میں احمدیوں کو مرتد قرار دے کر قتل کر دیا گیا تھا' ہم اس سلسلہ میں صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مذہبی استبداد کی تاسف انگیز مثالیں ہیں اور اگر انسانی معاملات میں کوئی خوبی اور شرافت (DECENCY)باقی ہے تو انسانی ضمیر کو اس کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے۔ یہ واقعات' صحیح اسلامی تعلیم اور احکام کے کس قدر خلاف ہیں' اس کی وضاحت' سورہ بقرہ کی آیت نمبر۲۵۶ میں موجود ہے جو نہایت واضح طور پر مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے ---- **لا اکراہ فی الدین** ۷؎--------- دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبرو اکراہ نہیں۔ اسی طرح (اسی سورہ کی) آیت نمبر ۶۲ میں بھی تمام اہل مذاہب کو (مذہبی) آزادی کی ضمانت دی گئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ------ **ان الذین امنوا والذین ھادوا والنصاری والصابئین من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** جو لوگ (قرآن پر) ایمان لائے اور جو یہودی کتب مقدسہ کا اتباع کرتے ہیں اور عیسائی اور صابئین--- اور جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں' ان کا اجرا ان کے رب کے ہاں ملے گا۔ ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا------ سورہ آل عمران کی آیت نمبر۷۹ میں' ایک ایسا متعین حکم ہے جس کی رو سے کسی انسان کو----- حتی کہ پیغمبر کو بھی---- اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر زبردستی ٹھونسے۔ (وہ آیت یہ ہے)----- **ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ ولکن کونوا ربّنین بما کنتم تُعَلِّمون الکتب وبما کنتم**

۶؎ (WRIT PETITION NO : 937 ——— 1968)

۷؎ اصل فیصلہ میں صرف انگریزی ترجمہ (علامہ یوسف علی) دیا گیا ہے۔ آیات ہم نے خود درج کردی ہیں۔ ترجمہ وہی دیا گیا ہے جو فیصلہ میں درج ہے۔

تلوسون------ کسی انسان کے لئے جسے خدا نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا
کی ہو' یہ ممکن نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے پرستار بن
جاؤ- (اس کے برعکس وہ کہے گا کہ) تم اس خدا کے پرستار بنو جو سب کا پروردگار ہے
کیونکہ تم نے کتاب کی تعلیم دی ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھا ہے-
فکر و ضمیر کی آزادی کی ضمانت اس سے واضح تر الفاظ میں دی نہیں جا سکتی تھی-

ہم قرآن کریم کی سند و حجت کی بنیاد پر فیصلہ دینے والے ان جج صاحبان کو مستحق تحسین و تبریک قرار دیتے ہیں- کس قدر واجب الطمینان ہے یہ امر کہ مسلمان اب رفتہ رفتہ پھر سے قرآن کے قریب آرہا ہے- فالحمد للہ علیٰ ذالک!

(دسمبر ۱۹۶۸ء)

---O---

۱۴- عوام کی آواز---- خدا کی آواز نہیں ہوتی

علامہ اقبالؒ کے صاحبزادہ' ڈاکٹر جاوید اقبال نے' لاہور میں یوم اقبال کی تقریب پر' تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

علامہؒ کے نزدیک لا الہ الا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے دل و دماغ سے غیر اللہ
کا تسلط ختم کر کے' صرف اللہ کی حاکمیت تسلیم کرے ... ..اللہ کی حاکمیت سے مراد
عوام کی حاکمیت ہے- کیونکہ اللہ کی رضا کا اظہار ہمیشہ عامتہ الناس کی آواز کے ذریعے
ہوتا ہے-

(چٹان ۲۸ اپریل ۱۹۶۹ء)

یہ وہی "عامتہ الناس" کی آواز ہے جس کے متعلق خدا نے اپنے رسول سے کہا تھا کہ:

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن و ان ھم الا یخرصون (۶/۱۱۷)

اگر' تو دنیا میں بسنے والوں کی اکثریت کا کہنا مانے گا تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا
دیں گے- وہ (حق و یقین کی نہیں بلکہ) ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکلیں
دوڑاتے رہتے ہیں-

اور جن کے متعلق' ان کے (مقرر کے) والد ماجد کا ارشاد ہے:

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

خدا کی آواز' عامتہ الناس کی آواز نہیں ہوتی- اس کی آواز صرف اس کی کتاب------ (قرآن کریم)------ میں محفوظ ہے اور اسی (کتاب) کی حاکمیت کا نام خدا کی حاکمیت ہے-

ومن لم یحکمم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۵/۴۴)
جو لوگ کتاب اللہ کی حکومت قائم نہیں کرتے' تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔
(جون ۱۹۶۹ء)

۱۵۔ حادثوں میں مرنے والے شہید نہیں ہوتے

اگلے دنوں لاہور میں ایک بہت بڑے کاروباری کی موت حادثہ سے واقع ہو گئی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس موت کا سبب زہر خورانی تھا۔ ان صاحب کا تعلق جماعت اہل حدیث سے تھا۔ ان کی اس حسرتناک وفات پر تبصرہ کرتے ہوئے' اخبار المنبر نے (جس کا مسلک اہل حدیث ہے) اپنی ۵/۱۲ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ:

> .... کی رحلت کا یہ پہلو حد درجہ الم انگیز ہے کہ یہ سانحہ انتہائی تیز اثر زہر "سائناؤائڈ" کھلانے سے ہوا۔ اس واقعہ نے اس صدمہ کو کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ لیکن اس "شر" میں "خیر" کا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ توقع ہے کہ ...... سے جو غلطیاں' لغزشیں بالخصوص بعض نامناسب قسم کے کاروبار کی صورت میں رونما ہوئیں' اللہ تعالیٰ اس حادثہ کو ان کا کفارہ بنا دیں اور انہیں اپنی مغفرت تامہ سے نوازیں۔

یعنی حادثہ سے موت واقع ہو جائے تو بلیک مارکیٹنگ' سمگلنگ اور اسی قسم کی دیگر کاروباری بددیانتیاں سب معاف ہو جاتی ہیں!

قرآن کریم کی رو سے' شہید کا مرتبہ سب سے بلند ہوتا ہے' اتنا بلند کہ انہیں مردہ کہنا یا مردہ سمجھنا بھی معصیت خداوندی میں داخل ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ روایات کی رو سے' شہیدوں کے زمرے میں کون کون داخل ہو جاتا ہے۔ غور سے سنئے۔ مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو؟ حاضرین نے عرض کیا کہ جو خدا کی راہ میں مارا جائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح تو میری امت میں شہداء کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہے؟ فرمایا جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید' جو طاعون سے مر گیا وہ شہید' جو اسہال (دستوں کی وجہ) سے مر گیا وہ شہید' جو پانی میں ڈوب کر مر گیا وہ شہید' جو مکان کے گرنے سے مر جائے وہ شہید۔ اسی طرح ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ جو نمونیہ سے مر جائے وہ شہید' جو آگ میں جل کر مر جائے وہ بھی شہید' جو عورت وضع حمل سے مر جائے وہ بھی شہید۔

المنبر نے غالباً" اسی پر مستنبط کر کے' حادثہ (زہر خورانی) کی موت کو مغفرت کا موجب قرار دیا ہے؟ ہمیں ان حضرات پر نہ کوئی افسوس ہے نہ حیرت۔ تاسف اور حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس قسم کی روایات اس ذات اقدس و اعظمؐ کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں جس کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرایا گیا کہ:

قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم(۶/۱۵)

اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی اپنے رب کے کسی حکم کی خلاف ورزی کروں' تو یوم مکافات سے مجھے بھی خائف رہنا ہوگا۔

غور کیجئے کہ خدا کے اس دین کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ یاد رکھئے! حادثوں سے مرنے والے شہید نہیں ہو جاتے۔ شہید وہی ہے جو دین کی محافظت میں برضاو رغبت اپنی جان دے دے۔ قرآن کی اصطلاح میں انہیں مقتولین فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔ (نومبر۱۹۶۹ء)

۱۲۔ قرآن کریم اور زمانے کے تقاضے

(ثبات و تغیر کا حسین امتزاج)

خرم ایجنسی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر(۲) کا مطالعہ کر رہا تھا کہ' اس میں جناب ...... کا ایک مفید مضمون بعنوان "قرآن کی تصویر" (؟) نظر سے گزرا۔ وہاں پر انہوں نے ایک محترم بزرگ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے الحق کے یہ معنی کئے ہیں کہ حق وہ جو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ لغات القرآن جلد دوم میں نے نکالی تو وہاں پر بھی یہ عبارت ملی۔ معلوم ہوا کہ محترم بزرگ سے ان کا مطلب آپ ہیں۔ یہ سطور اس شبہ کو دور کرنے کا باعث بنے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن الحق ہے اور زمانے کے تقاضے تو کبھی غلط اور کبھی درست ہوتے ہیں۔ تو غلط تقاضے قرآن کس طرح پورے کرے گا۔ صاحب مضمون نے کہا ہے کہ حق زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا' بلکہ زمانہ مجبور ہوتا ہے کہ حق کے مطابق چلے۔ لہٰذا' بذریعہ طلوع اسلام اس اہم بات کو واضح کر دیں۔

جواب :- میں نے' نہ تو سیارہ ڈائجسٹ کا قرآن نمبر دیکھا ہے اور نہ ہی محولہ بالا مضمون میری نظر سے گزرا ہے۔ لیکن صاحب مکتوب نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے' اس کا ازالہ ضروری ہے --- ان امور کی وضاحت پہلے بھی متعدد بار کی جا چکی ہے۔ بایں ہمہ' ان کی مزید وضاحت فائدے سے خالی نہیں ہوگی۔

لغات القرآن کے بارے میں پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ یں نے اس میں کسی لفظ کے معنی اپنی طرف سے نہیں دیئے۔ تمام معانی عربی زبان (بالخصوص قرآن کریم) کی مستند کتب لغت کی رو سے دیئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے ساتھ ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جہاں تک لفظ حق کا تعلق ہے' میں نے اس کے معانی صرف یہی نہیں دیئے کہ وہ بدلنے والے حالات کا تقاضا پورا کرتا ہے' بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ حق اپنے مقام پر محکم' اٹل اور امٹ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ حق باطل کی ضد ہوتا ہے۔ اتنی سی بات سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو چیز باطل کی ضد ہو وہ باطل کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔

امام راغب نے حق کے معانی کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے۔

الحق (حق) کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں' جیسا کہ دروازے کی
چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں
گھومتی رہتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مثال ایسی برجستہ ہے کہ اس سے اصل مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ دیوار اپنے مقام پر محکم ہوتی ہے لیکن وہ بدلنے والے حالات کا تقاضا پورا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس' دروازے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اصل مقام پر محکم بھی ہوتا ہے' لیکن دیوار کی طرح جامد نہیں ہوتا۔ جب آپ اندر آنا یا باہر نکلنا چاہیں تو وہ کھل جاتا ہے اور جب آپ چاہیں کہ نہ کوئی اندر آسکے اور نہ باہر جا سکے تو وہ بند کیا جا سکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا پورا کرنا۔

اب دیکھئے کہ قرآن کریم کی نسبت سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ اسے دو تین مثالوں سے سمجھئے۔

۱۔ قرآن کریم میں ہے کہ نماز سے پہلے وضو کرو۔ اور دوسری جگہ ہے کہ جب پانی نہ ملے یا بیماری کی حالت میں ہو' تو وضو کی بجائے تیمم کرو۔ آپ نے دیکھا کہ بدلنے والے حالات کے مطابق قرآن کریم نے خود ہی دو الگ الگ حکم دے دیئے۔ اپنے اپنے حالات میں دونوں احکام حق ہیں۔

۲۔ قرآن کریم میں مخالفین کے متعلق کہیں یہ کہا گیا ہے **فاعف عنهم واصفح**(۵/۱۳) انہیں معاف کر دو' ان سے درگزر کرو۔ اور کہیں کہا گیا ہے **واقتلوهم حيث ثقفتموهم**(۲/۱۹۱) انہیں جہاں پاؤ قتل کرو۔ یہ دو احکام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن اپنے اپنے مقام پر دونوں حق ہیں۔ جہاں حالات کا تقاضا درگزر کرنے کا ہو' وہاں درگزر کرنا حق ہے اور جہاں ان کے خلاف جنگ کرنا ضروری ہو' وہاں جنگ کرنا حق کا تقاضا ہے۔

۳۔ اپنی مملکت کی سرحدوں کو دشمن کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ "امکان بھر اپنی تیاری رکھو اور سرحدوں پر گھوڑوں کے رسالے متعین کر کے ان کی حفاظت کرو" (۸/۶۰)۔
ظاہر ہے کہ یہاں اصل مقصد اپنی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ جب تک یہ حفاظت گھوڑوں کے رسالوں سے ممکن تھی' یہی طریق' حق کا تقاضا تھا۔ آج کے زمانے میں یہ تقاضا توپوں' ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ اب یہ طریق اختیار کرنا حق ہے۔

۴۔ اوپر کی مثال میں ایک طریق کار (گھوڑوں کے رسالوں) کا تعین قرآن نے خود کر دیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے بیشتر احکامات ایسے ہیں' جن میں صرف ایک اصول دیا گیا ہے۔ ان اصولوں کی عملی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ مثلاً" اسلامی نظام کے متعلق اس نے اصولاً" کہا ہے **وامرهم شورى بينهم** (۴۲/۳۸) یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ مشاورت کا کوئی طریقہ قرآن نے متعین نہیں کیا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ یہ طریقہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق' امت خود تجویز کرے گی۔ اور ہر وہ طریق جس سے مشاورت کا مقصد حاصل ہو جائے' حق کا تقاضا پورا کر دے گا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے انتخاب میں

مشاورت کا طریق اور تھا' آج اس کا طریقہ اور ہوگا۔ بالفاظ دیگر' جس طریق سے مشاورت کا مقصد پورا ہوگا وہ الحق ہوگا اور جس طریق سے مشاورت کی نفی ہوگی وہ باطل ہوگا۔

ان مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ایسا کہنے کا مفہوم کیا ہے کہ حق بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ حق باطل کا ساتھ دیتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ حق ایک اصول دیتا ہے اور اس اصول پر عمل درآمد زمانے کے تقاضوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اگر کسی وقت اس اصول کو نظر انداز کر دیا جائے یا بدل دیا جائے تو وہ پروگرام باطل ہو جائے گا۔ اس کے برعکس' اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس اصول پر عمل کرنے کے لئے جو طریق کسی زمانے میں وضع ہوا تھا وہ غیر متبدل ہے اور خواہ وہ زمانے کے تقاضے پورے کرے یا نہ کرے' ہمیں اسی کے مطابق عمل کرنا ہوگا' تو یہ تصور بھی حق کے مفہوم کے خلاف ہے۔ قرآن کے اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو جزئی قوانین وضع اور اختیار کئے جائیں گے' جب زمانے کے حالات مقتضی ہوں' تو ان میں تبدیلی کی جا سکے گی۔ دروازہ اپنے مقام پر قائم رہے گا' حالات کے مطابق اسے بند کیا جائے گا اور جب ضرورت پڑے' کھولا جائے گا۔ اگر دروازہ جامد ہو جائے تو وہ دروازہ ہی نہیں رہتا۔ یوں اسلام کا نظام اپنے مقام پر اٹل اور محکم بھی ہے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا ہے۔ زمانے کو بے شک پھر پھرا کر قرآنی اصولوں کی طرف آنا ہے۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہی ہوا جائے گا۔ اقبالؒ نے اسی کو ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے تعبیر کیا ہے۔ دروازہ کی مثال سے یوں سمجھئے کہ دین کھلنے اور بند ہونے والا دروازہ ہوتا ہے اور جب وہ بند ہو کر منجمد ہو جاتا ہے تو اسے مذہب کہا جاتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہوگی۔ میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں' لیکن یہ چیز فرصت کی محتاج اور منتظر ہے۔ (پرویز)

(جولائی ۱۹۷۰ء)

نوٹ:۔ میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب "شاہکار رسالت" باب "اسلامی نظام" میں وضاحت سے لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں "قرآنی فیصلے" جلد اول ص ۵۰۳ ایڈیشن سوم ۱۹۹۲ء بھی دیکھئے۔

۱۷۔ "مادر وطن" کی اصطلاح غیر اسلامی ہے

طلوع اسلام گزشتہ چوبیس سال سے اس بات کو برابر دہرائے چلا آرہا ہے کہ جب تک ہم اپنی قوم کے نوجوانوں کے دل میں اس حقیقت کو راسخ نہیں کر دیں گے کہ نہ سرزمین پاکستان عام وطنوں کی طرح ایک وطن ہے اور نہ یہاں کی مملکت عام مملکتوں کی سی ایک مملکت --- اس وقت تک یہاں کے ملی مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں مل سکے گا۔ اس سلسلے میں پرویز صاحب کا وہ مقالہ جو طلوع اسلام کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا اور ان کا وہ

خطاب، جو زیر نظر اشاعت (اکتوبر ۱۹۷۱ء) میں شائع ہو رہا ہے، خاص طور پر درخور توجہ ہے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہی نہیں، تاسف ہوا کہ ۶ ستمبر ۱۹۷۱ء کے یوم دفاع کے سلسلے میں اکابرین ملت کی طرف سے جس قدر پیغامات، اعلانات، بیانات، خطابات، تقاریر وغیرہ فضا میں پھیلیں اُن سب میں ان شہداء کو وطن کی حفاظت میں جان دینے والے کہہ کر پکارا گیا۔ کوئی بھی اس سے آگے نہ بڑھا۔ کسی نے بھی انہیں اسلام کا محافظ اوردین کا پاسبان کہہ کر نہ پکارا۔ اس سلسلے میں ایک بیان مفتی محمود صاحب کا بھی اخبارات میں شائع ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ بزرگوار اپنے آپ کو بہت بڑا عالم اور اسلام کا بہت بڑا محافظ قرار دیتے ہیں۔ سنئے کہ انہوں نے کیا کہا۔ انہوں نے اپنے پیغام میں کہا:

> شہدائے ستمبر کو خراج عقیدت پیش کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس مادر وطن کی ناموس کی خاطر ملک کے ان جانبازوں نے اپنی جانوں کی قربانی پیش کی تھی، ہم اس ناموس پر کوئی حرف نہ آنے دیں۔ (امروز، بابت ۶ ستمبر ۱۹۷۱ء، ص ۶)

آپ "مادر وطن" کی اصطلاح پر غور فرمایئے۔ یہ خالص مشرکانہ تصور ہے۔ ہندوؤں کے ہاں گئو ماتا، گنگا ماتا، بھارت ماتا، دھرتی ماتا، ان کے معبودان باطل کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ تصور زمانہ قدیم کے اصنامیات کا پیدا کردہ ہے جس کی جڑ کاٹنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا تھا۔ قرآن نے وطن کو صرف اس قدر اہمیت دی ہے کہ یہ قرآنی قوانین و احکام کی تنفیذ کا محسوس ذریعہ بنتا ہے اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ جس وطن میں اس کا امکان نظر نہ آتا ہو، وہاں سے ہجرت کر جانا مومن کا فریضہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا تھا اور قرآن نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جن مسلمانوں نے بلا کسی عذر کے مکہ سے ہجرت نہیں کی، ان کے ساتھ جماعت مومنین کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اسلام میں وطن کی اس حیثیت کے بعد ----- اسے مادر وطن کہنا، بت پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔ وطن کی یہی حیثیت تھی جسے خلاف اسلام قرار دیتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

حتیٰ کہ انہوں نے مسلمانوں سے بڑی سختی کے ساتھ کہا کہ:

اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

ان کی زندگی کے آخری لمحات میں ان کا جو مباحثہ، (مولانا) حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ ہوا تھا، اس کا موضوع بھی یہی تھا۔ اس بحث و نزاع کا عنوان انہوں نے "معرکہ دین و وطن" رکھا تھا۔ اس میں اسلام کی رو سے وطن کا صحیح مقام متعین کیا گیا تھا۔ اس لئے ہمیں وطن کے لئے اس قسم کی اصطلاحات استعمال کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔

ہم مفتی صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن و حدیث یا صدر اول کی تاریخ میں کہیں بھی اپنے ملک کو مادر وطن کہا گیا ہے۔ (اکتوبر ۱۹۷۱ء)

-------------- ○ --------------

۱۸- موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ

(انہیں اسلامی تہذیب سے کچھ واسطہ نہیں)

روزنامہ مساوات کی ۲۴ جنوری ۷۲ء کی اشاعت کے ایک زیر اداریہ میں' موہنجوڈارو کے آثار قدیمہ کے سلسلہ میں لکھا ہے:-

> محققین کا کہنا ہے کہ مزید کھدائی سے پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب کے آثار ملیں گے لیکن اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی کہ سابقہ حکومتوں کو صرف اپنی کرسیوں سے دل چسپی تھی اور پاکستانی تہذیب ان کے لئے بے معنی شے ہے۔

کیا ہم مدیر مساوات سے دریافت کر سکتے ہیں کہ موہنجوڈارو سے پانچ ہزار سال پہلے کے جو آثار ملیں گے انہیں "پاکستانی تہذیب" سے کیا واسطہ ہوگا؟ یہ محض اتفاق ہے کہ تقسیم ہند کے وقت رقبوں کی جو لکیریں کھینچی گئیں' ان کی رو سے موہنجوڈارو یا ہڑپہ وغیرہ مملکت پاکستان کی حدود کے اندر آگئے۔ اگر یہ لکیریں ذرا آگے بڑھ آتیں تو یہ مقامات ہندوستان کا حصہ ہوتے۔ اور اگر آپ کا معیار یہ ہے کہ جو کچھ پاکستانی علاقہ کے اندر آگیا ہے وہ پاکسانی تہذیب کا مظہر ہے تو پھر ہندوؤں کے مندر' بدھوں کے اسٹوپے' سکھوں کے گوردوارے' جو پاکستانی حدود کے اندر آگئے ہیں' سب پاکستانی تہذیب کے مظاہر قرار پا جائیں گے!

آپ نے دیکھا کہ جب انسان کا پاؤں اپنے مرکز سے اکھڑ جائے تو پھر اس کی زندگی کا دائرہ کس طرح ٹیڑھا میڑھا ہو جاتا ہے۔ حضرت! پاکستانی تہذیب کے ڈانڈے ملانے ہیں تو بدر وحنین کے ریگزاروں سے ملایئے' موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے صنم کدوں سے نہیں۔

(مارچ ۱۹۷۲ء)

---------------- ○ ----------------

۱۹- وصیت کے حکم کی وضاحت

ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے:-

"کئی دن سے میں وصیت کے بارہ میں قرآنی آیات پر غور کر رہا ہوں۔ اس دوران میں میرے سامنے مفہوم القرآن بھی ہے لیکن اس سے بات واضح نہیں ہوئی' اس لئے آپ کے پاس یہ پرچہ ارسال ہے۔ امید ہے آپ اس کے جواب سے ضرور نوازیں گے۔

۱- آیت ۲/۱۸۰ میں آپ نے لکھا ہے کہ والدین اور اقربین کے لئے قاعدہ کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ اس آیت میں جس قاعدہ کا ذکر ہے وہ کیا ہے؟

۲- آیت ۲/۱۸۲ میں ہے کہ اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا'

بلکہ وہ کسی کی طرف بے جا طور پر جھک گیا ہے تو اسے چاہئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے۔ (موص کی موت کے بعد یا پہلے) یہ وصیت بدلنے کے مترادف نہ ہوگا۔ یہاں یہ بات قابل وضاحت ہے کہ جب موص کو اختیار ہے کہ وہ جس قدر جس کو چاہے وصیت کر دے تو پھر اس کی وصیت پر یہ پابندی کیسی کہ ہر وارث یہ کہے گا کہ' موص نے ناانصافی کی ہے' اس کا فیصلہ کرایا جائے اور موص کی موت کے بعد تو یہ وصیت کو بدلنا ہی ہوگا۔

۳۔ آیت ۴/۱۱ کے آخری حصہ میں ہے کہ وصیت کے بعد جو کہ کی گئی ہو' اس جملہ کے بعد ہے کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ یا تمہاری اولاد میں سے کونسا رشتہ نفع رسانی کے لحاظ سے تم سے قریب تر ہے' اس لئے یہ حصے خدا نے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ اس آیت کے مطابق یہ گمان ہوتا ہے کہ جب ہم یہ جان ہی نہیں سکتے کہ کون شخص ہم کو زیادہ نفع رسانی کے لحاظ سے قریب تر ہے تو پھر اگر ہم وصیت کل مال کی کر دیں تو ظاہر ہے وہ ایسے شخص کے پاس پہنچ سکتی ہے جو ہم سے نفع رسانی میں دور تر ہو اور یہ قریب تر والے کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس امر کی بھی ذرا وضاحت فرما دیجئے۔

۴۔ ۴/۱۲ آیت میں وصیت اور اس کے بعد غیر مضر کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب میں یہ سمجھا ہوں کہ ایسی وصیت کی جائے جو غیر مضر ہو۔ دوسرے وارثوں کے حق میں جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمام مال کی وصیت ایک آدمی کے حق میں کر دے تو دوسرے تمام وارث اس وصیت کی رو سے مضرت رساں ہوئے' یعنی ان کو ضرر پہنچا۔

ان چاروں مقامات سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ ان آیتوں میں جو اللہ تعالیٰ نے بندہ کو اختیار دیا ہے کہ جس قدر اور جس کو چاہے وصیت کرے' اس پر کچھ شرطیں لگا دی ہیں جو ان مذکورہ بالا آیتوں میں مذکور ہیں۔ امید ہے آپ ان آیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں بصیرت افروز اور اطمینان بخش جواب عنایت فرمائیں گے"

جواب :۔

قرآن کریم میں ہے **کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرن الوصیتہ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین** (۲/۱۸۰) تم میں سے جب کسی کے سامنے موت آموجود ہو' اور وہ مال و دولت اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہو تو اس کے ذمے فرض ہے کہ وہ اپنے والدین اور دیگر اقربا کے حق میں' قاعدے قانون کے مطابق' وصیت کرے۔ ایسا کرنا متقیوں کے لئے لازم ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس آیت میں وصیت کے حکم کی کس قدر شدت کے ساتھ تاکید کی گئی ہے۔ پہلے کہا گیا ہے کہ **کتب علیکم** ـــــــ تم پر فرض قرار دیا گیا ہے ـــــــ اور آخر میں ہے **حقا علی المتقین** ایسا کرنا متقیوں پر لازم ہے ـــــ کیا لازم ہے؟ اپنے ترکہ کے لئے اپنے والدین اور دیگر اقربا کے حق میں وصیت کرنا۔

یہ قرآن کریم کا حکم ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ہماری موجودہ شریعت کا حکم کیا ہے؟ یہ کہ وصیت ۱/۳ ترکہ سے زائد میں جائز نہیں' اور یہ بھی والدین اور اقربا (یعنی وارثوں) کے حق میں نہیں ہو سکتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ حکم' قرآن کریم کے اس قدر تاکیدی حکم کے یکسر خلاف ہے۔ اس حکم شریعت کی بنیاد کیا ہے؟

ایک روایت ------ کہا یہ جاتا ہے کہ روایات کے پرکھنے کے جو معیار مقرر ہیں' ان میں سب سے پہلا معیار یہ ہے کہ وہ روایت قرآن کے خلاف نہ ہو۔ یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک روایت' قرآن کریم کے اس قدر واضح اور تاکیدی حکم کے صریحا" خلاف ہے' لیکن اسے صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سے ایک اہم سوال پیدا ہوا کہ جب کسی روایت اور قرآن کریم کی آیت میں تضاد واقع ہو تو اس وقت کیا کیا جائے! آپ کہیں گے کہ اس کا جواب آسان ہے۔ روایت کے متعلق کہہ دیا جائے کہ وہ رسول اللہؐ کی ہو نہیں سکتی' اس لئے غلط ہے۔ قرآن کا حکم اٹل ہے۔ لیکن نہیں! ارباب شریعت کا جواب یہ نہیں۔ ان کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں سمجھ لیا جائے کہ قرآن کی آیت منسوخ ہے اور روایت کا حکم' واجب التعمیل۔ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:۔

> نبیؐ کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب حجت رہے اور مطابق نہ رہے تو حجت نہ رہے۔ .... اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے **کتب علیکم** .... (۲/۱۸۰) اور رسول اللہؐ نے فرمایا **لا وصیۃ للوارث** وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اس حدیث پر رہا ہے' یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قول رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔

(فتنہ انکار حدیث از علامہ حافظ محمد ایوب مرحوم)

اس تمہید کے بعد' مذکورہ بالا خط کی طرف آیئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جو مال کسی شخص کی ملکیت ۸۔ میں ہو' اس میں سے کوئی شخص بطور حق کچھ مطالبہ نہیں کر سکتا ۹۔۔ وہ اس مال کا مالک ہے اور اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق' جسے چاہے اور جتنا چاہے' دے دے۔ اپنی زندگی میں دے دے تو اسے اس کا بھی اختیار ہے اور اگر وہ اسے اپنی موت کے بعد دینا چاہے تو اس کے لئے وصیت کر دے۔ وصیت کرنا قرآن کی رو سے فرض ہے لیکن اگر ایسا ہو کہ کوئی شخص وصیت کر نہیں سکا یا اس کی وصیت اس کے پورے ترکہ کو محیط نہیں (COVER نہیں کرتی) تو پھر اس کی تقسیم ان حصوں کے مطابق کی جائے گی جنہیں خدا نے خود مقرر کر دیا ہے۔ اس لئے اس نے ہر حصہ کے بعد کہا ہے کہ **من بعد وصیۃ توصون بھا اودین** (۴/۱۲) یہ تقسیم' متوفی کا قرضہ ادا کرنے اور اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔ اس تقسیم کے سلسلہ میں کہا کہ اس کا اختیار لوگوں کو اس

۸۔ یعنی اسلامی مملکت اسے ایک فرد کی ملکیت قرار دے دے۔

۹۔ سائل و محروم کے حق کی بات اور ہے۔ یہ حق اسلامی مملکت کے ذمے واجب ہوتا ہے۔

لئے نہیں دیا گیا کہ متوفی تو جانتا تھا کہ کون کتنے کا مستحق تھا' لیکن دوسرے لوگ نہیں جان سکتے۔ اس لئے اگر اس تقسیم کا اختیار انہیں دے دیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ اس میں ناانصافی ہو جائے۔ **لہٰذا**' اس کا اختیار خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ **لا تدرون ایھم اقرب لکم نفعا** (۴/۱۱) کا یہی مطلب ہے۔ یہ بات متوفی سے نہیں کہی گئی' اس کی وفات کے بعد' دوسرے لوگوں سے کہی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک' وصیت کی اہمیت کس قدر ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس نے صرف ایک اصولی حکم دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آیات (۱۰۸-۱۰۶/۵) میں پوری تفصیل سے بتا دیا کہ وصیت کس طرح کرنی اور لکھوانی چاہیے۔ یہ ہے وہ قاعدہ اور قانون جس کی طرف (۲/۱۸۰) میں اشارہ کیا گیا ہے (یعنی بالمعروف کہہ کر)۔

سورۂ بقرہ میں' وصیت کے متعلق حکم دینے کے بعد ہے **فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بینھم فلا اثم علیہ** (۲/۱۸۲) اگر کوئی شخص دیکھے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا' بلکہ وہ کسی کی طرف بے جا طور پر جھک گیا ہے' تو اسے چاہئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے۔ اس میں وصیت کرنے والے کے اختیار پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی نہ ہی کسی کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس کی وصیت میں تبدیلی کر دے۔ کہا صرف یہ گیا ہے کہ اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے شدت جذبات یا عدم علم کی بنا پر کسی ایسے شخص کو محروم کر دیا ہے یا کم دیا ہے جو اس کی امداد کا زیادہ مستحق ہے ------ اور ایسا ممکن ہے ---- تو وہ کوشش کرے کہ ان کے درمیان مصالحت ہو جائے۔ دیکھئے یہاں "مصالحت کرانا" کہا گیا ہے' اور مصالحت تو محض مشورہ ہوتا ہے۔ کسی کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وصیت کرنے والا زندہ ہے تو اسے سمجھایا جائے اور اگر وہ فوت ہو جائے تو جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو' اس سے کہا جائے کہ بھائی! حق تو اس پر تمہارا ہی ہے لیکن تمہارا فلاں رشتہ دار بڑا محتاج ہے' کچھ اسے بھی دے دو۔ یہ وجہ ہے کہ اس آیت کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ **ان اللہ غفور رحیم** (۲/۱۸۲) خدا چاہتا ہے کہ جو غیر محفوظ ہے اس کی حفاظت ہو جائے' اور جو محتاج پرورش ہے اسے پرورش کا سامان میسر آجائے۔ مصالحت کی کوشش سے یہی مقصود ہے۔ آیت (۴/۱۲) میں جو **غیر مضار** کہا گیا تو یا تو اس کا تعلق صرف **دین** سے ہے۔ اس صورت میں اس چیز کو صرف عدالت متعین کرے گی کہ متوفی نے جو قرض لیا تھا اس سے اس کا منشاء کسی کو ضرر پہنچانا تو نہیں تھا۔ اور اگر اس کا تعلق وصیت سے بھی ہے تو اس کی وہی صورت ہوگی جسے ہم نے اوپر مصالحت کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اگر مصالحت کی کوشش ناکام رہے تو وصیت برقرار رہے گی۔ اس ضمن میں اس نکتہ کو پھر سے سامنے لے آنا چاہیے کہ کسی شخص کے مال میں سے دوسرا شخص اپنے حق کے طور پر کچھ مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے وصیت پر قانونی پابندی کوئی نہیں' پابندی اخلاقی ہے اور اخلاقی پابندیاں تو قرآن' مومن کی زندگی کے ایک ایک سانس پر عائد کرتا ہے۔

واضح رہے کہ وصیت یا وراثت وغیرہ کے احکام' اس عبوری دور سے متعلق ہیں جب ہنوز اسلامی نظام اپنی آخری شکل میں قائم نہ ہوا ہو۔ اس وقت نہ کسی کے پاس زائد از ضرورت مال ہوگا نہ اس کی تقسیم کا سوال پیدا ہوگا۔ آپ

دیکھتے نہیں کہ قرآن نے خود وصیت کے حکم میں **ان ترک خیرا** (۲/۱۸۰) کی شرط لگا رکھی ہے' یعنی اگر وہ مال چھوڑے تو۔ اسلامی نظام میں جب کسی کے پاس زائد از ضرورت مال رہے گا ہی نہیں تو یہ حکم خود بخود ساقط ہو جائے گا۔ اسلامی نظام کی مکمل صورت کا نقشہ حضور نبی اکرمؐ نے اپنی مثالی زندگی میں پیش فرما دیا تھا جب کہا تھا کہ ہمارا وارث کوئی نہیں ------ اور حضورؐ نے اپنے ترکہ میں کوئی مال چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ہاں! اسلامی مملکت جو کچھ کسی فرد کی ملکیت میں دے دے' وہ اسی کی ملک ہو جائے گا۔

(اپریل ۱۹۷۲ء)

۲۰۔ جمعہ کی چھٹی

پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں یہ "اہم ترین" مسئلہ زیر بحث ہے کہ ہفتہ وار تعطیل کس دن کی جائے۔ جن لوگوں کی نگاہیں ملی اور بین الاقوامی تقاضوں پر ہیں ان کی تجویز ہے کہ چھٹی حسب معمول اتوار کے دن رکھی جائے لیکن مولوی صاحبان کا ارشاد ہے کہ یہ چیز خلاف شریعت ہے۔ دین کا تقاضا ہے کہ جمعہ کے دن کاروبار بند رکھا جائے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مولوی صاحبان کا وہ کونسا دین ہے جس کا یہ تقاضا ہے' ورنہ خدا کے عطا کردہ دین میں جمعہ کے متعلق کچھ اور ہی آیا ہے۔ سورہ الجمعۃ میں ہے۔

> **یاایھا الذین امنوا اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر الله و ذروا البیع ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ○ فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل الله** ..... (۶۲/۹-۱۰)
>
> اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن صلوٰۃ کے لئے آواز (اذان) دی جائے تو کاروبار چھوڑ دیا کرو اور اللہ کے ذکر کی طرف لپک کر آجایا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو تو----
>
> اور جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو پھر ملک میں پھیل جاؤ اور رزق خداوندی کی تلاش کرو۔

ان آیات سے واضح ہے کہ قرآن کریم' جمعہ کو سارا دن کاروبار بند رکھنے کا تصور نہیں دیتا۔ اس کے برعکس' وہ بتاتا ہے کہ کاروبار صرف صلوٰۃ کے وقت کے لئے بند کیا جائے گا۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد 'کاروبار جاری رکھا جائے گا۔

واضح رہے کہ اس قسم کے مسائل (کہ ہفتہ میں کونسے دن کاروبار بند رکھا جائے) کا تعلق دین سے نہیں' ملی تقاضوں سے ہے۔ ہم نے جو قرآن کریم کی (مندرجہ بالا) آیات پیش کی ہیں تو وہ یہ بتانے کے لئے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت کا یہ جو مطالبہ ہے کہ جمعہ کی چھٹی' دین کا تقاضا ہے' یہ غلط ہے۔ اگر انہوں نے یہ تقاضا قرآن سے ثابت کرنا

ہے تو پھر قرآنی تصریحات خود ان کے مطالبہ کے خلاف جاتی ہیں۔ اگر ہم ہفتہ میں کسی روز بھی چھٹی نہ کرنا چاہیں تو یہ بھی دین کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور اگر ہفتہ کے کسی ایک روز چھٹی کرنا چاہیں تو دین اس سے بھی نہیں روکتا۔

(اکتوبر ۱۹۷۲ء)

۲۱۔ دو قومی نظریہ ——— قوم اور امت

ہمارا دور بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں لوگ مسلمان ہونے کے مدعی بھی ہوتے ہیں اور اسلام کے (فروعات نہیں بلکہ) مسلمات سے انکار بھی کرتے ہیں ——— انکار ہی نہیں کرتے بلکہ اس انکار پر اصرار کرتے ہیں اور اپنے اس انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بحث بھی کرتے ہیں۔

(۲) اسلام کے بنیادی مسلمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے پوری نوع انسان کی تقسیم دو گروہوں میں کی ہے اور اس تقسیم کا معیار کفر اور ایمان ہے **ھو الذی خلقکم فمنکم کافر ومنکم مومن** (۶۴/۲) خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور ایک گروہ مومنین کا ——— اس معیار تقسیم و تفریق کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام مسلم ایک گروہ کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسرے گروہ کے افراد۔ اسی کو (دور حاضر کی اصطلاح میں) دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے' دنیا کے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔

جب ہم اس قرآنی نظریہ تقسیم کو پیش کرتے ہیں تو اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ (مثلاً) پاکستان اور افغانستان میں دو الگ الگ قومیں نہیں بستیں۔ یہ ایک ہی قوم ہے۔ اور اس سے آگے یہ کہ پاکستان اور افغانستان کیا' اس نظریہ کی رو سے' تمام مسلم ممالک میں بسنے والے افراد ایک قوم ہیں۔ اور یہ بات خلاف حقیقت ہے۔ مختلف اسلامی ممالک کے مسلمان الگ الگ قومیں ہیں' اس لئے اس سے واضح ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار' ایمان کا اشتراک نہیں' وطن کا اشتراک ہے۔ لہذا' یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار' ایمان کا اشتراک ہے۔

آپ نے اس منطق کے صغریٰ کبریٰ پر غور فرمایا؟ وہ صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قوم سمجھتے ہیں' اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام کی رو سے معیار قومیت' ایمان کا اشتراک ہے۔

یعنی ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی نص صریح کی رو سے' معیار قومیت کفر اور اسلام کا اختلاف ہے۔ اور ان حضرات کا ارشاد ہے کہ چونکہ موجودہ مسلمانوں کا عمل اس کے خلاف ہے' اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام کی رو سے معیار قومیت' ایمان کا اشتراک ہے! ذرا اس دلیل کو آگے بڑھائیے اور دیکھئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے! قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا د ینھم ...... الخ (۳۲-۳۱/۳۰)
مسلمانو! تم اسلام لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا' یعنی ان لوگوں میں
سے نہ ہو جانا' جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے۔
اور آپ اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ نہیں! چونکہ مسلمانوں میں ہر جگہ فرقے موجود ہیں اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ
اسلام میں فرقہ سازی شرک ہے۔
یا یہ کہ قرآن کریم میں ہے کہ :

من لم یحکم بما انزل اللہ فاولک ھم الکافرون (۵/۴۴)
جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' وہ کافر ہیں۔
اور آپ کہتے ہیں کہ اس وقت کوئی اسلامی مملکت بھی ایسی نہیں جہاں حکومت کتاب اللہ کے مطابق قائم ہو۔ اس لئے
یہ کہنا غلط ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔
یہ ہے منطقی نتیجہ اس دلیل کا۔ چونکہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قومیں سمجھتے ہیں
اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں معیار قومیت' ایمان کا اشتراک ہے' یعنی ان حضرات کے نزدیک' صحیح اور غلط کا
معیار' مسلمانوں کا موجودہ عمل ہے نہ کہ قرآن کریم کا فیصلہ۔ اس دلیل کا بودا پن کسی دلیل کا محتاج نہیں۔
ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے' نوع انسان کے دو ہی گروہ ہیں' کافر اور مومن۔ سوال یہ ہے کہ اس
معیار تقسیم کی رو سے ایمان کے اشتراک کی بنا پر جو "گروہ" وجود میں آتا ہے اس کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا
ہے کہ :

(i) وکذالک جعلنکم امتہ وسطالتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (۲/۱۴۳)
اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم نوع انسان کے اعمال کے نگران ہو اور رسول تمہارے
اعمال کا نگران رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح سے جو امت وجود میں آئی تھی' وہ کسی خاص خطہ زمین میں بسنے والے
مسلمانوں پر مشتمل تھی یا ساری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس آیت میں **جعلنکم** اور **علیکم** میں (کم) کی ضمیر
کا اطلاق کسی خاص وطن کے مسلمانوں پر ہوتا تھا یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس میں **شھداء علی الناس** کا
فریضہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا تھا یا کسی خاص خطہ ارض میں بسنے والے مسلمانوں کا! اس میں رسول کی نگرانی کسی خاص
ملک کے مسلمانوں تک محدود تھی یا ساری دنیا کے مسلمان اس کے احاطہ میں آجاتے تھے! فرمایئے کہ اس میں وہ کونسا
جزو تھا جو کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں سے الگ کرتا تھا۔ اس آیت کی رو سے' خدا نے
ایک امت متشکل کی تھی' امم متشکل نہیں کی تھیں۔ اس نے کہیں بھی امت عربیہ' امت مصریہ' امت ایرانیہ' امت
عراقیہ وغیرہ نہیں کہا تھا۔
(ii)اس نے دوسری جگہ کہا ہے **کنتم خیر امتہ اخرجت للناس** .... (۳/۱۰۹) تم ایک بہترین امت ہو جسے

نوع انسان کی بہبود کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔ اس میں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ **کنتم** (تم) کی ضمیر کسی خاص خطہ زمین کے مسلمانوں کے لئے ہے یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے! یہ جو **الناس** کی منفعت کے لئے امت کی تشکیل کی گئی تھی وہ کسی خاص وطن میں محصور تھی یا ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی!

(iii) قرآن کریم کہتا ہے کہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر جو امت وجود میں آتی ہے' وہ مکان کے اعتبار سے ہی حدود فراموش نہیں ہوتی' زمان کے اعتبار سے بھی قیود نا آشنا ہوتی ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ کسی ایک زمانے میں مختلف ممالک میں بسنے والے مومن' ایک امت کے افراد ہوتے ہیں' بلکہ اس نظریہ پر ایمان رکھنے والے دنیا میں جب اور جہاں بھی ہو گزرے ہیں' وہ سب ایک ہی امت کے افراد تھے۔ اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں' مختلف ممالک میں پیدا ہونے والے حضرات انبیاء کرامؑ کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ **ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون** (۲۱/۹۲ : ۵۲/۲۳) یہ سب ایک ہی امت تھے اور ان کے ایک امت ہونے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ایک ہی خدا کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ واضح رہے کہ چونکہ امت کی تشکیل اس کے نبی کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم نے جو مختلف انبیاء کرام کا ذکر کر کے انہیں امت واحدہ قرار دیا ہے تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ ان کے متبعین ایک ہی امت کے افراد تھے۔ اس سے واضح ہے کہ کسی ایک خطہ زمین کے' ایک ہی زمانہ کے مومن ہی ایک امت نہیں' اس اصول کو ماننے والے' شروع سے آج تک' ایک ہی امت کے افراد ہیں۔ اس نے یہاں تک کہہ دیاہے کہ اس امت کانام بھی شروع سے آج تک ایک ہی رہاہے۔ **ھو سمکم المسلمین من قبل وفی ھذا** (۷۸/۲۲) اس نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی یہی نام رکھا گیا ہے۔ لہٰذا' حضرت نوحؑ سے لے کر آج تک جن لوگوں نے بھی ایمان کے اشتراک کو معیار قومیت تسلیم کر لیا' وہ امت مسلمہ کے افراد قرار پا گئے' بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ کس زمانے میں گزرے ہیں اور کونسے ملک میں بستے تھے۔

(iv) قرآن کریم نے انہیں امت کہہ کر ہی نہیں پکارا' وہ ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب **اخوۃ** (بھائی بھائی) ہیں۔ سورۂ آل عمران میں ہے کہ :

> تم حبل اللہ (کتاب اللہ) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ
> تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔
> **فاصبحتم بنعمتہ اخوانا** اور یوں اپنی نعمت سے تمہیں باہمی بھائی بھائی بنا دیا۔
> (۳/۱۰۲)

ظاہر ہے کہ اس رشتہ اخوت سے کسی ایک وطن کے مسلمان ہی پیوست نہیں۔ اس میں ساری دنیا کے مسلمان منسلک ہیں۔ اور یہ رشتہ' اعتصام بہ حبل اللہ (قرآن سے وابستگی) ایمان ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ **انما المومنون اخوۃ** (۴۹/۱۰) حقیقت یہ ہے کہ (کسی ایک خطہ زمین کے نہیں بلکہ ساری دنیا میں بسنے والے) مومن' ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اخوت کا رشتہ قومیت کے رشتہ سے کہیں زیادہ عمیق اور

مستحکم ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں جس کا مطلب واضح ہے کہ اخوت کے اس رشتہ کی بنیاد' ایمان کا اشتراک ہے۔ جو لوگ ایمان میں ان سے مشترک نہیں وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ اس میں شامل ہونا چاہیں تو صرف ایمان لانے سے ہی ایسا کر سکتے ہیں۔ غور کیجئے عرب کے رہنے والے غیر مسلم (مشرکین قریش) اور مسلمان' وطن' نسل' رنگ' زبان کے اشتراک کے باوجود' ایک امت کے افراد قرار نہیں پا سکے۔ ان کے متعلق واضح الفاظ میں کہا گیا کہ **فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین....** (۹/۱۱) اگر یہ اپنی موجودہ کفر کی روش سے تائب ہو کر تمہارے اقامت صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کے فریضہ میں شریک ہو جائیں تو پھر یہ "دین میں تمہارے بھائی" بن سکتے ہیں' یعنی ان کے اور تمہارے درمیان تمام مشترک عناصر (نسل' رنگ' زبان' وطن وغیرہ کا اشتراک) انہیں تمہارا بھائی نہیں بنا سکتے------- حالانکہ ان میں سے اکثر و بیشتر خونی رشتہ کی بنا پر بھی بعض مسلمانوں کے بھائی تھے۔ یہ دین کے اشتراک کی بنا پر تمہارے بھائی بن سکتے ہیں۔

اور یہ رشتہ اخوت کسی ایک دور کے مومنین تک ہی محدود نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' یہ گزرے ہوئے زمانے کے مومنین تک کو بھی محیط ہے۔ چنانچہ قرآن نے ہر دور کے مسلمانوں سے کہا ہے کہ ان کی دعا یہ ہونی چاہئے کہ **ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان** (۵۹/۱۰) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی' جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزرے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر متشکل ہونے والی امت' کس طرح زمان اور مکان کے حدود سے ماوراء ہوتی ہے اور ان میں باہمی رشتہ قومیت ہی کا نہیں ہوتا' اس سے کہیں گہرا اخوت کا رشتہ ہوتا ہے۔

آپ یقیناً" حیران ہوں گے کہ قرآن کریم کی اس قدر واضح تعلیم کی موجودگی میں' وطنیت کو معیار قومیت قرار دینے والے "مسلمان" اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل کیا لاتے ہیں۔ وہ بھی سن لیجئے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ قرآن نے' ایمان کے اشتراک کی بناء پر امت بنائی ہے' قوم نہیں بنائی۔ ایمان کے اشتراک سے امت وجود میں آتی ہے اور وطن کے اشتراک سے قوم۔ تحریک پاکستان کے دوران' دو قومی نظریہ کے مخالف یہی دلیل لایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان' مذہب کی بنا پر ایک امت ہیں۔ لیکن ہندوستان میں بسنے کی بنا پر' وہ اور غیر مسلم' سب ایک (ہندوستانی) قوم کے افراد ہیں۔ اس دلیل کی بنا پر وہ کہا کرتے تھے کہ تمام دنیا کے مسلمان' مذہب کی بنا پر ایک امت ضرور ہیں' لیکن مختلف ملکوں کے باشندے ہونے کی بنا پر ان کی قومیتیں الگ الگ ہیں۔ اور امت اور قوم کی یہ تفریق درحقیقت مذہب اور دین کی تفریق پر مبنی ہے۔ مذہب میں واقعی یہ ہوتا ہے کہ ایک ملک کے باشندے اپنا الگ الگ مذہب رکھتے ہیں' لیکن قومیت ان سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن دین میں اس قسم کی ثنویت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ثنویت سیکولرازم کی پیدا کردہ ہے۔ دین میں امت اور قوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کے حامی مسلمانوں کی فریب خوردگی یا مغالطہ آفرینی کی وجہ یہ تھی کہ مغرب سے آمدہ نیشن (NATION) کے لفظ کا

ترجمہ قوم کیا گیا اور اس کے بعد کہا گیا کہ قرآن نے مسلمانوں کو جداگانہ امت قرار دیا ہے' جداگانہ قوم نہیں قرار دیا۔ مذہب کے اعتبار سے' وہ غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں۔ لیکن سیاسی نقطہ نگاہ سے' وہ اور غیر مسلم' مل کر ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ یہی وہ سیکولرازم یا ثنویت ...... (DUALITY) تھی جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ :

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کے ہاں (جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا) اور زمانہ نزول قرآن میں' قوم کے لفظ نے وہ سیاسی مفہوم اختیار نہیں کیا تھا جو عصر حاضر میں مغربی تصور قومیت کی رو سے' آجکل رائج ہے (وہ تو بلکہ قوم میں عورتوں کو بھی شامل نہیں کیا کرتے تھے) لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے اس مقصد کے لئے امت کا لفظ ہی نہیں قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ قرآن کریم میں ہدایت و رحمت ہے **لقوم یومنون** (۵۲/ ۷) ایمان لانے والی قوم کے لئے (دیگر کئی ایک مقامات پر بھی یہ الفاظ آئے ہیں)۔ اس کے برعکس' سورۂ یونس میں ہے کہ خدا کی آیات اور تنبیہات کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں **عن قوم لا یومنون** (۱۰/۱۰۱) اس قوم کو جو ایمان نہیں لاتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے مسلم اور غیر مسلم کے لئے قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ پھر' ان کے لئے دو الگ الگ اصطلاحات ہی استعمال نہیں کیں بلکہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان میں باہمی تعلقات کس قسم کے ہوں گے۔ غور سے دیکھئے۔ فرمایا:

لا تجدو قوما یومنون باللہ والیوم الاخر یوا دون من حاداللہ ورسولہ ولو کانوا اباء ھم اوابناء ھم او اخوانھم او عشیرتھم........(۵۸/۲۲)

تم کبھی ایسا نہیں دیکھو گے کہ جو قوم خدا اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے' وہ ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرے جو خدا اور رسول (یعنی اسلامی نظام) کی مخالفت کریں' خواہ وہ ان کے ماں باپ' اولاد' بھائی اور دیگر افراد خاندان ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ ہے ان دونوں قوموں میں اختلاف کی نوعیت! آپ محض اشتراک وطن کی بنا پر انہیں ایک قوم قرار دیتے ہیں اور قرآن کریم' ایمان کے اختلاف کی وجہ سے' باہمی رشتہ داریوں تک کے تعلقات بھی منقطع کر دیتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس کے بعد' ان دو متضاد نظریات زندگی کے حامل افراد' ایک قوم کے افراد بن سکتے ہیں؟ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے' ہر غیر مسلم "خدا و رسول" (اسلامی نظام) کا مخالف ہوتا ہے۔ کافر و مومن کا ایک قوم کے افراد قرار پانا تو ایک طرف' قوم مومنین کو دعا یہ سکھائی گئی ہے کہ **فانصرنا علی القوم الکافرین** (۲/۲۸۶) ہمیں قوم کافرین پر غلبہ و نصرت عطا فرما۔ سینہ میں اس قسم کی آرزوئیں رکھنے اور ان کا اس طرح اعلان کرنے والے' غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں ایک دلیل اور بھی دی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اگر ایک مومن سہواً" یا نادانستہ کسی مومن

کو قتل کر دے' تو اس کی دیت (خون بہا) دی جائے گی۔ قرآن نے اس خون بہا کی ادائیگی کا طریق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ **فان کان من قوم عدو لکم وھو مومن فتحریر رقبۃ مومنۃ وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق ....** (۴/۹۲) اگر مقتول مومن ہو لیکن اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہاری عداوت ہے، تو پھر دیت یوں دی جائے گی۔ اور اگر اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہارے معاندانہ تعلقات ہیں تو پھر اس طرح .... "۔ اس سے استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ دیکھئے قرآن اس کا امکان تسلیم کرتا ہے کہ ایک مومن' اس قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے جس کے ساتھ تمہارے دشمنی کے تعلقات ہوں یا میثاقی تعلقات۔ یہ قوم بہرحال غیر مسلموں کی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان' غیر مسلموں کی قوم کے افراد بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ دلیل' یونہی سمجھئے' جیسے کوئی شخص ہاتھی گزارنے کے لئے تنکوں کے پل بنائے۔ ایسا کہنے والے یہ قطعاً" بھول جاتے ہیں کہ وہ حالات کیا تھے جن میں قرآن نے ایسا کہا تھا؟ ابتدائے اسلام میں کیفیت یہ تھی کہ مختلف قبائل میں اکا دکا لوگ ایمان لے آتے تھے۔ وہ مسلمان تو ہو جاتے تھے لیکن رہتے تھے اپنے ہی قبیلہ میں۔ ان کے لئے ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا۔ خود مکہ کے مسلمان اسی مکہ میں اسی قوم قریش میں رہتے تھے' اور مدینہ کے مسلمان بھی مدینہ کی مخلوط آبادی کے افراد تھے۔ یہی کیفیت مختلف قبائل میں رہنے والے مسلمانوں کی تھی۔ مندرجہ بالا آیت میں دیت کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں' وہ ایسے ہی مسلمانوں کے متعلق ہیں۔

اس کے بعد جب ایک ایسا مقام میسر آگیا جہاں اسلامی مملکت کے قیام کے امکانات روشن تھے (یعنی مدینہ) تو مکہ کی جماعت ہجرت کر کے وہاں منتقل ہو گئی۔ جب وہاں اپنی آزاد مملکت قائم ہو گئی تو جہاں جہاں بھی مسلمان بستے تھے ان سے کہہ دیا کہ وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ ان میں بعض ایسے تھے جنہیں دشمنوں نے اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ وہ وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔ انہیں اس حکم سے مستثنے قرار دے کر کہا گیا کہ وہ انتظار کریں تاآنکہ ان کے وہاں سے منتقل کرانے کا انتظام کیا جا سکے۔ اس دوران میں ان کی ہر ممکن اعانت اور خبرگیری کا خیال رکھا جائے گا۔ یعنی یہ وہ لوگ تھے جو وہاں سے نکلنے کے لئے ہروقت مضطرب و بیقرار رہتے تھے' لیکن بامر مجبوری ایسا کر نہیں پا سکتے تھے (۲/۲۷۳ : ۴/۹۸)۔ اور یہی تھے جنہیں وہاں سے نکالنے کے لئے آخرالامر مملکت اسلامیہ کو جنگ کا حکم دیا گیا۔(۴/۷۵)

کچھ لوگ (مسلمان) ایسے بھی تھے جنہیں ہجرت کے امکانات حاصل تھے لیکن وہ وہاں سے آنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں آپ (عصر حاضر کی اصطلاح میں) "متحدہ قومیت" کے حامی کہہ سکتے ہیں' یعنی یہ "مذہب" کی حیثیت سے تو مسلمان رہنا چاہتے تھے لیکن اپنی قومی حیثیت وطنی یا نسلی رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے ان کے متعلق کیا کہا؟ یہ کہا کہ یہ لوگ منافق ہیں۔ چاہتے یہ ہیں کہ یہ جس طرح خود دعویٰ ایمان کے باوجود کافر کے کافر رہنا پسند کرتے ہیں' تمہیں بھی کافر بنا دیں۔ **فلا تتخذوا منھم اولیاء حتی یھاجروا فی سبیل اللہ** (۴/۸۹) انہیں کبھی اپنا دوست نہ سمجھو تاوقتیکہ یہ وہاں کے لوگوں سے قطع تعلق کر کے تمہارے ہاں نہ آجائیں۔ اور اگر یہ

یہاں آنے کے بعد، پھر اپنی سابقہ قومیت کی طرف پلٹنا چاہیں تو ان سے بھی اسی طرح جنگ کرو جس طرح دوسرے دشمنوں سے جنگ کی جاتی ہے (۴/۸۹)۔ اس سے ذرا آگے جا کر کہا کہ موت کے وقت ان لوگوں سے ملا ئکہ پوچھیں گے کہ تم ان لوگوں میں کیوں رہے، تو یہ جواب میں کہیں گے کہ ہم کیا کرتے۔ ہم مجبور تھے۔ جواب دیا جائے گا کہ تم مجبور کیوں تھے! خدا کی زمین وسیع تھی اور تمہیں نقل مکانی کے امکانات حاصل تھے۔ پھر یہ عذر کیسا؟ چنانچہ انہیں جہنم میں دھکیل دیا جائے گا (۴/۹۷)۔

ہم ان حضرات سے، جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو وہ اشتراک وطن کی بنا پر غیر مسلموں کی قوم کا فرد بن کر رہ سکتا ہے، یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس پر غور کریں کہ جن مسلمانوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، وہ مسلمان رہنا چاہتے تھے اور مسلمان رہنے میں انہیں کسی قسم کی دشواری بھی نہیں تھی۔ پھر وہ کونسی بات تھی جس کی بنا پر قرآن انہیں جہنمی قرار دے رہا ہے اور مسلمانوں سے کہہ رہا ہے کہ ان سے دوستانہ تعلقات ہرگز روانہ رکھیں، اور اگر وہ اپنی روش پر اصرار کریں تو ان سے جنگ بھی کریں۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ (ان حضرات کے تصور کے مطابق) امت اور قوم میں فرق کرتے تھے۔ وہ امت کے اعتبار سے مسلمان رہنا چاہتے تھے، لیکن قومیت کے لئے وطن یا نسل کو معیار قرار دیتے تھے۔ یہ وہ ثنویت تھی جس کی بنا پر قرآن انہیں مسلمان ہی تسلیم نہیں کرتا تھا۔

یہ ہے معیار قومیت کی اہمیت قرآن کی رو سے جسے آج کل محض ایک سیاسی مسئلہ تصور کر کے درخور اہمیت ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اب رہا یہ سوال کہ آجکل ساری دنیا کے مسلمانوں نے وطن یا نسل کو معیار قومیت قرار دے رکھا ہے۔ دین، معیار قومیت کہیں نہیں، تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے قرآن کا نہیں۔ تحریک پاکستان کا مقصود یہ تھا کہ آج جبکہ دنیا میں کہیں بھی اسلام کو معیار قومیت نہیں قرار دیا جا رہا' ایک مختصر سے خطہ زمین ہی میں سہی، ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کی بنیاد اسلام کے معیار قومیت پر ہو اور جس میں تمام فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کیے جا سکیں۔ مقصد یہ تھا کہ یہ مملکت اسلام کے احیاء کے لئے ذرۂ اولین (FIRST CRYSTAL) کا کام دے۔ جب اسلامی معیار قوی کو یہاں عملاً" نافذ کر دیا جائے تو پھر اس تجربہ کو آگے بڑھایا جائے اور رفتہ رفتہ دیگر اسلامی ممالک کو بھی اس راستے پر لایا جائے۔ منتہی اس اسکیم کا یہی تھا کہ پھر سے ساری دنیا کے مسلمان امت واحدہ (یعنی ایک قوم) کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔

لیکن وائے بد نصیبی کہ ہم نے ایک مملکت تو حاصل کر لی لیکن زندگی یہاں بھی قرآنی قالب میں نہ ڈھل سکی۔ ہمارے لبوں پر الفاظ تو دو قوی نظریہ کے رہے لیکن عملاً" معیار قومیت' وطن کا اشتراک ہی رہا۔ پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایمان کے اختلاف و افتراق کی بنا پر دو قومیں نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک ہی قوم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ حالت ان کی ہے جو (زبان سے ہی سہی' بہرحال) دو قوی نظریہ کے مدعی ہیں۔ جو لوگ تقسیم سے پہلے وطن کے اشتراک کی بنا پر قومیت کے قائل تھے' یہاں آکر ان کا "کفر" پہلے سے بھی زیادہ متشدد اور اجدر ہو گیا ہے یعنی وہاں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتے تھے' لیکن یہاں خود مسلمانوں کو چار قومیتوں

میں تقسیم کر رہے ہیں! یا للعجب۔ یعنی ہندوستان میں وطن کے اشتراک کی بنا پر، مسلم اور غیر مسلم ایک قوم، اور یہاں اسی اشتراک وطن کے باوجود، خود مسلمانوں کی چار قومیتیں! اور اس پر اصرار یہ کہ یہ عین مطابق اسلام ہے۔ مطابق اسلام تو ایک طرف، یہ تو خود ان کے نظریہ قومیت کے بھی مطابق نہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ایک ملک کے باشندے ایک قوم تو قرار پاتے ہیں۔ اپنی اس روش (چار قومیتوں) کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام مسلمانوں کو امت واحدہ قرار دیتا ہے، واحد قوم نہیں قرار دیتا۔ مسلمان خواہ چار چھوڑ، چار سو قوموں میں بھی منقسم ہو جائیں، ان کی امت کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ ہم سمجھ نہیں سکے کہ یہ "امت کی وحدت" ہے کیا بلا جو اختلاف قومیت کے باوجود بدستور قائم رہتی ہے اور اس کا عملی ماحصل کیا ہے؟ قرآن نے کہا تھا کہ اگر ایک مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً" قتل کر دے تو وہ سیدھا جہنم میں چلا جاتا ہے۔ یہ تھا وحدت امت کا عملی نتیجہ۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کا بلا دریغ قتل عام کرتے ہیں، بلکہ ایک ہی ملک کے مسلمان، نسلی، صوبائی، لسانی حتیٰ کہ سیاسی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، اور اس کے باوجود ان کے امت واحدہ ہونے کے "عقیدہ" پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یاد رکھیئے! آج کی اصطلاح میں جو مفہوم لفظ قوم (نیشن) کا ہے قرآنی اصطلاح میں وہی مفہوم لفظ امت کا ہے جب اسے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا جائے۔ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک امت (یعنی ایک قوم) قرار دیتا ہے اور جغرافیائی یا نسلی اور لسانی اختلافات ان کے ایک قوم ہونے کے راستے میں حائل نہیں ہوتے۔ اس اعتبار سے امت اور قوم میں فرق کرنا خلاف اسلام ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں مسلمان مختلف ممالک میں آباد تھے۔ ان کی نسلیں بھی الگ الگ تھیں اور زبانیں بھی جدا جدا۔ حتیٰ کہ ان کا "کلچر" بھی ایک دوسرے سے الگ تھا۔ لیکن اس کے باوجود، وہ سب ایک قوم (امت) کے افراد تھے۔ ان کی قومیتیں مختلف نہیں تھیں۔ جو حضرات آج کل جغرافیائی یا نسلی، لسانی یا صوبائی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کو الگ الگ قومیں قرار دیتے ہیں، انہیں اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن ان کی خدمت میں اتنا تو عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اندر اتنی اخلاقی جرات پیدا کریں کہ اپنے اس تصور یا عمل کے متعلق اعتراف کریں کہ یہ خلاف اسلام ہے۔ کسی نظریہ یا عمل کے خلاف یا مطابق اسلام ہونے کے لئے کوئی خارجی معیار ہونا چاہیے اور مسلمانوں کے لئے وہ معیار کتاب اللہ کے سوا اور کونسا ہو سکتا ہے۔ کتاب اللہ کی رو سے ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کی قوم میں کوئی غیر مسلم شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کے مسلمات میں سے ہے۔

(جولائی ۱۹۷۳ء)

۲۲۔ سیکولر نظام کسے کہتے ہیں؟

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں سیکولر حکومت کی اصطلاح عام ہو رہی ہے لیکن اس کا کوئی متعین

مفہوم سامنے نہیں آتا۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ اس کا ترجمہ عام طور پر لادینی حکومت کیا جاتا ہے۔ لیکن سیکولرازم کے حامی کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ سیکولر حکومت میں خدا یا مذہب کا انکار نہیں ہوتا۔

کیا آپ بتائیں گے کہ سیکولر حکومت سے کیا مراد ہے اور دینی حکومت سے کس طرح مختلف ہوتی ہے؟

طلوعِ اسلام

قرآنی نقطہ نگاہ سے ایک مملکت وہ ہے جس میں جملہ کاروبار حکومت' خدا کی کتاب کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔ یہ وہ نظام حکومت تھا جسے قائم کرنے کے لئے حضورؐ نبی اکرمؐ سے ان الفاظ میں کہا گیا تھا کہ **فاحکم بینهم بما انزل الله** (۵/۴۸) ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرو۔ اس نظام میں انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی کتاب اللہ کی حدود سے باہر نہیں رہتا۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہوتی ہے۔ اسے اسلام کے عقیدۂ توحید پر مبنی دینی ریاست کہا جاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے یہ تھیاکریسی سے بھی مختلف ہوتی ہے۔

(۲) دوسرا نظام حکومت وہ ہے جس میں کتاب اللہ تو ایک طرف' خدا کا نام تک بھی نہیں آنے پاتا۔ یہ کافرانہ نظام ہوتا ہے جس کے متعلق کہا کہ **ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الکافرون** (۵/۴۴) جو ماانزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ اشتراکی حکومتوں کا یہی نہج ہوتا ہے کیونکہ مارکس کے فلسفہ کی بنیاد خدا کے انکار پر ہے (اگرچہ سروست وہ' بنا بر مصلحت' مسلمانوں کو نماز' روزہ وغیرہ کی اجازت دے دیتے ہیں)۔ اسے سیکولر حکومت کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ اس کی ایک قسم ہے۔ اس کی دوسری قسم کا ذکر آگے آتا ہے۔

(۳) تیسری قسم کا نظام حکومت وہ ہے جس میں مذہب پرست لوگوں کو اعتقادات' عبادات اور پرسنل لاز اپنی مرضی سے اختیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے' لیکن امور مملکت میں مذہب کو دخیل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اسے مذہب اور سیاست کی ثنویت (DUALISM) کہا جاتا ہے۔ قرآن اسے مشرکانہ انداز حکومت قرار دیتا ہے' یعنی زندگی کے ایک دائرہ میں خدا کو ماننا اور دوسرے دائرہ (سیاست) میں انسانوں کو صاحب اختیار (AUTHORITIES) تسلیم کرنا۔ سورۂ زمر میں ہے۔

> **واذا ذکر الله وحدہ اشمازت قلوب الذین لا یومنون بالاخرۃ واذا ذکر الذین من دونه اذا هم یستبشرون** ○ (۳۹/۴۵)
>
> جب ان سے خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے (یعنی کہا جاتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں صرف خدا کے احکام کا اتباع کرو) تو جو لوگ آخرت کے منکر ہیں' انہیں یہ بات بے حد ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن جب خدا کے علاوہ اوروں کو بھی ساتھ شامل کر لیا جاتا ہے تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

یہ ہے توحید کے مقابلہ میں ثنویت کا شرک۔ مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہا گیا کہ تم ایسا نہ کرنا۔ تمہارا دعویٰ یہی ہونا

چاہیے کہ:

قل اللهم فاطر السموت والارض علم الغيب والشهادة انت تحكم بين عبادك في ما كانوا فيه يختلفون (۳۹/۴۶)

اے اللہ! تو فاطر ارض و سما ہے' عالم الغیب والشہادۃ ہے اور تجھے اور صرف تجھے یہ حق اور اختیار حاصل ہے کہ جن امور میں انسان اختلاف کریں' ان میں فیصلہ کرے۔

ثنویت کا نظام جسے قرآن نے مشرکانہ انداز حکومت کہا ہے' آجکل کی جمہوریت میں رائج ہے۔ وہ اسے سیکولر کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ سیکولر نظام دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس میں خدا کا نام تک نہیں آنے پاتا اور دوسرا وہ جس میں مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے' لیکن کاروبار مملکت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق طے پاتا ہے۔ اس دائرہ میں خدا کو دخیل نہیں ہونے دیا جاتا۔ قرآن کریم کی رو سے سیکولر نظام دونوں قسم کے باطل ہیں' یعنی کافرانہ بھی اور مشرکانہ بھی۔ لیکن چونکہ شرک کو بھی سنگین ترین جرم (ظلم عظیم ۳۱/۱۳) قرار دیتا ہے' اس لئے وہ سیکولر نظام جس میں صرف "مذہبی" آزادی ہوتی ہے اس کے نزدیک سب سے زیادہ مردود قرار پاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ کافرانہ سیکولر نظام میں مسلمانوں کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا لیکن مشرکانہ سیکولر نظام میں مسلمانوں کو مطمئن کرا دیا جاتا ہے کہ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے اور یہی اسلام کا تقاضا ہے۔ یہی وہ فریب خوردگی یا فریب آفرینی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے کہ:

افتومنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض (۲/۸۵)

کیا تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم کتاب کے ایک حصہ (اعتقادات' عبادات' شخصی قوانین) پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ (متعلقہ امور مملکت) سے انکار کرتے ہو۔

فما جزاء من يفعل ذالك منكم الا خزى في الحيوة الدنيا ويوم القيمته يردون الى اشد العذاب وما الله بغافل عما تعملون (۲/۸۵) *

یاد رکھو! تم میں سے جو ایسا کرے گا' تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت میں بھی شدید ترین عذاب میں مبتلا۔ خدا تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔

یہ ہے وہ نظام ہے جس میں مسلمانوں کی حالت وہ ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:

وما يومن اكثر هم بالله الا وهم مشركون (۱۲/۱۰۶)

وہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود مشرک رہتے ہیں۔

یہ ہے وہ سیکولر نظام جسے ہندوستان میں ہندو قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس' تحریک پاکستان کا مطالبہ دینی نظام کے

قیام کے لئے جداگانہ مملکت کا تھا۔ ہمارے نیشنلسٹ علماء کرام وہاں' ہندو کی تائید و حمایت کرتے تھے اور تحریک پاکستان کی مخالفت۔ یہی حالت دوسرے قومیت پرست مسلمانوں کے لیڈروں کی تھی' یعنی یہ سب سیکولر نظام کے داعی تھے۔ یہی وہ لیڈر ہیں جو پاکستان میں بھی سیکولر نظام کے لئے کوشاں ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن اسی نظام کا حامی تھا جس کے لئے اس نے پاکستان سے علحدگی اختیار کرلی۔ اب بقیہ حصہ ملک میں بھی ایسی سیاسی جماعتیں ہیں' جن کے منشور میں سیکولر نظام کے قیام کا مطالبہ شامل ہے۔ اور اس دور کے نیشنلسٹ علماء (جو یہاں آگئے ہیں) یا ان کے متبعین اور عقیدت مند' ان کی تائید کرتے ہیں۔ جو مذہب پرست بظاہر سیکولر نظام کے مخالف ہیں اور اقامت دین کی تحریک کے مدعی' یہاں تھیاکرٹیک نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں نظام حکومت مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ماانزل اللہ کے مطابق قیام حکومت ان میں سے کسی کا بھی مطالبہ یا نصب العین نہیں۔ جہاں تک مملکت پاکستان کا تعلق ہے' اس نے نظری اور آئینی طور پر تو اپنے دینی ہونے کا اعلان کر رکھا ہے'لیکن عملاً" یہاں بھی ہنوز سیکولر نظام ہی رائج ہے۔ پاکستان تو ایک طرف' کتاب اللہ کی حکومت اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں ؎

مغرب ز تو بیگانہ' مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم' نقش دگر انگیزی

(ستمبر ۱۹۷۴ء)

۲۳۔ مسجد اقصیٰ سے کونسی مسجد مراد ہے

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے:۔

سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الا قصی...... (۱/۱۷)

اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کو لے گئی۔

اس آیت میں مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق واقعہ معراج سے ہے جب حضورؐ پہلے مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے آسمانوں کی سیر فرمائی۔

میں نے مفہوم القرآن میں لکھا کہ یہ درحقیقت واقعہ ہجرت کا بیان ہے اور اس میں مسجد اقصیٰ سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس پر (حسب عادت) شور مچا دیا گیا اور اس کے خلاف دلیل یہ دی گئی کہ یہ بالکل نئی بات ہے۔ اس سے پہلے کسی نے ایسا نہیں کہا۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے' متقدمین میں سے (غالباً") کسی نے ایسا نہیں کہا تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ

دلیل ہی بے معنی ہے۔ صحیح بات صحیح ہے خواہ وہ پہلی مرتبہ ہی کیوں نہ کہی گئی ہو۔ اور غلط بات غلط ہے' خواہ اسے ہزار بار ہی کیوں نہ دہرایا گیا ہو (میں نے اس کے بعد اپنی کتاب "شاہکار رسالت" میں موجودہ مسجد اقصیٰ کی تاریخ بھی بیان کر دی تھی)۔

اگلے دنوں ایک صاحب کی وساطت سے مجھے مولانا عنایت اللہ اثری (وزیر آبادی - ثم گجراتی) کی کتاب "حصول تیسیر البیان (علیٰ) اصول تفسیر القرآن' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر (حیرت اور) خوشی ہوئی کہ اس میں انہوں نے اس آیت میں مسجد اقصیٰ کا وہی مفہوم لیا ہے جسے میں نے مفہوم القرآن میں لکھا تھا۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مجھے مولانا صاحب سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اس کا مجھے علم ہے کہ وہ فرقہ اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم ہیں۔ ایک اہل حدیث عالم کی طرف سے اس آیت کا وہ مفہوم جو روایاتی مفہوم سے ہٹا ہوا ہو' واقعی باعث تعجب (اور چونکہ وہ مفہوم میرے نزدیک قرآن کے منشا کے مطابق ہے' اس لئے وجہ حیرت) ہے۔ مولانا صاحب اگر بقید حیات ۱۰؎ ہوں (خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور خدا ان کی عمر دراز کرے) تو وہ میری طرف سے اس تحقیق اور حق گوئی کی جرات پر ہدیہ تبریک قبول فرمائیں۔ ان کی تحقیق کے ضروری مقامات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

حصول تیسیرالبیان (علیٰ) اصول تفسیرالقرآن

(از مولانا عنایت اللہ اثری' وزیر آبادی' گجرات' شائع کردہ اپریل ۱۹۵۵ء)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ **سبحان الذی اسری بعبدہ .... عبد شکورا** (بنی اسرائیل ۱۷)

اللہ رحمٰن و رحیم کا نام لے کر پڑھو۔ چرچا کرو (اور) وعدہ خلافیوں اور غلط پیش گوئیوں سے اسے خوب پاک اور صاف بیان کرو تاکہ وہ اپنے بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجد حرام سے (جو کہ اس کی جائے سکونت ہے) اس مسجد کی طرف کسی نہ کسی رات روانہ کر دے گا جو کہ یہاں سے بہت دور ہے اور کہ تبلیغ و اشاعت کی وجہ سے اس کے اردگرد بہت سے سعید الفطرت لوگ مسلمان ہو کر اسلامی انوار و برکات سے متمتع ہو رہے ہیں اور حلقہ اسلام دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اس لئے وہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے کہ اس کے توسط سے اب تک ہماری وہ آیتیں جو کہ پیشگوئیوں سے متعلق شائع ہوتی رہی ہیں کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور اس کے مخالف سب ناکام ہوں گے' ہم انہیں صاف طور پر پورا کر کے دکھا دیں اور مخالفوں کی طرف سے جو یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ فلاں فلاں پیش گوئی پوری نہیں ہوئی' اسے اللہ پاک سنتا رہا ہے اور جو کسی پیش گوئی کے خلاف انہوں نے قدم اٹھایا تاکہ وہ پوری نہ ہو سکے' اسے اللہ دیکھتا رہا۔ اب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا ہے تو اسے یہاں سے کسی دوسری جگہ روانہ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح پر موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے توسط سے بھی ہم نے فرعونی ناکامی اور موسوی کامیابی کی بابت بھی بہت سی پیش گوئیاں شائع فرمائیں جن کا ذکر اسی سورۃ میں آگے چل کر آ رہا ہے۔ جب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا تو اسے

۱۰؎ وہ بحمد للہ زندہ ہیں (۱۹۸۶ء)۔

مصر چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑا جہاں پر اسرائیلیوں کو ہماری دی ہوئی کتاب پر آزادانہ طور پر عمل کا موقع ہاتھ آیا کہ وہ اللہ پاک کے سوا کسی دوسرے کی طرف مائل نہ ہوں۔ قبل ازیں اسی طرح پر نوح علیہ الصلوۃ والسلام کی پیش گوئیاں بھی کہ وہ اور ان کے اعوان و انصار کامیاب اور دشمن سب ناکام ہوں گے، پوری ہوئیں کہ انہیں کشتی میں بٹھا کر بچایا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ پھر بعد میں بچے ہوئے لوگوں کا سلسلہ نسل چلا۔ اور آج ہم تمہیں اس بندۂ شکر گزار کی سنت پر دعوت دے کر شکر گزاری کے لئے خطاب کر رہے ہیں (صفحہ ۱۱۱۔ ۱۱۳)۔ ابتدائی آیت کریمہ پر کتب تفاسیر میں عموماً" اس اسراء نبویؐ کو بیان کیا گیا ہے جس کا موضوع اور صحیح حدیثوں میں بتصریح ذکر ہے اور بعض ائمہ صحاح نے بھی اس آیت کریمہ کو عنوان بنا کر ان حدیثوں کو بیان فرمایا ہے مگر متون حدیث میں آیت کریمہ کا کوئی ذکر نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسراء بیان فرماتے ہوئے اس آیت کریمہ کا ذکر فرمایا اور کسی روایت میں اس آیت کریمہ کا وہ شان نزول بھی مروی نہیں جس کا اسراء کی حدیثوں میں ذکر ہے اور جو کتب زرائد میں قتادہ اور زر بن جیش سے مقطوعاً" اور عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہ سے موقوفاً" اور ابو سعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ سے مرفوعاً" اسی آیت کریمہ کا ذکر مروی ہے تو وہ محدثانہ طریق پر سخت مخدوش ہونے پر بھی مسترد نہیں کہ وہ قرآنی لفظوں کے اطلاق اور تناسب پر محمول ہے۔ علاوہ اس کے اسراء کی جن حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہاب کا ذکر ہے، ان میں آپ کے ایاب کی بھی تصریح ہے مگر آیت کریمہ میں جس اسراء کا ذکر ہے اس میں واپسی کا کوئی ذکر کیا، اشارہ تک بھی نہیں (صفحہ ۱۱۴)۔

(سورۂ الانفال میں جو عدوۃ الدنیا اور عدوۃ القصویٰ کا ذکر آیا ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ) بدا کہ سے قصویٰ ہوا اور جب یہ قصویٰ ہے تو مدینہ بالاولیٰ قصویٰ ۱۱ ٹھہرا اور اس کی مسجد (نبوی) اقصیٰ ہوئی۔ بلکہ وفاء الوفا جلد نمبر ۱ صفحہ ۱۶ میں مطالع وغیرہ کا حوالہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے ناموں میں سے ایک نام اس کا اقصیٰ بھی ہے (ص ۱۲۱)۔ صحیح بخاری (پارہ ۱۵ صفحہ ۴۷۶) میں ہے کہ مسجد نبویؐ جس جگہ تعمیر ہوئی اس جگہ پر آپ کی تشریف آوری سے پہلے مسلمان اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور فتح الباری (پارہ ۱۵ صفحہ ۴۷۷) میں ابن سعد سے منقول ہے کہ رسول ۱۲ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ پر اسعد نماز پڑھایا کرتے تھے۔ اور وفاء الوفاء (جلد ۱، صفحہ ۲۴۲) میں بحوالہ ابن اسحٰق منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبویؐ کی جگہ میں اسعد بن زرارہ پنج وقتہ نماز پڑھتے اور پڑھایا کرتے تھے بلکہ جمعہ بھی وہی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ بھی وہاں پر ہی نماز پڑھتے پڑھاتے رہے۔ پھر اس کے بعد اسعد کی کوششوں سے آپ نے وہاں پر مسجد تعمیر فرمائی جو کہ آج تک مسجد نبوی کے نام سے موسوم

۱۱۔ (حاشیہ از مصنف) یہ عجیب بات ہے کہ جس اونٹنی پر سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت طے فرمایا وہ مدینہ طیبہ پہنچ کر مسجد نبویؐ کی جگہ میں بحکم خداوندی بیٹھ گئی اور اس کا نام قصویٰ (قصواء) قرار پایا۔ (زاد المعاد۔ عمدۃ القاری۔ وفاء الوفاء)۔ (اسی قصویٰ پر حضورؐ نے بڑے بڑے اہم سفر طے فرمائے)۔

۱۲۔ ان مقامات پر اردو ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ عربی عبارات حذف کردی گئی ہیں۔ (طلوع اسلام)

ہے۔ اور جہاں پر مسجد قبا تعمیر ہوئی' وہاں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے پنج وقتہ نماز بلکہ جمعہ بھی پڑھا پڑھایا جاتا تھا اور امام سالم تھے اور خطیب مصعب تھے...... فتح الباری (پارہ ۱۵ صفحہ ۴۷۶) میں بحوالہ ابن ابی شیبہ جابرؓ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے جہاں جہاں پر تبلیغ و اشاعت سے اسلام پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے وہاں پر مسجد بنا کر نماز شروع کر دی گئی (صفحہ ۴۲-۱۲۲)۔

(اس کے بعد محترم مصنف نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جو آیا ہے **ولید خلوا المسجد کما دخلوہ اول مرۃ** (۱۷/۷) تو اس المسجد سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے بدلائل و براہین واضح کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مسجد اقصیٰ نہیں جس کا ذکر آیت اسریٰ میں آیا ہے۔ جس مسجد کا ذکر آیتہ اسریٰ میں آیا ہے اس سے مراد مدینہ طیبہ ہی ہے۔ بیت المقدس والی مسجد کا نام مسجد اقصیٰ بعد میں رکھا گیا تھا (صفحہ ۲۴۴ - ۱۲۵) -

---

مولانا صاحب نے اپنے مقالہ میں اسریٰ کا ترجمہ "لے گیا" کے بجائے "لے جائے گا" (روانہ کر دے گا) کیا ہے' یعنی ماضی کے بجائے مستقبل ---- اس کی تائید میں بھی انہوں نے دلائل دیئے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے۔

(پرویز)

(جنوری ۱۹۷۵ء)

۲۴۔ حج بدل کی حیثیت

ہم سے پوچھا گیا ہے کہ حج بدل کی حیثیت کیا ہے اور اگر اسے کسی فوت شدہ کی طرف سے ادا کیا جائے تو کیا اسے اس سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے؟

طلوع اسلام

حج بدل کا قرآن کریم سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ ہمارے ہاں کے مروجہ عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے۔ باقی رہا مردہ کو اس سے کچھ فائدہ' تو حج بدل ہی نہیں' جو کچھ بھی مردے کے لئے ہمارے ہاں کیا جاتا ہے اس سے اسے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اسے فائدہ انہی اعمال سے ہوتا ہے جو اس نے خود کئے ہوں۔ **لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ** (۶/۱۶۵) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ خدا کے قانون مکافات کا واضح اور اٹل فیصلہ ہے۔

(جون ۱۹۷۵ء)

(اس کی تفصیلی تشریح باب ہفتم میں آچکی ہے)

۲۵- نفلی حج یعنی دوسرے حج کی شرعی حیثیت

سال رواں کے لئے حج کی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے' وزیر امور مذہبیہ' محترم کوثر نیازی صاحب نے بتایا کہ اس بار نفلی حج کی اجازت نہیں دی جائے گی- یہ اقدام زرمبادلہ کی بچت کے پیش نظر کیا جا رہا ہے-

(نوائے وقت' بابت ۷۶-۷-۱۹)

تمہیداً" یہ وضاحت ضروری ہے کہ مروجہ احکام شریعت کی رو سے' پہلی بار کا حج "فرض" قرار دیا جاتا ہے' اور اس کے بعد کا حج "نفلی" ——— نیازی صاحب نے نفلی حج پر پابندی کی وجہ "زرمبادلہ کی بچت" بیان کی ہے- لیکن اسلامی ممالک کے بعض علماء کے نزدیک ایسی پابندی شرعاً" ضروری ہے- یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس موضوع پر ہمیں کچھ عرصہ پہلے محترم پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا تھا- موقع کی مناسبت کے لحاظ سے اسے درج ذیل کیا جاتا ہے-

طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۷۵ء میں راقم نے علمائے الجزائر کا ایک فتویٰ پیش کیا تھا جس میں یہ فیصلہ درج تھا کہ حج کے دنوں میں چونکہ سخت اژدھام ہوتا ہے اور قربانی کرنے والے کو اپنے قربانی کے جانور کا علم تک نہیں ہوتا اور پھر اس کا گوشت عام طور پر ضائع ہو جاتا ہے' اس لئے اگر قربانی کے جانور کے بجائے اس کی قیمت خیرات میں دے دی جائے تو جائز ہے- یہ فتویٰ دراصل وہاں کے مشہور عالم دین علامہ بشیر الابراہیمی مرحوم نے دیا تھا جس کی تصدیق بعد میں الجزائر کے علماء کی مجلس نے کر دی- الجزائر والے حجاج اپنے علماء کے اس فتویٰ پر کئی سالوں سے عمل کر رہے ہیں- ظاہر ہے کہ اس کا اثر دوسرے حجاج پر بھی پڑنا تھا- چنانچہ جب اس فتویٰ کا دائرہ اثر پھیلنا شروع ہوا' تو رابطۃ العالم الاسلامی' مکۃ المکرمہ' نے اس کا نوٹس لیا اور اپنے سترہویں سالانہ اجلاس میں علمائے الجزائر کے مذکورہ بالا فتویٰ کو رد کر دیا- ہمارے ہاں علمائے الجزائر کا فتویٰ طلوع اسلام کے سوا کہیں شائع نہیں ہوا- لیکن رابطۃ العالم الاسلامی نے اس کی جو تردید کی تو اس کی خوب خوب پبلسٹی کی گئی اور ہمارے ملک کا شاید ہی کوئی اخبار یا رسالہ ایسا ہو جس نے اسے نقل نہ کیا ہو- وجہ اس کی ظاہر ہے-

حج کے بارے میں علمائے الجزائر نے مذکورہ بالا مسئلے کے بارے ہی میں فتویٰ نہیں دیا تھا' اس کے ساتھ ایک دوسرا مسئلہ بھی تھا اور وہ نفلی حج کی شرعی حیثیت کے بارے میں تھا کہ موجودہ حالات میں اس کا ادا کرنا کہاں تک جائز ہے- کیونکہ فرض حج ادا کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ آسانی اور سہولت سے یہ فریضہ ادا نہیں کر سکتے' تو نفلی حج میں شمولیت' فرض حج والوں کے لئے رکاوٹ ثابت ہوتی ہے- بلکہ بعض اوقات تو ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ نفلی حج والے تو کئی کئی حج ادا کر لیتے ہیں اور فرض ادا کرنے والوں کو اپنا فریضہ ادا کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا-

بنا بریں' جس طرح قربانی کے جانور کے بارے میں علمائے الجزائر نے یہ فتویٰ دیا کہ اس کی قیمت خیرات میں دے

دینا جائز ہے' اسی طرح نفلی حج کے بارے میں بھی انہوں نے یہ رائے دی کہ اس پر ہونے والے اخراجات نیکی کے دوسرے کاموں پر خرچ کر دیئے جائیں تو وہ نفلی حج سے افضل ہے۔ اتفاق سے انہی دنوں میں بھی الجزائر میں تھا۔ ہم جمعہ کی نماز کے لئے الجزائر کی مشہور تاریخی مسجد کتشاوہ میں جمع تھے۔ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چنانچہ ایک صاحب علم نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے نفلی حج کے سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ فرض نماز ادا کرنے والوں سے اس طرح بھری ہوئی مسجد میں کوئی "نیک بخت" زبردستی گھس کر نفل نماز ادا کرنا چاہے یا کسی فرض نماز پڑھنے والے کو نکال کر اس کی جگہ پر نفل نماز ادا کرے' تو اس بارے میں شریعت اسلامی کا یہی فیصلہ ہوگا کہ ایسا کرنے سے یہ شخص گناہ کا مرتکب ہوگا -------- سرمایہ دار حضرات اس سلسلے میں یہی کچھ کر رہے ہیں اور علماء حضرات نے انہیں کبھی اس زیادتی پر ٹوکا نہیں۔ یہ حضرات اپنے زائد سرمائے کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کو ان کے فرض سے روکنے کا موجب بن رہے ہیں' جو بہرحال نیکی شمار نہیں ہوگی۔ اس کے بجائے اگر وہ نفلی حج پر خرچ ہونے والی یہی رقم اللہ کی راہ میں نیکی کے دوسرے کاموں پر خرچ کریں تو عنداللہ ماجور ہوں گا۔

رابطۃ العالم الاسلامی نے اس فیصلے کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار اسی قرار داد (نمبر ۲۳) میں کیا جس میں اس نے قربانی کے متعلق الجزائر کے موقف کو مسترد کیا تھا۔ قرار داد کی جز (ب) میں قربانی کے بارے میں یہ فیصلہ تھا اور اس سے چند سطور آگے' بلکہ بالکل متصلاً" جز (ج) میں نفلی حج کے بارے میں علمائے الجزائر کے مذکورہ بالا فیصلے کی تائید کی گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسی مصلحتیں تھیں کہ ہمارے علماء حضرات نے آدھی بات (یعنی قربانی کے متعلق) نقل کر کے اس کے دوسرے حصلہ پر پردہ ڈال دیا۔ اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ (عربی عبارت حذف کر کے ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔

> (ترجمہ) حج ان ارکان اسلام میں سے ہے جو ساری عمر میں صرف ایک دفعہ فرض ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو زائد حج ادا کیا جائے گا وہ نفل شمار ہوگا۔ نیکی اور تقرب الٰہی کے حصول کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں اور یہ نیکیاں صرف حج یا عمرہ ادا کرنے تک محدود نہیں۔ جس نے ایک دفعہ یہ فرض پورا کر لیا یا اس کے بعد نفلی حج بھی ادا کیا ہے' اگر وہ آئندہ اس نیت سے مزید نفلی حج پر جانے سے باز رہے گا کہ اس کے ان مسلمان بھائیوں کو موقع مل سکے جنہوں نے ابھی تک اصل فریضہ ادا نہیں کیا اور اس کے نہ جانے سے وہ سہولت اور آسانی سے یہ عبادت سرانجام دے سکیں' تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو بہت بڑا اجر دے گا۔

آپ نے دیکھا کہ علمائے الجزائر اور رابطۃ العالم الاسلامی کے فیصلوں کا نتیجہ ایک ہی ہے' صرف الفاظ کا معمولی سا فرق ہے۔ علمائے الجزائر کے نزدیک فرض عبادت میں نفل عبادت کے ذریعے خلل ڈالنے والا گنہگار ہوگا۔ رابطہ والوں نے بھی یہی بات کہی ہے لیکن الفاظ ذرا نرم استعمال کئے ہیں' کہ اگر نفلی حج والا فرض حج والوں کی سہولت و آسانی کے لئے

اس نفلی عبادت سے باز رہے، تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے اجر عظیم ملے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس اجر عظیم کو چھوڑ کر نفلی حج پر اصرار کرے گا تو وہ ضرور گنہگار ہوگا۔

---------------○---------------

نفلی حج کے متعلق آپ نے ارباب شریعت کا فیصلہ ملاحظہ فرمالیا۔ ہم وزارت امور مذہبیہ سے گزارش کریں گے کہ انہوں نے نفلی حج پر جو پابندی محض زرمبادلہ میں بچت کے لئے عائد کی ہے' اسے اس شرعی فیصلہ کی رو سے عائد کریں۔ یہ پابندی "مستقلاً" ہوگی' ہنگامی نہیں ہوگی اور قوم کے بیشتر اجتماعی مفاد کا موجب۔

واضح رہے کہ دین کے نظام میں تو حج کی حیثیت اور اہمیت ہی کچھ اور ہے۔ لیکن اس وقت حج ایک "مذہبی فریضہ" کے طور پر ادا کیا جاتا ہے' اس لئے ہماری اگلی گفتگو کا تعلق اسی سے ہے۔

(دسمبر ۱۹۷۶ء)

---------------○---------------

۲۶۔ فطرانہ کی شرح کیا ہے؟

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ معلوم کروں کہ شریعت کی رو سے امسال ہمیں فطرانہ کے پیسے کتنے دینے چاہئیں۔ اتفاق سے میں نے اخبار میں ایک خبر دیکھی جس کا عنوان تھا "فطرے کی رقم"۔ خوش ہوا کہ سوال کا جواب گھر بیٹھے مل گیا۔ لیکن اس کے نیچے جو کچھ لکھا ہوا ملا وہ یہ تھا۔

"فطرے کی رقم"

فطرہ نماز عید الفطر سے پہلے ادا کرنا چاہئے۔ فطرے کی رقم اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق سوا دو سیر گندم کی قیمت کے برابر ہونی چاہیے' جس کا اندازہ ایک روپیہ ۲۵ پیسہ لگایا گیا ہے۔ اہل حدیث کے عقیدے کے مطابق پونے تین سیر گندم کی قیمت کے برابر فطرہ ادا کرنا چاہئے۔ رقم کے متعلق اہل حدیث علماء نے یہ مشورہ دیا ہے کہ جس قیمت پر گندم آپ خرید کرتے ہوں اسی حساب سے پونے تین سیر گندم کی قیمت ادا کریں۔ ناظم جمعیت اہل حدیث مولانا ابوبکر غزنوی نے مشورہ دیا ہے کہ احتیاطاً" ڈیڑھ روپیہ فی کس ادا کیا جائے۔ شیعہ علماء نے فطرے کی رقم دو روپے مقرر کی ہے۔

یعنی اہل سنت کا حکم یہ ہے کہ فطرے کی رقم سوا روپیہ ہے۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں! یہ رقم (اہل حدیث کی شریعت کے مطابق) ڈیڑھ روپیہ ہے اور شیعہ حضرات کے فیصلے کے مطابق دو روپے فی کس ----- میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ ہمارے مذہبی پیشوا حضرات ایسی چھوٹی سی بات پر بھی متفق فیصلہ نہیں دے سکتے۔ کیا یہ کسی بات پر متفق ہوتے بھی ہیں؟

طلوع اسلام

آپ تو ایک فطرے کی رقم پر اختلاف کو دیکھ کر ہی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ آپ نگاہ کو ذرا دور لے جاتے تو دیکھتے کہ وہاں کیا کیا نظر آتا ہے۔ روزہ کس وقت کھولنا چاہئے' اس میں اختلاف۔ تراویح کی رکعت کتنی ہیں' اس میں اختلاف۔ عید کی نماز کا وقت کونسا ہے' اس میں اختلاف۔ نماز عید مساجد میں پڑھنی چاہئے یا کھلے میدان میں' اس میں اختلاف۔ نماز عید کی زائد تکبیریں کتنی ہوتی ہیں' اس میں اختلاف۔ ہاتھ باندھنے میں اختلاف' آمین کہنے میں اختلاف۔ غرضیکہ قدم قدم پر اختلاف۔ کوئی جزئی سا معاملہ بھی ایسا نہیں جس میں یہ حضرات متفق ہوں۔ ہاں ! ایک بات ضرور ایسی ہے جس میں یہ متفق ہو جاتے ہیں اور وہ ہے اس شخص کے خلاف کفر کا فتویٰ لگانا جو ان اختلافات کو مٹانے کے لئے انہیں قرآن کی طرف دعوت دے۔ اور یہ اس لئے کہ اگر یہ اختلافات مٹ جائیں تو ان کی مختلف دکانیں کس طرح سے چلیں؟ آپ ذرا اس کھلی ہوئی حقیقت پر غور کریں' بات واضح ہو جائے گی۔ ایک محلہ میں ایک مسجد موجود ہے اور وہ اتنی وسیع ہے کہ اس میں محلے کے سب نمازی سما سکتے ہیں۔ اتنے میں ایک اور مولوی صاحب "فارغ التحصیل" ہو کر آجاتے ہیں۔ اس مسجد میں پہلے سے امام صاحب موجود ہیں۔ اب یہ نووارد بیچارا کیا کرے؟ اس کی روٹی کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں کہ ایک اور مسجد بنے۔ لیکن یہ مسجد کیسے بنے؟ اس کے لئے نہایت آسان طریقہ ہے۔ وہ یہ وعظ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ اس مسجد کا امام' ہاتھ زیر ناف باندھتا ہے۔ لیکن شریعت حقہ کا فیصلہ یہ ہے کہ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں۔ لہٰذا' اس امام کے پیچھے نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ بار بار اس آواز کو دہراتا ہے اور اس کے بعد ایک کھلی جگہ پر دس اینٹیں اور پانچ لوٹے رکھ کر اذان دے دیتا ہے۔ سینے پر ہاتھ رکھنے کی شریعت حقہ ماننے والے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور یوں اس کے لئے امامت کی اسامی نکل آتی ہے۔ اس کے بعد وہ اٹھتے بیٹھتے اس "محکم عقیدہ" کی تبلیغ کرتا رہتا ہے کہ جو لوگ زیر ناف ہاتھ رکھنے والے امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں ان کی نماز نہیں ہوتی۔ آپ سوچئے کہ اگر یہ اختلاف پیدا نہ کیا جاتا تو اس کے لئے نیا ٹھکانا کیسے بن سکتا تھا! یہ وجہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کے اختلافات کو اس شدت سے قائم رکھتے ہیں اور ہر اس آواز کو جو اختلافات مٹانے کے لئے اٹھے' کفرو الحاد کی آواز قرار دے کر' اسے دبانے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی یہ اختلافات موجود تھے؟ اس کا جواب ان حضرات سے مانگئے!

(مارچ ۱۹۹۵ء)

۲۷۔ معجزہ اور کرامت میں کچھ فرق نہیں

ذیل کا اقتباس غور سے پڑھیے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ

براہ راست حق تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے' جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے **وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی** (۸/۱۷) اسی طرح کرامت میں بھی اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا' براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہو جاتا ہے۔ اور معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحب معجزہ و کرامت کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے -------
ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارق عادت کام اگر کسی صاحب وحی نبی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے' غیر نبی کے ذریعہ اس کا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔

یہ اقتباس ہے (مولانا) مفتی محمد شفیع (مرحوم) کی تفسیر (معارف القرآن) کا جو ماہنامہ البلاغ (کراچی) میں بالا قساط شائع ہو رہی ہے۔ اس کا حوالہ ہے (البلاغ بابت مارچ ۱۹۷۷ء' ص ۱۶)۔ اس وقت بحث معجزہ کے متعلق نہیں۔ نکتہ زیر غور صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک معجزہ دلیل نبوت ہوتا ہے' یعنی مدعی نبوت کے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت۔ لیکن (مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ) اولیاء کرام سے جو کرامات سرزد ہوتی ہیں ان میں بھی اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے معجزہ اور کرامت کی کنہ اور حقیقت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر معجزہ دلیل نبوت ہوتا ہے تو کرامت دلیل نبوت کیوں نہیں ہو سکتی جبکہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہوتے ہیں۔

لیکن مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں۔ دونوں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ نبی کے ہاتھ سے جو خارق عادت واقعہ ظہور میں آئے اسے معجزہ کہا جاتا ہے۔ اور غیر از نبی کے ہاتھ سے جو خارق عادت واقعہ رونما ہو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔

کیا یہ وہی بات نہیں جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا تھا کہ:

اسماء سمیتموھا انتم واباؤکم (۴۰/۱۲)

ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ لئے ہیں!

کیا (مفتی صاحب مرحوم کے ارشاد کے مطابق) معجزہ اور کرامت میں یہی فرق نہیں کہ ایک کو معجزہ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور دوسرے کو کرامت۔

ما انزل اللہ بھا من سلطن (۴۰/۱۲)

خدا نے ان ناموں کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔

محض ناموں کی تفریق سے یہ امت ہزار برس سے ایسی ایسی الجھنوں میں گرفتار چلی آرہی ہے جن سے نکلنا اس کے بس میں نہیں۔ (مثلاً) اللہ تعالیٰ نے کسی منتخب ہستی کو اپنی طرف سے براہ راست علم عطا کرنے کا نام وحی رکھا تھا اور جسے یہ علم عطا ہوتا تھا اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا تھا۔ ختم نبوت سے' خدا کی طرف سے اسطرح علم حاصل ہونے کا سلسلہ

ختم ہو گیا۔

لیکن بعد ازاں امت میں ایک عقیدہ رائج ہوا کہ (رسول اللہؐ کے بعد بھی) خدا کے، برگزیدہ بندوں کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا ہے۔ جب کہا گیا کہ یہ عقیدہ تو ختم نبوت کی نقیض ہے، تو کہا کہ نہیں۔ اس سے ختم نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس لئے کہ نبی کو جو علم حاصل ہوتا تھا اسے وحی کہا جاتا ہے اور غیر نبی کو جو اسی نوع کا علم حاصل ہوتا ہے اسے کشف والہام کہا جاتا ہے اور جن برگزیدہ ہستیوں کو یہ علم حاصل ہوتا ہے' انہیں نبی نہیں' اولیاء کہا جاتا ہے' یعنی خدا کی طرف سے علم حاصل ہونے کی کیفیت اور نوعیت ایک ہی ہے' لیکن اس کا نام الگ رکھ لیا گیا ہے۔ اس لئے اس سے ختم نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وہ جو "احمدیوں" اور ہمارے علماء میں نوے برس تک بحث کا سلسلہ جاری رہا اور بات، کسی فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچ نہ سکی تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خود علماء حضرات' کشف والہام پر عقیدہ رکھتے تھے اور کرامات اور پیش گوئیوں کے امکان کو تسلیم کرتے تھے۔ ان عقائد کے بعد فرق صرف ناموں کا رہ جاتا ہے۔ ان تمام الجھنوں کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ما انزل اللہ کو سلطان تسلیم کیا جائے یعنی جملہ عقائد و مسالک میں سند قرآن کریم کی قابل قبول قرار پائے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کوئی پیچیدگی بھی باقی رہ جاتی ہے۔

(اپریل ۱۹۷۷ء)

۲۸۔ پیشۂ وکالت

مسٹر اے کے بروہی نے سپریم کورٹ کے حالیہ مقدمہ میں' آئین کی عظمت کے ضمن میں جو دلائل دیئے وہ ان دلائل کی تردید کرتے تھے جو خود انہوں نے اس سے پہلے سپریم کورٹ ہی کے ایک مقدمہ میں پیش کئے تھے۔ اگلے دنوں وہ لندن تشریف لے گئے تو وہاں ان کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے خود اپنے ہی دلائل کی تردید کس طرح کر دی۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ :

> .... کی درخواست کے سلسلہ میں پاکستان کے سپریم کورٹ کے سامنے پاکستان کے آئین کے ضمن میں انہوں نے جس موقف کی حمایت کی وہ محض ایک وکیل کا پیشہ وارانہ فرض تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر دوسرا فریق ان سے رابطہ قائم کرتا اور ان کی فیس ادا کرتا تو وہ اسی شدومد کے ساتھ یہ کہتے کہ دوسرے فریق نے غلطی کی ہے۔
>
> (چٹان' مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۷۷ء)

۲۹۔ ایرانی شہنشاہیت اور ولی عہدی

(طلوع اسلام بابت اپریل، مئی ۱۹۵۸ء میں ذیل کا شذرہ شائع ہوا تھا)

"اس ماہ کی ایک اہم خبر ایران کی ملکہ ثریا کی طلاق ہے۔ یہ خبر اس لئے اہم نہیں کہ طلاق کسی ملک کی ملکہ کو ملی ہے۔ ہمارے نزدیک عورت ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ہر عورت یکساں ہے۔ اور ملکہ ہونے کی جہت سے، ہر عورت اپنے گھر کی ملکہ ہوتی ہے۔ اس خبر کی اہمیت ان خصوصی حالات کی بنا پر ہے جن کی وجہ سے نوبت طلاق تک پہنچی ہے۔ بتایا یہ گیا ہے کہ شاہ اور ملکہ (میاں اور بیوی) ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے تعلقات نہ صرف خوشگوار بلکہ محبت و مودت کے مظہر تھے۔ ان میں کسی قسم کی کوئی ناچاقی یا بدمزگی نہیں تھی۔ لیکن ان کی سات سالہ ازدواجی زندگی میں ملکہ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی اور چونکہ نرینہ اولاد کے بغیر تخت شہنشاہی بغیر ولی عہد کے رہا جاتا تھا، [۱۳] اس لئے بادشاہ کو بادل نخواستہ ملکہ کو طلاق دینی پڑی اور ملکہ کو بصد حسرت و یاس اس فیصلہ کو قبول کرنا پڑا ـــــ وہ فیصلہ جس سے ایران کے بہت سے گھرانوں میں صف ماتم بچھ گئی۔

اس سے دو اہم سوال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک عام انسانی حیثیت سے، دوسرا قرآنی نقطہ نگاہ سے۔

عام انسانی حیثیت سے یہ کہ، کیا کسی عورت کے ہاں اولاد نہ ہونا، واقعی ایسا جرم ہے جس سے وہ ایسی قسم کی انتہائی سزا کی مستحق قرار پا جاتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ جو لوگ اس سوال کا جواب مثبت میں دیں، انہیں اس کا قطعاً حق حاصل نہیں کہ وہ صف انسانیت میں کھڑے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ (قرآن کریم کے تمثیلی انداز میں بیان کردہ قصہ آدم کی رو سے) جب آدم کے دل میں حیات جاوید کی آرزو پیدا ہوئی تو ابلیس نے اس کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ وہ اولاد کے ذریعے حیات جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ اسی سے اس کا نام ہمیشہ کے لئے روشن رہ سکتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن، اولاد کی آرزو انسان کی ناک میں نکیل ڈالے نہ معلوم اسے کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اس ناکردہ گناہ کی سزا اکثر و بیشتر بیچاری "حوا کی بیٹی" کو بھگتنی پڑتی ہے۔ خدا جانے آدم کا شعور کب بیدار ہوگا اور وہ کب ابلیس کے اس فریب سے نکل سکے گا کہ وہ حیات جاوید اولاد کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ حیات جاوید انسانی ذات کی نشوونما اور پختگی سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ اولاد کے ذریعے بقائے نسل سے۔

قرآنی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ اور بھی زیادہ تاسف انگیز اور عبرت ناک دکھائی دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اولاد کا ہونا یا نہ ہونا طبیعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے جس پر مرد یا عورت کسی کا بھی اختیار نہیں ہوتا۔ (اگر مرد یا عورت میں سے کسی میں) اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں (اور مناسب علاج کے باوجود یہ صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی) تو اس میں فرد متعلقہ کا کوئی قصور نہیں جس کی وجہ سے اسے مستحق سزا قرار دیا جائے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے:۔

۱۳۔ شاہنشاہ ایران کی پہلی بیوی (جسے اس نے چھوڑ دیا تھا) کے ہاں نرینہ اولاد نہیں ہوئی تھی۔

یھب لمن یشاء اناثا ویھب لمن یشاء الذکورا ۝ او یزوجھم ذکرانا وانا ثا ویجعل من یشاء عقیما۔۔۔۔ (۴۲/۴۹-۵۰)

وہ جسے چاہتا ہے (اپنے قانون مشیت کے مطابق) بیٹیاں دیتا ہے' جسے چاہتا ہے بیٹے' یا بیٹے اور بیٹیاں دونوں' اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے (یہ سب اس کے مقرر کردہ قانون طبیعی کے مطابق ہوتا ہے)۔

جہاں تک طلاق کا تعلق ہے قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ عورت کا بے اولاد ہونا طلاق (یا نکاح ثانی) کے لئے وجہ جواز ہو سکتا ہے۔ نکاح کا مقصد میاں بیوی میں سکون اور مؤدت و رحمت ہے (۳۰/۲۱) اور جب تک ازدواجی زندگی میں یہ حسین عناصر موجود ہیں' انقطاع تعلقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگلی (اور سب سے اہم) چیز "ولی عہد" کا سوال ہے۔ کون مسلمان اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ اسلام کی گاڑی اس دن سے دوسری پٹڑی پر جا پڑی جس دن خلافت' ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ ملوکیت کے عام معنی ہیں' سلطنت کا باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً" منتقل ہونا۔ یہ وہ آواز ہے جو گزشتہ تیرہ سو برس سے ہر محراب و منبر سے اٹھتی اور مسلسل فضا میں پھیلتی رہی ہے کہ سلطنت میں وراثت اور ولی عہدی کا تصور شجر اسلام کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ لیکن کس قدر بدبختی ہے کہ جہاں تیرہ سو سال سے ہر محراب و منبر سے یہ آواز اٹھ رہی ہے' اس کے ساتھ ہی تیرہ سو برس سے' مسلمانوں کے ہر ملک میں' سلطنت باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً" منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ حتیٰ کہ آج جبکہ دنیا کی قریب قریب تمام غیر مسلم سلطنتیں زمانے کے تقاضے سے مجبور ہو کر' ملوکیت کو اپنے ہاں سے ختم کر چکی ہیں' ملوکیت اگر کہیں باقی ہے تو مسلمانوں کے ممالک میں باقی ہے۔ اور یہی ملوکیت ہے جس نے ایران میں ولی عہد سلطنت کی ضرورت کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس کے لئے ایک بے گناہ (خاتون) کو حوالہ قربان گاہ کر دیا گیا ہے۔

اس سے آگے بڑھئے تو ایک چیز بالکل واضح ہے' یعنی یہ کہ اس کی ضمانت کیا ہے کہ شاہ ایران کے ہاں کسی اور بیوی سے ضرور ضرور اولاد پیدا ہوگی' اور وہ لڑکا ہی ہوگا۔

اور سب سے آخر یہ کہ' شاہ ایران (ماشاء اللہ) ابھی جوان ہیں اور قانون طبیعی کے مطابق ان کے کافی مدت تک زندہ رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جس سرعت سے آجکل مزاج روزگار بدل رہا ہے اس کے پیش نظر اس کی بھی کیا گارنٹی ہے کہ جب آج کے ولی عہد کی تخت نشینی کا دور آئے گا' اس وقت انداز ملوکیت دنیا میں باقی ہوگا؟"

(طلوع اسلام' بابت اپریل۔ مئی ۱۹۵۸ء' ص ۳۸ تا ۴۷)

چنانچہ وہاں ایسا انقلاب آیا کہ ولی عہدی تو ایک طرف' شہنشاہیت ہی باقی نہ رہی۔ سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ ؎

الٹ جائیں گی تدبیریں' بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے' نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

(فروری ۱۹۷۹ء)

۳۰۔ "عزیر" کے متعلق غلط فہمی

ایک صاحب نے ہمیں 'اردو انسائیکلو پیڈیا (فیروز سنز) کے ص ۹۸۹ کی فوٹو سٹیٹ کاپی بھیجی ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔
عزیرؑ (حضرت) (۵۰۰ - ق-م) حضرت ہارون بن عمران کی نسل سے تھے۔ قرآن اور احادیث کے مطابق عزیرؑ نبی تھے۔ بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر کے تمام یہودیوں کو گرفتار کر لیا...... اور انہیں بابل لے آیا۔ اس وقت عزیر کم عمر تھے۔ چالیس برس کی عمر میں آپ بنی اسرائیل کے فقیہہ بنے اور رشدو ہدایت کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ اردشیر کے زمانے میں جب بنی اسرائیل نے بیت المقدس کو از سر نو تعمیر کرنا چاہا تو اس سلسلہ میں حضرت عزیر نے شاہی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا شروع کیا' اور بیت المقدس کی تعمیر میں بنی اسرائیل کو مدد دی۔ بیت المقدس کی تباہی کے وقت تورات کے تمام نسخے ناپید ہو چکے تھے۔ حضرت عزیر نے یہ نسخے ازسرنو مرتب کرائے (اس کے بعد اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جسے درج کرنے کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے)۔
اس میں کئی بنیادی غلطیاں ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ قرآن مجید نے عزیر نامی کسی شخص کو زمرہ انبیاءؑ میں شامل نہیں کیا۔ اس لئے انہیں قرآن کی رو سے بالتصریح نبی نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ قرآن مجید میں عزیر کا نام ایک ہی مقام پر آیا ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ یہودی اسے ابن اللہ (خدا کا بیٹا) کہتے تھے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ اہل مصر کا ایک دیوتا تھا (OSIRIS) جس کی شکل بیل کی سی تھی۔ وہ اسے خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ اہل مصر کی دیکھا دیکھی بنی اسرائیل نے بھی اس دیوتا کی پرستش کرنی اور اسے خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہی (OSIRIS) عزیر ہے جس کا ذکر قران مجید میں آیا ہے۔
دوسرے یہ کہ جس فقیہہ نے تورات کو از سر نو مرتب کیا تھا اس کا نام عذرا تھا (نہ کہ عزیر)۔ توریت میں اس کا نام اور ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔
ہم اپنے ہاں کے انسائیکلوپیڈیا قسم کی تالیفات کے مصنفین اور ناشرین سے درخواست کریں گے کہ وہ (کم از کم) اسلام اور حضرات انبیاء کرامؑ کے ضمن میں کچھ درج کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا کریں۔ ان کی یہ تالیفات عوام میں "سند" بن جایا کرتی ہیں۔

(فروری ۱۹۷۷ء)

۳۱۔ محنت کشوں کے مسائل

(اجرتوں کے نظام کی خرابی)

ایک صاحب نے لکھا ہے کہ آجکل محنت کشوں کی فلاح و بہبود کا سوال بڑی اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق کیا ہدایات آئی ہیں؟

طلوع اسلام

بات ذرا سطح سے نیچے اتر کر سمجھنے کی ہے۔ اس باب میں دو فریق ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک فریق محنت کش

یا ورکرز (WORKERS) یعنی کام کرنے والوں کا اور دوسرا فریق وہ جوان کام کرنے والوں کی فلاح اور بہبود کی تدبیریں سوچتا یا کرتا ہے۔ پہلا فریق تو ہوا ورکرز یا کام کرنے والوں کا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دوسرا فریق کن لوگوں کا ہے؟ جب پہلا فریق کام کرنے والوں کا ہے تو لامحالہ دوسرا فریق ان لوگوں کا ہوگا جو کام نہیں کرتے۔ تو اب مسئلہ کی شکل یوں بنی کہ جو لوگ کام نہیں کرتے ہیں وہ ان لوگوں کی فلاح و بہبود کی فکر کرتے ہیں۔ اور اگلا سوال یہ کہ ان کام نہ کرنے والوں کے پاس وہ پیسہ کہاں سے آتا ہے جس سے وہ ان کام کرنے والوں کی فلاح و بہبود کی تدبیریں کرتے ہیں؟ پیسہ تو لامحالہ کام کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ تو جو کام نہیں کرتے ان کے پاس' دوسروں کی فلاح و بہبود تو ایک طرف' خود اپنے کھانے کے لئے بھی کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ ان حقائق کی روشنی میں بات یوں ہوئی کہ کام نہ کرنے والے' کام کرنے والوں کی کمائی میں سے خود بھی کھاتے ہیں اور اسی میں سے تھوڑا بہت' کام کرنے والوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے صرف کرتے ہیں اور اسے بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے اور ثواب کا کام تصور کرتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ انسان آج تک دور غلامی سے نکلا ہی نہیں۔ اس نے کیا صرف اتنا ہے کہ فریب دہی کی خاطر کچھ لباس نئے تجویز کر دیئے اور کچھ نئی اصطلاحات وضع کر لی ہیں۔ جسے ہم دور جہالت کہتے ہیں اس میں انسان جو کچھ کرتا تھا اسے کھلے بندوں کرتا تھا۔ اس دور تہذیب میں یہ کرتا وہی کچھ ہے لیکن دوسروں کی بہبود کے نگاہ فریب پردوں میں لپیٹ کر۔ دور جہالت میں کام کرنے والے کو غلام کہا جاتا تھا اور اس سے کام کرانے والا اس کا آقا یا ماسٹر کہلاتا تھا۔ یہ آقا' غلام کی کمائی کا مالک ہوتا تھا اور اس میں سے اتنا غلام کو دے دیتا تھا جس سے وہ کام کرنے کے قابل رہے۔ بات آج بھی وہی ہے۔ فرق صرف الفاظ کا ہے۔

قرآن کریم نے اس تفریق کو ختم کر دیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ: **لیس للانسان الا ما سعی** (۵۳/۳۹) دنیا میں ہر انسان کو کام کرنا ہوگا۔ جو کام نہیں کرتا اسے کچھ نہیں مل سکتا' (بجز ان کے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہوں) بلکہ یوں کہئے کہ وہ انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ اس نے اس بنیادی اصول کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ **الا تزر وازرۃ وزر اخری** (۵۳/۳۸) کام کرنے والے' کام نہ کرنے والوں کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے۔ کام نہ کرنے والوں کو اس نے مترفین کہہ کر پکارا اور انہیں بارگاہ انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیا ہے۔ لہٰذا' قرآنی معاشرے میں تمام افراد کا سب یعنی کام کرنے والے ہوں گے۔ اس میں کام نہ کرنے والوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔ تقسیم کار کے اصول کے مطابق کام کی نوعیت میں فرق ہوگا۔ اسے باہمی تعاون کہا جائے گا۔ اس میں نہ کوئی کام گھٹیا ہوگا نہ بڑھیا۔ گھڑی کا ادنیٰ سا پیچ بھی اپنے مقام پر اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اہمیت اس کا مرکزی پرزہ' سپرنگ۔ اس اعتبار سے ان کام کرنے والوں کی اونچ نیچ کا بھی فرق نہیں ہوگا۔ اگر سو سو روپے کے پچاس نوٹوں کو اوپر تلے رکھ دیا جائے تو سب سے نچلے نوٹ کی بھی وہی قیمت ہوگی جو سب سے اوپر کے نوٹ کی ہوگی۔ مدارج میں فرق کام کی نوعیت کے مطابق نہیں ہوگا حسن کارکردگی کی بنا پر ہوگا یعنی جو کام اس کے سپرد تھا اسے اس نے کس قدر خوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رو سے آجر اور مستاجر (کام کرنے والوں اور لینے والوں) کے دو گروہوں کا وجود ہی نہیں رہتا۔ اس میں تمام افراد معاشرہ کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر' وہ معاشرہ محنت کشوں یا ورکرز پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں سب مل کر کام کرتے ہیں اور ان کی محنت کے نتیجے میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس سے ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس معاشرے میں "مزدوروں" کا بھی وجود نہیں ہوتا۔ مزدور کے معنی ہیں "مزد + ور" یعنی جسے کام کی مزد' اجرت دی جائے۔ اجرت (یا WAGES) کا تصور بھی نظام سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے۔ کام نہ کرنے والے' کام کرنے والوں کے کام کی اجرت مقرر کرتے ہیں اور اسے اس کی محنت کے ماحصل میں سے مقررہ اجرت ادا کر کے باقی سب خود سمیٹ لیتے ہیں۔ اجرت مقرر کرنے میں معیار یہ نہیں ہوتا کہ اس سے مزدور اور اس کے بال بچوں کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ معیار' اجرت مقرر کرنے والوں کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ قرآنی معاشرہ میں کام کی اجرتیں مقرر نہیں ہوتیں' ہر ایک کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے' محنت کشوں کے مسائل کا حل۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان' اس قسم کا معاشرہ قائم نہیں کرتا' وہ دور غلامی سے نکل نہیں سکتا' خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی مہذب اور آزاد تصور کیوں نہ کرے۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

(مئی ۷۹ء)

۳۲۔ تصویر کی شرعی حیثیت

(مودودی مرحوم کے تضادات)

سوال :۔ سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے مودودی صاحب کو حال ہی میں جو ایوارڈ ملا ہے' میں اس کے دوسرے گوشوں کے متعلق گفتگو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھنا چاہتا ہوں۔ سردست اس کا صرف وہ گوشہ سامنے لانا چاہتا ہوں جس کا تعلق شاہ فیصل (مرحوم) کی اس تصویر سے ہے جو اس میڈل (تمغہ) پر ڈھلی ہوئی شکل میں منقوش ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مودودی صاحب نے انسانوں کی ہر قسم کی تصاویر کو حرام مطلق قرار دیا تھا۔ براہ کرم بذریعہ طلوع اسلام مطلع فرمائیے کہ کیا یہ صحیح ہے؟ اور اگر صحیح ہے تو پھر مودودی صاحب اس مصور تمغہ کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

جواب:۔ تصویر کے متعلق مودودی صاحب نے ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۶۲ء میں سورۃ السباء کی تفسیر کے سلسلے میں' بڑی تفصیلی بحث کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی

حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی اکرمؐ کے صحیح ارشادات' صحابہ کرامؓ کے عمل اور فقہاء اسلام کے متفق فتاویٰ کی رو سے ایک مسلم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متاثرہ لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔

بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں' حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقہ کو۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہئیں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں' یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسمے جن کو معبود بنا لیا گیا ہو۔ باقی دوسری تصویروں اور مجسموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام و ارشادات سے قانون اخذ کرنے کے بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک و بت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر ان بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں' ڈکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے استیصال کی خاطر دیا ہے' اصلاً" غلط ہے۔ شارع نے مطلقاً" جاندار اشیاء کی تصویر کو روکا ہے۔ ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے متبع ہیں' تو ہمیں علی الاطلاق اس سے رک جانا چاہیے۔ ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی علت حکم خود تجویز کر کے اس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں (صفحات ۳۰-۲۸)۔

اس مطلق ممانعت میں استثنائی صورتوں کے متعلق انہوں نے لکھا ہے :-

اس عام حکم کے اندر اگر کوئی استثنا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جہاں تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو یا جبکہ تصویر کسی بڑی تمدنی مصلحت کے لئے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہے۔ مثلاً" پاسپورٹ' پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لئے تصویریں محفوظ کرنا' ڈاکٹروں کا علاج کے لئے یا فن طب کی تعلیم کے لئے مریضوں کی تصویریں لینا اور جنگی اغراض کے لئے فوٹو گرافی کا استعمال .... لیکن لیڈروں کی تصویریں اور جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں کسی طرح بھی جائز اور حقیقی

ضرورت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ خصوصاً" لیڈروں کی تصویریں تو بندگان خدا کو اس خطرے سے بہت ہی قریب پہنچا دیتی ہیں' جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے...... سکوں پر بادشاہ کی تصویر کا بطور علامت حاکمیت ثبت کیا جانا' کیا یہ سب بت پرستی کی جڑیں نہیں؟ ...... میں تو چھوٹے بچوں کی تصویر لینے کو بھی اسی لئے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں میں آگے چل کر کس کو خدا بنا لیا جائے۔ (رسائل و مسائل' حصہ اول' ستمبر ۱۹۵۱ء' صفحہ ۹۱-۱۹۰)

تصویر کے متعلق مودودی صاحب کا عقیدہ واضح ہے۔ وہ انسانوں کی تصویر کو حرام مطلق قرار دیتے ہیں۔ اور انہوں نے جو استثنائی صورتیں بتائیں ہیں' ظاہر ہے کہ فیصل ایوارڈ پر شاہ مرحوم کی تصویر (جسے مجسمہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا) ان میں سے کسی شق کے تابع بھی نہیں آتی۔

(جون ۱۹۷۹ء)

۳۳- استیذان کی اہمیت

(اجازت لے کر آؤ)

قرآن مجید ایک عظیم' محیط کل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں جہاں کائنات کے مستور حقائق اور قوموں کے عروج و زوال کے غیر متبدل قوانین دیئے گئے ہیں وہاں انسانی معاشرتی زندگی سے متعلق ایسی ہدایات بھی بیان کی گئی ہیں جو سطحی نگاہوں سے دیکھنے والوں کے نزدیک بڑی معمولی سی ہیں ——— ایسی معمولی کہ ان کے نزدیک انہیں وحی کی رو سے عطا کئے جانے کی چنداں ضرورت نہ تھی ——— لیکن اگر انہیں روزمرہ زندگی کے تجربہ کی روشنی میں ذرا گہری نظروں سے دیکھا جائے تو ان کی اہمیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آج کی نشست میں ہم ان میں سے دو ایک ہدایات کو سامنے لاتے ہیں جنہیں نظرانداز کرنے سے ہمارے معاشرہ میں بہت سی الجھنیں اور بدمزگیاں پیدا' اور پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ جن حضرات کو ان پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ ان کی اہمیت کو نمایاں کرنا بڑا ضروری ہے۔

ان میں سے پہلی ہدایت یہ ہے:-

یا یھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا ...(۲۴/۲۷)

اے جماعت مومنین! جب تم اپنے گھر کے علاوہ کسی اور کے ہاں جاؤ تو پہلے ان سے اجازت طلب کرو اور جب وہ اجازت دیں تو پھر اندر جاؤ۔

اس کے بعد ہے:-

فان لم تجدوا فیھا احدا فلا تدخلوھا حتی یوذن لکم ۚ وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا .... (۲۴/۲۷)

اور اگر تم دیکھو کہ اس گھر میں کوئی نہیں تب بھی اس کے اندر نہ جاؤ۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ آپ اس وقت واپس تشریف لے جائیں تو (دل میں کوئی گرانی لئے بغیر) واپس آجاؤ۔

ان ہدایات میں کہا تو یہ گیا ہے کہ کسی کے ہاں بلا اجازت مت جاؤ' لیکن وسیع پیمانے پر اس سے مراد یہ ہے کہ کسی سے ملنے کے لئے جانا ہو تو پہلے وقت مقرر کرو' یعنی (BY APPOINTMENT) جاؤ۔ یونہی' جب جی چاہے کسی سے ملنے کے لئے نہ چلے جاؤ۔ اگر کسی کے ہاں اتفاقیہ جانا پڑے تو بھی اہل خانہ سے پہلے پوچھ لو کہ انہیں ملنے کے لئے وقت ہے۔ اور اگر وہ معذرت کر دیں تو اس کا برا نہ مناؤ۔ واپس چلے جاؤ۔

مغربی ممالک میں چونکہ وقت کی قیمت کا بڑا احساس ہے اس لئے انہوں نے اپنے اوپر اس پابندی کو بڑی شدت سے عائد کر رکھا ہے۔ وہاں پہلے سے وقت مقرر کئے بغیر کوئی کسی کے ہاں نہیں جاتا۔ لیکن ہمارے ہاں (جنہیں خدا کے ہاں سے یہ ہدایت ملی تھی) کیفیت یہ ہے کہ جب کسی کا جی چاہے ملنے کے لئے چلا آتا ہے۔ اس سے دوسرے کے کام' وقت اور مصروفیات میں جس قدر حرج واقع ہوتا ہے' اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں اس قسم کے ملاقاتیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اول تو وہ اس کی جرات نہیں کر سکتے کہ اس آنے والے سے کہہ دیں کہ اس وقت معاف فرمایئے۔ اور اگر وہ کہیں اس کی جرات کر لیں تو آنے والے صاحب اس کا اتنا برا مناتے ہیں کہ بعض اوقات ہمیشہ کے لئے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس بدمزگی سے بچنے کے لئے اہل خانہ کو اکثر اوقات جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ یہ وبا ہمارے ہاں عام ہے اور نتیجہ ہے اس قرآنی ہدایت کو نظرانداز کر دینے کا۔

۲۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ آنے والے صاحب بلا اطلاع چھپا چھپ گھر کے اندر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے اہل خانہ کی پرائیویسی میں جس قدر خلل واقع ہوتا ہے' ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے :۔

واذا سالتموھن متاعا فسئلوھن من وراء حجاب .... (۳۳/۵۳)

اور اگر تمہیں نبی کے گھر سے کوئی چیز لینی ہو تو اس کے لئے بھی یونہی بے محابا اندر نہ چلے جایا کرو۔ قاعدے کے مطابق پردے کے باہر سے اسے مانگا کرو۔

ظاہر ہے کہ اس حکم کا اطلاق بھی عام ہے کہ بلا اطلاع دیئے اور اجازت لئے' کسی کے مکان کے اندر نہ چلے جایا کرو۔ اہل یورپ کے ہاں اس کی بھی پابندی ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی خیال نہیں کرتا (ہم سے ہمارے بوڑھے اچھے تھے کہ وہ خود اپنے گھر میں بھی آتے تو ڈیوڑھی میں کھنکار کر اندر جاتے تھے)۔

(۳) ہمارے ہاں اگر دو چار دوستوں یا عزیزوں کو کھانے پر بلایا جائے تو اہل خانہ کا پورے دن کا پروگرام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ کچھ تو (دوپہر کے کھانے کے لئے) بارہ ہی بجے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور بعض تین تین بجے تک تشریف نہیں

لاتے اور باقی سب ان کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر کھانے کے بعد جو محفل جمتی ہے تو کوئی اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں یہ ہدایت دی گئی :۔

یا یھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یوذن لکم الی طعام غیر نظرین اِنٰہ ولکن اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولا مستا نسین لحدیث .... (۳۳/۵۳)

اے جماعت مومنین! تم یونہی بن بلائے اور بغیر اجازت لئے رسول کے گھر نہ چلے جایا کرو۔ اگر وہ تمہیں کھانے کے لئے بلائے تو اس کے ہاں جاؤ۔ لیکن وہ بھی اس طرح نہیں کہ تم کھانا پکنے سے پہلے ہی وہاں جا بیٹھو اور کھانے کا انتظار کرتے رہو۔ جب کھانا تیار ہو جائے اور وہ تمہیں بلائے تو پھر اندر جاؤ۔ اور جب کھانا کھا چکو تو وہاں سے چلے جاؤ۔ وہیں بیٹھے باتوں میں نہ لگ جاؤ۔

اہل مغرب اس پابندی پر بھی عمل کرتے ہیں اور بڑے سکھ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے تو خود اپنے گھروں میں بھی کھانے کے اوقات مقرر کر رکھے ہیں اور اس کی بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی بات کہی ہے جو متعین طور پر تو رسولؐ اللہ سے متعلق ہے' لیکن وہ ترجمانی کرتی ہے ہم میں سے ہر ایک کے دل کی۔ فرمایا:۔

ان ذالکم کان یوذی النبی فیستحی منکم واللہ لا یستحی من الحق ...... (۳۳/۵۳)

تمہاری موجودہ روش سے رسولؐ کو بڑی اذیت پہنچتی ہے لیکن وہ شرم کی وجہ سے تمہیں کچھ کہتا نہیں' لیکن اللہ تو حق بات کہنے سے نہیں شرماتا (اس لئے اس نے یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے)۔

ان ہدایات خداوندی کی مزید تشریح اور تصریح کی ضرورت نہیں۔ اے کاش ہم قرآن مجید کی ان چھوٹی چھوٹی ہدایات پر ہی عمل پیرا ہوتے تو کتنے آرام سے رہتے!

(جون ۱۹۷۹ء)

۳۴۔ میں نے جماعت کیوں نہیں بنائی! میں نماز کیسے پڑھتا ہوں؟

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب کا میرے نام ایک طویل مراسلہ موصول ہوا ہے۔ اس کا جواب تو انہوں

نے براہ راست مانگا ہے' لیکن جو سوالات اس میں اٹھائے گئے ہیں ان کا تعلق کسی ایک فرد سے نہیں' نفس اسلام سے اور اس کے بعد تحریک طلوع اسلام سے ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ (نام اور مقام کے حوالے حذف کر دینے کے بعد) وہ خط اور اس کا جواب طلوع اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے قارئین اس کے مطالعہ کو مفید پائیں گے۔ پہلے وہ خط ملاحظہ فرمایئے:۔

خط

"میں تقریباً" ۷۶ء کے اوائل سے آپ کے ماہنامہ "طلوع اسلام" کا مطالعہ کر رہا ہوں ..... کے چھوٹے سے قصبے میں قرآنی نظریات کو اپنی حد تک پھیلانے کی کوشش بھی کرتا رہا ہوں۔ آپ سے تعارف میرے دوست .... نے کرایا۔ آپ کی قرآنی تفسیر پسند آئی۔ گو نہ میں آپ کی کوئی ضخیم کتاب پڑھ سکا ہوں اور نہ ہی "طلوع اسلام" کو باقاعدگی سے زیر مطالعہ رکھ سکا ہوں' لیکن طلوع اسلام کی روشنی نے مجھے متاثر ضرور کیا ہے۔ لہٰذا' باقاعدگی سے اس کا خریدار ہوں۔ کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے رابطہ قائم کر کے آپ سے ان سوالات کا جواب حاصل کروں جو میرے اپنے ذہن میں ابھرتے ہیں یا دوسروں کی جانب سے پوچھے جاتے ہیں۔ دیگر حضرات کی قسم مختلف ہے۔ ان میں کچھ متاثرین جماعت اسلامی ہیں۔ کچھ کمیونسٹ' سوشلسٹ اور اکثریت دہریوں کی ہے۔ سب سے زیادہ مقابلہ جماعت اسلامی سے ہے۔ اکثریت دوستوں کی ہے۔ لیکن اکثر اور ہر وقت کی بحث ..... کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ آپ کی اکثر باتوں خصوصاً" معاشی نظام کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن کچھ باتیں مولویانہ اور مذہبی سی ہوتی ہیں اور کچھ کا وزن میں خود بھی محسوس کرتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میرا مطالعہ ناقص اور نامکمل ہے۔ میں ...... طالب علم (پرائیویٹ) ہوں۔ کافی وقت ادھر لگتا ہے۔ ملازمت کے دھندے بھی ہیں۔ لیکن خیال آتا ہے کہ زندگی تو انہیں دھندوں میں صرف ہوگی۔ کچھ مطالعہ دائمی (ETERNAL) حیثیت و فوائد رکھنے والا بھی کیا جائے۔ لہٰذا' جن سوالات کا جواب آپ سے لینا ہے وہ درج کر کے اپنے مطالعہ میں اضافے کے لئے جواب چاہتا ہوں۔ جوابی لفافہ ساتھ ہے۔ کچھ جوابات ذاتی قسم کے ہوں گے۔ ان کا جواب بھی ضرور عطا فرمائیں کیونکہ آپ کی اپنی ذات بھی خاصی زیر بحث رہتی ہے۔ آپ کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے سبب صرف فرضی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اطمینان نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو اعتماد سے جواب نہیں دیا جا سکتا۔ صرف ذاتی دلائل پر بھروسہ کرتا ہوں مگر خود مطمئن نہیں رہتا۔ سب سے بڑا اعتراض .... یہ کرتے ہیں اسلام میں ایک ایسی جماعت کا قیام ضروری ہے جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ لیکن پرویز صاحب' اس حکم قرآنی کی تعمیل میں ابھی تک کسی باقاعدہ جماعت کا قیام عمل میں نہیں لائے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت کو لوگ فرقہ تو ضرور کہیں گے لیکن کم از کم بے چین روحوں (RESTLESS SOULS) کو تو کوئی جائے سکون نظر آ سکے گی۔ جماعت نہ ہونے کا مطلب تو یہ لیتے ہیں کہ پرویز صاحب صرف دوسری جماعتوں پر تنقید ہی تنقید کرتے رہتے ہیں' خود کوئی آئیڈیل پارٹی پیش نہیں کرتے۔

جماعت سازی

ایک ایسی جماعت ہونا چاہیے تھی جو سیاسی' مذہبی یا دینی طور پر (IDEAL) پیش کرتی تاکہ حکومت الہیہ کے قیام کا مقصد حاصل ہو سکتا۔ میں خود بھی یہی سوچتا ہوں کہ فرقہ تو پہلے بھی آپ کے عقائد کو کہا جاتا ہے۔ کیوں نہ ایک جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے جو صحیح قرآنی نظریات پیش کرے اور آہستہ آہستہ اپنا دائرہ وسیع کر کے' مخلص اور بے لوث قیادت مہیا کر کے نظام الٰہی کے قیام کی جانب قدم اٹھائے۔ مشکلات کا سامنا تو بہرحال کرنا پڑے گا۔ اس مرتبہ اگست کے طلوع اسلام میں آپ کے توضیحی مقالہ بہ سلسلہ "دین و مذہب کی کش مکش" کے آخر پر آپ نے دبے الفاظ میں اجتماعی کوشش کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس میں مشکلات کے ساتھ ساتھ کامیابی کے امکانات بھی کافی ہیں۔ ایسا راستہ اختیار کرنا جس میں "ہوس زر" جیسی میٹھی بیماری کو ترک کرنا پڑتا ہے' دولت محفوظ نہیں رہ سکتی' بہت مشکل اور کٹھن ہے۔ اس میں تو لوگ چندہ دینے سے بھی کترائیں گے۔ عہدوں اور ناموری کا لالچ تنظیم اور جماعت میں رکاوٹ بن جائے گا' اور پھر وہاں جہاں سے کسی منافع دنیوی کی امید بھی نہ ہو۔ پھر ممکن ہے کہ لوگ تعلیم یافتہ طبقے میں اسے مقبول سمجھ کر ادھر دوڑیں اور اسے بھی دوسری جماعتوں کی طرح مختلف حربوں سے بدنام کرنے کی کوشش کریں اور انجام پھر وہی نکلے۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ کام مکمل نہیں ہو سکے گا جسے مکمل ہونا چاہیے۔ آپ نے لٹریچر کی صورت میں قابل تعریف کام خاصی حد تک مکمل کر دیا ہے۔ اب اگلا قدم اجتماعی کوشش ہونا چاہیے۔

نماز

۲۔ جب اجتماعی کوشش کی صورت میں کسی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے تو دین کے اہم ترین رکن "نماز" کے بارے میں آپ کو بتانا ہوگا کہ کس طرح مل کر پڑھی جائے۔ آپ کی یقیناً" ریسرچ ہوگی کہ حضورؐ پاک اور ان کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی۔ نماز باجماعت کا حکم بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ لیکن آپ قرآنی کنونشن کے موقع پر نماز با جماعت کا اہتمام نہیں کرتے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے مختلف عقائد کے لوگ جو آپ سے متاثر ہوں گے' ایک دوسرے کے پیچھے قرآنی کنونشن سے نماز پڑھنے سے کتراتے ہوں گے اور آپ کو کہنا چاہیے کہ وہ اپنے اپنے طریقوں کے مطابق جا کر نماز ادا کر لیں لیکن آپ خود بھی تو کسی نہ کسی طریقے پر نماز پڑھتے ہوں گے اور یقیناً" (جہاں تک میرا اپنا خیال ہے) وہ طریقہ آپ کی تحقیقات کا نچوڑ ہوگا۔ اور میری نظر میں آپ کی ریسرچ موجودہ دور کے دیگر محققین سے زیادہ صائب ہے۔ آپ صرف ان لوگوں سے علیحدہ نماز پڑھنے کا کہتے ہیں جن کی نماز آپ کی نماز (بہ لحاظ ادائیگی وغیرہ) سے نہیں ملتی یا تمام لوگوں سے ؟ ------ آپ نے عبادات کے فلسفے کے علاوہ ان کی ادائیگی پر بھی ضرور ریسرچ کی ہوگی۔ کیا آپ نے مختصراً" ہی سہی' کوئی ایسی تحریر چھوڑی ہے جس میں عبادات کی ادائیگی کا صحیح ذکر ہو؟ جس میں رسول پاکؐ کے طریقہ کا مدلل ثبوت درج ہو اور عبادات میں جہاں جہاں تبدیلی کی اجازت ہو' وہ بھی درج ہو؟ آخر فلسفہ تو انہی کی سمجھ میں آسکتا ہے جو علمی لحاظ سے بہت اعلیٰ طبقہ ہے۔ ادائیگی سے فوائد تو ہر ایک کو پہنچتے

ہیں' پھر ادائیگی کا کوئی نہ کوئی طریقہ بھی تو ہوگا۔ ان دو سوالات کے علاوہ مندرجہ ذیل سوالات کا جواب بھی عطا فرمائیں۔ تمام سوالات درج کرتا ہوں جن کے جوابات آپ کی کتب کی صورت میں ہیں۔ کتب کے نام لکھ کر بھیج دیں۔ میں منگوالوں گا' انشاء اللہ۔ باقیوں کے جواب تحریری طور پر دیدے دیں۔ شکریہ۔

سوالات

۱۔ آپ نماز باجماعت کا اہتمام کیوں نہیں کرتے؟ آپ خود کون سے طریقے پر نماز پڑھتے ہیں؟
۲۔ آپ نے اب تک کوئی سیاسی یا تبلیغی جماعت کیوں قائم نہیں کی' جبکہ قرآن مجید اس کا حکم دیتا ہے؟
۳۔ کیا آپ نے کبھی حج فرمایا؟ ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک کے دورے پر برائے تعلیم یا ریسرچ بھی تشریف لے گئے؟
۴۔ اسلام میں خلافت کا معیار اور طریق انتخاب کیا ہے جو قرون اولیٰ یا زمانہ خلفائے راشدین میں اختیار کیا گیا؟ قرآن کیا کہتا ہے اور اب موجودہ دور میں کونسا طریقہ اختیار کیا جائے؟ صحابہ ثلاثہؓ کا طریقہ درست تھا؟
۵۔ کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے' فقط زیارت کے لئے؟

اگر آپ کے پاس اجتماعی کوشش کا کوئی پروگرام ہے تو اسے نشر فرمائیں' تاکہ کام کچھ آگے بڑھ سکے۔ جس طرح اسلام نے ارتقائی منازل طے کی ہیں اسی طرح احیاء اسلام کا بھی اپنی منزل پر پہنچنا ضروری ہے۔ لٹریچر تیار ہے تو اگلا قدم اٹھایا جائے مگر احتیاط سے' کہیں انجام "مصلحت پسندی" اور پھر جماعتی مفادات کی خاطر قرآن کے مفہوم میں تغیر و تبدل نہ ہو ——— انشاء اللہ قرآنی مشعل کو روشن رکھا جائے گا' آندھیوں میں بھی اور تاریک راتوں میں بھی۔ حقیقی اسلام غلبہ ضرور حاصل کرے گا مگر ابھی دولت' موجودہ سیاست اور مذہبی پیشوایانہ ذہنیت رکاوٹ ہے۔ اب ان سب کے خلاف نفرت پھیل رہی ہے۔ متبادل حقیقی کی ضرورت ہے"۔

والسلام

———— ○ ————

جواب

اس خط میں بنیادی اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ:

> اسلام میں ایک ایسی جماعت کا قیام ضروری ہے جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے لیکن پرویز صاحب اس حکم قرآنی کی تعلیم میں ابھی تک کسی باقاعدہ جماعت کا قیام عمل میں نہیں لائے۔

یعنی اتنا ہی نہیں کہ اس قسم کی جماعت کا قیام مناسب یا مفید رہے گا' بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور چونکہ میں نے اس حکم خداوندی کی تعمیل نہیں کی اس لئے میں معصیت خداوندی کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ حقیقت

اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا نے امت کے اندر مذہبی فرقے یا جماعتیں بنانے کا حکم تو چھوڑ' اس کی اجازت بھی نہیں دی۔ اس نے اسے بڑی سختی سے روکا ہے اور اسے شرک قرار دیا ہے۔ میں اس موضوع پر کافی کچھ لکھ چکا ہوں لیکن چونکہ مذہبی فرقوں اور جماعتوں کی طرف سے اس گمراہ کن نظریے کی بڑی شدومد سے اشاعت کی جا رہی ہے' (اور اسی وجہ سے مراسلہ نگار بھی اس سے متاثر ہیں) اس لئے ضروری نظر آتا ہے کہ اس باب میں قرآنی احکام اور تعلیم کی ایک بار پھر وضاحت کر دی جائے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

ان لوگوں کی طرف سے اس قسم کی گمراہ کن مغالطہ آفرینی سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ کی تاویل کی آڑ میں کی جاتی ہے۔ اس آیت کو تو ہم بعد میں پیش کریں گے' پہلے یہ دیکھئے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" (نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کے فریضہ کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد کیا ہے؟

(۱) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو مبعوث فرمایا تو حضورؐ کا ایک اہم فریضہ یہ قرار دیا کہ :

یا مرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر (۷/۱۵۷)

وہ لوگوں کو معروف کا حکم دے گا اور منکر سے روکے گا۔

ہم اس مقام پر معروف او منکر کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے۔ اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ جن امور کو قران کریم جائز اور درست قرار دیتا ہے' وہ معروف ہیں اور جنہیں وہ غلط اور ناجائز ٹھہراتا ہے' وہ منکر ہیں۔ رسول اللہؐ کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔

(۲) لیکن امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ فریضہ تنہا رسولؐ کا نہیں تھا۔ رسولؐ کے ساتھ ایک امت کی تشکیل بھی ہوئی تھی اور اس امت کا بھی یہی فریضہ قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے کہ :

کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (۳/۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کی خاطر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ ساری کی ساری امت کا تھا' نہ کہ امت میں سے کسی خاص گروہ کا۔ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ میں امت یہ فریضہ حضورؐ کی سرکردگی میں سرانجام دیتی تھی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد اسے یہ فریضہ تنہا سرانجام دینا تھا۔

(۳) قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ یہ فریضہ پوری کی پوری جماعت مومنین کا ہے' کسی خاص گروہ کا نہیں۔ سورۂ التوبہ میں مومنین کی مختلف خصوصیات بیان کرتے ہوئے انہیں :- **الامرون بالمعروف والناھون عن المنکر** (۹/۱۱۲) کہا گیا ہے' یعنی "امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے"۔

(۴) دوسرے مقام پر مومنین کے ساتھ مومنات کا بھی اضافہ کر کے اس کی وضاحت کر دی کہ یہ فریضہ امت کے مرد اور عورتیں سب کے سب سرانجام دیں گے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

والمومنون والمومنت بعضهم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینهون عن المنکر (۹/۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

ان تمام آیات میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔ امر کے معنی کسی بات کا حکم دینا ہیں اور نہی کے معنی کسی کام سے حکماً" روک دینا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ اسی صورت میں سرانجام دیا جا سکتا ہے جب یہ امت صاحب اقتدار ہو۔ چنانچہ سورۂ الحج میں ہے کہ:

الذین ان مکنهم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونهو عن المنکر (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوۃ، ایتائے زکوۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے۔

اس سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت میں اقتدار پوری کی پوری امت کو حاصل ہوتا ہے، کسی خاص گروہ کو نہیں دیکھئے (۲۲/۴۱)۔ لہذا، اس آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، وعظ و نصیحت کی بات نہیں۔ اس فریضہ کو اسلامی مملکت احکام و قوانین کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پوری کی پوری امت کا فریضہ ہے نہ کہ کسی خاص گروہ کا۔ اور امت اس فریضہ کو اقتدار مملکت کی رو سے سرانجام دیتی ہے نہ کہ وعظ و نصیحت کے ذریعے۔ اسلام کے صدر اول میں اس فریضہ کی ادائیگی کی یہی شکل تھی، یعنی امت اس فریضہ کو اسلامی مملکت کے ذریعے سرانجام دیتی تھی۔ اس زمانے میں اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کوئی الگ گروہ نہیں تھا۔

صدر اول کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو دین میں ثنویت پیدا ہو گئی جس کے نتیجے میں مذہبی پیشوائیت وجود میں آگئی۔ انہوں نے کہا کہ سیاسی امور تو حکومت کے متعلق ہیں اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہمارا فریضہ ہے۔ اس کے لئے انہیں کسی سند کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ سند تلاش کر لی اور وہ بھی خود قرآن سے۔ آپ حیران ہوں گے کہ قرآن کریم جو مذہبی پیشوائیت کو مٹانے کے لئے آیا تھا، اس سے اس کی سند کیسے مل سکتی تھی۔ لیکن جب کوئی قرآن کو مسخ کرنے پر اتر آئے تو اسے اس سے اپنی کونسی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی؟ سنئے کہ انہوں نے یہ سند کیسے حاصل کی۔

سورۂ آل عمران کی ایک آیت پہلے درج کی جا چکی ہے جس میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ "تم وہ امت ہو جس کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے" (۳/۱۱۰)- اسی سورۃ میں اس سے ذرا پہلے ہے **ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر** (۳/۱۰۴) اس کا ترجمہ یوں کر لیا گیا کہ "تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے"- اس سے یہ سند لے آئے کہ یہ فریضہ امت میں سے ایک خاص گروہ کا ہے اور وہ گروہ علماء یا مذہبی پیشواؤں کا ہے- ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قران کریم میں جہاں جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر آیا ہے اسے پوری کی پوری امت کا فریضہ بتایا گیا ہے- اگر آیت (۳/۱۰۴) کا وہ مفہوم لیا جائے جس کے سہارے مذہبی پیشوائیت نے اپنے وجود کی سند مہیا کی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان تمام چیزوں کو منسوخ قرار دے دیا جائے گا جن میں اسے پوری کی پوری امت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے- اگر انہیں منسوخ نہ سمجھا جائے تو پھر قرآن کریم میں تضاد لازم آئے گا' یعنی وہ متعدد آیات میں اسے پوری کی پوری امت کا فریضہ قرار دیتا ہے اور ایک آیت میں امت میں سے ایک گروہ کا فریضہ- یہ کھلا ہوا تضاد ہے جو خود قرآن کریم کے دعوئ کے خلاف ہے (۴/۸۲) اور جس سے قرآن مجید کی محکمیت ختم ہو جاتی ہے-

سوال یہ ہے کہ ان حضرات نے یہ مفہوم لے کس طرح سے لیا' جو قرآن کریم کی پوری کی پوری تعلیم کے خلاف ہے- آیت کے الفاظ ہیں "**ولتکن منکم امۃ**" انہوں نے **منکم** سے فائدہ اٹھایا اور اس کا مفہوم یہ لیا کہ "تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے"- عربی زبان کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ حرف من کے متعدد معانی میں سے دو معانی نمایاں ہیں' یعنی **تبعیض** اور **تبئین**- تبعیض کے معنی ہوتے ہیں "میں سے" اور تبئین سے مراد ہوتی ہے "پورے کا پورا"- عربی لغت کے ماہرین کا قول ہے کہ حرف من کو تبعیض (میں سے) کے معنوں میں صرف اس مقام پر لینا چاہیے جہاں اس کی جگہ لفظ "بعض" کو بلا تکلف لا سکیں- جہاں ایسی صورت نہ ہو وہاں اس کے معنی تبئین کے لینے چاہئیں (یعنی پورے کا پورا)- حوالہ کے لئے دیکھئے اتقان- میں اس مقام پر مثال کے طور پر صرف دو آیات پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں-

(۱) سورۂ التغابن میں ہے: **ھو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن** (۶۴/۲) "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا- پھر تم میں سے بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن"- ظاہر ہے کہ یہاں من کے معنی تبعیض ہی کے لئے جائیں گے- دوسری طرف سورۂ فاطر میں ہے **والذی اوحینا الیک من الکتب ھو الحق** (۳۵/۳۱) "اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف وہ کتاب نازل کی جو حق پر مبنی ہے"- اگر یہاں من کے معنے "بعض" لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کا صرف کچھ حصہ رسول پر نازل کیا- اس مفہوم کی رو سے اسلام کی اصل و اساس پر پانی پھر جاتا ہے- **لہذا**' اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے تمہاری طرف پوری کی پوری کتاب نازل کی- اس میں "منکم" کے یہی معنی ہیں اور یہی معنی آیت (۳/۱۰۴) میں لئے جائیں گے کیونکہ سارے قرآن میں امر بالمعروف اور نہی عن

المنکر کا فریضہ پوری کی پوری امت کا قرار دیا گیا ہے نہ کہ امت میں سے کسی ایک گروہ کا۔ اس سے واضح ہے کہ اس آیت کی وہ تاویل جو یہ حضرات کرتے ہیں منشاء و مقصود قرآنی کے یکسر خلاف ہے۔

ایک اور پیچیدگی

لیکن اگر ان حضرات کی اس تاویل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے **ولتکن منکم امتہ** "تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو یہ فریضہ ادا کرے۔ اس سے (ان حضرات کی تاویل کی رو سے بھی) امت میں اس قسم کی صرف ایک جماعت کے وجود کا جواز نکل سکتا ہے' ایک سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن امت میں اس فریضہ کی ادائیگی کے مدعی جس قدر فرقے اور جماعتیں ہیں ان کا حدو شمار ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قدر کثیر تعداد کے گروہ اپنے جواز کے لئے اس آیت سے کس طرح سند لیتے ہیں؟ اس کا طریق بڑا آسان ہے۔ ان میں سے ہر گروہ کا دعویٰ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والی جماعت ہم ہیں' باقی تمام فرقے اور جماعتیں اپنے دعوے میں جھوٹی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک نئی جماعت کی تشکیل کا ارادہ کرتا ہے تو اسے پہلے سے موجود فرقوں اور جماعتوں کو (CONDEMN) کرنا پڑتا ہے' یعنی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان جماعتوں میں سے کوئی بھی اس فریضہ خداوندی کو ادا نہیں کر رہی' اس لئے ایک نئی جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے۔

ایک اور جماعت

مثال کے طور پر جماعت اسلامی ہی کو لیجئے جو اس دعویٰ کی سب سے بڑی مدعی ہے۔ مودودی کسی جماعت کے بغیر اپنے خیالات کی اشاعت کرتے چلے آرہے تھے اور جماعت سازی کو تفرقہ پردازی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا تھا:۔

> مسلمان قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں' تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔
>
> (مسلمان اور سیاسی کشمکش' جلد [illegible] ص ۵۷)

اس کے بعد جب ان کے دل میں اپنی الگ جماعت کے قیام کا خیال ابھرا تو یہ "تفرقہ پردازی اور [illegible] بندی" نہ رہی بلکہ عین تقاضائے اسلام قرار پا گئی۔ اس کے لئے' جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے' یہ ضروری تھا کہ پہلے باقی جماعتوں کو

(CONDEMN) کیا جائے' چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں لکھا:۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات' مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کا سد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علماء دین اور مفتیان شرع متین' دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں...... انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور صالح جماعت کا برسرکار آنا ہے..... اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے' صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔

(سیاسی کشمکش' حصہ سوم' ص ۲۰۱' ۱۹۷' ۹۵)

اس طرح انہوں نے اپنی جماعت کی تشکیل کی اور اس کے جواز میں سند اسی آیت کی پیش کر دی۔ اس سے یہ نہیں ہوا کہ پہلے سے موجود فرقوں اور جماعتوں نے کہہ دیا ہو کہ ہم سب واقعی راہ گم کردہ ہیں اس لئے ہم اپنے وجود کو ختم کرتے ہیں۔ اس فریضہ خداوندی کی ادائیگی کے لئے یہی نئی جماعت موجود رہے گی۔ مودودی صاحب نے انہیں راہ گم کردہ قرار دیا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو برسر حق اور جماعت اسلامی کو راہ گم کردہ قررا دے دیا اور اس طرح یہ سب اپنی اپنی جگہ قائم اور مطمئن رہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔ یہی وہ فرقہ بازی اور جماعت سازی ہے جسے قرآن کریم شرک کہہ کر پکارتا ہے' جب کہتا ہے کہ **ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون** (۳۰/۳۱-۳۲) "مسلمانو' دیکھنا!...... تم ایمان لانے کے بعد مشرکین میں سے نہ ہو جانا' یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود بھی ایک فرقہ یا جماعت بن گئے۔ اس تفرقہ بازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر گروہ اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔" جب تک کوئی فرقی یا جماعت (حزب) یہ ذہنیت نہ پیدا کرے' اس کا جداگانہ تشخص باقی نہیں رہ سکتا۔ الگ تشخص کے لئے دو شرائط لازمی ہیں۔ جماعت کے اندر عصبیت اور دوسروں کے خلاف نفرت اور یہ دونوں چیزیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب آپ اپنے کو برسر حق اور دوسروں کو باطل پرست قرار دیں۔ ہر فرقہ اور ہر جماعت کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

عقیدتاً" تو ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات ذاتی مصلحتیں انہیں بعض دوسری جماعتوں کے برسر حق ہونے کے اعتراف پر مجبور کر دیتی ہیں۔ مثلاً" ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ جب مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی طرح ڈالی تو یہ کہہ کر کہ ملک کے تمام علمائے دین اور مفتیان شرع متین سب کے سب راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں

بھٹک رہے ہیں اور تمام فرقے اور جماعتیں جنس کا سد ہیں۔ لیکن جب یہاں انہوں نے ان ہی علماء دین اور مفتیان شرع متین کے اتحاد سے متحدہ محاذ قائم کیا تو فرمایا:۔

> موجودہ حالت میں ایسی جماعتوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں میں دین کا علم پھیلانے کی کوشش کریں اور ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے جدوجہد کریں...... یہ وہ تفرقہ نہیں جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے بلکہ یہ اس آیت قرآنی کے منشاء کے عین مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیے جو نیکی کی طرف بلائے اور برائیوں سے روکے۔ (نوائے وقت بابت ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۸ء)

چلتے چلتے یہ بھی دیکھئے کہ مودودی صاحب نے قرآنی آیت کا ترجمہ تو یہ کیا ہے کہ "تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیے" لیکن کہا یہ ہے کہ "موجودہ حالت میں ایسی جماعتوں کی ضرورت ہے"۔ آپ نے غور فرمایا کہ جب انسان پر مفاد پرستی کے جذبات غالب آجاتے ہیں تو وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کس قسم کی متضاد باتیں کرتا ہے۔

یہ ہے، میرے عزیز! جماعت سازی کے متعلق قرآن کریم کی واضح تعلیم۔ وہ امت میں مختلف جماعتوں اور فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیتا ہے۔ میری زندگی کا مشن امت میں اس احساس کا بیدار کرنا ہے کہ اسلام اور وحدت امت لازم و ملزوم ہیں اور اس کے لئے قرآنی مملکت کا قیام ناگزیر ہے۔ میں اس فکر کو 'الگ فرقہ' پارٹی یا جماعت بنائے بغیر' عام کئے چلا جا رہا ہوں۔

میرا مشن

مختلف مقامات پر جو لوگ اس فکر سے متفق ہوتے ہیں وہ مل بیٹھتے ہیں' یہ سوچنے کے لئے کہ اس فکر کو باہمی تعاون سے عام کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ اس تعاونی شکل کا نام بزم طلوع اسلام ہے اور اسی کو میں اجتماعی کوشش سے تعبیر کرتا ہوں۔ چونکہ اس قرآنی فکر کی کامیابی سے مختلف فرقوں اور جماعتوں کا وجود باقی نہیں رہتا اس لئے ان کی طرف سے اس کی مخالفت لابدی ہے۔ مجھے ان کی اس مخالفت کا نہ کوئی گلہ ہے نہ افسوس۔ افسوس اس امر کا ہے کہ وہ اس مخالفت میں جھوٹے پروپیگنڈے اور بہتان تراشیوں سے کام لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں بتایا گیا ہے کہ "زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہوتا ہے" (مودودی صاحب)۔ ان ہی بہتان تراشیوں میں ایک شاخسانہ پرویزی فرقہ کا بھی ہے۔ آپ سوچئے کہ جو پرویز فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہو وہ خود ایک فرقہ بنائے گا؟ لیکن یہ اس کی رٹ لگائے چلے جاتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں ایک جماعت ضرور قائم کروں:۔

> لوگ اسے فرقہ تو ضرور کہیں گے لیکن کم از کم بے چین روحوں کو تو کوئی جائے سکون نظر آسکے گی۔

لوگوں کی تسکین کی خاطر ہی سہی

مجھے آپ کی اس سادگی پر رحم بھی آیا اور ہنسی بھی۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ فرقہ سازی شرک ہی سہی لیکن اس سے کچھ بے چین روحوں کی تسکین کا سامان تو مہیا ہو جائے گا۔ یہ اسی قسم کی فرمائش ہے جیسی فرمائش بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے یہ کہہ کر کی تھی کہ ہمیں ایک بت بنوا دیجئے تاکہ ہم اپنے جذبہ صنم پرستی کی تسکین کر سکیں۔ اس قسم کی تسکین کا سامان کوئی سامری تو بہم پہنچا سکتا ہے' وحی خداوندی کا متبع ایسا نہیں کر سکتا۔ یاد رکھیے! اس قسم کا سکون وہ فریب نفس ہوتا ہے جو مذہبی افیون سے پیدا ہوتا ہے ——— یہ دیر' کنشت' صومعے' بتکدے' درگاہیں' خانقاہیں' تکیے' زاویے ——— سب اسی فریب سکون کی تلاش کے مظاہر ہیں۔ غالب کے الفاظ میں ۔

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا!
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

اسلام انہیں مٹا کر' وہ اطمینان دلانے کے لئے آیا تھا جو علیٰ وجہ البصیرت' دل و دماغ کے مطمئن ہو جانے کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

———————○———————

نماز کیسے پڑھی جائے

آپ نے جماعت سازی کے سلسلہ میں نماز کا ذکر چھیڑ دیا اور یہ بالکل فطری امر تھا۔ اس لئے کہ وہ نماز جو وحدت امت کا محسوس مظہر تھی' آج امت میں تفرقہ کی بین علامت بن گئی ہے۔ دس ہزار مسلمان ایک جلسے میں بیٹھے مقرر کی تقریر سن رہے ہوں گے اور ان میں باہمی تفرقہ کا شائبہ تک دکھائی نہیں دے گا۔ لیکن جونہی اذان کی آواز کانوں تک پہنچے گی وہ اجتماع مختلف ٹولیوں میں بٹ جائے گا اور اپنے اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھے گا۔ اس قسم کی تشتت خیز نمازوں کا نقشہ آپ متحدہ محاذ میں شامل ان جماعتوں میں دیکھ چکے ہیں جنہیں مودودی صاحب دین کی تبلیغ کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں:

> جب اجتماعی کوشش کی صورت میں کسی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے گا تو دین کے اہم ترین رکن نماز کے بارے میں بھی آپ کو بتانا ہوگا کہ کس طرح مل کر پڑھی جائے۔ آپ کی یقیناً" ریسرچ ہوگی کہ حضور پاکؐ اور ان کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی تھی۔

ریسرچ

میرے عزیز! اگر آج کسی طرح بھی حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ حضورؐ نبی اکرم اور آپ کے صحابہؓ نے

کس طرح نماز پڑھی تھی (اور دیگر ارکان اسلام ادا فرمائے تھے) تو امت کے کس قدر اختلافات مٹ جائیں؟ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہ سن کر آپ کو حیرت تو ضرور ہو گی لیکن جب یہ حقیقت ہے تو (بادل ناخواستہ ہی سہی) مجھے یہ کہنا اور آپ کو سننا پڑے گا۔ آج کوئی ذریعہ تحقیق ایسا نہیں جس سے حتمی طور پر یہ معلوم کیا جا سکے۔ یہ بڑا اہم اور نازک معاملہ ہے۔ اس لئے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضورؐ نبی اکرم نے اپنے عرصہ نبوت میں نمازیں پڑھیں اور تنہا اور خلوت میں نہیں پڑھیں' ہزارہا صحابہؓ کی معیت میں پڑھیں۔ یہ کوئی نظری مسئلہ نہیں تھا جس کے مفہوم کے سمجھنے میں اختلاف ہو جاتا۔ یہ ایک محسوس عمل تھا جسے' صحابہؓ نے رسولؐ اللہ کو کرتے ہوئے دیکھا اور خود بھی حضورؐ کی اقتداء میں ویسے ہی کیا۔ پھر حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے بھی اس عمل کو جاری رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس تمام دوران میں نماز کی ایک ہی شکل ہو گی۔ عمل محسوس کی صورت یہ ہے کہ وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک اسی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ صحابہؓ کے زمانے سے آج تک امت کا سلسلہ متواتر چلا آرہا ہے' یعنی ایسا نہیں ہوا کہ کسی زمانے میں سابقہ امت پوری کی پوری ختم ہو گئی ہو اور پھر کچھ عرصہ کے خلاء کے بعد ایک نئی امت وجود میں آئی ہو۔ ایسا نہیں ہوا۔ امت کا تواتر اور تسلسل برابر قائم رہا۔ اس حقیقت کے پیش نظر نماز کی وہ شکل جو عہد رسالت مآبؐ میں قائم ہوئی تھی' اسے اسی شکل میں آج تک قائم رہنا چاہیے تھا۔

تواتر محسوس

لیکن آج ہی نہیں ہمارے ہاں صدیوں سے یہ عالت ہے کہ مختلف فرقوں کی نمازیں مختلف ہیں۔ اور ان اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ایک فرقے کا پیرو دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتا۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اس نماز کا کیا ہوا جو صدر اول میں قائم ہوئی تھی اور اس کی جگہ یہ مختلف نمازیں کہاں سے آگئیں؟ ہمارے ہاں کے لٹریچر میں اس کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ آپ فرمایئے کہ ہمارے پاس وہ کونسا ذریعہ ہے جس سے یقینی طور پر کہا جا سکے کہ اس نماز کی یہ شکل تھی۔

---------------○---------------

احادیث

اب آگے بڑھیے! ہر فرقہ اپنی نماز کی تائید میں احادیث پیش کرتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے ہاں احادیث کے ان مجموعوں میں بھی جنہیں صحیح تسلیم کیا جاتا ہے' نماز کی مختلف شکلیں ملتی ہیں' اور ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے اپنی نماز کی شکل صحیح حدیثوں پر قائم کر رکھی ہے۔ آپ فرمایئے کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے حتمی طور پر یہ کہا جا سکے کہ ان میں سے فلاں احادیث کی رو سے نماز کی جو شکل قائم ہوتی ہے وہ رسول اللہؐ کی نماز تھی۔ ایسا کوئی ذریعہ نہیں۔

---------------○---------------

تاریخ

احادیث سے آگے بڑھ کر تاریخ کی طرف آیئے۔ اسے بھی ہم دنیا کے سامنے بڑے فخر سے پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن ذرا حقائق کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ اس کی پوزیشن کیا ہے۔ مدینہ منورہ عہد رسالت مآبؐ میں اولین تین خلفاءؓ راشدین کے زمانے تک اس مملکت کا دارالخلافہ رہا جس کی حدود مختلف براعظموں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض مملکت کے نظم و نسق کے لئے کوئی سیکریٹریٹ ہوگا۔ تحریری احکام جاری ہوتے ہوں گے...... دستاویزات ضبط تحریر میں لائی جاتی ہوں گی۔ مختلف ولایات کے گورنروں کے ساتھ خط و کتابت ہوتی ہو گی۔ دوسری سلطنتوں کے ساتھ معاہدات ہوتے ہوں گے۔ حکومت کی آمدنی اور خرچ کے حسابات رکھے جاتے ہوں گے۔ اس سیکریٹریٹ میں ان سب کا ریکارڈ ہوگا۔ لیکن کیا یہ حقیقت موجب صد حیرت نہیں کہ ان میں سے کاغذ کی ایک چٹ تک بھی ہمارے ہاں موجود نہیں۔ مدینہ منورہ اس زمانے سے آج تک مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا اور آباد و شاداب رہا۔ اس پر باہر سے نہ کوئی حملہ ہوا جس کی بدولت وہ ریکارڈ ضائع ہو گیا ہو۔ نہ کوئی زلزلہ آیا کہ وہ عمارات زمین میں دھنس گئی ہوں۔ نہ کوئی ایسی آگ لگی نہ کوئی سیلاب آیا۔

وہ ریکارڈ کہاں گیا؟

اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ اتنا ذخیرہ بالآخر گیا کہاں؟ اس کے متعلق نہ کسی نے کوئی تحقیق کی نہ اس سوال کا کوئی جواب دیا۔ اس دور کی پہلی مفصل تاریخ تیسری صدی میں جا کر مرتب ہوئی اور وہ بھی احادیث کی طرح زبانی روایت کی بنا پر۔ کسی مورخ نے یہ نہیں لکھا کہ میں نے اپنی تاریخ کو اس دور کی اصل (ORIGINAL) دستاویزات سے مرتب کیا ہے۔ یہ جو حضورؐ نبی اکرم کے دو چار نامہ مبارک (خطوط) شائع ہوئے ہیں وہ باہر کے علاقوں کے غیر مسلموں کے ہاں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہے ہمارے اس دور کی تاریخ کی حالت! آپ فرمایئے کہ کیا اس کی رو سے اس دور سے متعلق حتم و یقین کے ساتھ کچھ بھی کہا جا سکتا ہے؟ اس پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ اس دور کے احوال و کوائف کے متعلق یقینی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا! اس اعتراض کا جواب میرے ذمے نہیں۔ میرے متعلق تو آپ صرف یہ دیکھئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے' وہ حقیقت ہے یا نہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ فرمایئے کہ ہمارے ہاں ریسرچ کے وہ کونسے ذرائع ہیں جن کی بناء پر کوئی حتم و یقین کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جو نماز ادا فرمائی تھی اس کی ہیئت اور تفصیلات یہ تھیں۔ "حتم و یقین" کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے خلاف کچھ ثابت نہ کیا جا سکے۔ نماز کی دیگر تفاصیل کو تو چھوڑیئے' ہمارے ہاں اس ہزار سال میں یہ بھی طے نہیں پا سکا کہ حضورؐ نے تراویح کی آٹھ رکعت ادا فرمائی تھیں یا بیس رکعت' حالانکہ اس کا تعلق محسوس گنتی سے ہے۔ ان حالات کے پیش نظر میں یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ارکان اسلام کو جس جس طریق سے ادا کرتے چلے آرہے ہیں' ادا کرتے رہیں لیکن ایک

دوسرے سے جھگڑیں نہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا طریق سنت نبویؐ کے مطابق ہے' کوئی بھی حتم و یقین کے ساتھ ایسا ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر ثابت کیا جا سکتا تو یہ اختلافات کیوں پیدا ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ کسی فرد یا گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں کہ ان طریقوں میں کوئی ردو بدل کر سکے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے کیونکہ ایسا کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی اتھارٹی نہیں ہوگی۔ اگر کبھی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے انداز کی قرآنی مملکت قائم ہو گئی تو اسے یہ اتھارٹی حاصل ہو گی کہ وہ امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے کوئی متفقہ طریق متعین کرے۔ اتھارٹی کے بغیر فرقہ اہل قرآن نے ایک نئی وضع کی نماز ایجاد کی تھی۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوا کہ "کل حزب بما لدیھم فرحون" (۳۰/۳۲) کی صف میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

میں نے اپنے جس مسلک کا اوپر ذکر کیا ہے' میں خود بھی اس پر کاربند ہوں۔ میں حنفی گھرانے میں پیدا ہوا اور اس لئے اسی مسلک کے مطابق نماز پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ اگرچہ میں کسی دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے ساتھ نماز پڑھنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔

کنونشن میں نماز

آپ پوچھتے ہیں کہ میں طلوع اسلام کنونشن کے موقع پر نماز باجماعت کا اہتمام کیوں نہیں کرتا۔ طلوع اسلام کنونشن میں مختلف مسالک کے پیروکار جمع ہوتے ہیں۔ آپ فرمایئے کہ اس میں کس مسلک کے مطابق نماز باجماعت کا اہتمام کیا جائے؟ انہیں کسی ایک مسلک کے مطابق نماز پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر ہر مسلک کے متبعین کو اجازت دی جائے کہ پنڈال میں اپنی اپنی الگ جماعت کھڑی کر لیں تو اس سے تشتت اور انتشار کا جو عبرت ناک منظر سامنے آئے گا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات کے تابع مناسب یہی ہے کہ مختلف مسالک کے لوگ مختلف مساجد میں جا کر اپنے اپنے طریق کے مطابق نماز ادا کر لیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے کنونشنوں میں آج تک کسی قسم کا کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ وہ وحدت فکر و نظر کی بنا پر باہمی اخوت اور مساوات کے مثالی اجتماعات ہوتے ہیں۔ مقصد ان سب کے سامنے ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ امت میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (قرآنی مملکت) کا قیام کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی مملکت کی سنٹرل اتھارٹی کو میں مرکز ملت کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس کے لئے منزل اول یہ ہے کہ مسلمانوں کی ذہنیت میں قرآن کے مطابق تبدیلی پیدا کی جائے۔ اور یہ چیز قرآن کریم کے بتائے ہوئے طریق کے عین مطابق ہی نہیں بلکہ لاینفک ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس میں نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ کی جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے قوم کے دل و دماغ میں اس حقیقت کا راسخ کرنا ہے کہ وحدت امت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ مسلمانوں میں مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں' یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی داعی جماعتیں' یہ سب تفرقہ کا موجب ہیں اور تفرقہ قرآن مجید کی رو سے شرک ہے۔ اگر' جیسا کہ آپ نے کہا ہے' میں بھی ایک الگ جماعت بنالوں تو اس کا مطلب ہو گا کہ میں مذہب کے بتکدے میں

ایک اور بت کا اضافہ کر دوں- میں اس تصور سے ڈرتا اور کانپتا ہوں- میں نے پارٹی بنائے بغیر قرآنی مفہوم کے عام کرنے کی طرح ڈالی اور توفیق ایزدی سے اس میں مجھے اپنے اندازہ سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے- اگر مذہب پرست طبقہ' جو قرآنی مملکت کے قیام میں اپنے وجود کی نفی دیکھتا ہے' اس کی مخالفت نہ کرتا اور جھوٹے پروپیگنڈے کی بنا پر اس کے راستے میں روڑے نہ اٹکاتا تو یہ کامیابی اور بھی زیادہ ہوتی- آپ سوچئے کہ ایک طرف ان کی طرف سے پیدا کردہ مشکلات اور دوسری طرف میرا یہ اصول کہ اس مقصد کے لئے نہ صدقہ نہ خیرات' نہ نذر نہ نیاز' نہ فطرانہ نہ زکوۃ یا قربانی کی کھالوں کی رقوم جمع کرتی ہیں اور نہ ہی ' کسی بیرونی ملک سے امداد حاصل کرنا تو ایک طرف' خود اپنی پبلک سے بھی چندہ نہیں مانگنا--------- جو کچھ کرنا ہے خود اپنے وسائل ہی سے کرنا ہے--------- ان مانعات اور اس کوتاہ دامانی کے باوجود اس باب میں اس قدر کامیابی کا سبب اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ حق کی آواز ہے اور حق کی آواز کو اگر تھوڑا سا بھی محسوس سہارا میسر آجائے تو وہ اپنے زور دروں سے بڑی تیزی سے آگے بڑھ جاتی ہے-

یہ ہے عزیز من! میرا مقصد' میری زندگی کا مشن اور میرا طریق کار- جو احباب اس سے بطیب خاطر متفق ہوتے ہیں وہ اس فکر کو آگے بڑھانے میں باہمی تعاون سے کام لیتے ہیں- اس مشن کو اور آگے بڑھانے اور اس سے اپنی زندگی کے بعد بھی اس چراغ کو زندہ رکھنے کے لئے قرآنک ریسرچ سنٹر اور درس گاہ کے قیام کا پروگرام میرے سامنے ہے- اس کے راستے میں جو روڑے اٹکائے گئے اور جو مشکلات پیدا کی گئیں انہیں

کسی بتکدہ میں کروں بیاں تو صنم بھی کہدے ہری ہری

لیکن بفضلہ تعالیٰ ان مشکلات پر قابو پا لیا گیا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں عملی پیش رفت جلد سامنے آجائے گی- اگر میری زندگی نے ایفا کی تو میں امید کرتا ہوں کہ میں اسے اپنے سامنے بار آور ہوتا دیکھ لوں گا-

وبیدہ التوفیق

سوالات کے جوابات

آپ نے اپنے خط کے آخیر میں کچھ متعین سوالات پوچھے ہیں- ان میں سے پہلے دو کا جواب تو تصریحات بالا میں آگیا ہے--------- یعنی نماز کے طریق اور الگ پارٹی کے قیام کے متعلق- آپ کا تیسرا سوال ہے-

۳- کیا آپ نے کبھی حج فرمایا- ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک کے دورے پر برائے تعلیم یا ریسرچ بھی تشریف لے گئے-

جواب --------- جی نہیں--------- ذاتی طور پر مجھے اس کی استطاعت نہیں اور عوام کے پیسوں پر ایسا کرنا میرے لئے قابل قبول نہیں-

آپ کا چوتھا سوال یہ ہے:-

۴- اسلام میں خلافت کا معیار اور طریق انتخاب کیا ہے- جو قرون اولیٰ یا زمانہ خلفاء

راشدینؓ میں اختیار کیا گیا تھا؟ قرآن کیا کہتا ہے اور اب موجودہ دور میں کونسا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کیا صحابہؓ ثلاثہ کا طریق درست تھا۔

جواب معلوم نہیں "خلافت" سے آپ کی مراد کیا ہے۔ اگر اس سے مراد اسلامی حکومت ہے تو جو حکومت اپنے جملہ معاملات میں قرآنی اقدار کی پابند ہو اسے اسلامی حکومت یا خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جائے گا۔ جہاں تک انتخاب یا حکومت کے کسی اور طریق کار کا تعلق ہے' اس باب میں ایک اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

اصول اور تفصیلات

قرآن مجید نے جن امور کی تفصیلات خود متعین نہیں کیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور ابدی قرار دینا منشاء خداوندی نہیں تھا۔ اس نے اصول اور حدود متعین کر دیئے اور اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ان کی تفاصیل اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کرے۔ یہ حدود اور اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی لیکن ان کی جزئیات اور انہیں روبہ عمل لانے کا طریق کار ضروریات زمانہ کے مطابق بدلتا رہے گا۔ بنا بریں' کسی ایک زمانے میں اختیار کردہ طریق' آنے والے زمانوں کے لئے لازی نہیں قرار پاتا۔ لہٰذا ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ صحابہؓ نے کیا طریق عمل اختیار کیا تھا۔ اول تو' جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا' ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں جس کی رو سے ہم حتمی اور یقینی طور پر کہہ سکیں کہ انہوں نے کیا طریق کار اختیار فرمایا تھا------ چونکہ قرآن کریم نے انہیں مومن حقہ قرار دیا ہے اس لئے یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جو طریق بھی اختیار فرمایا ہوگا وہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اختیار کیا ہوگا (اس کی تفصیل آپ کو میری کتاب "شاہکار رسالت" میں ملے گی)۔ دوسرے یہ کہ ہم پر اس کی من و عن پابندی لازی نہیں۔ انہوں نے وہ طریق اپنے حالات کے مطابق اختیار کیا ہوگا۔ قرآن نے اصول یہ بیان فرمایا ہے کہ امور مملکت باہمی مشاورت سے طے کرو۔ اس مشاورت کا طریقہ کیا ہوگا' اسے اس نے ہم پر چھوڑا ہے کہ ہم اپنے حالات کے مطابق جو طریق کار مناسب سمجھیں' اختیار کر لیں------ شرط وہی ہوگی کہ یہ طریق کار قرآن مجید کے اصول' اقدار اور حدود سے متصادم نہ ہو۔

آپ پوچھتے ہیں کہ "موجودہ دور میں کونسا طریقہ اختیار کیا جائے"۔ میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے وہ قرآنی حکومت کے متعلق ہے' یعنی اس حکومت کے متعلق جو قرآنی اصول و حدود کی پابند ہو۔ اس وقت دنیا میں کوئی حکومت بھی ایسی نہیں۔ جب کوئی اسلامی حکومت قائم ہوگی' تو وہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو طریق کار بھی اپنے لئے متعین کرے گی وہ اسلامی قرار پا جائے گا۔ ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ اسلامی حکومت تو کہیں موجود نہیں اور ان بحثوں پر گتھم گتھا ہوتے رہتے ہیں کہ حکومت سے متعلق اسلامی احکام کیا ہیں۔ اس وقت جن طرق و احکام کو اسلامی یا شرعی کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ کسی فرقہ کے فقہی احکام ہوتے ہیں۔ انہیں اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ یوں بھی وہ احکام کسی خاص زمانہ کے حالات کے مطابق مدون ہوئے تھے جو آج کے حالات میں فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ اگر کوئی حکومت اسلامی بننا چاہتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے فیصلہ کرے کہ اس کا جملہ کاروبار حدود قرآنی کے اندر رہتے ہوئے بروئے

کار آئے گا۔ اس کے بعد وہ جو فیصلے قرآن کریم کے مطابق کرے گی وہ اسلامی کہلائیں گے۔ اس وقت امت میں جو خلفشار ہے وہ ان حقائق کو نظرانداز کر دینے کا نتیجہ ہے۔

باقی رہا آپ کا یہ سوال کہ "کیا صحابہؓ ثلاثہ کا طریق درست تھا" سو اول تو (جیسا کہ لکھا جا چکا ہے) ہم یقینی طور پر کہہ نہیں سکتے ہیں کہ ان کا طریق کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہمیں ان کے اعمال و کردار کو موضوع بحث بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ حضرت عمرؓ یا حضرت صدیق اکبرؓ کا طریق درست تھا یا نہیں۔ وہ ہم سے ہمارے طریق ہی کے متعلق پوچھے گا۔ اس نے یہ بنیادی اصول بیان کر دیا ہے کہ:

تلک امتہ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون(۲/۱۴۱)

یہ لوگ اپنے اپنے وقتوں میں دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے تھا' جو کچھ تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

چونکہ قرآن مجید نے جملہ صحابہؓ کے متعلق کہا ہے کہ وہ سچے اور پکے مومن تھے (۸/۷۴) ان کے لئے جنت کی بشارت ہے (۹/۱۰۰)۔ تفصیل "شاہکار رسالت" میں ملے گی۔ لہٰذا قرآن مجید کی اس شہادت کی بنا پر ہمارا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ صحابہؓ کبار کی سیرت قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ عہد رسالت مآبؐ اور زمانہ صحابہؓ کی تاریخ اور احادیث کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کے خلاف ہیں انہیں غلط قرار دیتا ہوں۔ اسی قسم کی احادیث کے صحیح ہونے کا انکار ہے جس کی بناء پر مجھے منکر حدیث' فلہذا کافر قرار دیا جاتا ہے۔

آپ کا آخری سوال یہ ہے:

کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے' فقط زیارت کے لئے!

جواب: جی ہاں! میرے درویش خانہ کا دروازہ ہر متلاشی حق کے لئے کھلا ہے۔ جب کسی کا جی چاہے (وقت مقرر کر لینے کے بعد) ملاقات ہو سکتی ہے لیکن محض زیارت کے لئے نہیں۔ زیارت تو قبروں ہی کی کی جاتی ہے۔ زندہ انسانوں سے تو کچھ سیکھنے سکھانے کے لئے ملا جاتا ہے۔

آخر میں میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا خط جس حسن نیت کا آئینہ دار ہے وہ درخور تحسین ہے۔ دعا ہے' اللہ تعالیٰ آپ کے قرآنی ذوق میں برکت عطا فرمائے۔

والسلام

پرویز

---------○---------